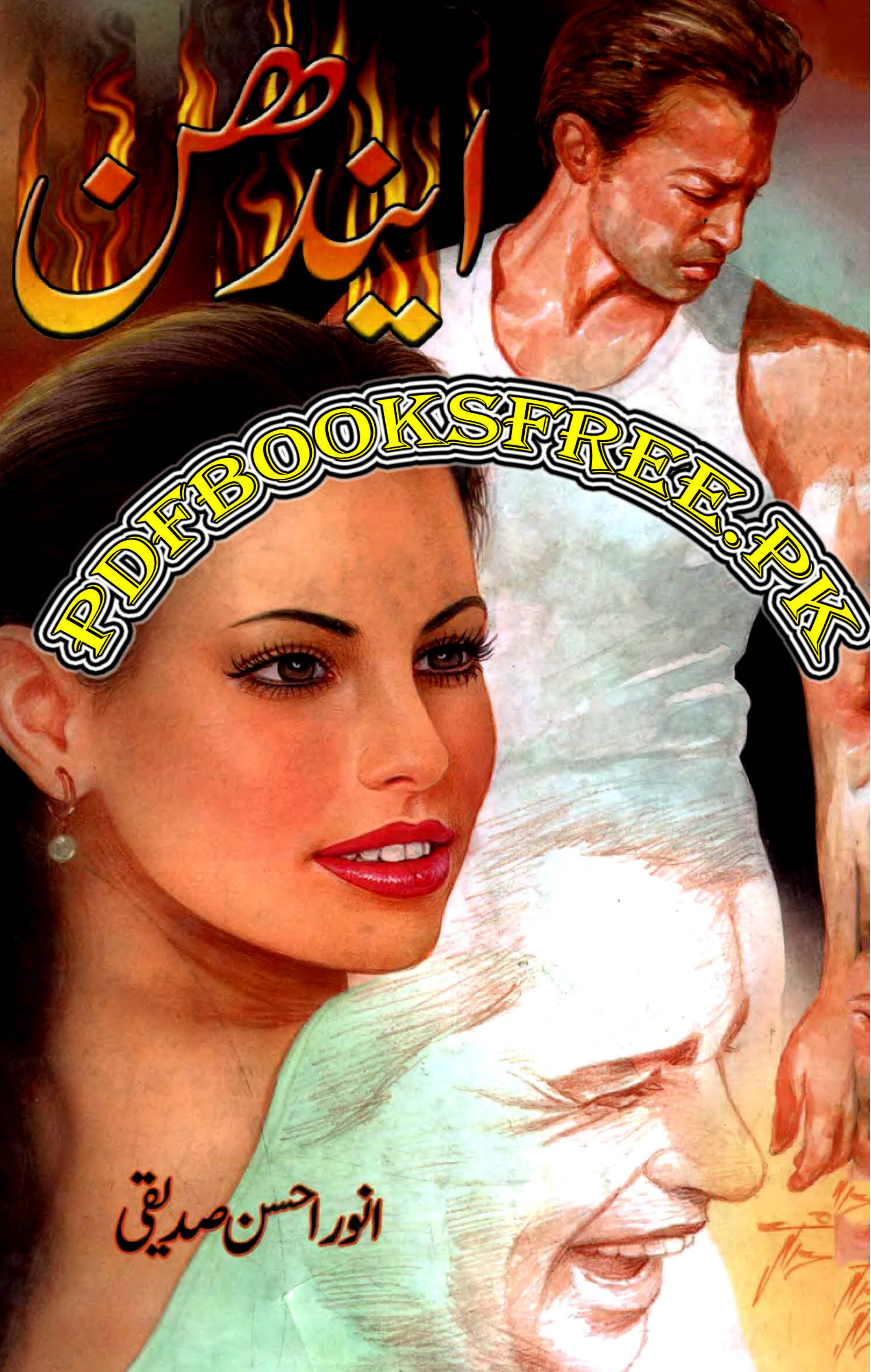


ایندھن
PDFBOOKSFREE.PK
انور احسن صدیقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



اندھیروں سے لڑنے والی کہانی

"ایندھن" نفرت پر محبت کی ازلی اور ابدی فتح کی کہانی ہے۔

محبت انسان کا وہ قوی ترین جذبہ ہے جسے ہر انسان اپنے ساتھ لے کر اس عالم رنگ و بو میں وارد ہوتا ہے۔ ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ محبت اور صرف محبت کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے تو اپنی ماں کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے اور اس کے لئے محبت کا اظہار کرتا ہے جو خود بھی اس کے لئے سراپا محبت ہوتی ہے اور پھر وہ اپنی معصوم مسکراہٹ سے ہر اس شخص کو محبت کا پیغام دیتا ہے جو اس کے قریب آ کر اس سے التفات جتاتا ہے۔ بچے کے دل میں کسی کے لئے نفرت کا جذبہ نہیں ہوتا لیکن جس معاشرے میں وہ آنکھ کھولتا اور پرورش پاتا ہے' وہ نفرتوں کا مارا ہوا بدنصیب معاشرہ اس فرشتوں جیسے معصوم اور پاکیزہ بچے کو بھی نفرت کرنا سکھا دیتا ہے۔

"ایندھن" دو ایسے محبت کرنے والے انسانوں کی کہانی ہے جنہوں نے اپنے وجود کی ساری توانائی اور اپنے باطن کی تمام تر قوت کے ساتھ اپنی محبت کا دفاع کیا اور خود کو اپنی نظروں سے گرنے نہیں دیا۔ انہوں نے نفرت کے خلاف جنگ کی اور روایت شکنی کے ذریعے نئی روایات قائم کرنے کی کوشش کی۔

یہ قبائلی و دیہی معاشرے سے جدید شہری معاشرے میں قدم رکھنے کی اور اس سفر کے دوران سوچ کے زاویوں اور سماجی رویوں میں غیر محسوس طور پر نمودار ہونے والی تبدیلیوں کی کہانی ہے' یہ معروضی حالات کے تحت بدلنے والے انسانی رشتوں کی کہانی ہے۔ یہ نسل' زبان اور قومیت کے امتیازات کو رد کرنے والی انسانی اخوت اور دردمندی کی کہانی ہے۔

"ایندھن" افراد اور گروہوں کی زندگی میں ان بدلتی ہوئی اخلاقی اور مادی قدروں

اور روایات کی کہانی ہے جو ماحول کی تبدیلی کے زیر اثر رونما ہوتی ہیں اور پسماندہ' کم ترقی یافتہ' دبے اور کچلے ہوئے ذہنوں کو نئی عصری روشنی عطا کرتی ہیں۔

"ایندھن" ہزاروں برس سے غیرانسانی روایات کی تاریکی میں پسے ہوئے جاگیرداری معاشرے میں اچانک نمودار ہو جانے والے روشن ستاروں کی کہانی ہے اور ان ظالم ہاتھوں کی کہانی بھی جو ہر قیمت پر ان ستاروں کو گل کر دینا چاہتے تھے۔

"ایندھن" معیشت کی نئی دنیاؤں میں نئے انسانی تعلقات کی تلاش و جستجو اور ان تعلقات کی بنیاد پر ایک نئی زندگی کی تعمیر کی کوشش کی کہانی ہے۔

"ایندھن" لازوال انسانی عزم و حوصلے' جرأت مندی اور پیش قدمی کی کہانی ہے' ایک ایسے سادہ دل معصوم لڑکے اور لڑکی کی کہانی ہے جنہوں نے اپنی سادگی اور معصومیت میں محبت کی سچائی کا رنگ بھر کر اسے ایک نیا مفہوم دیا۔

صوبہ سرحد کے ایک دور افتادہ سرد' پہاڑی گاؤں سے شروع ہو کر کراچی کے صنعتی معاشرے میں انجام پذیر ہونے والی یہ کہانی دو دنیاؤں کے تصادم کی ایک ایسی کہانی ہے جو بیک وقت الم انگیز بھی ہے اور نشاط آفریں بھی۔

انور احسن صدیقی

دور بہت دور نیلے شفاف' صاف ستھرے آسمان سے اجلی اجلی سفید دھوپ کی جو چاندی برس رہی تھی وہ بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف میں مل کر اس کو اور زیادہ چمکدار اور دلکش بنا رہی تھی اور پہاڑوں کی چوٹیاں بڑے بڑے آئینوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ جن کی طرف نظر بھر کر دیکھنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ آسمان سے لے کر پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں تک جیسے صاف چمکدار برق برس رہی تھی اور پہاڑ کی چوٹیوں سے لے کر نیچے دامن کوہ تک سفید براق اجالے کی بارش ہو رہی تھی۔ نرم حرارت آمیز' زندگی بخش اجالا' جو اس وقت چاروں طرف تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا اور دور دور تک کے مناظر صاف اور واضح نظر آتے تھے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی سورج اپنی فیاضیاں لٹاتا ہوا نظر آتا تھا اور گہرے نیلے' بے داغ آسمان پر دور دور تک بادل کا کوئی ٹکڑا نظر نہیں آ رہا تھا۔

خیر زماں نے نظر اٹھا کر نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان بالکل خالی تھا۔ کافی بلندی پر چند چیلیں ایک دوسرے سے کچھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اُڑ رہی تھیں۔ چیلوں کے سیاہ نظر آنے والے بدن چمکیلی دھوپ اور نیلے آسمان کے پس منظر میں ہوا کے دوش پر یوں ڈول رہے تھے جیسے وسیع و عریض سمندر میں دور بہت دور ننھی ننھی کشتیاں تیرتی ہوئی جا رہی ہوں۔

ساری فضا گہری اور پُراسرار خاموشی میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس قدر گہرا سناٹا تھا جیسے دنیا بھر سے آوازوں کا وجود ہی ختم ہو گیا ہو۔ ہلکی ہلکی خوشگوار حرارت میں لپٹا ہوا یہ سناٹا اپنے دامن میں ان گنت کہی اور ان کہی داستانوں کو چھپائے ہوئے تھا جو صدیوں سے اس پہاڑی علاقے میں جنم لیتی رہی تھیں اور دم توڑتی رہی تھیں۔ یہ سناٹا' یہ پہاڑ' یہ فضائیں ان ہزاروں داستانوں کی امین تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتی تھیں اور اپنا وقت پورا کر کے ماضی کے تہہ خانوں میں دفن ہو جاتی تھیں۔ ہمیشہ کے لئے' کبھی دوبارہ وقوع

پذیر نہ ہونے کے لئے۔

فضا کی اس گہری اور پُراسرار خاموشی کو توڑتی ہوئی کسی بھی وقت کسی پرندے کی تیز، کرخت یا سریلی آواز گونج اٹھتی اور پہاڑوں سے ٹکرا کر پیدا ہونے والی اس کی بازگشت دیر تک سنائی دیتی اور پھر رفتہ رفتہ ڈوب جاتی، کسی جاں بہ لب انسان کی نبضوں کی طرح اور پھر ذرا ہی دیر بعد کوئی دوسری آواز اس کی جگہ لے لیتی۔

اور پھر اچانک وہ مانوس اور سامعہ نواز آواز ابھری جس کا خیر زماں کو بڑی دیر سے انتظار تھا۔ یہ ایک بے الفاظ آواز تھی جس میں نہ کسی سے تخاطب تھا نہ کلام لیکن پھر بھی خیر زماں اس آواز کو اسی جیسی ہزاروں آوازوں کے درمیان پہچان سکتا تھا۔ اس آواز کے ساتھ تو اس کے دل و جان کا رشتہ تھا۔ یہ آواز اس کے لئے دنیا کی ساری آوازوں میں عزیز ترین تھی جس کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ یہ تو وہ آواز تھی جو اس کے لئے بالیدگیِ روح اور نشاطِ جاں کا سبب تھی۔ اس آواز کو سن کر اس کی آنکھوں میں نشہ اور ہزار رنگ اترتے تھے۔

وہ اس چٹان پر سے اٹھا جس پر وہ اب تک لیٹا ہوا تھا اور اس نے سامنے نظر ڈالی۔ اس کی بکریاں سامنے ہی موجود تھیں۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چٹان کے پیچھے سے نکل آیا اور اس طرف کو مڑ گیا جدھر سے اس نے وہ مانوس آواز آتی ہوئی سُنی تھی۔

وہ آ رہی تھی اور خیر زماں کے دل کی دھڑکنوں میں جیسے مٹھاس گھلتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اترنے والا نشہ اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا اور چہرے پر اچانک بکھر جانے والا رنگ اور زیادہ نکھر آیا تھا۔ اس وقت اس کا وجود سرمستی و شادمانی کی ایک ناقابل بیان کیفیت کا پیکر بن کر رہ گیا تھا۔ کس قدر خوشی تھی .... کتنی بہت ساری خوشی ایک ساتھ...........

اپنی بکریوں کو ہنکاتی ہوئی زرینہ، اونچی نیچی چٹانوں پر چلتی ہوئی اور ناہموار زمین پر سے گزرتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی جدھر اس کو آنا چاہئے تھا۔ جہاں خیر زماں اس کا انتظار کر رہا تھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی جیسے ساری کائنات مسکرا اٹھی۔ دو محبت کرنے والے جیسے ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں تو ان کے ساتھ پوری کائنات مسکرانے لگتی

ہے۔

وہ دونوں قدرے ایک ہموار چٹان پر ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ خیر زماں نے زرینہ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور اسے وہاں ایک ایسی ٹھنڈی، میٹھی، لطیف اور نازک روشنی نظر آئی جس نے خود خیر زماں کے سارے وجود کو منور کر دیا۔ یہ جاں بخش اور روح پرور روشنی خیر زماں کے رگ و پے میں سرایت کرتی چلی گئی۔

الفاظ بے معنی تھے، کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ زرینہ کا قرب ہی خیر زماں کے لئے ایک ایسی نعمت تھا جس کے بعد پھر اور کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی تھی۔ زرینہ اگر اس کے پاس موجود ہوتی تو وہ ساری عمر خاموش رہ کر گزار سکتا تھا۔ اس کے گلاب سے کھلے ہوئے پھول کی طرح تر و تازہ اور چاند جیسے روشن چہرے کو اپنی نظروں کے سامنے پا کر اسے تکتے ہوئے وہ اپنی پوری زندگی گزار سکتا تھا۔ دنیا کا سارا حسن اس دل آویز احساس میں سمٹ آتا تھا کہ زرینہ اس کے پاس موجود ہے اور وہ جب چاہے اس سے بات کر سکتا ہے۔

زرینہ کی بکریاں اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں اور اس نے ان کو زیادہ دور جانے سے روکنے کے لئے اپنے منہ سے ایک خاص قسم کی آواز نکالی اور خیر زماں کو ایسا لگا جیسے کوئی اس کے کانوں میں شہد ٹپکا رہا ہو۔ زرینہ کی آواز .... دنیا کی سب سے زیادہ سریلی، میٹھی اور زندگی بخش آواز۔

"زیادہ دور نکل گئیں تو مصیبت ہو جائے گی میری۔" زرینہ نے خیر زماں کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "میں کہاں تک ان کے پیچھے بھاگتی رہوں گی؟"

دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں اور نظروں کے اس الجھاؤ میں ایک ایسی کہانی کا تانا بانا بُنا جا رہا تھا جس کا آغاز تو ہو چکا تھا لیکن اِس کے انجام کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

"ہم دونوں مل کر اِن کے پیچھے بھاگیں گے اور انہیں ایک جگہ لے آئیں گے۔" خیر زماں نے مسکرا کر زرینہ سے کہا اور زرینہ ہنس پڑی۔ خیر زماں بھی ہنس پڑا۔ موسم کی جاں فزا حرارت میں جیسے یکایک اضافہ ہو گیا اور پُراسرار سناٹا اور زیادہ گہرا ہو گیا۔

☆=====☆=====☆

وہ دونوں اس وقت جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے وہ ان دونوں کے گاؤں کے درمیان کی

جگہ تھی۔

یہ صوبہ سرحد کا ایک دشوار گزار پہاڑی علاقہ تھا جہاں کی بلند و بالا پہاڑی چوٹیوں پر سال کے بارہ مہینے برف جمی رہتی تھی۔ یہاں گرمی کا موسم مختصر ہوتا تھا اور سال کے زیادہ تر دنوں میں سردی رہتی تھی۔ گرمی کے موسم میں بھی راتیں خنک ہوتی تھیں اور جب سردیوں کا موسم شروع ہوتا تھا اور برف باری کا آغاز ہوتا تھا تو آہستہ آہستہ راستے بند ہونے لگتے تھے اور پھر ایک وقت وہ آتا تھا جب یہ علاقہ باقی ساری دنیا سے کٹ جاتا تھا۔ ہر طرف برف کے حصار قائم ہو جاتے تھے اور چار جانب برف کی حکمرانی مسلط ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی اس علاقے تک پہنچنے کے لئے کافی دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ سارے کا سارا بلند و بالا پہاڑی علاقہ تھا اور یہاں تک آنے کے لئے کوئی باقاعدہ سڑک موجود نہیں تھی۔ ٹیڑھے ترچھے، بل کھاتے ہوئے، اونچے نیچے، خطرناک کچے پہاڑی راستے تھے جو باقی دنیا سے اس علاقے کا رابطہ قائم کرتے تھے۔ مگر سردیوں میں جب برف باری کا موسم ہوتا تو یہ سارے راستے برف سے اَٹ جاتے اور ان پر سے گزر کر جانا ناممکن ہو جاتا تھا۔ قریب ترین شہر تک نہیں پہنچا جا سکتا تھا اور اس لئے سردیوں کے موسم کی آمد اور برف باری کے آغاز سے پہلے پہلے علاقے کے لوگ حسبِ توفیق اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے پاس ذخیرہ کر لیتے تھے۔

ملک کے بیشتر علاقوں کی طرح غربت اور پسماندگی اس علاقے کا بھی مقدر تھی۔ روزگار نابود تھا اور معاش کے مسائل بہت محدود تھے۔ لوگوں کے پاس زمینیں تھیں جن پر تھوڑی بہت کاشت کر لیتے تھے۔ سخت موسم کے باعث زمین پر سارا سال کاشت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ موسم کی تلخی زمین کو بھی نامہربان اور بے مروت بنا دیتی تھی اور وہ اپنے خزانے اگلنے سے انکار کر دیتی تھی۔

کھیتی باڑی کے علاوہ یہاں کے لوگ مویشی پالتے تھے۔ مویشیوں کے دودھ، گوشت اور کھالوں کو ان کی سماجی اور معاشی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل تھے۔

پشاور شہر کا نام اس علاقے کے لوگوں کے لئے ایک بے حد دلکش اور سحرانگیز نام تھا اور یہاں کے جن خوش نصیب لوگوں کو اس شہر میں جانے کا اور اس کو دیکھنے کا موقع ملا تھا وہ اس کے بارے میں بڑے جوش و خروش اور ہیجان کے ساتھ باتیں کرتے رہتے تھے اور یہاں کے بازاروں، دکانوں، ہوٹلوں، سینما گھروں اور تفریح گاہوں کے بارے میں جو کچھ

کہتے تھے وہ سننے والوں کو کسی دوسری دنیا کا احوال معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس سے کہیں زیادہ سحرانگیز اور ناقابلِ یقین احوال ایک اور شہر کا تھا، یہ تھا شہر کراچی۔ اس علاقے میں کئی لوگ ایسے تھے جو غربت اور بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آ کر بڑی مشکلیں برداشت کرتے ہوئے کراچی چلے گئے تھے اور اب وہ وہیں رہتے اور کام کرتے تھے۔ سال دو سال کے بعد، عید بقرعید کے موقع پر، گھر کا چکر لگاتے تھے اور مہینے دو مہینے قیام کر کے واپس چلے جاتے تھے۔

کراچی میں رہائش اختیار کرنے والے ان لوگوں کی زبانی اس علاقے کے لوگ جب اس شہر کے بارے میں سنتے تھے تو ان کو بمشکل ہی ان باتوں کا یقین آتا تھا۔ انہیں یہ ساری باتیں افسانوی معلوم ہوتی تھیں اور شہر کراچی کوئی جادوئی یا طلسماتی شہر لگتا تھا جہاں کوئی مافوق الفطرت مخلوق آباد تھی۔ جو محیرالعقول کارنامے سرانجام دینے کی اہل تھی۔ علاقے میں گنتی کے محض چند ہی لوگ تھے جن کا کراچی سے کوئی رابطہ تھا۔ البتہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جنہوں نے پشاور دیکھا تھا۔ علاقے کے لوگوں کی بھاری اکثریت کا آنا جانا صرف اپنے قریب ترین شہر تک محدود تھا اور وہاں بھی سال کے کچھ ہی مہینوں تک جانا ممکن ہوتا تھا۔ پھر تو برف باری کے سبب راستے ہی بند ہو جاتے تھے اور علاقے کے لوگ برفیلے موسم کے قیدی بن کر رہ جاتے تھے۔ پھر آمدورفت کے لئے صرف ایک ہی راستہ کھلا رہ جاتا تھا اور یہ تھا فضائی راستہ لیکن اس علاقے میں دور دور تک کوئی ہوائی اڈہ یا ہیلی پیڈ نہیں تھا۔ یہاں کوئی جہاز یا ہیلی کاپٹر نہیں آتا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے جہازوں کو صرف آسمان پر پرواز کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

ڈیرہ امین گل اور بابر خیل اس بلند و بالا پہاڑی علاقے کے دو گاؤں تھے جو ایک دوسرے کے قریب قریب واقع تھے۔ دونوں گاؤں کی حالت تقریباً ایک ہی جیسی تھی۔ یہاں نہ کوئی اسکول نہ تھا ہسپتال۔ کوئی سرکاری ڈسپنسری تک موجود نہیں تھی۔ لوگ اپنے مقدر سے ہی جیتے اور مرتے تھے۔ مقدر سے لڑنے کے مواقع ان کو حاصل نہیں تھے۔ دونوں گاؤں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ آڑے ترچھے، اونچے نیچے، ناہموار پہاڑی سلسلے پر مشتمل تھا۔ جہاں گرمیوں کے موسم میں جگہ جگہ ہرے بھرے درخت اور دور تک پھیلا ہوا سبزہ نظر آتا تھا۔ بہار کا موسم آتے ہی برف پگھلنے لگتی اور مردہ درختوں اور پیڑ پودوں میں جیسے جان پڑ جاتی۔ اپنی طویل نیند سے بیدار ہونے لگتے اور موسم کی مہربانیوں کا شکریہ

ادا کرنے لگتے۔ یہی موسم دونوں گاؤں کے لوگوں کے لئے سب سے زیادہ مؤثر معاشی سرگرمی کا باعث ہوتا تھا۔ اس زمانے میں دونوں گاؤں کے لوگ جلدی جلدی قریبی شہر جاتے رہتے تھے اور راستے بند ہونے سے پہلے پہلے اپنے آپ کو آنے والے موسم کی ابتریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر لیتے تھے۔

ڈیرہ امین گل اور بابر خیل میں اگرچہ الگ الگ قبیلے آباد تھے لیکن یہاں ملی جلی آبادی بھی تھی۔ یعنی دونوں گاؤں میں ایسے خاندان بھی آباد تھے جن کا تعلق اکثریتی قبیلے سے نہیں تھا لیکن یہ لوگ یہاں رہ رہے تھے۔ دونوں گاؤں کے لوگوں کے درمیان عمومی طور پر اچھے تعلقات تھے اور آپس میں شادی بیاہ بھی کرتے رہتے تھے۔ تاہم' دونوں گاؤں میں متعدد گھرانے ایسے بھی تھے جن کے درمیان دشمنی اور عداوت کے رشتے تھے۔

بد قسمتی سے خیر زماں اور زرینہ کے خاندان ایسے ہی خاندانوں میں شامل تھے۔

خیر زماں کا خاندان گاؤں امین خیل میں رہتا تھا اور ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ اس پہاڑی گاؤں میں کب سے آباد ہیں اور ان کے بزرگ کہاں سے آئے تھے۔ خاندان کے بزرگوں کو اپنے بزرگوں سے اور ان بزرگوں کے بزرگوں کو اپنے بزرگوں سے بس یہی ایک بات معلوم ہوتی چلی آئی تھی کہ وہ لوگ اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ صدیاں گزر گئی تھیں اور وہ لوگ یہیں رہتے چلے آئے تھے اور ایک ہی انداز کی زندگی بسر کرتے چلے آئے تھے۔ ان کے اردگرد کی دنیا میں کتنا کچھ بدل چکا تھا لیکن وہ آج بھی وہی صدیوں پرانے طرز کی زندگی گزار رہے تھے۔ علاقے میں بجلی کے نہ ہونے کے سبب عہد جدید کی کوئی بھی برقی سہولت اس علاقے میں نہیں پہنچ سکی تھی۔

جس وقت سے ہم اپنی اس کہانی کا آغاز کر رہے ہیں اس وقت خیر زماں کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ وہ گاؤں ڈیرہ امین گل کا رہنے والا تھا۔ اس کے باپ کا نام بخت خان اور ماں کا نام گل بی بی تھا۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی نواز خان تھا اور ایک چھوٹی بہن تھی جس کا نام نور جہاں تھا۔

یہ مختصر سا کنبہ گاؤں ڈیرہ امین گل میں آباد تھا۔ اس کنبے کے ہر شخص نے اس گاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ خیر زماں کی ماں اور بخت خان کی بیوی گل بی بی بھی اتفاق سے اسی گاؤں کی رہنے والی تھی اور کسی دوسرے گاؤں سے بیاہ کر نہیں آئی تھی۔

تھوڑی سی زمین' تھوڑے سے مویشی اور اپنے ہاتھوں کی محنت .... گاؤں کے

زیادہ تر لوگوں کی طرح بخت خان کے خاندان کا معاشی اثاثہ یہاں آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ صدیوں کی غربت' افلاس اور پسماندگی نے دل سے احساس زیاں کو بھی مٹا دیا تھا اور یہ جو کچھ میسر تھا اس پر قناعت کرنا اور اسی میں خوش اور مطمئن رہنے کی راہیں تلاش کرنا زندگی کا ایک دیرینہ اسلوب بن کر رہ گیا تھا۔ بخت خان خود محنت کرتا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے محنت کرتے تھے۔ اس کی بیوی اور بیٹی محنت کرتی تھیں اور اس طرح ان سب لوگوں کے ہاتھوں کی مشترکہ محنت سے گھر کا ایک جما جمایا' بندھا ٹکا نظام خاموشی اور روانی کے ساتھ چل رہا تھا۔ ایک بنا بنایا معمول تھا جس پر تقریباً ہر روز ایک ہی انداز سے عمل ہوتا تھا۔

زرینہ کا خاندان' پڑوسی گاؤں بابر خیل میں آباد تھا۔ زرینہ کے باپ کا نام شمروز خان اور اس کی ماں کا نام آمنہ تھا۔ زرینہ کی ایک چھوٹی بہن تھی جس کا نام فیروزہ تھا۔ زرینہ کی عمر اس وقت تقریباً سولہ سال کی تھی۔

بخت خان کے خاندان کی طرح شمروز خان کا خاندان بھی پچھلی نہ جانے کتنی صدیوں سے اسی پہاڑی علاقے میں آباد تھا۔ اس کے آباؤ اجداد میں سے کسی کو بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ کب اور کہاں سے ہجرت کر کے وہاں آن کر آباد ہو گئے تھے۔ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ لوگ تو وہاں صدیوں سے آباد ہیں۔ البتہ زرینہ کی ماں اور شمروز خان کی بیوی آمنہ اس گاؤں کی رہنے والی نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے گاؤں سے بیاہ کر یہاں آئی تھی اور پھر یہیں کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے میکے میں اب کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ ختم ہو چکے تھے۔ اس کی دنیا اب اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں تک محدود تھی اور وہ جیسے انہیں دیکھ کر جیتی تھی۔

بابر خیل میں آباد بیشتر دوسرے خاندانوں کی طرح شمروز خان کا خاندان بھی معاشی تنگ دستی' پسماندگی اور جہالت کی دھند میں لپٹا ہوا زندگی بسر کر رہا تھا اور راضی برضا و شاکر بہ تقدیر کے سہل انگار اور سکون پرور فلسفے پر عمل کرتا ہوا زندگی کے دن گزار رہا تھا۔

بخت خان اور شمروز خان کا تعلق الگ الگ قبیلوں سے تھا لیکن ان دونوں قبیلوں کے درمیان صرف قبائلی فرق کے علاوہ اور کوئی نزاع نہیں تھا۔ دونوں قبیلوں میں آپس میں شادی بیاہ کی روایات بھی موجود تھیں۔

لیکن بد قسمتی سے شمروز خان اور بخت خان کے خاندان میں آپس میں دیرینہ دشمنی

تھی اور اس دیرینہ دشمنی کے نتیجے میں ہر چند سال کے بعد اس طرف کا یا اس طرف کا کوئی ایک آدھ آدمی مارا ضرور جاتا تھا۔ جب ایک طرف کا آدمی مارا جاتا تھا تو پھر دوسری طرف والوں کے لئے ضروری ہو جاتا تھا کہ وہ بھی اس کا بدلہ لیں اور اس طرف کے کسی آدمی کو قتل کریں۔ قتل کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ جو اصل مجرم ہو جس نے اپنے ہاتھوں سے خون کیا ہو اسی کو قتل کیا جائے۔ اس کی کوئی شرط نہیں تھی۔ بس مخالف خاندان کا فرد ہونا کافی تھا۔ دونوں خاندانوں میں قتل ہونے والا آخری آدمی شمروز خان کا ایک رشتے کا چچا تھا۔ جسے آج سے کوئی دو سال پہلے اس کے گاؤں کے باہر ابتدائے سرما کی ایک خنک اور سرمئی شام کو کسی نامعلوم قاتل نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیا تھا۔ مقتول کا نام راحت خان تھا۔

راحت خان ایک بے حد خوش مزاج' خوش دل' ملنسار اور ہنسنے ہنسانے والا آدمی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر عمر کے انسانوں کے درمیان خوش رہ سکتے ہیں اور انہیں خوش رکھ سکتے ہیں۔ وہ بچوں کے درمیان بیٹھتا تو خود بھی ان جیسا بن جاتا اور بچے اس کے ساتھ مل کر بڑی خوشی محسوس کرتے۔ اس نے شاید ہی کبھی کسی بچے کو مارا ہو۔ وہ نوجوانوں کے ساتھ ہوتا تو ان کی دلچسپیوں اور مشاغل کا حصہ بن جاتا اور عمر کا جیسے کوئی فرق ہی نہیں رہتا تھا اور جب وہ اپنی عمر کے لوگوں اور اپنی سے بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ ہوتا تھا تو ایک بالکل مختلف انسان ہوتا تھا۔ سنجیدہ' بردبار' متین اور دانشمند لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت ہنس مکھ بھی۔

راحت خان کا کبھی کسی سے جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ اگر کہیں جھگڑا ہونے کے اسباب و امکانات پیدا بھی ہوتے تھے تو وہ بڑی خوش اسلوبی اور حکمت عملی سے ان کو ٹال جاتا تھا۔ بعض لوگ اس کو دبے لفظوں میں بزدلی کا بھی طعنہ دیتے تھے لیکن وہ ایک خاموش اور نرم مسکراہٹ کے ساتھ اس طعنے کو پی جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آدمی کو زندگی سے پیار کرنا چاہئے کیونکہ کوئی بھی شخص دنیا میں ایک بار سے زیادہ نہیں آتا۔ زندہ رہنے کے لئے صرف ایک ہی زندگی ملتی ہے۔

اور کسی سے بھی دشمنی نہ رکھنے والے اس راحت خان کو کسی نے آج سے دو سال پہلے گاؤں کے باہر اس وقت قتل کر دیا تھا جب وہ کہیں باہر سے واپس گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ گو کہ قاتل کا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا لیکن ڈیرہ امین خان اور بابر خیل کے سارے ہی

لوگ اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ راحت خان کے قاتل کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ تقریباً چار سال کا عرصہ گزرا جب راحت خان کے چھوٹے بھائی نے بخت خان کے ایک رشتے کے بہنوئی کو قتل کیا تھا اور پھر وہ جلد ہی یہاں سے کہیں باہر چلا گیا تھا۔

اور یوں ہر چار پانچ سال کے وقفہ سے بلکہ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ لمبے وقفے سے دونوں خاندانوں کا ایک نہ ایک آدمی قتل ہوتا چلا آ رہا تھا۔ مقتول کا اس کے علاوہ اور کوئی قصور نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک مخالف خاندان کا رکن ہے اور یہی ایک وجہ اس کو قتل کرنے کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مخالف خاندان کے کسی فرد کو قتل کرنا' دونوں خاندانوں کے لئے عبادت کا درجہ رکھتا تھا اور جب ایک آدمی قتل ہو جاتا تھا تو قاتل خاندان کے لوگوں کے سر فخر سے بلند ہو جاتے تھے اور سینے سکون و اطمینان سے بھر جاتے تھے۔ جبکہ مقتول خاندان کے لوگ مارے جانے والے کا غم منانے کے ساتھ ساتھ بدلے کے بارے میں بھی سوچنے لگتے تھے اور قاتل خاندان کے لوگوں میں سے اپنے شکار کا انتخاب کرنے لگتے تھے۔ قاتل خاندان کے لوگوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کون اب اگلا نشانہ ہو گا۔

عدم تحفظ اور عدم سلامتی کی ایک فضا تھی جس میں دونوں خاندان زندہ تھے اور یہ کون سی نئی چیزیں تھیں۔ یہ سلسلہ تو نہ جانے کب سے' کتنے برسوں سے یا شاید کتنی صدیوں سے چلا آ رہا تھا اور دونوں خاندانوں کے کتنے لوگ تھے جو اس سلسلے کی نذر ہو کر لقمۂ اجل بن چکے تھے۔

اور اب یہ سب کچھ اس طرح سے زندگی کا حصہ بن چکا تھا کہ اس پر نہ کسی کو حیرت ہوتی تھی' نہ ملال' نہ غصہ آتا تھا اور نہ خوف محسوس ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ تو ان لوگوں کی زندگی میں شامل ہو چکا تھا اور انہیں اسی طرح سے جینا تھا۔ ان کے آباؤ اجداد بھی اسی طرح جیتے آئے تھے اور خود انہیں بھی اسی طرح جینا تھا۔

اس دیرینہ دشمنی کی وجہ کیا تھی' یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔ دونوں خاندانوں میں جو بزرگ اس وقت زندہ تھے ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس دشمنی کی وجہ کیا تھی اور ان بزرگوں کے جو بزرگ مر چکے تھے ان کو بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ دشمنی کیوں تھی اور کس طرح سے شروع ہوئی تھی۔ دونوں خاندانوں کے درمیان کوئی بھی معلوم تنازعہ

موجود نہیں تھا' نہ کسی زمین کے ٹکڑے پر کوئی جھگڑا تھا۔ نہ کسی اور بات پر کوئی تنازعہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ مگر اس کے باوجود دشمنی تھی اور پوری طرح تھی۔ ایک دوسرے کو قتل کیا جاتا تھا اور اس کو لازمی فریضے کی ادائیگی سمجھ کر مطمئن اور خوش ہوا جاتا تھا۔

معلوم و نامعلوم دیرینہ دشمنی کی یہ خونی روایات صرف بخت خان اور شمروز خان کے خاندان تک محدود نہیں تھیں۔ ان کا سلسلہ تو اس قدیم طرز کے قبائلی معاشرے کو پوری طرح سے اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا اور جاگیرداری کے مضبوط نظام اور صنعت و کاروبار کے فقدان نے ان خونی روایات کو اور ان جیسی کتنی ہی کہنہ و فرسودہ روایات کو زندہ رکھا تھا جن کے نتیجے میں انسانوں کی زندگی میں صرف مشکلات میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔

خیر زماں اور زرینہ کی یہ بڑی بدنصیبی تھی کہ وہ دونوں مخالف اور دشمن خاندانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے اور اس میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا۔ اگر قصور تھا تو ان کے مقدر کا جس نے ان کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب لا کھڑا کیا تھا اور اس خطرناک قربت کا احساس ان کو اس وقت ہوا تھا جب وہ اس راستے پر بہت آگے تک جا چکے تھے اور وہاں سے واپسی کا سفر اتنا آسان نہیں تھا۔

اس سارے قصے کا آغاز آج سے کوئی ایک سال پہلے ہوا تھا۔

سردی کے موسم کا آغاز ہونے والا تھا۔ فضا اپنے تیور بدل رہی تھی۔ زمین اور آسمان اپنے رنگ اور اپنے مزاج کو بدل رہے تھے۔ سورج نے صبح کو طلوع ہونے میں تاخیر شروع کر دی تھی اور وہ اپنا سفر جلد طے کر کے شام کو بہ عجلت اپنے گوشۂ عافیت میں جا چھپتا تھا۔ درختوں پر سے پتیاں جھڑنا اور کم ہونا شروع ہو گئی تھیں اور علی الصبح چاروں طرف دھند ہی دھند ہوتی تھی۔ البتہ طلوع آفتاب کے ساتھ ساتھ دھند چھٹتی جاتی تھی اور فضا میں ایک بے حد خوشگوار نکھار پیدا ہو جاتا تھا۔

اس روز خیر زماں معمول کے مطابق اپنی بکریوں کو چرانے کے لئے گاؤں سے باہر گیا اور اس علاقے میں پہنچا جو ڈیرہ امین خان اور بابر خیل کا درمیانی علاقہ تھا۔ یہاں گاؤں کی کوئی خاص سرحد مقرر نہیں تھی۔ بس جہاں ایک گاؤں کی آبادی اور اس کی زیر کاشت زمینیں ختم ہو جاتی تھیں وہاں گاؤں ختم ہو جاتا تھا اور پٹواری کے کھاتے میں جو کچھ لکھا ہوا تھا اس سے تو سارے لوگ واقف ہی نہیں ہوتے تھے۔

ویسے بھی دونوں گاؤں کے درمیان آمدورفت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ دونوں

جگہوں کے لوگ آزادی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے تھے۔ دونوں گاؤں کے کئی گھرانوں میں تو آپس میں رشتہ داریاں بھی تھیں۔ لوگوں میں باہمی ربط و ضبط تھا اور لوگ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے تھے۔

اس روز خیر زماں اپنی بکریوں کو اِدھر اُدھر چرنے کے لئے چھوڑ کر خود ایک چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور گہرے نیلے رنگ کی اس چھوٹی سی چڑیا کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جو ایک چھوٹے سے پیڑ کی جڑ پر جگہ جگہ چونچیں مار رہی تھی اور وہاں سے کچھ نکال نکال کر کھا رہی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کی وہ چڑیا اتنی خوبصورت تھی کہ خیر زماں کی نگاہیں اس کے ننھے سے جسم میں جیسے جذب ہوتی جا رہی تھیں۔

اچانک اس نے ایک آواز سنی جیسے کوئی چیز گری ہو اور اس کے ساتھ ایک بکری کے زور زور سے شور مچانے کی اور ایک سہمی ہوئی سی نسوانی آواز۔

وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس سمت بڑھا جدھر سے آوازیں آئی تھیں۔ ایک بڑی سی اور اونچی چٹان کے پیچھے اس نے ایک نوعمر لڑکی کو دیکھا جو ایک بکری کی ٹانگ پکڑے ہوئے اسے آہستہ آہستہ سہلا رہی تھی۔

لڑکی کے چہرے کا صرف ایک رخ خیر زماں کی نظروں کے سامنے تھا اور وہ پہچان نہیں سکا تھا کہ وہ کون لڑکی تھی لیکن وہ جو کوئی بھی تھی اِس بکری کی وجہ سے کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔ وہ اس بکری کو بار بار چمکار رہی تھی اور اس کی اگلی ایک ٹانگ کو سہلا رہی تھی۔

"کیا ہوا اس کو؟" خیر زماں نے لڑکی کے قریب جا کر پوچھا اور جب لڑکی نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس وقت اس کا پورا چہرہ خیر زماں کے سامنے آیا اور خیر زماں نے اس کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اگر وہ غلطی نہیں کر رہا تھا تو وہ شمروز خان کی بڑی بیٹی زرینہ تھی جو آج سے چند ماہ پہلے اپنی ماں آمنہ اور چند دوسری رشتہ دار عورتوں کے ساتھ ایک شادی میں شرکت کرنے کے لئے ڈیرہ امین گل آئی تھی۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چند لمحوں تک وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ اس وقت وہاں بالکل اکیلے تھے اور دور دور تک کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔

خیر زماں کے لہجے میں نرمی تھی اور اس کے انداز میں مدد کرنے کا جذبہ کارفرما تھا۔

زرینہ نے اس نوجوان لڑکے کو دیکھا جس کا رویہ مہر آمیز معلوم ہوتا تھا اور جو اس مشکل

وقت میں اس کی مدد کر سکتا تھا۔

تاہم اس نے فوری طور پر پہچان لیا تھا کہ وہ ڈیرہ امین گل کے بخت خان کا بڑا بیٹا خیر زماں ہے۔ وہ خیر زماں کی بہن نور جہاں سے ابھی چند ماہ پہلے ہی تو ایک شادی میں ملی تھی جس میں شرکت کرنے کے لئے وہ اپنی ماں اور دیگر رشتہ دار عورتوں کے ساتھ ڈیرہ امین گل آئی تھی۔ ایک دوسرے کے مخالف خاندانوں کی عورتیں شادی کی ایک ہی تقریب میں شریک تھیں اور ان کے درمیان دعا سلام اور بات چیت وغیرہ بھی ہوئی تھی۔ خوشی کے اس موقع پر سب ہی لوگ اس تقریب میں شریک تھے۔

اور اب وہ دونوں اچانک ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے تھے۔ وہ دشمن اور مخالف خاندانوں کے افراد جن کے بزرگ ایک دوسرے کو قتل کر کے، خوشی محسوس کرتے تھے۔

لیکن ان دو نوجوان انسانوں کے دلوں میں اس وقت ایسا کوئی وحشیانہ جذبہ موجود نہیں تھا۔ زرینہ کسی مشکل کا شکار تھی اور اسے مدد کی ضرورت تھی اور خیر زماں کو ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی کہ وہ زرینہ سے نفرت کرے اور زرینہ کے سامنے خیر زماں تھا جو اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کس پریشانی کا شکار ہے اور زرینہ کو کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی کہ وہ خیر زماں سے نفرت کرے۔ اس وقت کی مخصوص فضا نے' اس ماحول نے' اس کیفیت نے' ان دونوں کو دوستانہ طور پر ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا اور ان کے دلوں میں کسی بھی قسم کا مخالفانہ جذبہ موجود نہیں تھا۔

"میری بکری کی ٹانگ میں چوٹ لگ گئی ہے۔" زرینہ نے کہا۔ "اس کا پیر پھسل گیا تھا اور یہ اوپر والی چٹان سے نیچے گر گئی تھی۔ اب اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا ہے۔"

"لاؤ میں دیکھوں۔" خیر زماں نے کہا اور بکری کے قریب آ کر اس کو پکڑ کر چاروں ٹانگوں پر کھڑا کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن بکری چاروں ٹانگوں پر کھڑی نہیں ہو سکی۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی اور گری جا رہی تھی۔ اس کی دائیں جانب والی اگلی ٹانگ زور نہیں پکڑ رہی تھی۔

خیر زماں نے بکری کی پتلی' سوکھی لکڑی جیسی ٹانگ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ماہرانہ انداز میں اس کا جائزہ لینے لگا۔ زرینہ اس کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

بکریوں کے دکھ درد کو سمجھنا خیر زماں کے لئے کوئی زیادہ مشکل بات نہیں تھی۔ اس

نے جب سے آنکھ کھولی تھی تب سے اپنے گھر میں بکریاں دیکھی تھیں اور بچپن سے ہی وہ بکریوں کی دیکھ بھال کرتا چلا آیا تھا اور اب سترہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ ان کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا جو اس نے اپنے بزرگوں کے تجربے سے اور خود اپنے تجربے سے سیکھا تھا۔

اس نے ذرا سی دیر میں اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ بکری کی ٹانگ کی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ اس کے صرف چوٹ لگی تھی جس کے باعث وہ چلنے میں سخت تکلیف محسوس کر رہی تھی اور وقتی طور پر چلنے سے تقریباً قاصر ہو گئی تھی۔

"اس کی ٹانگ ٹوٹی نہیں ہے۔" اس نے زرینہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس میں صرف چوٹ لگی ہے۔ گھر جا کر اس کو آرام کرنے کا موقع دینا۔ دو ایک دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔"

ان دونوں کے درمیان یہ ملاقات دو ایسے انسانوں کے درمیان ملاقات تھی جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کچھ نہیں تھا۔ وہ صرف عمومی انسان دوستی اور خیر سگالی کے جذبے کے تحت ملے تھے اور ان دونوں کے درمیان اس وقت جو تھوڑا بہت تعلق قائم ہوا تھا وہ ایک عام سے' بے نفع و ضرر انسانی تعلق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی بھی نہیں تھے۔ پہلے سے ایک دوسرے کے صورت آشنا تھے۔

"تم .... بخت خان کے بڑے بیٹے خیر زماں ہو نا؟" زرینہ نے اس کی شناخت کی توثیق چاہی۔

"ہاں۔" خیر زماں نے جواب دیا۔ "اور تم .... شمروز خان کی بڑی بیٹی زرینہ ہو؟"

"ہاں' میں زرینہ ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اپنی بکریوں کے ساتھ اوپر آ گئی تھی۔ اس اونچی چٹان پر سے یہ بکری گر پڑی۔ عام طور سے میں اِدھر نہیں آتی ہوں۔"

"اِدھر آیا کرو۔" خیر زماں نے بے اختیاری کے سے عالم میں کہہ دیا۔ "ادھر کچھ علاقے میں گھاس کافی زیادہ اور بڑی نرم اور رسیلی ہوتی ہے۔ میں تو اپنی بکریوں کو لے کر زیادہ تر اسی طرف آتا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں بکریاں سیر ہو جاتی ہیں۔"

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ ان کی باتیں صرف بکریوں اور گھاس چارے تک محدود تھیں۔ اس میں کوئی خاندانی موضوع شامل نہیں تھا۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی دوسرے کے بارے یہ نہیں کہا کہ وہ دشمن خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یا یہ کہ ان کے خاندان کے درمیان صرف اور صرف دشمنی کے رشتے ہیں۔ اس بات سے بالکل قطع نظر وہ دو عام انسانوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ پیش آ رہے تھے۔

بکری زمین پر زرینہ کے قریب بیٹھی ہوئی تھی اور زرینہ اس پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے خیر زماں کے ساتھ باتیں کرتی جا رہی تھی۔

"اس بار تو سردیوں کا موسم جلد ہی شروع ہوتا نظر آ رہا ہے۔" اس نے خیر زماں سے کہا۔ "مجھے یاد ہے، پچھلے سال ان دنوں میں اتنی زیادہ سردی نہیں تھی۔"

"موسم تو اسی طرح گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔" خیر زماں نے کہا۔ "کبھی سردی جلدی شروع ہو جاتی ہے تو کبھی گرمی جلدی شروع ہو جاتی ہے اور جو موسم جلدی شروع ہو جاتا ہے وہ جلدی ختم بھی ہو جاتا ہے۔"

"یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔" زرینہ نے اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ "میری اماں بتاتی ہیں کہ ایک بار سردیاں بہت دیر سے شروع ہوئیں اور بہت جلدی ختم ہو گئیں۔ برف باری بھی کافی دیر سے شروع ہوئی تھی اور زیادہ دنوں تک رہی بھی نہیں تھی۔ جلد ہی اس کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔"

"معلوم نہیں۔" خیر زماں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "موسم کی تو اپنی مرضی ہوتی ہے۔ اس کے بھی تو اپنے دستور ہوتے ہیں۔"

"اب مجھے چلنا چاہئے۔" زرینہ نے کہا اور ساتھ ہی وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

خیر زماں بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے زرینہ کی بکریوں کو ایک جگہ جمع ہونے میں مدد دی۔

لیکن جو مجروح بکری تھی وہ اپنی ٹانگوں پر پوری طرح سے کھڑی نہیں ہو سکی۔ اس نے کئی بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار گر پڑی۔

"لگتا ہے مجھے اس کو یہیں چھوڑ کر گاؤں جانا ہو گا۔" زرینہ نے خاصی پریشانی کے

ساتھ کہا۔ "کسی کو بلا کر لاؤں گی، وہ اس بکری کو اٹھا کر لے جائے گا۔ یہ تو کھڑی بھی نہیں ہو سکتی، چلے گی بھلا کیسے؟"

"کسی کو بلا کر لانے کی کیا ضرورت ہے؟" خیر زماں نے مسکراتے ہوئے کہا اور بکری کو اٹھا کر اپنے دونوں شانوں پر لاد لیا۔ بکری زور زور سے ممیا رہی تھی لیکن اس نے بھاگنے یا نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس وہ بڑے آرام سے خیر زماں کی پیٹھ پر لد گئی۔

"چلو۔" خیر زماں نے زرینہ سے کہا۔ "اس کو تمہارے گاؤں تک پہنچا دیتا ہوں۔"

"اوہ .... یہ تو .... مشکل کام ہے۔" زرینہ نے قدرے گھبراتے ہوئے کہا۔ "گاؤں تو یہاں سے کافی دور ہے۔"

"دور ہے تو کیا ہوا؟" خیر زماں نے کہا۔ "اگر میں اس کو تمہارے گاؤں تک نہیں پہنچاؤں گا تو پھر یہ کس طرح گاؤں تک جائے گی؟ یہ خود تو نہیں چل سکتی اور اگر تم اس کو چلانے کی کوشش کرو گی تو اس کی ٹانگ کی تکلیف اور زیادہ بڑھ جائے گی اور پھر اس کے ٹھیک ہونے میں زیادہ دن لگ جائیں گے۔"

"میں اس کو چلا کر نہیں لے جاؤں گی۔" زرینہ نے کہا۔ "میں اس کو اس طرح اپنے کندھوں پر لاد لوں گی جس طرح تم نے لادا ہے۔"

"نہیں، یہ کافی مشکل ہو گا تمہارے لئے۔" خیر زماں نے کہا۔ "اچھا خاصہ وزن ہے بکری کا اور پھر چلنا بھی تو کافی ہے۔"

اس نے زرینہ کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور زرینہ کے گاؤں بابر خیل کی طرف چل پڑا۔

زرینہ نے جلدی جلدی اپنی باقی بکریوں کو اکٹھا کیا اور پھر وہ بھی خیر زماں کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔

کچھ دیر تک وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر زرینہ نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔ "کیا تم روزانہ ہی اِدھر آتے ہو؟"

"ہاں۔" خیر زماں نے جواب دیا۔ "میں اپنی بکریاں لے کر اسی طرف آتا ہوں۔ میں نے تم کو بتایا نا، اِدھر کچھ جگہ ایسی ہے جہاں گھاس بہت اچھی ہوتی ہے۔ نرم بھی اور رسیلی بھی اور بکریاں اس کو بڑے شوق اور رغبت سے کھاتی ہیں۔ جلد ہی ان کا پیٹ بھر جاتا

ہے۔"

"تو اور لوگ بھی اپنی بھیڑوں اور بکریوں کو لے کر اِدھر آتے ہوں گے؟"

"زیادہ نہیں۔" خیر زماں نے اس کو بتایا۔ "کبھی کبھار کوئی آ نکلتا ہے۔ ورنہ زیادہ تر لوگ تو اپنے مویشی لے کر نیچے اتر جاتے ہیں۔ وہاں بھی گھاس اور چارے کی فراوانی ہے لیکن میں نیچے نہیں جاتا۔ میں اپنی بکریاں لے کر اِدھر ہی آ جاتا ہوں۔ یہاں ان کی دعوت کا بہت اچھا سامان موجود ہوتا ہے۔" وہ آہستہ سے ہنسا اور زرینہ بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

ہنسی سے زرینہ کے چہرے کی سرخ رنگت کچھ اور زیادہ سرخ ہو گئی اور موتی کی لڑی جیسے سفید سفید، ہموار دانت، گلگوں چہرے کی سرخ رنگت کے پس منظر میں کچھ زیادہ ہی خوبصورت لگنے لگے اور اس کی آنکھوں کی چمک میں جیسے اچانک اضافہ ہو گیا۔

خیر زماں کو وہ اچھی لگی لیکن اس اچھا لگنے میں خصوصیت کے ساتھ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ یہ تو ایک اچھی اور خوبصورت چیز کے لئے تحسین و توصیف کا ایک سیدھا سادا ساجذبہ تھا جو اس کے دل میں فوری طور پر پیدا ہو گیا تھا۔

ان دونوں کے درمیان ایک بار پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ طویل راستہ تھا جو انہیں طے کرنا تھا اور اس سارے راستے کے دوران وہ گونگوں کی خاموش تو نہیں رہ سکتے تھے۔ مگر اس بار ان کی گفتگو کا موضوع بکریاں نہیں تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے گھروں کے بارے میں، گھروں کے افراد کے بارے میں اور ان کے مسائل کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

"نور جہاں کو میں نے اس روز شادی میں بہت دنوں کے بعد دیکھا۔" زرینہ نے دوران گفتگو کہا۔ "وہ تو ایک دم سے بہت بڑی ہو گئی ہے۔" خیر زماں کی چھوٹی بہن نور جہاں زرینہ سے کوئی تین سال چھوٹی تھی۔

"وقت کے ساتھ ساتھ تو سبھی بڑے ہوتے چلے جاتے ہیں۔" خیر زماں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "ہم سب بڑے ہوتے جاتے ہیں اور ہمارے اردگرد جو کچھ بھی ہے اس کی عمر میں اس کے پرانے پن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔"

"ہاں، وہ تو ٹھیک ہے۔" زرینہ نے کہا۔ "لیکن نور جہاں ایک دم سے بہت بڑی ہو گئی۔ یا شاید مجھے وہ بڑی معلوم ہوئی۔ مگر وہ مجھے بہت اچھی لگی۔"

"بہت کام کرتی ہے وہ گھر کا۔" خیر زماں نے اپنی بہن کی تعریف سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اماں کا بہت ہاتھ بٹاتی ہے اور اس میں اتنا دم ہے کہ اماں کے بغیر ہی سارے گھر کو سنبھال سکتی ہے۔"

"لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔" زرینہ نے کہا۔ "آخر ایک نہ ایک دن تو انہیں پورا گھر سنبھالنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے لئے انہیں شروع سے ہی تیار رہنا چاہئے۔"

"تم بھی اپنے گھر کا بہت سا کام کاج کرتی ہو گی؟" خیر زماں نے اس سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" زرینہ نے فوراً جواب دیا۔ "میں اور فیروزہ مل کر گھر کا کام کاج کرتی ہیں۔ صبح کو میں کچھ دیر کے لئے بکریوں کو لے کر نکل جاتی ہوں لیکن پھر جلدی واپس آ جاتی ہوں۔ ہم دونوں بہنیں مل کر سارا ہی کام کر لیتی ہیں۔ ہم اپنی ماں کو تو زیادہ کام کرنے بھی نہیں دیتیں۔ مگر وہ مانتی ہی نہیں ہیں۔ ان سے خالی نہیں رہا جاتا۔ وہ کسی نہ کسی کام میں مصروف ہی رہتی ہیں۔"

اس جگہ سے بابر خیل کا طویل فاصلہ انہوں نے اسی طرح باتوں میں طے کیا۔ سارے راستے میں ان کے درمیان خاندانی دشمنی کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی اور یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ ویران اور سنسان علاقے میں خالی راستوں میں انہیں گاؤں بابر خیل یا گاؤں ڈیرہ امین گل کا کوئی بھی آدمی نہیں ملا جس نے ان دونوں کو اکٹھا دیکھا ہو۔

بابر خیل کے بالکل قریب پہنچ کر خیر زماں رک گیا اور اس نے آہستہ سے اپنے کندھوں پر لدی ہوئی بکری کو نیچے اتار دیا۔

"تمہارا گھر قریب آ گیا ہے۔" اس نے زرینہ کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "اب تھوڑی دور تک تو تم خود بھی اس کو اٹھا کر لے جا سکتی ہو۔"

"ہاں لے جا سکتی ہوں۔" زرینہ نے ایک نرم و لطیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ!"

"شکریے کی کوئی بات نہیں۔" خیر زماں نے کہا۔ "لیکن دیکھو بہتر ہو گا کہ اپنے والدین کو یہ بات نہ بتانا کہ میں تمہاری زخمی بکری کو اپنے کندھوں پر لاد کر یہاں تک لایا تھا۔"

"کیوں؟" زرینہ نے محتاط انداز میں پوچھا۔ "یہ بتانے میں کیا ہرج ہے؟"

"تم .... تم جانتی ہو کہ ہمارے خاندانوں کے درمیان دشمنی چل رہی ہے۔" خیر

زماں نے رک رک کر کہا۔ ”شاید تمہارے گھر والے اس بات کو پسند نہ کریں کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر تک آیا تھا۔“

”اس میں نہ پسند کرنے والی کون سی بات ہے؟“ زرینہ نے کہا۔ ”تم نے تو بڑی مدد کی ہے۔ میرے ساتھ کوئی دشمنی تو نہیں کی ہے اور ہم دونوں کے درمیان تو کوئی دشمنی نہیں ہے۔“

”پھر بھی.........“ خیر زماں نے کہا۔ ”بہتر یہی ہو گا کہ ان کو مت بتاؤ۔ کسی نے مجھے یہاں تمہارے ساتھ آتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ انہیں کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہو سکے گا۔“

”نہیں خیر زماں!“ زرینہ نے مستحکم اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ ہو سکتا ہے کسی نے ہم کو دیکھا ہو اور ہمیں اس کی خبر نہ ہوئی ہو اور تب اگر میرے والدین کو معلوم ہو گا کہ میں نے ان سے یہ بات چھپائی تو یہ اچھا نہ ہو گا۔ تم نے میری مدد کی ہے۔ مجھے گولی تو نہیں ماری ہے۔ تو اس بات کے بتا دینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ تم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جس پر میرے والدین تم سے ناراض ہوں۔“

”خیر تمہاری مرضی۔“ خیر زماں نے کہا۔ ”جیسا تم چاہو۔“

”چاہئے تو یہ تھا کہ میں تم کو اپنے گھر میں بلاتی اور تمہاری خاطر تواضع کرتی۔“ زرینہ نے کہا۔ ”لیکن افسوس ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتی اور تم جانتے ہو.........“

”ہاں ہاں‘ جانتا ہوں۔“ خیر زماں نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”جانتا ہوں میں‘ اپنی اور تمہاری مجبوری کو سمجھتا ہوں اور اب میں چلتا ہوں۔ تم اگر چاہو تو اپنی بکریوں کو لے کر اُدھر ہی آ جایا کرو۔ وہاں کی گھاس بہت اچھی ہے۔“

”آؤں گی۔“ زرینہ نے کہا اور پھر اس نے اپنی مجروح بکری کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ خیر زماں نے اس کی مدد کی اور اس کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اپنے گھر واپس آنے تک اس واقعے کی بس ایک ہلکی سی یاد اس کے دماغ میں باقی رہ گئی تھی۔ سوچنے کے لئے اور بہت سی باتیں تھیں۔ کرنے کے لئے اور بھی بہت سے کام تھے اور اسے زرینہ کے بارے میں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن اگلے روز جب وہ اپنی بکریوں کو لے کر وہاں پہنچا تو اس کے دماغ میں گزشتہ روز کے واقعے کی ساری یاد تازہ ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی ایک نامعلوم سی خواہش نے اس

کے دل میں چپکے سے سر ابھارا۔ کتنا اچھا ہو کہ زرینہ آج پھر آ جائے۔ یہ ایک عجیب سی خواہش تھی جو خود بخود اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ اسے اس پر قدرے تعجب بھی تھا لیکن خواہشوں پر انسان کو اختیار تو نہیں ہوتا۔

اس کی نگاہیں خود بخود اس راستے پر بھٹکنے لگیں جدھر سے زرینہ کے آنے کے امکانات ہو سکتے تھے لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی انسان‘ نہ کوئی بکری۔ دو پہاڑی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف آج بھی کل کی طرح آئینے کی طرح چمک رہی تھی اور اس کو دیکھنے سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ فضا میں نرم دھوپ کی اجلی اجلی حرارت اسی طرح گھلی ہوئی تھی اور گہرے پُراسرار سناٹے میں کسی کسی وقت کسی پرندے کی تیز چہچہاہٹ گونج اٹھتی تھی جو ذرا سی دیر کے لئے ہوا کے دوش پر لہراتی پھر خاموش ہو جاتی اور ایک بار پھر سناٹا طاری ہو جاتا۔ ایک عجیب سی پُراسرار کیفیت تھی جو ساری فضا پر طاری تھی۔

پھر اچانک بکری کے ممیانے کی آواز سنائی دی اور وہ چونک پڑا۔ یہ آواز بہت ہلکی تھی اور دور سے آ رہی تھی۔ یہ خیر زماں کی اپنی کسی بکری کی آواز نہیں تھی اور جس طرف سے آ رہی تھی ادھر خیر زماں کی کوئی بکری موجود نہیں تھی۔ بلکہ آواز مخالف سمت سے آ رہی تھی۔ خیر زماں جلدی سے ایک قریبی اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا اور تب اس نے دور سے ایک بکری کو آتے دیکھا لیکن وہ تنہا بکری نہیں تھی۔ اس کے پیچھے چند اور بکریاں بھی تھیں اور ان بکریوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا مدھم سا انسانی پیکر تھا جو آہستہ آہستہ اسی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

اس کے ہونٹوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور اس کی نظریں اسی سمت میں جم کر رہ گئیں۔ انسانی ہیولا زیادہ واضح ہوتا جا رہا تھا اور پھر اس نے زرینہ کو پہچان لیا۔ وہ اپنی بکریوں کے پیچھے پیچھے اسی طرف آ رہی تھی۔

زرینہ وہاں آن پہنچی اور اس نے بھی خیر زماں کو دیکھ لیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرائے۔

”تو تم نے بھی آخر اس طرف آنے کا فیصلہ کر لیا؟“ خیر زماں نے خوشگوار اور متبسم انداز میں اس سے پوچھا۔

”ہاں۔“ زرینہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے سوچا کہ تمہاری بات مان کر دیکھوں۔ شاید اس طرف بکریوں کو کچھ زیادہ بہتر چارہ ملے۔“

"ضرور ملے گا۔" خیر زماں نے کہا۔ "تم روز بکریوں کو لے کر اسی طرف آ جایا کرو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ وہ زخمی بکری اب کیسی ہے؟"

"ابھی وہ کھڑی نہیں ہو پا رہی ہے۔" زرینہ نے کہا۔ "بابا اس کا علاج کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کی ٹانگ پر لگانے کے لئے دوا بنائی ہے اور آج صبح لگائی ہے۔ اس سے اس کی ٹانگ دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گی اور وہ چل پھر سکے گی۔"

"چلو' یہ تو بہت اچھا ہوا۔" خیر زماں نے کہا۔ "خدا کرے وہ جلدی ٹھیک ہو جائے۔"

"بابا بھی کہہ رہے تھے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" زرینہ نے کہا۔ "اور .... اور .... میں نے ان کو بتا دیا تھا.........." اس کی آواز اچانک ہلکی ہو گئی اور آنکھیں بھی نیچے جھک گئیں۔ وہ کچھ رک رک کر ذرا محتاط انداز میں بول رہی تھی۔

"کیا؟" خیر زماں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس سے سوال کیا۔ بلکہ شاید یہ سوال اچانک ہی اس کی زبان سے نکل گیا۔

"یہی کہ میری زخمی بکری کو تم نے اپنی پیٹھ پر لاد کر میرے گھر کے قریب تک پہنچایا تھا۔" زرینہ نے کہا۔

"پھر؟" خیر زماں نے جلدی سے پوچھا۔ "انہوں نے کیا کہا' کیا انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا؟"

"نہیں۔" زرینہ نے کہا۔ "انہوں نے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ انہوں نے یہ کہا کہ خاندانی دشمنی کے باوجود تم نے ایک لڑکی کی مدد کر کے اچھا کام کیا ہے اور پھر ہم لوگ مردوں کے جھگڑوں میں عورت کو نہیں گھسیٹتے۔"

"انہوں نے بالکل ٹھیک کہا۔" خیر زماں نے ایک دم خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "دشمنیاں اور لڑائیاں تو مردوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ عورتوں کو ان سے الگ ہی رکھنا چاہئے۔"

"ہاں۔" زرینہ نے کہا۔ "ہم دونوں کے خاندانوں میں آج تک کبھی کسی عورت کو قتل نہیں کیا گیا۔ جتنے بھی قتل ہوئے سب مرد ہی قتل ہوئے۔" اس وقت تک وہ دونوں ایک ایسی جگہ بیٹھ چکے تھے جو آس پاس چٹانوں سے گھری ہوئی تھی اور وہاں بیٹھے ہوئے کسی شخص کو بالکل قریب جائے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ان دونوں نے ایک ساتھ غیر

شعوری طور پر یا شاید نیم شعوری طور پر ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں انہیں آسانی سے دیکھا نہ جا سکے۔

"اور .... آج سے کچھ سال پہلے بابا راحت خان قتل ہوئے تھے۔ مجھے ان کے قتل کا بہت افسوس ہوا تھا۔ میں بہت روئی تھی ان کی موت پر۔ وہ بہت اچھے آدمی تھے۔ بہت ہنسنے ہنسانے والے۔ ہم بچوں کے ساتھ وہ مل کر بیٹھ جاتے تھے تو خود بھی بچہ بن جاتے تھے۔ کتنا کھیلتے تھے وہ ہمارے ساتھ اور ان کا تو کبھی کسی کے ساتھ جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو بہت ہی اچھے آدمی تھے۔ پھر بھی .... نہ جانے کیوں .... ان کو .... ان کو قتل کر دیا گیا۔"

خیر زماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زرینہ کے اس سوال کا کیا جواب دے۔ اس کے پاس تو کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔

"دشمنیوں میں ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔" قدرے توقف کے بعد اس نے بہت ہلکی اور دبی آواز میں کہا۔ اسے زرینہ کے ساتھ دشمنیوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ بھلا زرینہ سے کیا دشمنی' کیا اتنی پیاری' خوبصورت' مہربان اور دل نواز لڑکی سے کوئی دشمنی بھی کر سکتا تھا؟

"مگر ایسا کیوں ہوتا ہے خیر زماں؟" زرینہ نے اچانک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ "بابا راحت خان نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ ان جیسے آدمی سے کسی کو کیا نقصان پہنچ سکتا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں۔"

خیر زماں خاموش رہا۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ گو کہ خود اس کے دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوا تھا کہ راحت خان کسی کو نقصان پہنچا سکتا تھا یا نہیں زرینہ نے یہ سوال اٹھایا تھا تو وہ اس کے بارے میں پہلی بار سوچ رہا تھا۔ کیا واقعی راحت خان سے کسی کو نقصان پہنچا سکتا تھا؟ اس نے راحت خان کے بارے میں جو کچھ سنا تھا وہ بالکل وہی تھا جو کہ زرینہ اس کو بتا رہی تھی۔

"خیر زماں!" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد زرینہ نے آہستہ سے کہا۔ "ہمارے اور تمہارے خاندانوں کے درمیان دشمنی کی اصل وجہ کیا ہے؟"

"مجھے .... مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" خیر زماں نے کہا۔ "بس یہ معلوم ہے کہ دشمنی ہے اور پچھلی کئی نسلوں سے چلی آ رہی ہے۔ کیوں ہے یہ نہیں

معلوم۔"

"مجھے بھی نہیں معلوم۔" زرینہ نے کہا۔ "اور میرے گھر میں بھی کسی کو نہیں معلوم۔ کل میں نے بابا سے پوچھا تھا کہ یہ دشمنی کب سے ہے اور کیوں ہے لیکن وہ میرے سوال کا جواب نہیں دے سکے۔ ان کو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ دشمنی کیوں ہے۔ بس یہ ہے کہ وہ چلی آ رہی ہے۔"

"دشمنی کی کوئی وجہ رہی ہو گی بہت برسوں پہلے کئی نسلوں پہلے .... کوئی وجہ رہی ہو گی .... اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ لوگ اس وجہ کو تو بھول گئے ہوں گے اور صرف دشمنی یاد رہ گئی ہو گی۔" خیر زماں نے کہا۔

"ہاں' ایسا ہی ہوا ہو گا۔" زرینہ نے اس کے خیال سے اتفاق کیا' "لیکن جب دشمنی کی وجہ بھی ختم ہو گئی' وہ .... لوگ مر کھپ گئے جن کے ساتھ اس وجہ کا تعلق تھا تو پھر اس دشمنی کو بھی ختم ہو جانا چاہئے .... مگر.........."

اسی وقت خیر زماں کی ایک بکری ایک اونچی چٹان پر چڑھ گئی جو بڑی خطرناک تھی۔ اگر وہ وہاں سے گر جاتی تو اس کی بھی ٹانگ ٹوٹ سکتی تھی۔ بکری جست لگا کر چٹان پر چڑھ گئی تھی لیکن اس کے لئے وہاں سے اترنا آسان نہیں تھا۔ خیر زماں جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور بکری کی طرف چلا گیا۔ زرینہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی گئی۔ ان دونوں نے مل کر بکری کو اس اونچے ٹیلے سے اتار لیا۔ "اگر یہ گر جاتی تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو میری بکری کا ہوا ہے۔" زرینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پھر تمہیں اس کو بھی اپنی پیٹھ پر لاد کر گھر لے جانا پڑتا۔"

"ہاں۔" خیر زماں نے کہا۔ "بکری بڑی نازک اور ڈرپوک مخلوق ہوتی ہے۔"

وہ دونوں پھر اسی جگہ آ بیٹھے جہاں وہ اس سے پہلے بیٹھے ہوئے تھے لیکن اب ان کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی اس کا تعلق ان کے خاندانوں کی باہمی دشمنی سے نہیں تھا۔ یہ موضوع تو جیسے ختم ہو گیا تھا اور اب وہ دوسری چیزوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اپنے اپنے گھروں اور گھر والوں کے بارے میں۔ بدلتے ہوئے موسم کے بارے میں اور دوسری چیزوں کے بارے میں۔ ان کی دنیا محدود تھی۔ ان کا علم اور ان کے تجربات محدود تھے لیکن اس کے باوجود ان کے پاس گفتگو کے موضوعات کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کتنی بہت ساری چیزیں تھیں جن کے بارے میں وہ باتیں کر سکتے تھے اور کرتے رہے۔

"مجھے اب جانا چاہئے۔" کافی دیر کے بعد زرینہ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سورج اپنے سفر کا نصف اوّل طے کر کے نصفِ آخر کے مرحلے میں کب کا داخل ہو چکا تھا۔ اجلی اجلی دھوپ کی رعنائیاں اپنے شباب پر تھیں اور فضا کی نرمی میں قدرے درشتی شامل ہو گئی تھی۔

"اچھا؟" خیر زماں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔ "اب گھر ہی جاؤ گی؟"

"ہاں' گھر ہی جاؤں گی۔" زرینہ نے کہا۔ "اور کہاں جاؤں گی بھلا؟"

وہ دونوں ساتھ ساتھ چل پڑے۔ زرینہ نے اپنی بکریوں کو اکٹھا کیا اور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ خیر زماں کچھ دور تک اس کے ساتھ چلتا رہا۔

"بس اب تم واپس چلے جاؤ۔" زرینہ نے اس سے کہا۔ "آج میرے ساتھ کوئی زخمی بکری نہیں ہے۔" اس کے چہرے پر ایک نرم و شیریں مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہاں میں اب جاتا ہوں۔" خیر زماں نے کہا۔ "اپنی بکریوں کی بھی کچھ فکر کرنی ہے۔ کل آؤ گی نا؟" خیر زماں نے سوال اس انداز میں کیا کہ اس میں اقرار کا پہلو جیسے پہلے سے شامل تھا۔

"بکریوں کو لے کر تو آنا ہی ہے۔" زرینہ نے مبہم سی بات کہی۔

"تو پھر ادھر ہی آ جانا۔" خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔ جواب میں زرینہ نے صرف آہستہ سے اپنی گردن ہلائی اور کچھ کہا نہیں۔ وہ اپنی بکریوں کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔

یہ ان کی دوسری ملاقات تھی اور پھر اس کے بعد ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور وہ دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی بالکل غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ یہ سلسلہ ایک سرسری سی' عام سی' دوستانہ انسانی ملاقات سے شروع ہوا تھا اور پھر کچھ عرصے کے اندر اندر یہ ایک والہانہ کیفیت میں تبدیل ہو گیا۔ وہ دونوں اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ وہ دو دشمن خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے لیکن انہوں نے اس حق کے حصول کے لئے کسی سے درخواست نہیں کی۔ ان کے دلوں کے اندر پیدا ہونے والے محبت کے سرکش اور زور آور جذبے نے خود ہی یہ اجازت حاصل کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے خود بخود یہ جذبہ اتنا قوی اور مستحکم ہو گیا تھا کہ اس نے تمام مصلحتوں کو پسِ پشت ڈال دیا تھا اور

انہیں دنیا کی باقی ہر چیز اس جذبے کے آگے کمزور نظر آنے لگی۔

پہلے دوستی' پھر پسندیدگی اور پھر محبت کا احساس جیسے جیسے بڑھتا گیا تھا ویسے ویسے ان کے اندر تحفظ اور رازداری کا احساس بھی پیدا ہوتا گیا تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ان کی محبت کو ان کے خاندانوں میں پذیرائی حاصل نہیں ہو گی اور اسے سختی کے ساتھ مسترد کر دیا جائے گا۔ اس لئے ان کے لئے ضروری تھا دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ضروری تھا کہ وہ اپنی محبت کو چھپائیں۔ اس راز کو راز ہی رہنے دیں اور اس کو افشا نہ ہونے دیں اور یہ اگرچہ بہت مشکل کام تھا تاہم وہ بہت زیادہ احتیاط برتتے رہے تھے۔ لوگوں کی نظروں سے چھپ چھپ کر ملتے تھے اور حتی المقدور اپنی محبت کے راز کو چھپاتے تھے۔ ان کی ملاقاتیں روزانہ نہیں ہوتی تھیں۔ کچھ دن کی لگاتار ملاقاتوں کے بعد سے انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ہفتے میں دو دن سے زیادہ نہیں ملیں گے اور وہ اس پر سختی کے ساتھ عمل بھی کرتے تھے۔ یہ صرف خوفِ رسوائی ہی نہیں تھا بلکہ محبت کی سنگین اور جان لیوا آزمائش میں مبتلا ہو جانے کا خوف بھی تھا جو چاہتوں کی تمام تر شدت کے باوجود انہیں ایک دوسرے سے دور رہنے پر مجبور کرتا تھا۔

اور یوں انہوں نے ایک سال کا عرصہ گزار دیا۔ خیر زماں تو اپنی بکریوں کو لے کر تقریباً روزانہ ہی ادھر جاتا تھا اور اپنی جگہ پر موجود رہتا تھا لیکن زرینہ روزانہ نہیں آتی تھی۔ وہ صرف مقررہ دنوں پر آتی تھی اور پھر جب موسم کی نامہربانیوں میں اضافہ ہوتا گیا اور شدید برف باری کے نتیجے میں راستے بار بار برف سے ڈھکنے لگے تو زرینہ کا آنا اور بھی کم ہو گیا تھا۔ اس کی سرگرمیاں صرف اپنے گاؤں کے اندر اور اردگرد تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں لیکن ان دنوں بھی خیر زماں نے اس کا انتظار کرنا نہیں چھوڑا تھا اور زرینہ بھی کسی کسی دن' موسم کو قدرے مہربان اور مائل بہ کرم پا کر ادھر آ نکلتی تھی اور پھر وہ دونوں اونچی چٹانوں سے گھرے ہوئے کسی محفوظ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر باتیں کرتے تھے لیکن زرینہ زیادہ دیر نہیں رکتی تھی۔ وہ جلدی ہی چلی جاتی تھی۔ برف باری کا خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا تھا اور سخت سردی ہاتھ پیروں کو منجمد کئے ڈالتی تھی۔ ان دنوں زندگی کا لب و لہجہ بڑا سخت اور درشت ہو جاتا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ سخت ترین سردی کا موسم گزر گیا اور شب و روز کی جان لیوا سرد مہری کم ہونے لگی۔ اردگرد کی فضا میں تبدیلی کے آثار نمودار ہونے لگے اور اس کے ساتھ ہی خیر

زماں اور زرینہ کی ملاقاتوں کے سلسلے میں بھی گرمجوشی آنی شروع ہو گئی۔ گزرتے ہوئے وقت نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کو اور بھی زیادہ شدید کر دیا تھا اور ان کے جذبوں کو مزید توانائی اور استحکام بخشا تھا۔ ہجر کی ساعتیں جتنی طویل ہوتی گئی تھیں ملاقات کا شوق اتنا ہی تیز ہوتا گیا تھا اور نرم و لطیف احساسات کی آنچ اتنی ہی زیادہ تیز ہوتی گئی تھی۔

گو کہ انہوں نے اپنی محبت کے راز کو چھپائے رکھنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن محبت کا راز تو کبھی بھی پوشیدہ نہیں رہتا۔ ایک نہ ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب یہ راز منکشف ہو جاتا ہے۔

خیر زماں اور زرینہ کی محبت کا راز تو ابھی دوسروں پر منکشف نہیں ہوا تھا لیکن کچھ اڑتی اڑتی باتیں ان سے ضرور منسوب کی جانے لگی تھیں۔ کئی لوگ ایسے تھے جنہوں نے ان کو ایک آدھ بار ایک دوسرے کے ساتھ دیکھا تھا لیکن یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی اور یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کو کوئی خاص معنی پہنائے جاتے۔ وہ دونوں اپنی بکریوں کے ساتھ باہر جاتے تھے اور اگر گاؤں کے باہر کہیں اکٹھا نظر آ گئے تو یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات تو نہیں تھی۔

سردیاں ختم ہو گئیں' گرمیوں کے زندگی آمیز موسم کا آغاز ہو گیا۔ فضا میں جیسے ایک سرشاری کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور وہ دونوں اس سرشاری کی کیفیت میں گم ایک چٹان کے سائے تلے بیٹھے ہوئے تھے۔ جس جگہ وہ بیٹھے ہوئے تھے وہ ان دونوں کے گاؤں کے درمیان کی جگہ تھی اور گزشتہ ایک سال سے ان کی محبتوں کی امین اور ان کی چاہتوں کی راز دار تھی۔

☆======☆======☆

دراز گل کو آج بابر خیل میں کچھ کام تھا۔ دن چڑھے وہ اپنے گاؤں ڈیرہ امین خان سے بابر خیل کے لئے روانہ ہوا۔ وہ سیدھے اور صاف راستے سے باآسانی جا سکتا تھا لیکن اس میں اس کو کچھ زیادہ چلنا پڑتا۔ اس کے پاس وقت کم تھا اور اسے جلدی بابر خیل پہنچنا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دشوار اور بلند پہاڑی راستے کا انتخاب کیا جس سے گزر کر وہ نسبتاً جلد بابر خیل پہنچ سکتا تھا۔

دراز گل اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے انہی پہاڑی بستیوں میں

آنکھ کھولی تھی اور وہ یہاں کے سارے اسرار و رموز کا آشنا تھا۔ پتھروں کی سرگوشیاں کس طرح سرسراتی ہیں اور پہاڑوں سے ٹکرا کر آوازیں کیونکر گونجتی ہیں' دراز گل خوب جانتا تھا اور اس لئے سرگوشیوں کی وہ بہت ہلکی ہلکی سی سرسراہٹ اس کی سماعت سے باہر نہ رہ سکی جو ایک قریبی چٹان کے پیچھے سے ابھر رہی تھی۔

وہ ٹھٹک کر کھڑا رہ گیا۔ ابھی تک وہ چلنے میں کسی احتیاط سے کام نہیں لے رہا تھا لیکن ان پُراسرار سرگوشیوں کو سننے کے بعد اس نے اپنی رفتار بھی کم کر دی اور وہ قدم بھی بہت محتاط انداز میں اٹھانے لگا۔ بغیر کوئی آواز پیدا کئے ہوئے۔

وہ دبے پاؤں بڑی آہستگی کے ساتھ چلتا ہوا اس چٹان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک اور چیز جو اس کو نظر آ رہی تھی وہ تھی کچھ بکریاں۔ وہ اپنے گاؤں کی ان بکریوں کو پہچانتا تھا۔ یہ بخت خان کی بکریاں تھیں جنہیں بخت خان کا بڑا بیٹا خیر زماں چرانے کے لئے لے جاتا تھا۔

اور پھر دراز گل نے خیر زماں کو دیکھ لیا۔ چٹانوں کے اندر بنی ہوئی اس قدرتی پناہ گاہ جیسی جگہ میں خیر زماں اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ دراز گل نے اس کو دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ وہ بابر خیل کے شمروز خان کی بیٹی زرینہ تھی۔

خیر زماں اور زرینہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ایک دوسرے کے قریب قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہرے کسی تیز و تند اندرونی احساس مسرت سے گلنار ہو رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہنسی تھی اور ان کی آنکھوں میں جیسے کہکشائیں اتری ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں اس طرح سے گم تھے کہ انہیں اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ ہلکی ہلکی سرگوشیوں میں باتیں رہے تھے۔

دراز گل نے ان کی سرگوشیوں پر توجہ نہیں دی اور ان کی باتوں کو سننے کی کوشش نہیں کی۔ جو منظر وہ دیکھ رہا تھا وہ اس درجہ حیرت انگیز' غیر متوقع اور ناقابل یقین تھا کہ ذرا دیر کے لئے وہ بالکل دم بخود ہو کر رہ گیا تھا اور اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

دراز گل نے بعض لوگوں کی زبانی کچھ عرصہ پہلے یہ بات سنی تو تھی کہ بخت خان کا بڑا بیٹا خیر زماں اور شمروز خان کی بڑی بیٹی زرینہ اکثر ایک دوسرے کے ساتھ دیکھے گئے ہیں لیکن اس بات کا تو اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے اور اس نے ایسی سنگین شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ چند لمحوں تک شدید حیرت اور تشویش کے عالم

میں یہ منظر دیکھتا رہا۔ وہ بار بار اپنی پلکیں جھپکا رہا تھا اور گویا خود کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جو کچھ اس کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ کوئی خواب نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔

وہ خواب نہیں تھا۔ حقیقت ہی تھی اور بڑی ظالم' قاتل اور فتنہ انگیز حقیقت تھی۔ اس حقیقت کے نتیجے میں کیسی کیسی قیامتیں برپا ہو سکتی تھیں۔

دراز گل نے اس وقت ان دونوں کی خلوت میں مخل ہونا اور انہیں ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے آگے چلا گیا۔ گو کہ اسے بابر خیل جانے کی جلدی تھی۔ تاہم وہ اس میں تاخیر کا بھی متحمل ہو سکتا تھا۔ اگر یہ نہایت ضروری ہوتا لیکن اس وقت کی صورت حال میں وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ خاموشی سے وہاں سے چلا جائے اور جو کچھ کرنا ہے بعد میں کرے۔

دراز گل ان دونوں کو راز و نیاز میں مصروف چھوڑ کر وہاں سے آگے روانہ ہو گیا۔ اس کے دل و دماغ میں چنگاری سی سلگ رہی تھی۔ وہ آنے والے طوفان کی تیزی و تندی اور بلاخیزی کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

دراز گل' گل بی بی کا سگا بھائی اور خیر زماں کا سگا ماموں تھا۔ وہ عمر میں گل بی بی سے کچھ بڑا تھا۔

دراز گل بھی ڈیرہ امین گل کا ہی رہنے والا تھا۔ اس نے اسی گاؤں میں آنکھ کھولی تھی اور وہ یہیں پلا بڑھا تھا لیکن جب اس کی عمر پندرہ سال کی تھی تو اس وقت وہ اپنے ایک دور کے عزیز کے ساتھ کراچی چلا گیا۔ اس کے اس عزیز کو جس کا کراچی کی سبزی منڈی میں پھلوں کا کاروبار تھا' اپنی دکان کے لئے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جس پر وہ کیش وغیرہ کے معاملات میں بھروسہ کر سکے۔ دراز گل اگرچہ ایک نو عمر لڑکا تھا لیکن وہ ایک باصلاحیت اور ذمہ دار نوجوان تھا اور اس کے عزیز نے اس کی ان صلاحیتوں کو بھانپ کر اسے اپنے ساتھ کراچی چلنے کی دعوت دی۔ دراز گل کے والدین نے تھوڑی سی چیل و حجت کے بعد اس کو کراچی جانے کی اجازت دے دی اور دراز گل کراچی چلا گیا۔

اور اب وہ گزشتہ تقریباً ربع صدی سے کراچی میں ہی رہ رہا تھا۔ وہاں اس کا سبزی منڈی میں پھلوں کا چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔ کراچی میں اس کا گھر تھا۔ اس کے بیوی بچے کراچی میں اس کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

لیکن فی الحقیقت دراز گل کے دو گھر تھے۔ ایک گھر تو کراچی میں تھا اور دوسرا گھر ڈیرہ امین گل میں تھا اور اب یہ کہنا مشکل تھا کہ کون سا اصلی گھر ہے اور کون سا ثانوی۔ کیونکہ اس خاندان کا زیادہ تر وقت تو کراچی میں ہی گزرتا تھا۔ گاؤں تو یہ لوگ اچھے موسم میں صرف مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے لئے آتے تھے اور پھر واپس کراچی چلے جاتے تھے۔ دراز گل کے بچوں کو گاؤں اچھا ضرور لگتا تھا لیکن صرف چند دن کے لئے۔ اس کے بعد وہ کراچی جانے کے لئے بے چین ہونے لگتے۔ شام ہوتے ہی جب ایک غم انگیز قسم کی تاریکی سارے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تو بچوں کا جی بہت گھبراتا۔ یہاں لالٹینوں اور لیمپوں کی روشنی کے باوجود انہیں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا لگتا۔ کراچی میں تو ان کی بجلی سے منور شامیں، ٹی وی کے سامنے گزرتی تھیں اور ٹی وی کی سکرین پر ایک جادوئی دنیا ان کے لئے طرح طرح کے کھیل تماشے لئے موجود ہوتی تھی۔ پھر بازاروں کی رونقیں تھیں۔ دکانوں کی چہل پہل تھی۔ بستیوں میں موجیں مارتی ہوئی زندگی تھی۔ آدھی آدھی رات تک جاری رہنے والے ہنگامے تھے لیکن یہاں تو شام ہوتے ہی اندھیرا پھیلتے ہی، جیسے دنیا ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی رات کو کھانا کھا لیا جاتا تھا اور پھر کچھ دیر کے بعد سونے کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ بچوں کو اس ماحول سے، اس طرز زندگی سے وحشت سی ہونے لگتی۔ علی الصباح سے شام تک گاؤں کی خوبصورت اور دلنواز فضا تو ان کے لئے اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتی تھی کیونکہ یہ مناظر شہر میں ناپید تھے لیکن یہ کشش بھی چند روز کے اندر اندر ہی معدوم ہو جاتی تھی اور بچوں کو بڑی شدت کے ساتھ کراچی یاد آنے لگتا۔

دراز گل کا سب سے بڑا بیٹا شہزاد کراچی کے ایک اسکول میں میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ وہ اس سال میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ دراز گل اس کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس سے چھوٹی بیٹی دردانہ آٹھویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ دوسری بیٹی فائزہ چھٹی کلاس میں تھی اور سب سے چھوٹا بیٹا افراسیاب خان پانچویں کلاس میں۔ یہ سارے بچے کراچی میں ہی پیدا ہوئے تھے اور ان کی پرورش و تربیت کراچی میں ہوئی تھی۔ ان میں سے ہر ایک اردو اس طرح بولتا تھا جیسے یہ اس کی مادری زبان ہو۔ سب بچے اسکول جاتے تھے۔

دراز گل کے بچوں کے لئے تو ان کا اصلی گھر کراچی ہی تھا اور گاؤں ان کے لئے

ایک اجنبی جگہ تھی جہاں وہ کچھ دن آ کر تو رہ سکتے تھے لیکن یہاں مستقل قیام کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن دراز گل اور اس کی بیوی کے لئے ان کا اصلی گھر اب بھی گاؤں میں تھا۔ گو کہ وہ دونوں ہی کراچی کی شہری زندگی کے اتنے زیادہ عادی ہو چکے تھے کہ شہر کے بغیر ان کا گزارہ ہی نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی اپنے گاؤں سے انہیں جو ایک والہانہ محبت تھی اس میں کمی نہیں ہوئی تھی۔

ایک عرصے سے شہر میں رہنے اور ایک بالکل مختلف فضا میں سانس لینے کے باعث دراز گل کی سوچ کے زاویوں میں کافی تبدیلیاں نمودار ہو گئی تھیں۔ اگرچہ وہ اس معاشرے کی تمام قدیمی روایات سے ذہنی طور پر اپنا رشتہ توڑ نہیں پایا تھا جس سے اس کا تعلق تھا لیکن روایات پر اصرار میں کمی اور روشن خیالی اور آزادی فکر کا کچھ پرتو ضرور اس کے ذہن میں داخل ہو چکا تھا۔

دراز گل ان دنوں کچھ عرصے کے لئے گاؤں آیا ہوا تھا۔ خاندان میں کسی کی موت ہو گئی تھی اور تعزیت کے لئے آنا ضروری تھا۔ اس کے بچے اس لئے ساتھ نہیں آئے تھے کیونکہ ان کے امتحانات ہونے والے تھے اور چونکہ بچے کراچی سے باہر نہیں جا سکتے تھے اس لئے دراز گل کی بیوی بھی کراچی سے نہیں جا سکتی تھی۔

دراز گل کو اپنی بہن کے بچوں سے محبت تھی۔ وہ انہیں خوش و خرم، خوش حال اور پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا تھا۔

لیکن ابھی ابھی اس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا تھا اس نے اس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسے اپنے عزیز بھانجے خیر زماں کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش اپنے سامنے پھڑکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی اکلوتی بہن گل بی بی کو اپنے نوجوان بیٹے کی خون آلود لاش پر ماتم کناں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کا بہنوئی بخت خان درد و غم اور قہر و غضب کی تصویر بنا ہوا کھڑا تھا۔ ویسے بھی، شمروز خان کے خاندان کا ایک قرض بخت خان کے خاندان پر ابھی باقی تھا۔ راحت خان کے خون کا بدلہ ابھی تک نہیں لیا گیا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ بدلہ فوراً ہی لیا جائے۔ اس کے لئے تو برسوں انتظار کیا جا سکتا تھا۔ اپنی سہولت سے، موقع محل دیکھ کر، کبھی بھی بدلہ لیا جا سکتا تھا۔

"یہ ناممکن ہے؟" دراز گل نے دل ہی دل میں کہا۔ "اس خوفناک سلسلے کو یہیں اور اسی جگہ ختم ہو جانا چاہئے۔ وہ دونوں نوجوان اور نادان ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس

نہیں ہے کہ وہ آگ سے کھیل رہے ہیں جو نہ صرف ان دونوں کو جلا کر بھسم کر دے گی بلکہ ان کے خاندان کو بھی آنے والی نہ جانے کتنی مزید نسلوں تک تباہ و برباد کرتی رہے گی۔"

درازگل اپنے خیالات میں گم بابر خیل پہنچ گیا جہاں وہ تقریباً سہ پہر تک رہا۔ اس دوران اس کا گزر شمروز خان کے گھر کے دروازے کے سامنے سے بھی ہوا۔ اس نے اس کے گھر کے دروازے کو دیکھا اور اس کے دل میں درد کی ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی۔ کاش' اس دروازے سے زرینہ کی لاش نہ نکالی جائے۔

اس روز واپس ڈیرہ امین گل پہنچنے کے بعد شام کو درازگل نے ایک لڑکے کو بھیج کر خیرزماں کو اپنے پاس بلایا۔ وہ خیرزماں کے گھر جا کر اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہاں اور دوسرے لوگ بھی موجود تھے اور اگر وہ وہاں سب سے الگ تھلگ خیرزماں سے بات کرتا تو لوگوں کو اس بارے میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔

خیرزماں جب اپنے ماموں کے پاس اس کے گھر آیا جہاں اس کا ماموں اکیلا تھا' تو اس کو قدرے تعجب ہو رہا تھا کہ ماموں نے کس ضروری کام سے اس کو بلوایا ہے۔

اپنی بہن کے بچوں کے ساتھ درازگل کے تعلقات دوستانہ اور خوشگوار تھے اور ان کے درمیان خاصی بے تکلفی پائی جاتی تھی۔ خیرزماں اپنے والدین سے اتنا بے تکلف نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنے ماما درازگل سے بے تکلف تھا۔ اور ماما درازگل تو اس کو پسند بھی بہت تھے۔ وہ کراچی میں رہتے تھے اور ان میں اور یہاں کے لوگوں میں بہت فرق پیدا ہو چکا تھا جس کا اظہار بہت ساری مختلف صورتوں میں ہوتا تھا درازگل کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ وہ تو ایسی ایسی چیزوں کے بارے میں جانتے تھے جن کے متعلق گاؤں کے لوگوں کو کچھ بھی نہیں معلوم تھا اور وہ جب بھی گاؤں آتے تھے اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی نئی چیز' کوئی نئی خبر' کوئی نئی معلومات لے کر آتے تھے۔

"آؤ بیٹھو۔" درازگل نے اپنے بھانجے کو اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا اور درازگل اپنے ماما کی اس مزاجی کیفیت کو دیکھ کر کچھ سہم سا گیا۔ ماما درازگل تو ہمیشہ بہت زیادہ خوش مزاجی اور بے تکلفی کے ساتھ بات کیا کرتے تھے۔ آج ان کے لب و لہجے میں یہ کھردرا پن کہاں سے آ گیا تھا؟

خیرزماں بیٹھ گیا اور درازگل کی طرف غور سے دیکھنے لگا جس کے چہرے پر گہری

سنجیدگی طاری تھی۔

درازگل نے اصل موضوع کی طرف آنے کے لئے کوئی تمہید نہیں باندھی۔

"تم.......... شمروز خان کی بیٹی زرینہ کے ساتھ وہاں چٹان کے نیچے بیٹھے ہوئے کیا کر رہے تھے؟" اس نے ایک دم براہ راست سوال کیا اور خیرزماں اس طرح اچھل پڑا جیسے کسی بچھو نے اس کو ڈنک مار دیا ہو۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ماما درازگل نے یہ پوچھنے کے لئے اس کو بلایا تھا۔ اس کو اور خود زرینہ کو بھی اس بات کا بڑی حد تک یقین تھا کہ ان دونوں کی خفیہ محبت کا کسی کو علم نہیں ہے اور وہ دونوں اب تک بالکل محفوظ ہیں لیکن ماما درازگل کو تو سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ انہوں نے نہ جانے کب اور کیسے ان دونوں کو وہاں دیکھ لیا تھا۔

خیرزماں نے جواب دینے میں چند لمحوں کا توقف کیا۔ سب سے پہلے تو وہ اپنی اس حیرت پر غالب آیا جو ماما درازگل کا سوال سن کر اس پر طاری ہوئی تھی۔ پھر اس نے دل ہی دل میں اس سوال کے مضمرات پر غور کیا اور پھر یہ سوچا کہ اب جبکہ ماما درازگل نے اس کو اور زرینہ کو اکٹھے دیکھ ہی لیا ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے تو پھر اب اس کو پورے طور سے سامنے آ ہی جانا چاہئے۔ کم از کم ماما درازگل تو ایک ایسے انسان تھے جو اس کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے بلکہ اس کی مدد بھی کر سکتے تھے۔ اس نے ماما درازگل کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"تت تت.......... تت.......... تو.......... تو آپ نے ہمیں کب دیکھ لیا ماما؟" اس نے درازگل کے سوال کا براہ راست جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔ تاہم' اس کے لب و لہجے میں قدرے شرمساری کا عنصر شامل تھا۔

"میں نے تم دونوں کے بارے میں کچھ لوگوں سے ایسی ہی اڑتی اڑتی خبریں سنی تھیں کہ تم اکثر ایک دوسرے کے ساتھ دیکھے گئے ہو۔" درازگل نے کہا۔ "لیکن میں نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لوگ تو ہر طرح کی باتیں کرتے ہی رہتے ہیں لیکن آج میں نے اپنی آنکھوں سے تم دونوں کو وہاں ایک دوسرے کے ساتھ اس حالت میں بیٹھے ہوئے دیکھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور میں اپنی آنکھوں کو تو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔" اس نے اپنی تیز اور چبھتی ہوئی نظریں خیرزماں کے چہرے پر گاڑھ دیں۔

"جو کچھ آپ نے دیکھا تھا ماما! میں اس سے انکار تو نہیں کر سکتا۔" خیر زماں نے نظریں نیچی کرکے کہا۔ "اصل بات یہ ہے ماما! کہ ہم دونوں............"

"ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے' وغیرہ وغیرہ۔" اس نے خیر زماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہی کہنا چاہتے ہو نا اس کے آگے تم؟"

"ہاں ماما!" خیر زماں نے کہا۔ "میں .... میں .... یہی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"احمق .... گدھے .... بے وقوف .... تم کو معلوم بھی ہے کہ تم کس لڑکی کے بارے میں اس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ کیا تم یہ بات بھول گئے ہو کہ زرینہ شمروز خان کی بیٹی ہے اور شمروز خان کے خاندان کے ساتھ تمہارے خاندان کی صدیوں پرانی دشمنی ہے۔ کیا تم یہ نہیں جانتے؟"

"جانتا ہوں ماما! بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔" خیر زماں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "لیکن .... میں .... اس کو چھوڑ نہیں سکتا اور .... نہ ہی .... نہ ہی وہ مجھ کو چھوڑ سکتی ہے۔"

"تم دونوں پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟" دراز گل نے آنکھیں نکال کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم کو نہیں معلوم کہ تمہاری اس بے وقوفی کی حرکت کا انجام تباہی اور بربادی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے؟ تم دونوں' اپنے اپنے خاندانوں کی مکمل بربادی کا سامان کر رہے ہو۔"

"ماما! آخر یہ تو بتائیے کہ ہمارے دونوں خاندانوں کے درمیان دشمنی کی اصل وجہ کیا ہے؟" خیر زماں نے دراز گل سے پوچھا۔ "ہمارے دونوں قبیلوں کے درمیان تو کوئی تنازعہ نہیں ہے اور بہت عرصے سے دونوں قبیلے امن و سکون کے ساتھ رہ رہے ہیں لیکن ہمارے دونوں خاندانوں کے درمیان آخر کیا بات ہے؟ ہم لوگ کیوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں؟"

"یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔" دراز گل نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہ دشمنی کیوں ہے' کس وجہ سے ہے' یہ کب سے ہے اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا اور ان علاقوں میں برسوں سے' صدیوں سے پرورش پانے والی بے شمار خاندانی اور قبائلی دشمنیاں ایسی ہیں جن کی اصل وجہ سے کوئی بھی واقف نہیں ہے

اور نہ ہی کوئی ان کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے' کیونکہ اگر وجہ معلوم ہو بھی جائے تو بھی دشمنی کوئی ختم تو نہیں ہو جائے گی۔"

"لیکن ماما! دشمنی کو ختم کرنے کی' دشمنی کو دوستی میں بدل دینے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے۔" خیر زماں نے کہا۔

"یہ بات تم محض اس لئے کہہ رہے ہو کیونکہ تم کو ایک ایسی لڑکی سے محبت کا دعویٰ ہے جو ایک دشمن خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "اور اگر ایسا نہ ہوتا' اگر تم زرینہ کی چاہت میں مبتلا نہ ہو گئے ہوتے تو شاید اس قسم کا کوئی بھی خیال تمہارے دماغ میں نہ آتا............"

"نہیں .... نہیں ماما!" خیر زماں نے جلدی سے کہا۔ "ایسا نہیں ہے۔ میں تو ہمیشہ سے ہی ان بے کار اور فضول قسم کی دشمنیوں کے خلاف ہوں جن کا شکار ہو کر خاندان کے خاندان نسلوں سے تباہی کا شکار ہو رہے ہیں لیکن میں کیا کر سکتا ہوں ماما؟"

"اگر تم کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ تو ضرور کر سکتے ہو کہ حالات کو اور زیادہ خراب مت کرو اور اپنے لئے زرینہ کے لئے اور دونوں خاندانوں کے لئے مزید تباہی کے سامان نہ کرو۔ اتنا تو تم کر ہی سکتے ہو نا؟"

"اگر ہمیں یہ بات معلوم ہو جاتی کہ ہمارے دونوں خاندانوں کے درمیان دشمنی کی وجہ کیا ہے تو ہم اس کو ختم کرکے دونوں خاندانوں کے تعلقات بحال کروانے کی کوشش کر سکتے تھے۔" خیر زماں نے کہا۔ "شاید کوئی صورت نکل آتی............"

"کس قدر حماقت کی باتیں کر رہے ہو تم؟" دراز گل نے اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "کیا ایسا ممکن ہے کہ صدیوں پرانی اس نامعلوم دشمنی کے اسباب کا پتہ لگایا جا سکے اور جو اسباب آج سے صدیوں پہلے موجود تھے ان کو اب دور کرنے کے بارے میں سوچا جائے؟"

"تو پھر یہ کیا جائے ماما کہ دشمنی ختم کر دی جائے۔" خیر زماں نے فوراً کہا۔ "دشمنی ختم تو کی جا سکتی ہے۔"

"کون کرے گا اس کو ختم؟" دراز گل نے اس کو کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تمہارا باپ کرلے گا؟ یا زرینہ کا باپ کرلے گا؟ وہ سب کے سب تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔"

"جانتا ہوں ماما!" خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔ "دیکھو نا اگر میری اور زرینہ کی شادی ہو جائے تو یہ دشمنی ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتی ہے۔"

"ہو سکتی ہے۔ ضرور ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ تمہاری اور زرینہ کی شادی ہو جائے جو کہ کبھی نہیں ہو سکتی۔ نہ تو بخت خان زرینہ کو اپنی بہو تسلیم کرے گا اور نہ شمروز خان تم کو اپنا داماد۔ تم دونوں ٹھکرا دیئے جاؤ گے اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسا زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہو گا جس کو سنبھالا نہ جا سکے گا۔"

"آپ کو اس معاملے میں میری مدد کرنی ہو گی ماما!" اچانک خیر زماں کا لہجہ طلب آمیز ہو گیا۔ وہ دراز گل سے سختی کے ساتھ کچھ مانگ رہا تھا۔ "سچ یہ ہے کہ میں اور زرینہ اب ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہماری زندگیاں تو اب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔ میں اب اس بات کو برداشت نہیں کر سکوں گا کہ زرینہ کسی اور کی ہو جائے۔"

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟" دراز گل نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہاری کوئی بھی مدد نہیں کر سکتا۔ شمروز خان کے ساتھ میرے کون سے دوستانہ تعلقات ہیں جو میں اس کو سمجھاؤں؟ وہ کیوں میری بات مانے گا اور اس سے پہلے تمہارا باپ میری کیوں مانے گا؟ تمہاری ماں کیوں مانے گی؟ میں اس دشمنی کے رشتے کو دوستی کے رشتے میں کس طرح بدل سکتا ہوں؟"

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا ماما! ورنہ میں اور زرینہ اپنی جان سے جائیں گے۔" خیر زماں نے کہا۔

"وہ تو ویسے بھی جاؤ گے۔" دراز گل نے اپنی پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "شمروز خان کو جب اس بات کے بارے میں معلوم ہو گا کہ تم اس کی بیٹی کے ساتھ محبت کا کھیل کھیل رہے ہو تو وہ تم کو بھی ختم کر دے گا اور شاید اپنی بیٹی کو بھی۔ ویسے بھی راحت خان کے قتل کا بدلہ ابھی باقی ہے۔"

"میں کوئی کھیل نہیں کھیل رہا ہوں ماما!" خیر زماں نے کہا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے سے سچی محبت کرتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"اور تم سمجھتے ہو کہ یہ شادی وغیرہ ہنسی کھیل ہے؟" دراز گل نے ناگواری کے ساتھ کہا۔ "تم سمجھتے ہو کہ شمروز خان اپنی بیٹی کو تھالی میں رکھ کر اپنے خاندانی دشمن کے

حوالے کر دے گا؟"

"ماما! کبھی نہ کبھی تو دشمنی کو ختم کرنا ہے۔" خیر زماں نے کہا۔ "ہم لوگ ہمیشہ تو ایک دوسرے کا خون نہیں پیتے رہیں گے۔ آپ تو شہر میں رہتے ہیں۔ ہر بات کو ہم لوگوں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ آپ کوشش کیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ زرینہ بھی بالکل یہی کچھ چاہتی ہے۔"

"تم دونوں کے چاہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا خیر زماں!" دراز گل نے کہا۔ "تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ جن لوگوں کے چاہنے سے سب کچھ ہوتا ہے وہ قیامت تک اس بات سے اتفاق نہیں کریں گے اور میں تم کو دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ اس سلسلے کو یہیں پر ختم کر دو ورنہ اس کا انجام بڑا خوفناک ہو گا۔"

"اس کو ختم کرنا اب میرے بس سے باہر ہے ماما!" خیر زماں نے کہا۔ "یہ تو بہت اچھا ہوا کہ آپ نے ہم دونوں کو یکجا دیکھ لیا اور اب آپ کو یقین آ جانا چاہئے کہ زرینہ بھی وہی چاہتی ہے جو کہ میں چاہتا ہوں۔ بس ماما! آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ ہماری مدد کیجئے۔"

"میں اس بارے میں سوچوں گا اور غور کروں گا۔" دراز گل نے کہا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ نوجوانی کے عشق کا جنون بڑا شدید اور طوفانی ہے اور اس کا خاتمہ اتنا آسان نہیں۔ ایسے لوگوں کی آج بھی کمی نہیں تھی جو جانتے بوجھتے اپنے آپ کو عشق کی ہلاکت میں ڈال دیتے تھے اور مارے جاتے تھے اور پھر کچھ کے بارے میں تو اخباروں میں خبریں چھپ جاتی تھیں اور کچھ ہمیشہ گمنام ہی رہتے تھے۔ ان کی المناک داستانیں ان کے وجود کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی تھیں اور ہمیشہ کے لئے ماضی کے تہہ خانوں میں دفن ہو جاتی تھیں۔

"ماما.......... میرے اچھے ماما!" خیر زماں نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے دراز گل کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔" دراز گل نے اس کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ بھی آپ کہیں گے ماما میں وہی کروں گا۔" خیر زماں نے جلدی سے کہا۔ "بتایئے کیا وعدہ لینا چاہتے ہیں؟"

"اب تم اس وقت تک زرینہ سے نہیں ملو گے جب تک کہ اس معاملے کا کوئی

فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بے موت مارے جاؤ۔ اگر شمروز خان کے کان میں اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ تم کو فوراً قتل کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے ماما!" خیر زماں نے کہا۔ "میں .... نہیں ملوں گا لیکن اس کو بتانا ضروری ہے۔ ورنہ وہ پریشان ہو گی۔ انتظار کرے گی اور مایوس ہو گی۔ وہ اب تین دن کے بعد اس جگہ آئے گی جہاں آپ نے ہم دونوں کو دیکھا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "تین دن کے بعد بھی وہاں تم نہیں جاؤ گے' میں جاؤں گا۔ میں خود جا کر اس کو بتا دوں گا کہ تم نہیں آ رہے ہو اور وہ تمہارا انتظار نہ کرے۔"

"مگر.......... مگر ماما.......... وہ.........."

"تم اس کی پرواہ مت کرو۔" دراز گل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں اس کو سمجھا لوں گا وہ کسی بھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو گی۔"

"جیسا آپ چاہیں ماما!" خیر زماں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "اب تو میں نے سارا معاملہ آپ پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ ہی کو سب کچھ سنبھالنا ہے۔"

"میں کچھ بھی سنبھالنے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔" دراز گل نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہ بات تم پہلے سے اچھی طرح جان لو کہ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں ماما! جانتا ہوں۔" خیر زماں نے کہا۔ "لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے ہاتھ میں بہت کچھ ہے۔ اگر آپ بابا کو راضی کر لیں۔"

"میں گل بی بی اور بخت خان سے بات کروں گا۔" دراز گل نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں پہلے سے بتائے دیتا ہوں کہ یہ معاملہ بنے گا نہیں اور تم کو زرینہ کا خیال اپنے دماغ سے باہر نکالنا ہو گا۔"

"دیکھا جائے گا ماما!" خیر زماں نے کہا۔ "آپ پہلے کوشش تو کر کے دیکھیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔" دراز گل نے کہا۔ "میں دیکھوں گا مگر دیکھو' خدا کے واسطے ہم سب کے لئے کوئی تازہ مصیبت نہ کھڑی کر دینا۔ پہلے ہی بہت سارے مسائل ہیں اور زیادہ مسائل نہ پیدا کر دینا۔"

"نہیں ماما!" خیر زماں نے کہا۔ "میں تو ابھی خاموشی سے آپ کی کوششوں کے بار آور ہونے کا انتظار کروں گا۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ وہاں سے چلا گیا۔

دراز گل ایک ہوشیار' جہاندیدہ اور تجربہ کار آدمی تھا۔ اسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ نوجوانی کے عشق کا جذبہ عام طور سے مصلحت اور دور اندیشی سے زیادہ سروکار نہیں رکھتا اور اس کی سرکشی بعض اوقات ایسی حدوں تک جا پہنچتی ہے جہاں جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی نئی اور انہونی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے علاقے کے ایسے کئی واقعات سے واقف تھا اور اب وہ سخت پریشانی اور تشویش کا شکار تھا۔ اسے اپنے عزیز بھانجے کی زندگی صاف خطرے میں نظر آ رہی تھی۔

اس نے اپنی بہن اور بہنوئی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اگلے ہی دن وہ ان لوگوں کے پاس جا پہنچا۔ اس نے تنہائی میں ان دونوں سے بات کی اور انہیں اس ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

بخت خان کی آنکھوں میں تو جیسے خون اتر آیا۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں پاگل ہو کر خیر زماں کو گولی مار دینے پر تُل گیا۔ "اس کی یہ ہمت کہ دشمن کی بیٹی کو بہو بنا کر اس گھر میں لانے کا خواب دیکھے۔"

لیکن دراز گل نے اس کو سمجھایا اور نرمی اور مصلحت سے کام لینے کا مشورہ دیا۔

"تم کیوں اپنی طرف سے انکار کرتے ہو؟ وہ دشمن کی بیٹی کو اپنے گھر میں لانا چاہتا ہے۔ اپنے گھر کی بیٹی کو تو دشمن کے گھر نہیں بھیج رہا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں اس کا گواہ ہوں اور اگر زرینہ دلہن بن کر اس گھر میں آ جائے تو کیا برائی ہے؟ آخر کو وہ بھی تمہارے برابر کا گھرانا ہے اور پھر تم کوئی خون معاف نہیں کر رہے ہو۔ تمہارا ان پر کوئی قرضہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کا ہی تم پر قرضہ ہے۔ اگر یہ رشتہ ہو گا تو یہ صدیوں پرانی دشمنی بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔"

حد درجہ برافروختہ اور سخت ناراض بخت خان نے پہلے تو دراز گل کو پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیا لیکن دراز گل نے بھی اس کو سمجھانے پر اپنی ساری شہری قابلیت اور تجربے کو صرف کر دیا۔ اسے ساری اونچ نیچ سمجھائی۔ انکار کی صورت میں خطرناک نتائج کے امکانات سے آگاہ کیا اور پہلے تو وہ اپنی بہن کو اور پھر اپنے بہنوئی کو بھی کسی قدر رام کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس کامیابی کے حصول میں اس کو دو دن لگ گئے گھنٹوں تک تلخ و ترش بحثیں جاری رہیں۔

"تم صرف مجھ کو اس امر کی اجازت دے دو کہ میں شمروز سے اس سلسلے میں بات

کروں۔ تم لوگوں کے وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اکیلا جاؤں گا اور اس سے بات کروں گا اور اس کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر اس نے ذرا بھی آمادگی کا اظہار کیا تو میں پھر تم لوگوں کو ساتھ لے کر اس کے پاس جاؤں گا۔ جہاں تک راحت خان کے قتل کا تعلق ہے تو ہم کچھ نہ کچھ کر کے اس کا خون بہا ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور اگر یہ رشتہ قائم ہو جائے تو بھلا اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"صرف تمہاری خاطر دراز گل!" بخت خان نے سخت غصے کے عالم میں کہا۔ "صرف تمہاری خاطر میں یہ بات مانے لیتا ہوں اور تم کو اجازت دیتا ہوں کہ تم بابر خیل جا کر شمروز خان سے اس رشتے کے بارے میں بات کر لو۔ اگر وہ مان جاتا ہے تو ٹھیک ہے اگر نہیں مانتا تو کوئی بات نہیں۔ اس میں ہماری کوئی بے عزتی نہیں ہے۔ ہر لڑکی کے والدین کو اس بات کا اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ جہاں چاہیں اس کی شادی کر دیں۔"

"میں کبھی بھی تم لوگوں کو بے عزت نہیں ہونے دوں گا۔" دراز گل نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "تمہاری عزت میری عزت اور تمہاری بے عزتی میری بے عزتی ہے۔ میں ایسی کوئی بھی بات نہیں ہونے دوں گا جس میں تم لوگوں کی بے عزتی کا پہلو نکلتا ہو۔ اس بات کا اطمینان رکھو۔ میں دو ایک دن میں بابر خیل جا کر شمروز خان سے بات کرتا ہوں۔"

دراز گل اپنی یکطرفہ کوششوں میں کامیاب ہو گیا تھا اور خیر زماں کے لئے یہ بہت بڑی خبر تھی۔ اسے ماما دراز گل کی زبانی یہ سب کچھ سن کر بہت خوشی ہوئی تھی اور اب تو گھر کے ہر فرد کو اس بات کا علم ہو گیا تھا۔ دو دن سے گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ تو گھر کے دوسرے افراد کو بھلا اس کی خبر کیوں نہ ہوتی خیر زماں اور زرینہ کی داستان عشق سے اب خیر زماں کے والدین کے علاوہ اس کے چھوٹے بھائی بہن' نواز خان اور نور جہاں بھی واقف ہو چکے تھے اور اس سارے معاملے کے نتیجے میں گھر کی فضا کچھ عجیب انداز کی' کشیدہ کشیدہ سی ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمام لوگ ایک دوسرے سے محتاط ہو گئے ہوں۔ وہ سنبھل سنبھل کر ایک دوسرے سے بول رہے ہوں اور ہر شخص دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا ہو۔ گھر کے ماحول میں ایک اجنبیت سی گھل گئی تھی اور خاص طور سے خیر زماں تو جیسے اچانک ان سب لوگوں کے لئے' اپنے والدین اور بھائی بہن کے لئے' اجنبی

بن گیا تھا۔ خیر زماں کے ساتھ ان سب لوگوں کے تعلقات میں یکبارگی ایک تکلف اور بیگانگی کا سا عنصر حائل ہو گیا تھا۔

تاہم' خیر زماں خوش تھا کہ بالآخر یہ بات اس کے والدین کے علم میں آ گئی اور انہوں نے ماما دراز گل کو اس بات کی اجازت بھی دے دی کہ وہ شمروز خان کے گھر جائیں اور زرینہ کے لئے اس کا پیغام دیں۔ اب آگے قسمت جو بھی دکھائے۔

☆======☆======☆

دراز گل نے زرینہ سے ملاقات کے بعد ہی اس کے باپ کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے بس ایک دن اور انتظار کرنے کی ضرورت تھی اور اس نے خیر زماں کو یہ بات بتا بھی دی تھی۔

اس سے اگلے ہی روز خیر زماں اور زرینہ کی ملاقات طے تھی۔ دراز گل نے خیر زماں کو سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ وہ وہاں نہ جائے اور یہ کہ وہ خود وہاں جائے گا۔

چنانچہ اس روز زرینہ نے جو کہ خیر زماں سے ملاقات کرنے کے لئے وہاں گئی تھی دراز گل کو اس جگہ موجود پایا اور وہ ایک دم خاصی پریشان ہو گئی۔ وہ دراز گل کو پہچانتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ وہ خیر زماں کا ماموں ہے لیکن اس کو دراز گل سے کبھی ملنے اور زیادہ باتیں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ بس اس کی شکل و صورت سے واقف تھی۔

زرینہ نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ خیر زماں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی بکریاں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وہ جلدی جلدی وہاں سے جانے لگی۔ اس نے دراز گل کو صرف سلام کرنے کے علاوہ اس سے اور کوئی بات نہیں کی تھی۔

"اب خیر زماں اگر آ بھی جائے تو بیکار ہے۔" وہ مایوسی کے ساتھ دل میں سوچ رہی تھی۔ "یہاں تو اس کا ماموں موجود ہے۔ بھلا اس کی موجودگی میں کوئی بات ہو سکتی ہے؟"

"ٹھہر جاؤ زرینہ بٹی!" دراز گل نے آواز دے کر اس کو روکا۔ "مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

"مجھ سے..........!" زرینہ نے گھبرا کر کہا۔ خوف اور تشویش کی ایک سرد لہر اس کے سارے وجود میں سرایت کرتی چلی گئی تھی۔

"ہاں' تم سے۔" دراز گل نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ میں سکون اور اطمینان کے ساتھ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

زرینہ کے دل کی دھڑکنیں ایک دم تیز ہو گئی تھیں۔ وہ اس صورت حال کو سمجھ رہی تھی۔ کہیں نہ کہیں' کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ شاید بہت زبردست قسم کی گڑبڑ۔ شاید ان کا راز فاش ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے خیر زماں نہیں آیا تھا بلکہ اس کا ماموں آیا تھا اور ان لوگوں نے شاید خیر زماں کو یہاں آنے سے روک دیا تھا۔ کیا انہوں نے اس کو کہیں بند کر دیا۔

"ہاں' تم سے زرینہ بیٹی!" دراز گل نے کہا۔ "آرام سے بیٹھ جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔"

دراز گل کا لب و لہجہ نرم و شیریں اور قطعی طور سے غیر جارحانہ تھا۔ اس کی جانب سے کسی قسم کے غصے اور ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا جا رہا تھا۔

زرینہ خاموشی سے ایک چٹان پر بیٹھ گئی اور دراز گل اس کے قریب کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"تم خیر زماں کا انتظار کر رہی تھیں نا؟" دراز گل نے بلا کسی تمہید کے براہ راست گفتگو کا آغاز کر دیا۔ "لیکن وہ آج نہیں آئے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ آنا نہیں چاہتا تھا بلکہ میں نے خود ہی اس کو یہاں آنے سے روک دیا تھا۔ کیونکہ میں خود تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

زرینہ نے اس کی باتوں کے جواب میں اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں جمع ہو گیا ہو۔ وہ اس غیر متوقع صورت حال کے لئے قطعی طور پر بالکل تیار نہیں تھی۔

وہ دراز گل سے ملاقات کرنے کے لئے اس کے سوالوں کے جوابات دینے کے لئے تو بالکل تیار نہیں تھی لیکن اب تو وہ اس طرح سے پھنس گئی تھی کہ جواب دیئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

دراز گل نے ابھی تک اس سے کوئی براہ راست سوال نہیں کیا تھا۔ ابھی تو وہ صرف اپنی بات کہہ رہا تھا اور زرینہ سن رہی تھی۔

"کیا تم کو یہ بات معلوم ہے کہ تمہارے اور خیر زماں کے خاندانوں کے درمیان دوستی کے نہیں دشمنی کے رشتے موجود ہیں اور اب خیر زماں کے خاندان کے کسی شخص کے قتل ہونے کی باری ہے؟"

"جی .... معلوم ہے۔" زرینہ آہستہ آہستہ خود کو اس نئی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار کر رہی تھی۔ اب جو بھی ہو' بات چیت تو بہرحال کرنی ہی تھی۔

"تو پھر تم دونوں جو کچھ کر رہے ہو اس سے کیا فائدہ ہے؟" دراز گل نے اس کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارا باپ خیر زماں کے ساتھ تمہاری شادی کے لئے راضی ہو جائے گا؟"

"معلوم نہیں۔" زرینہ نے نظریں نیچی کئے ہوئے بڑی آہستگی کے ساتھ کہا۔ "لیکن پھر میں کسی اور سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔" اچانک زرینہ کے دل میں ایک نیا عزم اور ایک نیا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنی محبت کے دفاع پر تل گئی تھی۔

"اوہ............" دراز گل نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک رونڈی' کچلی' ناخواندہ دیہاتی لڑکی کی زبان سے یہ الفاظ عجیب اور غیر متوقع معلوم ہوتے تھے۔ "تو .... تم واقعی یہ فیصلہ کر چکی ہو؟"

"ہاں ماما!" زرینہ نے کہا۔ "میں یہ فیصلہ کر چکی ہوں۔ میں خیر زماں کے علاوہ اور کسی کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔"

"مگر تم جانتی ہو۔ اچھی طرح سے جانتی ہو کہ تمہارے والدین اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ ایک دشمن کے بیٹے کو اپنے داماد کے طور پر قبول نہیں کریں گے اور ایک دشمن کے گھر اپنی بیٹی کو نہیں دیں گے۔"

"یہ ان کی مرضی ہے ماما!" زرینہ نے کہا۔ "اگر وہ ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ایسا ہی کریں اور میں .... میں ویسا ہی کروں گی جیسا کہ میں چاہوں گی۔ میں ساری عمر شادی نہیں کروں گی۔"

"پاگل لڑکی!" دراز گل نے کہا۔ "یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ تم ایسا کر سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں کر سکتی ہوں ماما!" زرینہ نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "کیا جمیلہ پھوپھی نے ایسا نہیں کیا؟ اگر جمیلہ پھوپھی ایسا کر سکتی ہیں تو میں کیوں نہیں کر سکتی؟"

جمیلہ کا نام سن کر دراز گل کے دل میں دکھ اور ہمدردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ آج سے کوئی بیس سال پہلے جمیلہ کی شادی جس نوجوان سے طے تھی وہ ایک اونچی چٹان پر سے

گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔ جمیلہ اور وہ نوجوان بچپن کے منگیتر تھے اور ان میں بہت محبت تھی۔ اپنے منگیتر کی موت کے بعد جمیلہ نے دوسری جگہ شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے لئے بہت اچھے اچھے رشتے آئے اور اس کے والدین نے طے بھی کئے لیکن جمیلہ نے شادی سے صاف انکار کر دیا تھا۔ باپ اور بھائیوں نے اس کو اپنی ناک کا مسئلہ بنا لیا تھا اور انہوں نے جمیلہ کو دھمکی دی کہ اگر وہ ان کی بات نہیں مانے گی تو وہ اس کو گولی مار دیں گے اور جمیلہ نے ان سے کہا تھا کہ وہ اس کے لئے تیار ہے اور وہ بخوشی اس کو گولی مار دیں لیکن وہ شادی نہیں کرے گی اور اپنی اس بات پر اڑی رہی تھی۔ تنگ آ کر اس کے والدین اور بھائیوں نے اس کو اس کے ہی حال پر چھوڑ دیا تھا اور پھر وقت گزرتا گیا۔ جمیلہ کے بالوں میں چاندی کے سفید سفید تار نمودار ہونے لگے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شادی کی عمر نکل گئی تھی اور اب تو اس بات کو بیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ جمیلہ آج بھی زندہ تھی اور اس نے شادی نہیں کی تھی۔

زرینہ کی بات سن کر دراز گل ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پرانی یادوں کے کتنے ہی سائے اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے اور گزر گئے۔ اسے اپنا دوست رسول خان یاد آ گیا۔ جو جمیلہ کے منگیتر کی موت کے بعد جمیلہ سے شادی کرنے کا بہت زیادہ خواہاں تھا اور اس نے اور اس کے گھر والوں نے بہت کوشش کی تھی کہ جمیلہ کسی طرح سے راضی ہو جائے لیکن جمیلہ راضی نہیں ہوئی تھی اور رسول خان کے دل میں آتش شوق اور بھی زیادہ ہوتی رہی تھی۔ پھر جب تمام تر کوششوں کے باوجود بھی جمیلہ راضی نہیں ہوئی تو رسول خان دل برداشتہ ہو کر گاؤں سے ہی چلا گیا تھا اور اس کے بعد وہ یہاں کبھی بھی دوبارہ واپس نہیں آ سکا تھا۔ گاؤں سے وہ کراچی چلا گیا تھا اور پھر چند سال کراچی میں رہنے کے بعد وہ دوبئی چلا گیا تھا جہاں سے اس نے کافی رقم اپنے گھر والوں کو بھیجی تھی اور پھر وہ دوبئی میں ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ اس کمپنی کے مالکوں کی جانب سے جس میں رسول خان کام کرتا تھا' رسول خان کے لواحقین کو اتنی بھاری رقم معاوضے کے طور پر دی گئی تھی کہ بابر خیل اور ڈیرہ امین گل میں کسی بھی شخص نے اتنی بڑی رقم کبھی ایک ساتھ نہیں دیکھی تھی۔ رسول خان خود تو مر گیا تھا مگر اپنے گھر والوں کو مالا مال کر گیا تھا۔ وہ لوگ اس دشوار گزار پہاڑی علاقے کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور انہوں نے یہاں سے بہت دور کوہاٹ کے پاس کہیں کوئی جائیداد خرید لی تھی اور اب وہیں رہتے تھے۔

"بات سے بات پیدا ہو جاتی ہے۔" دراز گل دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ "کتنے واقعات ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کا پورا رخ ہی موڑ دیتے ہیں اور انسان حالات کے دھارے میں بہتا بہتا کہاں پہنچ جاتا ہے اور اگر یہ واقعات رونما نہ ہوں تو انسان کی زندگی کا رخ کچھ اور ہو۔ اپنے منگیتر کے عشق نے جمیلہ کو زندگی کی ہر خوشی سے محروم کر دیا اور وہ تارک الدنیا ہو کر رہ گئی اور جمیلہ کی محبت نے رسول خان کو اس کے وطن سے ہزاروں میل دور سمندر پار' دوبئی میں لا پھینکا۔ جہاں المناک موت اس کے انتظار میں منہ پھاڑے کھڑی تھی۔"

اچانک دراز گل کو محسوس ہوا کہ اس کے اردگرد سناٹا اور بھی زیادہ گہرا اور بہت پُراسرار ہو گیا ہے۔ وہ اپنے خیالات سے ایک دم چونک پڑا۔ زرینہ ان کے سامنے موجود تھی اور اس کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ دراز گل پھر جلدی سے اپنی دنیا میں واپس آ گیا۔

"کیا میں جمیلہ پھوپھی کی طرح نہیں رہ سکتی؟" زرینہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہی تھی۔ "آخر وہ بھی تو بغیر شادی کے زندہ ہیں۔ ٹھیک ہے' میں بھی اس طرح رہ لوں گی۔"

اس کے جواب میں دراز گل بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ وہ زرینہ سے کہہ سکتا تھا کہ اس کا معاملہ جمیلہ کے معاملے سے بہت مختلف ہے۔ جمیلہ نے کسی دشمن خاندان کے لڑکے سے محبت نہیں کی تھی۔ اس کی شادی تو اس کے والدین نے بچپن میں طے کر دی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ان کی اس باہمی پسند میں ان کے والدین کی خوشی اور رضامندی بھی پوری طرح شامل تھی اور ان کی محبت کو دونوں خاندانوں کے بزرگوں کی طرف سے مکمل تحفظ حاصل تھا۔ جبکہ زرینہ اور خیر زماں کے معاملے میں تو سب کچھ بالکل ہی مختلف بلکہ متضاد تھا لیکن فی الحال اس نے زرینہ کو یہ سب کچھ سمجھانا مناسب اور ضروری نہیں جانا۔ "وقت آنے پر وہ سب کچھ خود ہی اچھی طرح سمجھ لے گی۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"میں کل تمہارے گھر آؤں گا۔" اس نے آہستہ سے زرینہ سے کہا۔ "اور تمہارے والد سے بات کروں گا۔ مجھے امید نہیں ہے کہ وہ میری بات مان لیں گے۔ پھر بھی میں ان کو سمجھانے اور راضی کرنے کی کوشش کروں گا لیکن اگر وہ راضی نہیں ہوئے تو پھر

تم خیر زماں کو ہمیشہ کے لئے بھول جانا اور اپنے لئے اور اس کے لئے مصیبت نہ کھڑی کرنا۔ تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ تمہارے والدین کی جانب سے انکار کی صورت میں اس سارے معاملے کو ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانا چاہئے ورنہ اس کا انجام بہت خراب ہو گا۔"

زرینہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور وہ اپنی چادر کے کونے سے اپنی بھیگتی ہوئی آنکھوں کو پونچھنے لگی۔

"میں اب چلتا ہوں۔" دراز گل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو اچھی طرح اپنے دماغ میں رکھنا۔"

دراز گل چٹان کے نیچے سے نکل آیا اور واپس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس نے کہنے کو تو بہت کچھ زرینہ سے کہہ دیا تھا لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی باتوں کا زرینہ پر کوئی اثر ہوا ہے۔ وہ تو جمیلہ کے انداز کی زندگی گزارنے کی سوچ رہی تھی۔

اگلے روز دراز گل، شمروز خان سے ملاقات کے لئے اس کے گھر پہنچا اور شمروز خان، دراز گل کو اپنے دروازے پر پا کر سخت حیران ہوا۔

بخت خان کا خاندان الگ تھا اور بخت خان کے سالے دراز گل کا خاندان الگ تھا۔

شمروز خان کی دشمنی بخت خان کے خاندان سے تھی۔ دراز گل کے خاندان سے نہیں تھی لیکن پھر بھی بخت خان اور دراز گل کے خاندان ایک دوسرے سے کوئی اتنا زیادہ الگ تو نہیں تھے۔ آخر دراز گل کی بہن بخت خان کی بیوی تھی۔ چنانچہ شمروز خان اور دراز گل کے خاندان کے درمیان بھی تعلقات خوشگوار نہیں تھے لیکن ان دونوں نے ایک دوسرے کے آدمیوں کو ہلاک کبھی نہیں کیا تھا۔ تاہم ان لوگوں کا آپس میں ملنا جلنا بالکل نہیں تھا اور شمروز خان کے لئے دراز گل کی اس کے گھر پر آمد بلاشبہ ایک حیران کن واقعہ تھی۔

اس نے گھر آئے ہوئے مہمان کا خیر مقدم کیا اور اسے عزت کے ساتھ بٹھایا اور اس سے خیر خیریت پوچھنے لگا لیکن اس کی آنکھوں میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔ "کیوں آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟" لیکن گھر آئے ہوئے مہمان سے فوری طور پر سوال پوچھنا کہ وہ کیوں آیا ہے، ایک مناسب بات نہیں تھی۔ ظاہر تھا کہ کوئی ایسی بڑی خاص مجبوری ہی ہو گی جو بخت خان کے سالے کو شمروز خان کے دروازے تک لے آئی تھی۔

لیکن دراز گل نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔ دراز گل مزاجاً بلا کسی لمبی

چوڑی تمہید کے بات شروع کرنے کا عادی تھا۔ تاہم، یہاں اس معاملے میں تو اسے بہرحال تھوڑی بہت تمہید باندھنی تھی۔

"شمروز خان! ہمارے بزرگوں نے جو دشمنی کی فصل بوئی تھی اسے ہم آج تک کاٹتے چلے آ رہے ہیں اور نہ جانے کب تک اسی طرح کاٹتے رہیں گے۔" دراز گل نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "مگر شاید ہمارے بچے اب اس فصل کو نہیں کاٹنا چاہتے۔ وہ اس کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت کا نہیں، ایک دوسرے سے محبت کا رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں۔"

شمروز خان کی پیشانی پر بہت سارے بل پڑ گئے اور اس کے چہرے پر ایک تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

"تم .... کیا کہنا چاہتے ہو دراز گل!" اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ دراز گل کو گھورتے ہوئے کہا۔ "صاف صاف بات کرو۔ کیا کہنے کے لئے آئے ہو؟"

"شمروز خان!" دراز گل نے سنبھل کر اور آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "میری بات سن کر غصے میں مت آ جانا۔ بلکہ ایک شفیق اور مہربان باپ کی حیثیت سے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔ بخت خان کا بڑا بیٹا، میرا بھانجا، خیر زماں اور تمہاری بڑی بیٹی زرینہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور کسی کو پسند کرنا کوئی جرم نہیں ہے، شمروز خان! میں تمہارے پاس تمہاری بیٹی کے لئے اپنے بھانجے کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے آگے جھولی پھیلا رہا ہوں شمروز خان!" اور اس کے ساتھ ہی دراز گل نے اپنی قمیض کا دامن شمروز خان کے سامنے پھیلا دیا۔

"دراز گل!" شمروز خان ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم کچھ اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟"

"میں نے پہلے ہی تم سے کہہ دیا تھا شمروز خان کہ میری بات سن کر تم غصے میں مت آ جانا۔" دراز گل نے بڑی نرمی اور آہستگی کے ساتھ کہا۔ "اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آخر ہر باپ اپنی بیٹی کی شادی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں تو کرتا ہی ہے۔ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں شمروز خان! انہیں ایک نہ ایک دن والدین کے گھر سے رخصت ہونا ہوتا ہے۔ میں اپنے بھانجے کے لئے تمہاری بیٹی کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں .... میں.........."

"دراز گل!" غصے کے عالم میں شمروز خان کی آواز کانپ رہی تھی۔ "چپ ہو جاؤ خدا کے واسطے' اگر تم میرے مہمان نہ ہوتے تو میں تم کو اس گستاخی کا ایسا مزہ چکھاتا کہ تم زندگی بھر یاد رکھتے۔ تم کو شاید اس بات کا احساس ہی نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"مجھے بخوبی احساس ہے شمروز خان کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" دراز گل نے جواب دیا۔ "میں خود بھی بال بچے دار آدمی ہوں۔ میں بھی بیٹی کا باپ ہوں اور بیٹے کا بھی۔ میں جانتا ہوں کہ اولاد کی خوشی کیا چیز ہوتی ہے اور اولاد کی خوشی کو پورا کرنے کے لئے والدین کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ آخر اولاد سے بڑھ کر والدین کے لئے اور کیا ہے؟"

"نہیں دراز گل نہیں۔" شمروز خان نے قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا لیکن اس کے لہجے کی تلخی اور ناگواری میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ "اس خیال کو اپنے دل سے ہمیشہ کے لئے نکال دو۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمارے اور بخت خان کے خاندان کے درمیان تو خون کے دریا حائل ہیں۔ ان دریاؤں کو کوئی عبور نہیں کر سکتا۔"

"صدق دل سے کوشش کی جائے شمروز خان تو ہر دریا کو عبور کیا جا سکتا ہے۔" دراز گل نے آہستہ سے کہا۔ "اگر تم اتفاق کرو تو میں بخت خان اور اس کی بیوی کو یہاں لے کر آؤں گا۔ وہ لوگ خود اپنی زبان سے تمہاری بیٹی کا رشتہ مانگیں گے۔"

"ابھی تو میرے چچا راحت خان کے خون کا قرض ہمارے اوپر باقی ہے۔" شمروز خان نے کہا۔ "راحت خان کے خون کا بدلہ تو ہمیں ابھی لینا ہے اور تم رشتے کی بات کرتے ہو؟"

"اس معاملے کو بھی طے کیا جا سکتا ہے شمروز خان!" دراز گل نے نرمی سے کہا۔ "راحت خان کے قتل کے بدلے میں خون بہا کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔"

"نہیں دراز گل نہیں۔" شمروز خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سختی کے ساتھ کہا۔ "ایسی بات مت کرو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ راحت خان کا خون ہمارے اوپر ادھار ہے۔ اس کا ادھار ہم ضرور چکائیں گے۔"

"بدلے کی بات مت کرو شمروز خان' میرے بھائی۔" دراز گل نے عاجزانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "کتنا خون اور بہے گا؟ اور اس سے کیا فائدہ ہو گا؟ ذرا سوچو۔ اگر تم یہ رشتہ قبول کر لیتے ہو تو دونوں خاندانوں کے درمیان نئے تعلقات کی بنیاد قائم ہو جائے گی اور ہمارے بچوں کی خوشی............"

"نہیں چاہئے مجھے ایسی خوشی اور نہیں چاہئے مجھے تعلقات کی ایسی نئی بنیاد۔" شمروز خان نے بپھر کر کہا۔ "میں اس بارے میں مزید کچھ کہنا سننا نہیں چاہتا۔ اب تم اپنی زبان بند کر دو اور اس قصے کو یہیں ختم سمجھو۔"

"فیصلہ کرنے میں جلدی مت کرو شمروز خان!" دراز گل نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں لیکن تم اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ زرینہ کی ماں سے بھی مشورہ کرو۔"

"مجھے کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" شمروز خان نے گرج کر کہا۔ "جو کچھ میں نے تم سے کہہ دیا ہے وہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔"

"میں تم سے پھر رابطہ قائم کروں گا شمروز خان!" دراز گل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم اس وقت غصے میں ہو۔ جب تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تب غیر جذباتی انداز میں میری بات پر غور کرنا اور زرینہ کی ماں سے ضرور مشورہ کرنا۔"

شمروز خان اس کو کڑی نظروں سے گھورتا رہا اور اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دراز گل وہاں سے چلا آیا۔

شمروز خان کا رویہ دراز گل کے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ اس کو پہلے سے اس بات کا اندازہ تھا کہ شمروز خان اس بات کے لئے تیار نہیں ہو گا کہ اپنی بیٹی کی شادی دشمن کے خاندان میں کر دے۔ وہ شمروز خان کے پاس کوئی لمبی چوڑی امیدیں لے کر نہیں آیا تھا۔ وہ تو اس لئے آیا تھا کہ یہ اس کے عزیز بھانجے کا اصرار تھا اور وہ اپنے بھانجے کو عملی طور پر یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ قطعی طور پر ناممکن تھا۔

"کیا خبر لائے ہیں آپ ماما!" اس نے جلدی سے اپنے ماموں سے سوال کیا لیکن شاید جواب سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ جواب تو اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ نہیں مانے گا۔" دراز گل نے قدرے ناراضگی کے ساتھ کہا۔ "میں وہاں محض تمہاری ضد کی وجہ سے گیا تھا ورنہ مجھے تو معلوم تھا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔"

"تو............ تو کیا شمروز خان نے بالکل ہی صاف انکار کر دیا؟" اس نے تھکی ہوئی شکستہ آواز میں پوچھا۔

"ہاں۔" دراز گل نے جواب دیا۔ "وہ تو اس بارے میں کچھ سننے کے لئے تیار ہی

نہیں ہے۔ اس نے قطعی صاف طور سے منع کر دیا ہے اور اس سے مزید کوئی بات کرنا بے کار ہے۔"

"اور .... اگر بابا خود اس کے پاس جائیں تو؟" خیر زماں نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" دراز گل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں دونوں ہی باتوں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نہیں جانتا کہ بخت خان اس کے پاس جانے کے لئے تیار ہو گا یا نہیں اور اگر وہ وہاں جانے کے لئے تیار ہو بھی گیا تو پھر شمروز کا رویہ کیا ہو گا۔ میرے لئے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ویسے موجودہ حالات میں بخت خان کے لئے وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ شمروز خان، راحت خان کا بدلہ لینے کے لئے بے چین اور تیار ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بات چیت میں تیزی، تلخی اور ترشی کے نتیجے میں فریقین کے درمیان ہتھیاروں کی جنگ بھی شروع ہو جائے اور کسی ایک آدھ شخص کی جان چلی جائے۔"

"لیکن ماما! کیا اب ہم خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے؟" خیر زماں نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "کیا شمروز خان کو راضی کرنے کی کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی؟ جبکہ زرینہ تو پوری طرح سے راضی ہے اور.........."

"کس قدر بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو تم۔" دراز گل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "زرینہ کے راضی ہونے یا نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ کیا آخری فیصلہ زرینہ کے ہاتھ میں ہے۔ نہیں احمق نہیں۔ آخری فیصلہ تو زرینہ کے باپ شمروز خان کے ہاتھ میں ہے۔"

اس کے بعد دراز گل نے اپنی بہن اور بہنوئی سے بات کی اور ان کو شمروز خان کے ساتھ ہونے والی بات چیت سے آگاہ کیا۔ ان لوگوں کے لئے بھی یہ سب کچھ غیر متوقع نہیں تھا۔

"میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔" بخت خان نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "وہ نہیں مانے گا اور وہ کیوں مانتا؟ وہ بھلا دشمن کے گھر میں اپنی بیٹی کیوں دیتا؟"

"اس سے پہلے میں نے زرینہ سے بھی بات کی تھی۔" دراز گل نے ان لوگوں سے کہا۔ "اور زرینہ کا کہنا یہ ہے کہ اگر اس کی شادی ہو گی تو صرف خیر زماں سے ورنہ وہ شادی ہی نہیں کرے گی اور جمیلہ کی طرح ساری عمر کنواری رہے گی۔"

"جمیلہ کی طرح..........!" گل بی بی نے ایک دم چونک کر کہا۔ آس پاس کے علاقوں میں بھلا کون ایسا تھا جو جمیلہ کے قصے سے واقف نہ ہو۔ "مگر جمیلہ کے منگیتر کی تو

موت واقع ہو گئی تھی اور .... وہ بات تو بالکل دوسری تھی۔"

"فی الحال یہ باتیں ان دونوں نوجوانوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔" دراز گل نے کہا۔ "وہ ایک دوسرے پر مر مٹنے کے لئے تیار ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ شمروز خان کو اپنی ضد کا کہیں کوئی خطرناک خمیازہ نہ بھگتنا پڑے۔"

"بھگتنا ہے تو بھگتے۔" بخت خان نے بگڑ کر کہا۔ "ہماری بلا سے، ہم کیا کریں؟"

"نہیں بخت خان!" دراز گل نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہو گا۔ تم اس بات کو صرف یکطرفہ طور پر کیوں لے رہے ہو؟ اگر زرینہ کے ساتھ کوئی زیادتی ہو گئی تو اس کے اثر سے تمہارا بیٹا بھی تو محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ تم یہ بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

"بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" گل بی بی نے اپنے بھائی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اپنے بیٹے کے بارے میں تو بہرحال سوچنا ہے۔"

"تو پھر کیا کریں ہم؟" بخت خان کے تیور ابھی بھی بگڑے ہوئے تھے۔ "ہم شمروز خان کی بیٹی کو زبردستی تو اٹھا کر نہیں لا سکتے اپنے گھر۔"

"ہمیں اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنی ہیں۔" دراز گل نے آہستہ سے کہا۔ "ہم نے تو اپنی اپنی زندگیوں کا بہترین وقت گزار لیا ہے۔ اب تو ان بچوں کو زندگی گزارنی ہے۔ ہمیں ان کی خوشیوں کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔"

وہ کچھ دیر تک رکا اور اپنی بہن اور بہنوئی کے چہروں کو بغور دیکھتا رہا۔ ان دونوں کے چہروں پر تشویش اور تفکر کے آثار نظر آ رہے تھے۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔" دراز گل نے آہستہ سے کہا اور وہ دونوں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا تجویز ہے؟" بخت خان نے جلدی سے پوچھا۔

"تمہارا تو وہاں جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔" دراز گل نے کہا۔ "ان لوگوں نے ابھی راحت خان کے قتل کا بدلہ نہیں لیا ہے۔ وہ معاملہ ابھی باقی ہے اور ان حالات میں تم کو وہاں نہیں جانا چاہئے لیکن کچھ اور لوگ جا سکتے ہیں اور شمروز خان سے بات کر سکتے ہیں۔"

"اور لوگ؟" بخت خان نے ماتھے پر بل ڈال کر اس کی طرف دیکھا۔ "اور لوگ کون؟"

"ہمارے قبیلے کے کوئی بھی بزرگ۔" دراز گل نے کہا۔ "مثال کے طور پر افضل خان اور جہاں زیب۔" اس نے قبیلے کے دو معتبرین کا نام لیا۔ "ان سے بات کی جا سکتی ہے۔ وہ دونوں محترم بزرگ ہیں۔ اگر وہ شمروز خان کے پاس جانے کے لئے تیار ہوں' پوری رازداری کے ساتھ' تاکہ یہ بات ابھی دوسروں تک نہ پہنچے اور شمروز خان کو اپنی بدنامی کا ملال نہ ہو' تو میں ان دونوں کے ساتھ ایک بار پھر شمروز خان کے پاس جانے کے لئے تیار ہوں۔"

"میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ دونوں اس کے لئے تیار ہوں گے یا نہیں۔" بخت خان نے کہا۔

"تم ان سے بات کر کے تو دیکھو۔" دراز گل نے اصرار کیا۔ "تم کو خود ہی ان سے بات کرنا چاہئے کیونکہ تم خیر زماں کے باپ ہو۔ اس حیثیت میں صرف تم ہی ان سے بات کر سکتے ہو۔"

"اگر تم ایسا کہتے ہو تو یہ بھی کر کے دیکھ لیں گے۔" بخت خان نے کہا۔ دراصل وہ موجودہ صورت حال سے سخت پریشان تھا۔ خیز زماں جس عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا اور جس عذاب میں اس نے اپنے سارے گھر والوں کو مبتلا کر دیا تھا اس سے چھٹکارے کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنی تھی۔ بخت خان نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس حد تک تو تیار کر لیا تھا کہ وہ شمروز خان کی بیٹی کو اپنی بہو کے طور پر قبول کر سکتا تھا اور اس کو اس حد تک لانے کا سہرا دراز گل کے سر تھا۔ جس نے بڑی دانشمندی کے ساتھ اس کو اس سارے معاملے کی اونچ نیچ سمجھائی تھی لیکن صرف اس کی ہی رضامندی تو کافی نہیں تھی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ شمروز خان بھی اس کے لئے تیار ہو جس کے کوئی آثار فی الحال نظر نہیں آتے تھے۔ تاہم' اس نے دراز گل کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ کچھ بزرگوں کو شمروز خان کے پاس بھیجا جائے۔

چنانچہ بخت خان اور دراز گل دونوں قبیلے کے ان دو معتبرین کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ وہ خیر زماں کے لئے شمروزخان کی بیٹی کا ہاتھ مانگنا چاہتے ہیں لیکن شمروز خان اس کے لئے تیار نہیں ہے اور اس نے اس رشتے سے انکار کر دیا ہے۔ جبکہ اس کے نتیجے میں دونوں خاندانوں کے درمیان صدیوں پرانی دشمنی بھی ختم ہو سکتی ہے۔ بخت خان اور دراز گل نے ان دونوں معتبرین سے اس معاملے میں مدد کی درخواست کی اور وہ دونوں

اس کے لئے تیار ہو گئے۔ ان دونوں سے زیادہ تر بات چیت تو خود دراز گل نے کی تھی اور اس نے ان کو محض اشارتاً یہ بات بتا دی تھی کہ زرینہ اور خیر زماں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں گے۔

اس کے چند روز کے بعد ہی دراز گل' افضل خان اور جہاں زیب کو ساتھ لے کر شمروز خان کے گھر بابر خیل پہنچا۔ شمروز خان ان لوگوں کو دیکھ کر اگرچہ حیران ہوا لیکن وہ پہلے ہی ان لوگوں کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ دراز گل کی ان لوگوں کے ساتھ موجودگی صاف بتا رہی تھی کہ وہ لوگ کس غرض سے آئے ہیں۔

افضل خان اور جہاں زیب نے بخت خان کی طرف سے اس کے بیٹے خیر زماں کا پیغام شمروز خان کی بیٹی زرینہ کے لئے دیا اور اس کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح سے دونوں خاندانوں کے درمیان صدیوں پرانی دشمنی ختم ہو جائے گی لیکن شمروز خان نے یہ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

دراز گل کو اگرچہ زیادہ امید تو پہلے بھی نہیں تھی۔ تاہم' وہ سوچ رہا تھا کہ شاید ان بزرگوں کی آمد اور ان کی گفتگو کے بعد اس کے رویے میں کچھ لچک پیدا ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شمروز خان اسی طرح اپنی بات پر اڑا رہا اور اس کے اس رویے سے دراز گل کو بہت افسوس ہوا۔

"تم ٹھنڈے دل سے ایک بار پھر غور کر لو شمروز خان!" اس نے کہا۔ "اور شاید اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔"

"میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے دراز گل!" شمروز خان نے خاصے کڑوے لہجے میں کہا۔ "میں اس معاملے میں اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"جیسی تمہاری مرضی شمروز خان!" افضل خان نے کہا۔ "ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ یہ معاملہ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہو جائے گا۔ اگر خیر زماں اور زرینہ کی شادی ہو جاتی تو دونوں خاندان ایک دوسرے کے قریب آ سکتے تھے اور دشمنی دوستی میں بدل سکتی تھی۔ بخت خان نے ایک اچھا قدم اٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن اب اگر تم کو یہ سب کچھ منظور نہیں ہے تو پھر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہاری مرضی۔"

"میری اپنی مجبوری ہے افضل خان!" شمروز خان نے جواب دیا۔ "میں اپنی بیٹی اپنے دشمن کے گھر میں نہیں دے سکتا۔"

وہ لوگ وہاں سے بے نیل و مرام واپس آ گئے اور اب یہ قصہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ شمروز خان نے اپنی بیٹی کے لئے بخت خان کے بیٹے کا رشتہ قبول کرنے سے صاف اور حتمی انکار کر دیا تھا اور کسی کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ زرینہ اس کی بیٹی تھی اور اس کو اختیار حاصل تھا کہ اس کے بارے میں جو فیصلہ چاہے کر لے یہی دستور تھا' یہی طریقہ تھا۔ آج تک یہی ہوتا چلا آیا تھا اور تمام لوگوں کے دل و دماغ اس کے مکمل طور پر عادی تھے۔

دراز گل نے خیر زماں کو ساری بات پوری تفصیل کے ساتھ بتا دی اور اس کو مشورہ دیا کہ وہ حالات سے سمجھوتہ کر لے اور زرینہ کے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔

"انسان اپنی زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔" دراز گل نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "لیکن ضروری نہیں کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ سب کچھ اس کو مل ہی جائے اور جو کچھ انسان کو اس کی کوشش کے باوجود نہ مل سکے اس پر اس کو صبر کر لینا چاہیئے۔"

لیکن دراز گل کے یہ الفاظ خیر زماں کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ اسے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ زندگی کی ہی بازی ہار گیا ہے۔ اس کے درد و غم کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ زرینہ کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور ہی اس کے لئے بڑا دردناک تھا۔ مگر وہ کیا کرے' جذبوں کی سرکشی اسے بہت کچھ کرنے پر اکسا رہی تھی۔

"میری مانو تو کچھ دنوں کے لئے میرے ساتھ کراچی چلے چلو۔" دراز گل نے اس سے کہا۔ "تمہارے والدین سے میں اجازت حاصل کر لوں گا۔ تم تو آج تک گاؤں سے باہر ہی نہیں نکلے ہو۔ بس زیادہ سے زیادہ قریبی شہر تک گئے ہو۔ ذرا کراچی چل کر دیکھو کہ دنیا کیسی ہے۔ تم سب کے سب لوگ تو کنویں کے مینڈک بنے ہوئے ہو۔ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نکلتے ہی نہیں۔"

"آؤں گا ماما!" خیر زماں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کبھی آؤں گا' ضرور آؤں گا۔"

"میرے ساتھ ہی کیوں نہیں چلتے؟" دراز گل نے کہا۔ "میں بس اب اگلے چند روز میں کراچی واپس جانے والا ہوں۔ مجھے تو پہلے ہی چلا جانا چاہیئے تھا۔ برف باری کا موسم بھی اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر برف باری شروع ہو گئی اور میں یہاں پھنس گیا تو پھر تو

کئی مہینے تک پھنسا رہوں گا اور یہاں سے باہر نہیں نکل سکوں گا۔"

"ماما! آپ نے بتایا تھا کہ آپ کراچی میں پیر الٰہی بخش کالونی میں رہتے ہیں۔" خیر زماں نے سرسری انداز میں کہا۔ "یہ علاقہ کراچی میں کہاں ہے اور آپ کے مکان کا پتہ کیا ہے؟ میں نے تو کبھی آپ سے آپ کے مکان کا پتہ بھی نہیں پوچھا۔"

"میں کراچی میں پیر الٰہی بخش کالونی میں رہتا ہوں۔" دراز گل نے کہا۔ "اس کو پی آئی بی کالونی یا پیر کالونی بھی کہتے ہیں۔ یہ کراچی کی بڑی پرانی آبادی ہے جو 1947ء میں ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کے لئے بنائی گئی تھی اور ایک زمانے تک اس میں صرف مہاجرین کی ہی آبادی تھی لیکن اب یہاں کے بہت سے مکانوں میں پٹھان اور پنجابی وغیرہ بھی رہتے ہیں۔ پیر کالونی کا علاقہ سبزی منڈی کے پیچھے ہے۔ اس لئے یہاں منڈی کے بھی تاجر وغیرہ کافی تعداد میں رہتے ہیں۔ انہوں نے یہاں مکانات خرید لئے ہیں اور بہت سے تو کرائے پر بھی رہتے ہیں۔ میں نے بھی وہاں ایک پرانا کوارٹر خریدا تھا اور پھر اس کو تڑوا کر نئے سرے سے بنوایا۔ اب وہ ایک کافی اچھا اور بڑا مکان ہے۔ میں نے اس کی اوپر کی منزل بھی بنوا لی ہے۔ آخر بچوں کے لئے بھی تو جگہ چاہیئے۔ میں تو جب بھی یہاں آتا ہوں' تمہارے والدین سے کہتا ہوں کہ وہ کچھ دنوں کے لئے کراچی چلیں لیکن تم لوگ تو یہاں سے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔"

"میں کبھی کراچی آؤں گا ماما!" خیر زماں نے کہا۔ "وہاں اس محلے' پیر کالونی میں تمہارے مکان کی پہچان کیا ہے؟"

"ہر مکان کا ایک نمبر ہوتا ہے۔" دراز گل اس کو بتانے لگا۔ "مکان اپنے نمبروں سے پہچانے جاتے ہیں۔" اور پھر اس نے خیر زماں کو اپنے مکان کا نمبر بتا دیا۔ خیر زماں نے اسی وقت نمبر اپنے دل پر نقش کر لیا۔ اس وقت جو کچھ خیر زماں کے دل میں تھا اگر اس کا ذرا سا بھی اندازہ دراز گل کو ہوتا تو وہ بھولے سے بھی خیر زماں کو اپنے ساتھ کراچی چلنے کی دعوت نہ دیتا۔

خیر زماں کافی دیر تک دراز گل سے کراچی کے بارے میں باتیں کرتا رہا اور دراز گل اس کو کراچی کے بارے میں بتاتا رہا۔

"میرے ساتھ ہی کراچی چلے چلو۔" دراز گل نے ایک بار پھر اس سے کہا۔ "وہاں چل کر تم اپنا سارا دکھ بھول جاؤ گے۔"

"شہر بدل دینے سے دکھ تو دور نہیں ہو جاتے ماما!" خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔ "دکھ تو اپنی جگہ ہی رہتا ہے۔"

"فرق پڑتا ہے بیٹا! بہت فرق پڑتا ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "جب آدمی کے پاس سوچنے کے لئے' کرنے کے لئے بہت سی چیزیں ہوتی ہیں تو پھر دکھ کا احساس بھی کم ہو جاتا ہے۔"

"میں جب بھی کراچی آؤں گا ماما' ہمیشہ کے لئے ہی آؤں گا۔" خیر زماں نے دراز گل سے کہا۔ "بس پھر وہیں رہوں گا۔ اس بڑے سے شہر میں جس کے بارے میں تم کہتے ہو کہ وہاں کی راتیں بھی دن سے زیادہ بارونق ہوتی ہیں اور مجھے وہاں کام تو مل جائے گا نا ماما!"

"کام کی وہاں کوئی کمی نہیں ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "کام بہت ہے۔ اگر تم وہاں آ کر کام کرنا چاہو گے تو یہ بھی کوئی مشکل بات نہیں؟ تم ایک بار وہاں آؤ تو۔"

☆======☆======☆

زرینہ کے گھر میں جو کچھ ہوا تھا وہ اس سے پوری طرح واقف تھی۔

دراز گل نے جب اس سے ملاقات کر کے اس کو یہ بتایا تھا کہ وہ اس کے باپ سے بات کرنے کے لئے اس کے گھر آئے گا تو اس وقت سے اس پر ایک شدید ہیجانی و اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ اسے اس بات کی بہت زیادہ امید تو نہیں تھی کہ اس کا باپ دراز گل کی بات مان لے گا تاہم' آس کی ڈور کچھ نہ کچھ تو ضرور باقی تھی۔

لیکن اس کے باپ نے دراز گل کی پیشکش کو مسترد کر دیا اور دراز گل مایوس ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ دراز گل کے جانے کے بعد شمروز خان نے گھر کے اندر آ کر اپنی بیوی آمنہ کو ساری بات بتائی اور آمنہ یہ سب سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئی۔ اس نے غیظ و غضب کے عالم میں کہا کہ وہ زرینہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دے گی لیکن اسے دشمن کے گھر کی بہو بننے کی اجازت نہیں دے گی اور ساتھ ہی دونوں میاں بیوی نے اس کے گاؤں سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی۔ بکریوں کو باہر لے جانے کا کام اس کے بجائے اس کی چھوٹی بہن فیروزہ کے سپرد کر دیا گیا۔ اس مجوزہ رشتے کا جتنا مخالف شمروز خان تھا اس سے کہیں زیادہ مخالف شمروز خان کی بیوی آمنہ تھی اور اس کی ایک خاص وجہ بھی تھی۔ دونوں خاندانوں کی پرانی دشمنی میں مارا جانے والا آخری آدمی راحت خان' جو رشتے

میں شمروز خان کا چچا تھا آمنہ کو خاص طور سے عزیز تھا۔ آمنہ کے والدین بچپن میں ہی مر گئے تھے اور راحت خان اور اس کی بیوی نے ہی آمنہ کی پرورش کی تھی اور پھر شمروز خان کے ساتھ اس کی شادی کر دی تھی۔ آمنہ راحت خان اور اس کی بیوی کو اپنے باپ اور ماں کی جگہ سمجھتی تھی اور راحت خان کے قتل کا اسے ایسا ہی صدمہ ہوا تھا جیسے کسی بیٹی کو اپنے باپ کے قتل کا صدمہ ہونا چاہئے تھا اور اس نے راحت خان کے قاتلوں سے پوری شدت کے ساتھ نفرت کی تھی۔ یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات تھی ہی نہیں کہ راحت خان کے قاتل کون تھے۔ راحت خان کی ذاتی طور پر نہ کسی سے دشمنی تھی نہ کبھی کسی سے لڑائی ہوئی تھی۔ راحت خان کو کون قتل کر سکتا تھا؟ اسے صرف خاندانی دشمنی کی بنیاد پر ہی قتل کیا جا سکتا تھا اور خاندانی دشمنی تو صرف ایک ہی خاندان سے تھی' بخت خان کے خاندان سے۔

تو جس خاندان نے راحت خان کو قتل کیا ہو اس خاندان میں آمنہ اپنی بیٹی کو بہو بنا کر کس طرح بھیج سکتی تھی؟

جب بخت خان کی جانب سے افضل خان اور جہاں زیب اس سلسلے میں آئے اور ان کے ساتھ دراز گل بھی' تو بھی شمروز خان نے اس رشتے سے انکار کر دیا اور ان لوگوں کو ناکام واپس جانا پڑا۔ آمنہ غصے کے عالم میں کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گھر کے اندر چکر لگا رہی تھی۔ "اگر تُو نے ہمارے دشمن کے بیٹے کا نام بھی اپنی زبان سے لیا تو تیرے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دوں گی۔" اس نے زرینہ کو پیٹھ پر زور سے ایک دو تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "زندہ دفن کر دوں گی زمین میں .... یاد رکھنا۔"

زرینہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ اس کا دل خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ رہا تھا۔ اب تو یہ بات قطعی طور سے طے ہو چکی تھی کہ اس کی اور خیر زماں کی شادی نہیں ہو سکتی اس کے گھر میں کوئی بھی اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ لوگ اس کو قتل کر سکتے تھے۔ اس کا گوشت چیل کوؤں کو کھلا سکتے تھے لیکن خیر زماں کے ساتھ اس کی شادی نہیں کر سکتے تھے۔

تو کیا خیر زماں کے بغیر زندگی گزاری جا سکتی تھی؟

نوجوانی کا جنون عشق مصلحت اندیشی' ریاکاری' موقع پرستی سے پاک' سرکشی اور شوریدہ سر۔ کچھ کر گزرنے کی آرزو......... آخر جمیلہ پھوپھی بھی تو تھیں۔

گھر میں اگر کسی کو زرینہ کے ساتھ ہمدردی تھی تو وہ اس کی چھوٹی بہن فیروزہ تھی۔ جو اس کے راز سے اس کے غم سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ دونوں صرف آپس میں بہنیں نہیں تھیں بلکہ بچپن کی سہیلیاں بھی تھیں۔ ان کے اور کوئی بھائی بہن تو تھا نہیں۔ بس وہی دونوں تھیں اور ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں۔

زرینہ گھر کے اندر کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر روتی پھرتی۔ مزید عذاب تو یہ تھا کہ وہ کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی۔ باپ تو خیر زیادہ تر گھر کے بیرونی حصے میں یا گھر کے باہر رہتا تھا لیکن ماں تو سارا وقت گھر میں موجود رہتی تھی اور وہ اگر زرینہ کو آنسو بہاتے ہوئے دیکھ لیتی تو ایک دم بپھر جاتی۔ "کون مر گیا ہے تیرا؟ کس کا ماتم کر رہی ہے؟ کس کی موت پر آنسو بہا رہی ہے تُو؟ خبردار تُو نے رو رو کر گھر میں نیستی پھیلائی۔ ہاتھ پیر توڑ کے لنگڑا لولا کر کے کونے میں بٹھا دوں گی۔ پھر ساری عمر روتی رہنا جی بھر کے۔" آمنہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہوتیں اور اس کی باچھوں سے کف بہنے لگتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اس نابکار لڑکی کا گلا گھونٹ دے جو راحت خان کے قاتلوں کے گھر بہو بن کر جانے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی بھلا راحت خان کے قاتلوں کے ساتھ بھی رشتہ جوڑا جا سکتا تھا؟ کیا راحت خان کا خون اتنا سستا تھا کہ اس کو یوں آسانی کے ساتھ معاف کر دیا جاتا اور سارے معاملے کو درگزر کر دیا جاتا؟ زرینہ کو آنسو بہاتے دیکھ کر آمنہ کا غصہ اور بھی فزوں ہو جاتا۔

زرینہ کو اس بات کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ خیر زماں کی کیا حالت ہو گی اور اس کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ان دونوں نے ساری زندگی ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ ساتھ مرنے جینے کے وعدے کئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ خیر زماں کس قدر ٹوٹ کر اس سے محبت کرتا ہے تو پھر خیر زماں اس سے الگ کس طرح رہ سکتا تھا' وہ اس کے بغیر کس طرح جی سکتا تھا؟

"جینا بھی ساتھ ہے اور مرنا بھی ساتھ ہے۔" زرینہ اپنے آپ سے کہتی۔ "خیر زماں کے بغیر جینے میں بھلا کیا رکھا ہے؟ تو پھر کیوں نہ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤں؟ ساتھ ساتھ مرنے کے لئے؟ خیر زماں کے ساتھ ہی مر جانے کے لئے؟"

"شمروز خان کبھی نہیں مانے گا۔" خیر زماں درد کی شدت سے تڑپ کر سوچتا۔ "اس نے سب کی بات مسترد کر دی۔ ماما دراز گل کے ساتھ ہی افضل خان اور جہاں زیب جیسے

بزرگوں کی بات بھی مسترد کر دی۔ وہ کبھی نہیں مانے گا۔ کبھی نہیں مانے گا۔ وہ زرینہ کو گولی مار دے گا' مجھ کو گولی مار دے گا لیکن ہم دونوں کی شادی نہیں ہونے دے گا اور زرینہ کے بغیر زندہ رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ تو پھر جب مرنا ہی ٹھہرا تو زرینہ کے ساتھ ہی کیوں نہ مروں؟ مرنا ہے تو دونوں ساتھ ساتھ مریں۔ اگر ساتھ جی نہیں سکتے تو ساتھ ساتھ مر تو سکتے ہیں۔"

اور یوں وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر مرنے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ جذبات کی شوریدہ سری اور جنون عشق کی سرکشی انہیں انتہائی قدم اٹھانے کی طرف لے جا رہی تھی۔ دونوں کے درمیان اس روز کے بعد سے کوئی ربط نہیں ہوا تھا جس دن دراز گل نے زرینہ سے ملاقات کی تھی لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے سے الگ' ایک دوسرے کے دل کی الم انگیز اور درد آگیں کیفیت کو' ایک دوسرے کی مجبوری کو' ایک دوسرے کے حسرت آمیز اشتیاق کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب نہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے غم میں برابر کے شریک تھے۔

دراز گل کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔ ہر بار جب وہ یہاں گاؤں آتا تھا تو اپنی بہن اور بہنوئی سے کہتا تھا کہ وہ لوگ بچوں کو لے کر کبھی کراچی آئیں اور کچھ دن اس کے پاس ٹھہریں لیکن ان میں سے کسی کا بھی آج تک کراچی جانا نہیں ہوا تھا۔ خود دراز گل بھی اکثر دو دو سال تک گاؤں نہیں آتا تھا۔ سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ سب کی اپنی الگ زندگی تھی۔ اس بار بھی یہاں سے جاتے وقت دراز گل نے اپنی بہن اور بہنوئی کو کراچی آنے کی دعوت دی اور حسب سابق ان لوگوں نے یہی کہا کہ وہ کبھی آئیں گے۔ رسمی سی بات تھی۔ آئی گئی ہو گئی اور دراز گل کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔

دراز گل کے جانے کے بعد خیر زماں خود کو اور بھی زیادہ تنہا' اداس اور پریشان محسوس کرنے لگا۔ دراز گل اگرچہ عمر میں اس کے باپ کے برابر کا تھا لیکن اس کا رویہ اس کے ساتھ دوستانہ اور بے تکلفانہ تھا۔ وہ اپنے ماما دراز گل کے ساتھ ہر چیز کے بارے میں گفتگو کر سکتا تھا اور اس پر اعتماد بھی کر سکتا تھا۔ ماما دراز گل اس کا ہمدرد اور دوست تھا۔ وہ اس سے اپنے دل کی ہر بات کہہ سکتا تھا اور اب وہ یہاں سے چلا گیا تھا تو کوئی بھی ایسا شخص موجود نہیں تھا جس کے ساتھ وہ زرینہ کے بارے میں گفتگو کر سکے۔ کم از کم باتوں میں ہی اس کی یاد کو تازہ کر کے ایک غم انگیز احساسِ مسرت سے لطف اندوز ہو سکے۔ کوئی

بھی تو نہیں تھا۔ اس کے جو دونوں چھوٹے بھائی بہن تھے' نو روز خان اور نور جہاں' ان کے ساتھ اس کی ایسی بے تکلفی کبھی نہیں رہی تھی جیسی بے تکلفی زرینہ اور اس کی چھوٹی بہن فیروزہ میں تھی۔ خیر زماں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں سے اپنی داستان عشق کے بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتا تھا اور جہاں تک والدین کا تعلق تھا تو بھلا ان سے گفتگو کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا؟ لے دے کے ایک ماما دراز گل تھے جن کے ساتھ زرینہ کے بارے میں باتیں کر کے دل کے بوجھ کو کچھ ہلکا کیا جا سکتا تھا اور اب تو وہ بھی چلے گئے تھے۔

زرینہ اس کی ہر ہر سانس میں موجود ہونے کے باوجود اس سے بہت دور تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ زرینہ پر اس کے والدین نے باہر آنے جانے پر پابندی لگا دی ہو گی۔ کیونکہ زرینہ اس روز کے بعد سے جبکہ دراز گل نے اس سے بات کی تھی پھر اس کو کبھی دکھائی نہ دی۔ وہ اپنی بکریوں کے ساتھ اس جگہ ہر روز ہی جاتا تھا جہاں وہ دونوں ملا کرتے تھے اور اس کے علاوہ آس پاس کے دوسرے قریبی علاقوں میں بھی زرینہ کو تلاش کرتا پھرتا تھا لیکن زرینہ کہیں نہیں تھی۔ اس کی اداس نظریں چاروں طرف بھٹکتے بھٹکتے بے دم ہو جاتیں۔ زرینہ کے وجود سے خالی' اجاڑ' ویران اور بے مہر مناظر اس کی آنکھوں کو تھکا دیتے اور زرینہ اس کو کبھی دکھائی نہ دیتی اور زرینہ کے بغیر یہ ساری دنیا اس دنیا کی ہر چیز' کس قدر بے معنی' فضول' اکتا دینے والی اور ہر قسم کی کشش سے خالی تھی۔

زرینہ تو نہیں آئی۔ کیونکہ وہ نہیں آ سکتی تھی لیکن فیروزہ آ گئی اور فیروزہ درحقیقت زرینہ کی زبان بن کر آئی تھی۔

اس روز وہ ٹھیک اسی جگہ موجود تھا جہاں وہ زرینہ سے ملا کرتا تھا۔ اس موہوم سی پُر فریب امید میں کہ شاید زرینہ وہاں بھولے بھٹکے آ نکلے کہ اچانک اس کو کسی بکری کے ممیانے کی آواز سنائی دی۔ اس نے جلدی سے اس طرف دیکھا۔ چند بکریاں اس طرف آ رہی تھیں اور ان کے پیچھے کافی دور ایک دھندلا دھندلا سا نسوانی پیکر بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ نسوانی پیکر ابھی اتنا دھندلا تھا کہ اس کے خدوخال واضح نہیں تھے اور اس سے کوئی مانوس یا نامانوس تصویر نہیں بنتی تھی۔

خیر زماں نے اپنی نظریں اس پیکر پر گاڑ دیں لیکن اس کی نظریں تو اس کے دماغ کی گرفت سے شاید بھاگی جا رہی تھیں اور اس پیکر کا صحیح طور سے احاطہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ زرینہ کا پیکر تو زرینہ کا پیکر تھا اور خیر زماں کتنی ہی دور سے اس کو پہچان سکتا تھا۔

دوسرے ہزاروں پیکروں کے درمیان۔

لیکن جیسے جیسے وہ پیکر نزدیک آتا گیا' ویسے ویسے خیر زماں کو اس بات کا اندازہ ہوتا گیا کہ اس کی نگاہوں اس کو دھوکا نہیں دے رہی تھیں۔ وہ پیکر زرینہ کا نہیں تھا۔ کس کا تھا؟ یہ بھی نہیں معلوم تھا' کیونکہ وہ ابھی بہت دور تھا۔

اور پھر اس نے اس کو پہچان لیا۔ وہ زرینہ کا نہیں' اس کی بہن فیروزہ کا پیکر تھا' جو اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ فیروزہ کو دیکھ کر اس کے جذبات میں ایک نئی ہلچل پیدا ہو گئی۔ فیروزہ کی آمد کے ساتھ ساتھ زرینہ کی خوشبو ساری فضا میں پھیل گئی تھی اور زرینہ کے پیکر کے حسین رنگ ہر طرف بکھر گئے تھے۔ فیروزہ' زرینہ کے پاس سے آ رہی تھی' زرینہ کی بہن۔

خیر زماں تیزی سے آگے بڑھ کر فیروزہ سے ملا۔ فیروزہ کا چہرہ تھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ تھی۔

خیر زماں نے بے تابی کے ساتھ' والہانہ انداز میں فیروزہ کا خیر مقدم کیا۔ نگاہوں کی اداسیوں نے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا اور پھر خیر زماں کو معلوم ہوا کہ فیروزہ تو زرینہ کی زبان بن کر اس کے پاس آئی ہے۔

جو کچھ فیروزہ نے اس سے کہا' اس کو سن کر خیر زماں کو اپنا سارا وجود کسی پھول کی طرح ہلکا لگنے لگا۔ موت زندگی سے بھی زیادہ پیاری لگنے لگی اور زندگی' محبت کی چند جیتی جاگتی ساعتوں کے مقابلے میں' بالکل حقیر اور بے مایہ دکھائی دینے لگی۔

اور خیر زماں نے فیروزہ کو اپنی زبان بنا کر زرینہ کے پاس بھیجا۔ فیروزہ دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ایک ایسی مسرت محسوس کر رہی تھی جس کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن جس کی قدر و قیمت اس کے لئے شاید دنیا کی ہر چیز سے زیادہ تھی۔

فیروزہ کے ذریعے پیغام سلام کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ایک دوسرے سے الگ رہ کر حرماں نصیبی کی زندگی گزارنے کے مقابلے میں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر مر جانا ہزار درجہ بہتر ہے۔ اگر زندگی میں یکجائی نہیں ملتی تو موت میں تو یکجائی مل جائے گی اور دلوں میں یہ حسرت تو نہ رہے گی کہ محبت کے بچاؤ کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔

"موسم تیزی سے بدل رہا ہے۔" اس روز فیروزہ نے خیر زماں سے کہا۔ "سردی بہت بڑھ چکی ہے اور کوئی دن جاتے ہیں کہ برف باری شروع ہو جائے گی۔ پھر راستے بند ہو جائیں گے اور کئی مہینے تک بند رہیں گے۔"

"ہاں فیروزہ!" خیر زماں نے کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ موسم بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا ہے اور.........."

"میں نہیں کہہ رہی ہوں خیر زماں!" فیروزہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "زرینہ کہہ رہی ہے اور خود موسم بھی کہہ رہا ہے۔ اب زیادہ انتظار نہیں کیا جا سکتا۔"

"نہیں، زیادہ انتظار کی ضرورت بھی نہیں۔" خیر زماں نے کہا۔ "مجھے جو ضروری کام کرنے تھے وہ میں کر چکا ہوں۔ تم زرینہ کو بتا دینا۔" اچانک اس کی آواز بہت ہلکی ہو گئی۔ سرگوشی اتنی ہلکی تھی کہ خود فیروزہ کو اپنا کان اس کے منہ کے کافی قریب لے جانے کی ضرورت تھی۔

☆======☆======☆

رات کا آخری پہر تھا اور وہ دونوں بڑی تیزی کے ساتھ، نیم تاریکی میں اونچے نیچے پہاڑی راستوں پر بڑی مہارت اور ہوشیاری کے ساتھ، قدم جماتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ چاندنی رات تھی اور آسمان پر روشن چاند، ہزارہا ستاروں کے جھرمٹ میں برف پوش پہاڑوں اور سرسبز وادیوں پر اپنا نرم سونا لٹا رہا تھا۔ فضا میں گہری خنکی تھی اور اس خنکی میں سونا کھلا ہوا تھا۔ سونا کھلی ہوئی اس خنکی میں، دور دور تک، ان دونوں کے علاوہ اور کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف وہ دونوں تھے اور ان کے چاروں طرف سناٹا تھا۔ ہُو کا عالم تھا۔ صرف کسی کسی وقت کسی جانور کے چلانے کی آواز بلند ہوتی، ذرا دیر تک پہاڑوں سے ٹکرا کر فضا میں گونجتی اور پھر خود بخود ختم ہو جاتی۔

زرینہ رات کے سناٹے میں چپکے سے اپنے گھر سے نکل کر آئی تھی اور فیروزہ اس کے ساتھ دروازے تک آئی تھی۔ دروازے پر آ کر دونوں بہنیں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئی تھیں اور دونوں نے بھیگی ہوئی آنکھوں اور ہلکی ہلکی سسکیوں کے درمیان ایک دوسرے کو پیار کیا تھا۔

زرینہ نے اپنے ساتھ اپنے پہنے کپڑوں کے چند جوڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں لیا

تھا۔ کوئی نقد رقم، کوئی زیور وغیرہ، اس نے نہیں لیا تھا۔ فیروزہ نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ کچھ رقم ساتھ لے لے۔ شاید ضرورت پڑ جائے لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ "میں یہاں سے کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی۔" اس نے اپنی بہن سے کہا تھا۔ "میں خالی ہاتھ جانا چاہتی ہوں۔ کل کو میرے والدین یہ نہ کہہ سکیں کہ میں ان کے گھر سے چوری کر کے بھاگی ہوں۔"

فیروزہ کو سب کچھ معلوم تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا، ہونے والا تھا، وہ سب فیروزہ کو معلوم تھا اور اگر فیروزہ موجود نہ ہوتی تو شاید یہ سب کچھ اتنی آسانی اور عمدگی کے ساتھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ فیروزہ نے ہی تو ڈور کے دونوں الگ الگ سروں کو آپس میں ایک کرنے کی کوشش کی تھی۔

زرینہ کو گھر سے رخصت کرنے کے بعد، فیروزہ کسی زندہ لاش کی طرح آ کر اپنے بستر پر گر پڑی تھی۔ اس کو ملال اس بات کا نہیں تھا کہ اس نے کوئی غلطی کی تھی۔ اس نے جو کچھ کیا تھا وہ اس کو غلطی نہیں سمجھ رہی تھی۔ غلطی تو وہ اس کو سمجھ رہی تھی جو اس کے والدین کر رہے تھے۔ آخر انسان اور باڑے میں بند بھیڑ بکری میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ یہ سبق اس نے بھی جمیلہ پھوپھی سے ہی سیکھا تھا۔ جو اس علاقے کی بہت سی عورتوں اور لڑکیوں کے لئے ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی اور جن کی بہت تعظیم بھی کی جاتی تھی۔

فیروزہ کو اصل فکر اس بات کی تھی کہ وہ دونوں بخیر و عافیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ پائیں۔ ان کے لئے یہ کام آسان نہیں تھا۔ ہر طرف نامعلوم خطروں کے آسیب منہ پھاڑے ان کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے اور کسی بھی لمحہ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ فیروزہ ان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

صبح کو گھر میں جو ایک بھیانک طوفان امنڈنے والا تھا، فیروزہ کو اس کا پورا پورا اندازہ تھا لیکن تب تک ان دونوں کو یہاں سے کافی دور نکل جانا چاہئے تھا۔ شمروز خان اور اس کے ساتھیوں کی بندوقوں کی مار سے کافی دور۔

اور خود فیروزہ کو اس طوفان کے دوران کیا کرنا تھا؟ اسے بھی رونے پیٹنے میں اپنی ماں کے ساتھ شریک ہو جانا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں زرینہ کو گالیاں اور کوسنے دے گی، اس کو بددعائیں دے گی۔ اس کے لئے خراب ترین الفاظ استعمال کرے گی لیکن وہ خود اپنی

ماں کی اس بدکلامی میں شریک نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ زرینہ کو بددعا نہیں دے سکتی تھی۔ اس کو آوارہ اور بدچلن قرار نہیں دے سکتی تھی۔

وہ اپنے بستر پر پڑی ہوئی خوف سے کانپتی رہی اور رات ڈھلتی رہی۔ وقت کے عظیم و وسیع و عریض سمندر سے جو ایک چلو پانی اس کے حصے میں آیا تھا' اس میں سے لمحوں کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک ٹپک کر خاک میں ملتی رہیں۔

زرینہ کا تو کوئی رازدار تھا بھی' لیکن خیر زماں کا کوئی رازدار نہیں تھا۔ وہ اس سارے معاملے کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھنے پر مجبور تھا۔ وہ نہ تو اپنے بھائی بہنوں کو اعتماد میں لے سکتا تھا اور نہ اپنے والدین سے یہ بات کہہ سکتا تھا۔ اس کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اگر اس نے یہ بات زبان سے بھی نکالی تو ایک قیامت برپا ہو جائے گی۔ اس کا باپ اس کو ہرگز ایسا نہیں کرنے دے گا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ کسی لڑکی کو لے کر غائب ہو جانا کوئی مذاق نہیں تھا۔ یہ اس علاقے کی روایات اور رسم و رواج کی روشنی میں بہت بڑا جرم تھا اور لڑکی کے لواحقین کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ اغوا کنندہ کو گولی مار دیں اور چونکہ اس صورت میں لڑکی کا پاک دامن رہنا مشکوک ہو جاتا تھا۔ اس لئے عام طور سے لڑکی کو بھی گولی مار دی جاتی تھی اور اگر بھاگنے میں لڑکی کی اپنی مرضی بھی شامل ہو تو پھر تو اس کو زندہ چھوڑنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ دونوں کی سزا موت تھی اور کون والدین ایسے تھے جو اپنے جوان بیٹے کی موت پر راضی ہو جاتے؟ موجودہ صورت میں تو موت سے کم بات ہو ہی نہیں سکتی تھی' کیونکہ شمروز خان کا خاندان تو ابھی بخت خان کے خاندان کا ایک قتل کا مقروض بھی تھا۔ راحت خان کے قتل کا حساب چکانا ابھی باقی تھا' تو خیر زماں کے قتل کی صورت میں وہ حساب بھی بڑی آسانی کے ساتھ چکایا جا سکتا تھا۔

اس لئے خیر زماں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ فیروزہ کے ذریعے اس کے اور زرینہ کے درمیان معاملات بالکل خاموشی کے ساتھ طے ہوتے رہے۔ یہاں سے ہمیشہ کے لئے نکل جانے کی تجویز دراصل زرینہ کی طرف سے ہی آئی تھی اور خیر زماں نے اس کو فوراً لبیک کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں کے درمیان ایک پورا منصوبہ تیار ہونے لگا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے دور تھے لیکن فیروزہ بیک وقت ان دونوں کی زبان بنی ہوئی تھی۔

خیر زماں نے بھی اپنے ساتھ زیادہ ساز و سامان اور کوئی زیادہ رقم نہیں لی تھی۔ زیادہ رقم تو وہ لے بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے کافی حساب کتاب لگا کر بس اپنی ضرورت بھر کی رقم لے لی تھی۔ وہ اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے لئے کوئی مالی مسئلہ نہیں کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ وہ جوان اور توانا' صحت مند آدمی تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ محنت مزدوری کر کے کما سکتا ہے اور اپنی اور اپنی بیوی کی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔

وہ مقررہ وقت پر اپنے گھر سے نکل کر خاموشی سے اپنے گاؤں کی سرحد کو عبور کر کے زرینہ کے گاؤں بابر خیل میں داخل ہو گیا تھا اور مقررہ جگہ پر جو زرینہ کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی' رک کر زرینہ کا انتظار کرنے لگا تھا۔

اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا اور زرینہ جلد ہی اسے دور سے آتی ہوئی نظر آ گئی تھی۔ وہ سنبھل گیا تھا اور اس آنے والے ہیولے کو غور سے دیکھنے لگا تھا۔ جو چند منٹ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ قریب پہنچنے پر اس نے دیکھ لیا کہ وہ زرینہ ہی تھی۔

"چلو۔" اس نے زرینہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ دونوں تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کی رفتار بہت تیز تھی اور وہ جلد از جلد گاؤں کی حدود سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ تمام راستے ان کے خوب اچھی طرح سے دیکھے بھالے تھے۔ یہ تو ان کا اپنا علاقہ تھا اور انہوں نے آنکھ کھول کر اپنے آپ کو یہیں پایا تھا۔ یہ ان کی اپنی زمین تھی' اپنی مٹی تھی۔ وہ اس زمین کے نشیب و فراز سے' اس مٹی کی خوشبو سے بخوبی واقف تھے۔

بہت دیر تک انہوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ بس ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے' خاموشی سے تیز تیز قدموں سے چلتے رہے۔

خیر زماں کے دائیں ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا' جسے وہ رات کے وقت کسی بھی جنگلی جانور کے حملے کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ ویسے اس علاقے میں ایسے خونخوار درندے کم ہی تھے جو انسان پر حملہ کر کے اس کو نقصان پہنچائیں اور جو ہوتے بھی تھے وہ انسان کی آہٹ پا کر بھاگ جاتے تھے۔ ان دونوں کا سفر خاموشی اور سکون کے ساتھ کٹ رہا تھا اور اب تک ان کے ساتھ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔ دونوں نے وحشت عشق کے عالم میں جو قدم اٹھا لیا تھا وہ انتہائی قدم تھا اور اس کا نہ کوئی مداوا تھا نہ تلافی۔ بس صبح ہونے کی دیر تھی' صبح ہوتے ہی جب ان دونوں کو اپنے اپنے گھروں سے غائب پایا جاتا تو پھر فوراً ہی یہ بات

سب کو معلوم ہو جاتی کہ بابر خیل کے شمروز خان کی بیٹی' ڈیرہ امین گل کے بخت خان کے بیٹے خیر زماں کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور بس' پھر اسی وقت وہ دونوں واجب القتل ہو جاتے۔ پھر دنیا میں کوئی طاقت ایسی موجود نہیں تھی جو زرینہ کی اس پاک دوستی کو' جس پر ابھی تک کوئی حرف نہیں آیا تھا' پاک دوستی ثابت کر سکتی۔ پھر تو سب کچھ ختم تھا' ہمیشہ کے لئے ختم۔ موت اور صرف موت۔ یہی ان دونوں کا مقدر تھا اور وہ دونوں اس بات سے اچھی طرح واقف تھے اور انہوں نے جان بوجھ کر اپنے لئے اس راستے کا انتخاب کیا تھا کیونکہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنے کو بالکل بے معنی اور ناقابل برداشت سمجھتے تھے۔

اگر مرنا ہی ٹھہرا تو پھر مرنے سے پہلے ایک بار جینے کی آخری جدوجہد کیوں نہ کر لی جائے' ایک بار سب کچھ داؤ پر لگا کر یہ بازی کھیل ہی کیوں نہ لی جائے۔

انہوں نے یہ بازی کھیل لی تھی اور اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ انہوں نے اپنی کشتیاں جلا دی تھیں۔ اب وہ صرف آگے ہی آگے جا سکتے تھے' وہاں ان کو چاہے موت ملتی یا زندگی' یہ ان کا نصیب تھا۔

اس وقت خوب سردی ہو رہی تھی۔ سردی' سناٹا اور چاندنی' تینوں چیزیں آپس میں گندھی ہوئی تھیں اور ایک طلسماتی فضا کی تشکیل کر رہی تھیں۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس سحر انگیز فضا سے بہت اچھی طرح لطف اندوز ہو سکتے تھے' لیکن اس وقت وہ موسم کے بارے میں صرف اتنا ہی سوچ سکتے تھے کہ سردی بہت ہے۔ چاندنی کے بارے میں صرف یہ سوچ سکتے تھے کہ اس کی وجہ سے ان کا سفر آسانی سے طے ہو رہا ہے اور سناٹے کے بارے میں صرف یہ کہہ سکتے تھے کہ بڑا بھیانک سناٹا ہے۔

"ہم نے یہ قدم بالکل بروقت اٹھایا ہے۔" بہت دیر کے بعد خیر زماں نے بڑی مدھم اور ہلکی آواز میں کہا۔ "بس دو چار دن کی بات ہے۔ برف باری شروع ہونے والی ہے۔ اس کے بعد تو ہم اپنے اپنے گاؤں سے نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ وہیں قید ہو کر رہ جاتے۔"

"ہاں۔" زرینہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سردی کا موسم تو ہم کو قید کر کے رکھ دیتا ہے۔ باہر کی دنیا ہمارے لئے ختم ہو جاتی ہے اور ہم باہر کی دنیا والوں کے لئے ختم ہو جاتے ہیں۔ کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔"

"اگلے موسم گرما تک تو نہ جانے کیا کچھ ہو جاتا۔" خیر زماں نے کہا۔ "کون جانے'

آنے والے وقت میں............"

"میں نے اماں کو بابا سے باتیں کرتے سنا تھا۔" زرینہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ میری شادی کی بات کر رہی تھیں۔ میرے رشتے داروں میں سے دو پیغام تو میرے لئے آئے ہوئے ہیں لیکن میرے والدین نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اماں بابا سے کہہ رہی تھیں کہ انہی دونوں میں سے کسی کے حق میں فیصلہ کر دیں اور اگلے موسم بہار میں میری شادی کر کے مجھے رخصت کر دیں۔ اگر میری صرف بات ہی پکی ہو جاتی تو پھر سب کچھ ہمارے لئے بہت مشکل ہو جاتا۔ میں کسی کی منگیتر بن جاتی اور پھر مجھے اسی کا ہو کر رہنا پڑتا۔"

"اس طرح زبردستی کسی کی منگیتر بنا دینے سے کیا ہوتا ہے؟" خیر زماں نے کہا۔
"جب تک نکاح نہ ہو جائے.......... شادی نہ ہو جائے.........."

"اس سے بھی بہت کچھ ہوتا ہے خیر زماں!" زرینہ نے اس سے کہا۔ "اگر میرے نام کے ساتھ کسی اور مرد کا نام لگا دیا جاتا تو یہ سب کچھ اتنا آسان نہ ہوتا۔"

"آسان تو یہ اب بھی نہیں ہے زرینہ!" خیر زماں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ جسے چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں زرینہ اس کے چہرے پر صاف طور سے دیکھ سکتی تھی۔ "ہم اپنا سب کچھ ختم کر کے یہاں سے نکلے ہیں۔ ہمارے سینے اس وقت ان کی گولیوں کی زد میں ہیں۔ اگر انہوں نے ہم کو دیکھ لیا' تلاش کر لیا' تو بس پھر.........."

"مت سوچو اس کے بارے میں۔" زرینہ نے سہم کر کہا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "صرف اس بارے میں سوچو کہ ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے' ہمیشہ اور کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ جب تک زندہ رہیں گے' ایک دوسرے کے ساتھ ہی زندہ رہیں گے۔"

وقت گزرتا جا رہا تھا' رات ڈھلتی جا رہی تھی اور فضا میں سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان دونوں میں سے کسی کو بھی رات کے اس حصے میں کمرے سے باہر نکل کر کھلی ہوئی راہوں پر چلنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ہوا کے جھونکوں کی یخ بستگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اگرچہ وہ دونوں گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے' پھر بھی سرد ہوا جیسے ان کی ہڈیوں کے اندر سرایت کرتی جا رہی تھی۔

"کوئی دن جاتے ہیں کہ ان راستوں پر کوئی قدم ہی نہیں رکھ سکے گا۔" کافی دیر کی

بوجھل اور اداس خاموشی کے بعد خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔ "برف باری شروع ہوتے ہی ہر چیز سفیدی کی موٹی چادر کے نیچے ڈھک جائے گی۔ پھر تو سفید برف کے علاوہ اور کچھ نظر بھی نہیں آئے گا۔"

"ہاں زرینہ!" خیر زماں نے کہا۔ "اور تب تک ہم ان شاء اللہ اپنے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے ہوں گے۔ وہاں تو اتنی سردی بھی نہیں ہو گی۔"

"تم نے سب کچھ ٹھیک سے معلوم تو کر لیا ہے نا خیر زماں!" زرینہ نے اس سے پوچھا۔

"جو کچھ بھی میں نے معلوم کیا ہے' وہ سب میں نے فیروزہ کے ذریعے تم کو بتا دیا ہے۔" خیر زماں نے آہستہ سے جواب دیا۔ "کوئی بھی ایسی بات نہیں،جو میں نے تم سے چھپائی ہو۔"

"اللہ مالک ہے۔" زرینہ نے دور آسمان کی بلندیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ چاند بہت دور افق کے ایک کنارے پر چلا گیا تھا اور لاکھوں تارے آسمان پر اس طرح جگمگا رہے تھے جیسے سیاہ زمین پر کسی نے لاتعداد چمکیلے موتی بکھیر دیئے ہوں۔

"خیر زماں!" کچھ دیر کے بعد زرینہ نے آہستہ سے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم لوگ زندہ ہیں۔ ہمارے سروں پر یہ تاروں بھرا آسمان ہے اور پیروں تلے یہ پتھر بھی' ناہموار' پہاڑی زمین اور دور تک پھیلا ہوا یہ سناٹا اور چاندنی اور کل جب ہم نہیں رہیں گے تو بھی آسمان پر ستارے اسی طرح چمکتے رہیں گے۔ یہ بے جان پتھر اور پہاڑ اسی طرح اپنی زبانیں بند کئے ہوئے' اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہیں گے اور رات کو سناٹا یوں ہی سنسنایا کرے گا؟ سب کچھ تو ایسا ہی رہے گا خیر زماں! بس یہی ہے نا کہ ہم نہیں ہوں گے۔"

"ابھی ذرا دیر پہلے تم مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں ایسی باتیں نہ کروں اور صرف زندگی کے بارے میں اور زندہ رہنے کے بارے میں سوچوں۔" خیر زماں نے آہستہ سے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور اب تم خود ایسی باتیں کر رہی ہو؟ مت سوچو ایسی باتوں کے بارے میں۔ دیکھو نا' دنیا میں جو بھی انسان پیدا ہوتا ہے' تو اس کو ایک نہ ایک دن تو مرنا ہوتا ہی ہے۔ کون ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا؟ سب لوگ مرجاتے ہیں' مگر دنیا ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ آسمان پر ستارے اسی طرح جگمگاتے رہتے ہیں اور پہاڑ اور پتھر اسی طرح خاموش

رہتے ہیں۔ مجھ جیسے' تم جیسے' کتنے ہی آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ تو پھر اس بات کا غم کیا؟"

"ہاں خیر زماں!" زرینہ نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "اس بات کا غم کیا؟ موت کا غم کیا؟ اگر زندگی ہے تو موت بھی ہے۔"

دونوں کے خیالات بہت الجھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک ایسا قدم اٹھالیا تھا جس کے خوفناک مضمرات سے وہ دونوں پوری طرح واقف تھے اور اب وہ خود کو بدترین صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر رہے تھے۔

صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی جب وہ قریب ترین شہر میں پہنچ گئے۔ کئی گھنٹے کا یہ طویل' پتھریلا' سنگلاخ اور دشوار گزار راستہ انہوں نے پیدل طے کر لیا تھا اور وہ بھی رات کے وقت اگرچہ وہ اس علاقے سے بخوبی واقف تھے۔ تاہم' رات کی نیم تاریکی میں یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ تیز رفتاری کے ساتھ چلتے ہوئے انہیں احتیاط کا بھی مظاہرہ کرنا تھا۔ ذرا سی غلطی سے ان دونوں میں سے کوئی کسی گہرے کھڈ میں گر کر زخمی بلکہ ہلاک بھی ہو سکتا تھا۔

ان دونوں کے گاؤں کے آس پاس بسوں کا کوئی اڈہ نہیں تھا۔ کوئی سڑک بھی ایسی نہیں تھی جس پر بسیں اور موٹر گاڑیاں وغیرہ چل سکیں اور ریلوے اسٹیشن کا تو اس بلند اور دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ قریب ترین شہر بھی' جو ایک چھوٹے سے قصبے سے زیادہ بڑا نہیں تھا' ان دونوں کے گاؤں سے کئی گھنٹوں کی دشوار گزار پیدل مسافت پر واقع تھا۔

اور اب وہ قریب ترین شہر کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں بسوں کا اڈہ واقع تھا۔ انہیں یہاں سے بس مل سکتی تھی۔ ابھی رات ختم نہیں ہوئی تھی۔ صبح کاذب کا وقت تھا۔ وہ دونوں بسوں کے اڈے کے پاس پہنچ گئے۔

وہاں اس وقت سناٹا پڑا ہوا تھا۔ کئی ٹرک وغیرہ کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے' لیکن کوئی شخص جاگتا ہوا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں ایک پیٹرول پمپ بھی تھا اور اس کے ساتھ کئی ایسے ہوٹل' جن میں چارپائیاں کرائے پر ملتی تھیں اور مسافروں کے علاوہ زیادہ تر تو ٹرکوں اور دوسری موٹر گاڑیوں کے ڈرائیور اور کلینر وغیرہ ان چارپائیوں کو استعمال کرتے تھے۔ ہوٹلوں میں لوگوں کے بیٹھنے کے لئے بھی چارپائیاں تھیں اور لکڑی کی بینچ بھی۔ باہر

خیل اور ڈیرہ امین گل کے علاوہ' آس پاس کے اور بھی بہت سے پہاڑی گاؤں کے لئے اسی قصبے کا بسوں کا یہ اڈہ باہر آمدورفت کا واحد وسیلہ تھا۔ لوگ یہیں سے زیادہ تر بسوں یا دوسری گاڑیوں میں بیٹھ کر باہر جاتے تھے اور جب اپنے گاؤں واپس آتے تھے تو بھی ان کو اسی اڈے پر اترنا پڑتا تھا۔ جہاں سے پھر وہ دشوار گزار پہاڑی علاقوں کا پیدل سفر کر کے اپنے گھروں کو پہنچتے تھے۔

وہ دونوں اپنی موٹی اور بھاری چادروں میں اچھی طرح سے لپٹے ہوئے تھے' اس طرح کہ انہوں نے اپنے چہروں کو بھی کافی حد تک چھپا لیا تھا۔ خیر زماں کے سر پر ایک اونی ٹوپی بھی تھی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ کچھ اور بھی زیادہ چھپ گیا تھا۔

بسوں کے اڈے پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ سناٹا اور نیم تاریکی' ان دونوں کے علاوہ وہاں اور کوئی جاگتا ہوا نہیں تھا۔ سامنے ہوٹلوں کے برآمدوں میں بہت سی چارپائیاں پڑی نظر آ رہی تھیں جن پر کمبل اور لحاف اوڑھے ہوئے لوگ سو رہے تھے۔ ابھی تو سردیاں باقاعدہ شروع نہیں ہوئی تھیں۔ سردیوں کے آغاز کے بعد سے تو رات کو اس طرح سے کھلے برآمدوں میں سونا ناممکن ہو جاتا تھا۔

"ابھی ذرا دیر میں پشاور جانے والی بس ہمیں مل جائے گی۔" خیر زماں نے آہستہ سے زرینہ سے کہا۔ "ہم اس میں بیٹھ کر پشاور روانہ ہو جائیں گے۔ ایک بار ہم یہاں سے سلامتی کے ساتھ نکل جائیں گے تو سمجھو کہ بہت بڑا کام ہو گیا۔"

صبح ہونے والی تھی اور صبح ہونے سے پہلے پہلے تو دونوں میں سے کسی کی بھی گمشدگی کا اس کے گھر والوں کو علم نہیں ہو سکتا تھا اور صبح کو جب اس بات کا علم ہوتا اور ان دونوں کی تلاش میں لوگ روانہ ہوتے تو قصبے کے بسوں کے اڈے تک آتے آتے ان کو اتنا ہی وقت لگتا جتنا وقت ان دونوں کو یہاں تک پہنچنے میں لگا تھا اور اس عرصے کے دوران وہ دونوں بس میں بیٹھ کر پشاور کے لئے روانہ ہو چکے ہوتے۔

اگرچہ خیر زماں نے فیروزہ کے ذریعے ساری باتیں زرینہ کو اچھی طرح سمجھا دی تھیں' پھر بھی اس نے اس کو کئی باتیں دوبارہ یاد دلانا ضروری سمجھا۔

"چہرے کو زیادہ سے زیادہ چھپائے رکھنا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "کوشش کرنا کہ تمہاری صورت صاف طور سے کسی کو دکھائی نہ دے اور یہ یاد رکھنا کہ تم میری بیوی ہو۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔"

"ہاں' مجھے یاد ہے۔" زرینہ نے آہستہ سے کہا۔ "سب کچھ اچھی طرح سے یاد ہے۔ بس خدا کرے ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔"

یہ صورت حال' جس سے اس وقت وہ دونوں دوچار تھے' قدرے خطرناک تھی۔ بسوں کے اڈے پر رات کی عملداری تھی اور وہ دونوں' ایک مرد اور ایک عورت' اس نامعقول وقت میں وہاں موجود تھے۔ ان کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ کوئی ساز و سامان بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ کون تھے وہ؟ کہاں جا رہے تھے؟ کیوں جا رہے تھے؟ کیا یہ آدمی اس عورت کو بھگا کر لے جا رہا تھا؟

یہ ساری باتیں بڑی تیزی کے ساتھ خیر زماں کے دماغ میں ابھریں اور اس نے فوراً ہی ان تمام خطرات کا حل بھی تلاش کر لیا۔

اس نے بسوں کے اڈے پر ایک ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں وہ دونوں کچھ دیر تک چھپ کر بیٹھ سکتے تھے اور سب سے پہلے بیدار ہو کر یہاں نمودار ہونے والے شخص یا اشخاص کی مشتبہ نظروں سے بچ سکتے تھے۔ ایک پرانی بس کا شکستہ ڈھانچہ کھڑا ہوا تھا۔ جس کی کھڑکیوں میں پھٹے پرانے پردوں کے ٹکڑے بھی لٹک رہے تھے۔ اس نے زرینہ کو اپنا مدعا بتایا اور زرینہ نے فوراً ہی اس کے خیال کی تائید کی اور وہ دونوں اس ٹوٹی ہوئی بس کے ڈھانچے کے اندر داخل ہو گئے۔

یہاں پہنچتے ہی انہیں ایک اور خوشگوار احساس ہوا۔ اس جگہ آ کر انہیں سخت سردی سے نجات مل گئی تھی۔ ان کے سر پر ایک چھت تھی اور چاروں طرف دیواریں ہوا کی تیز موجیں ان تک پہنچ کر ان کے جسموں میں برف نہیں گھول رہی تھیں۔

"اوہ .... یہ تو بہت اچھا ہے۔" زرینہ نے سرگوشی میں کہا۔ "یہاں تو سردی بھی کم ہے۔ ہم کچھ دیر تک یہاں آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔"

"صرف اس وقت تک' جب تک کہ لوگ جاگ نہیں جاتے اور ہاں چہل پہل نہیں شروع ہو جاتی۔" خیر زماں نے جواب دیا۔ "جیسے ہی یہاں لوگ جاگنا شروع کریں گے اور حرکت میں آنے لگیں گے' ہم بالکل خاموشی سے اس ٹوٹی ہوئی بس سے نکل کر سامنے لکڑی کی بینچ پر جا بیٹھیں گے جو مسافروں کے بیٹھنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس وقت تک شاید یہاں کچھ اور مسافر بھی آ جائیں اِدھر اُدھر سے۔ پھر کوئی خاص طور سے ہماری جانب متوجہ نہیں ہو گا۔ ہم دوسرے لوگوں میں مل جل جائیں گے بس اس کا خیال رہے کہ کوئی

ہم کو اس ٹوٹی ہوئی بس میں سے باہر نکلتے ہوئے نہ دیکھے۔"

"کوئی نہیں دیکھ پائے گا۔" زرینہ نے کہا۔ "یہ بالکل کونے میں، درختوں کے پاس کھڑی ہوئی ہے اور اس کا دروازہ بھی دوسری طرف ہے۔"

صبح کاذب کا وقت رخصت ہو رہا تھا اور اب افق پر ایک سہمی سہمی، یخ بستہ سی تھرتھراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ صبح ہونے کو تھی۔ قریب سے کسی مرغ نے بڑے زور سے بانگ دی اور اسی کے ساتھ فضا میں کسی اور پرندے کی چہکار کی آواز بھی گونج اٹھی۔

ایک ہوٹل کے برآمدے میں پڑے ہوئے پلنگوں میں سے بعض پر کسمساہٹ شروع ہو گئی۔ وہ دونوں ٹوٹی ہوئی بس میں سے کھڑکی کے پھٹے ہوئے پردے کے پیچھے سے ایک ہوٹل کے برآمدے کے منظر کو صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔ وہاں ایک آدمی اپنے جسم پر پڑے ہوئے کمبل کو ہٹا کر اٹھا اور کچھ دیر تک بستر پر بیٹھا سا ہوا، خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سے بستر سے نیچے اتر آیا اور اس نے اپنے سرہانے رکھی ہوئی ایک چادر کو اٹھا کر اپنے جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔

"لوگوں نے جاگنا شروع کر دیا ہے۔" زرینہ نے سرگوشی میں خیر زماں سے کہا۔ "اب ذرا دیر میں ہمیں بھی باہر نکلنا ہو گا۔"

"ہاں۔" خیر زماں نے کہا۔ "اب زیادہ دیر نہیں ہے۔"

اسی وقت بیک وقت دو تین بستروں میں کسمساہٹ شروع ہو گئی اور کئی لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہو چکا تھا۔

اس کے کچھ ہی دیر کے بعد سامنے سے کچھ لوگ نمودار ہوئے، یہ مسافر معلوم ہوتے تھے۔ ان کے پاس سامان کی کچھ گٹھڑیاں اور پوٹلیاں وغیرہ تھیں۔ ان میں کچھ عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ یہ لوگ بسوں کے اڈے پر آ کر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

"چلو۔" خیر زماں نے کہا۔ "مسافر آنے شروع ہو گئے ہیں۔ کچھ دیر میں کوئی نہ کوئی بس بھی آ جائے گی۔ ہم کو اب اس جگہ سے باہر نکل آنا چاہئے۔"

"ہاں۔" زرینہ نے کہا اور وہ دونوں خاموشی سے بس سے باہر نکل آئے۔ انہیں وہاں سے نکلتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس طرف کوئی نہیں تھا۔ ان کی یہ ترکیب پوری طرح کامیاب رہی تھی۔

بس میں سے نکلنے کے بعد وہ دونوں آہستہ اور محتاط قدموں سے چلتے ہوئے سیدھے

اس طرف پہنچ گئے جہاں ابھی ابھی کچھ مسافر آ کر بینچ پر بیٹھے تھے۔ جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ وہ دونوں بھی ایک قریبی بینچ پر بیٹھ گئے۔

سورج کی روشنی تیزی سے پھیلنی شروع ہو گئی تھی اور دور پہاڑیوں پر سے نرم اور سفید دھوپ نیچے اترتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بڑا سہانا اور دلفریب منظر تھا لیکن ان دونوں کے لئے اس وقت اس منظر میں کوئی کشش نہیں تھی۔ انہیں تو اس وقت صرف یہ انتظار تھا کہ جلد از جلد بس آ جائے اور وہ لوگ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ وہ اس علاقے سے جلد از جلد باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ جلد سے جلد، زیادہ سے زیادہ دور، بہت دور۔

ابھی تک کوئی بس نہیں آئی تھی اور دونوں بس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے اور اِدھر اُدھر سے کافی لوگ آنے شروع ہو گئے تھے۔ بسوں کے اڈے پر مسافروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ صورت حال ان دونوں کے لئے قدرے سازگار تھی۔ اب وہ اکیلے مسافر نہیں تھے اور اسی لئے وہ خصوصی توجہ کا مرکز بھی نہیں بن سکتے تھے۔ ان کے آس پاس اور بھی بہت سے لوگ تھے۔

اسی وقت دو آدمی ان کے بالکل قریب آ کر بینچ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ خیر زماں نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور اس کی جان نکل گئی۔

وہ اس کے گاؤں کا بزرگ افضل خان اور اس کا بیٹا مراد خان تھا۔ افضل خان وہ آدمی تھا جو دراز گل اور جہاں زیب کے ساتھ بخت خان کی طرف سے زرینہ کے لئے خیر زماں کا پیغام لے کر گیا تھا۔

افضل خان .... افضل خان اور اس کا بیٹا مراد خان .... وہ دونوں اچانک نہ جانے کہاں سے، کس طرح سے، کس طرف سے، نمودار ہو گئے تھے اور اب بینچ کے بالکل پاس کھڑے ہوئے تھے۔ اتنے قریب کہ اگر خیر زماں ذرا سا بھی زور سے بولے تو وہ دونوں اس کی آواز کو صاف طور سے سن لیں۔

خیر زماں کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ جس بات کا اسے مسلسل خطرہ لاحق رہا تھا وہ ہو رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ بسوں کے اڈے پر، اس کے آس پاس، کوئی جاننے والا، اپنے گاؤں کا یا کسی قریبی گاؤں کا، کوئی شخص نہ مل جائے اور یہی ہوا۔

افضل خان وہاں موجود تھا، اپنے بیٹے مراد خان کے ساتھ اور افضل خان تو اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ بخت خان نے زرینہ کے لئے اپنے بیٹے خیر زماں کا پیغام بجھوایا تھا

جسے نامنظور کر دیا گیا تھا۔

اب کیا ہو سکتا تھا؟ اپنے آپ کو چھپانا کس طرح ممکن تھا؟ وہ لوگ کتنے قریب موجود تھے اور اس کا بھی موقع نہیں تھا کہ جگہ ہی تبدیل کر لی جائے۔ بلکہ اس صورت میں تو خطرہ اور بھی زیادہ تھا۔ جگہ تبدیل کرنے کی غرض سے تو اپنی نشست پر سے اٹھنا اور حرکت کرنا ضروری تھا اور حرکت کرنے کی صورت میں اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ افضل خان اور اس کا بیٹا ان دونوں کی طرف دیکھ لیں اور پھر شاید کچھ چھپانا ممکن نہ ہوتا۔ واحد صورت یہی تھی کہ خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا جائے اور آنے والے لمحوں کا انتظار کیا جائے۔

خیر زماں اور زرینہ بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا رخ سامنے سڑک کی طرف تھا۔ افضل خان اور مراد خان بھی ان کے قریب ہی اس طرح کھڑے ہوئے تھے کہ ان کا رخ بھی سڑک کی طرف تھا۔ گویا ان سب لوگوں کا رخ ایک ہی جانب تھا اور اگر افضل خان یا مراد خان اپنے بائیں جانب مڑ کر ذرا بھی توجہ سے دیکھتا تو اسے بینچ پر بیٹھا ہوا خیر زماں تو کم از کم نظر آ ہی سکتا تھا۔ چادر میں چھپی زرینہ تو آسانی سے نظر نہ آتی لیکن خیر زماں کو دیکھا جا سکتا تھا۔

زرینہ نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ان دونوں کو پہچانتی تھی۔ افضل خان کو تو وہ خاص طور سے بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ کیونکہ افضل خان صرف گاؤں ڈیرہ امین گل کی ہی ایک بزرگ شخصیت نہیں تھا بلکہ اس کا شمار علاقے کی برگزیدہ اور قابلِ تعظیم شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی چند بار شمروز خان کے گھر آ چکا تھا۔

ان دونوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ زرینہ کے سارے وجود میں خوف کی سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ یہ کیا ہو گیا تھا' افضل خان اور اس کا بیٹا کہاں سے ٹپک پڑے تھے' موت کے فرشتوں کی طرح اور اب کیا ہو گا؟

اس نے جلدی سے اپنی چادر کو اپنے چہرے کے اوپر اس طرح کھینچ لیا کہ اس کا چہرہ بالکل ہی چھپ گیا۔

جس حد تک ممکن ہو سکتا تھا خیر زماں نے اپنے چہرے کو بھی چادر سے چھپایا اور خاص طور سے اپنے دائیں جانب کے حصے کو تو اور بھی زیادہ اچھی طرح چھپا لیا۔ افضل خان اور مراد خان دونوں اس کے دائیں جانب تھے۔

اس نے اور زرینہ نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ دونوں خوف اور پریشانی کے عالم میں اس قدر سہمے ہوئے تھے کہ ان سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی تھی اور پھر وہ کیا بات کر سکتے تھے' اس معاملے میں ان کے پاس ایک دوسرے سے کچھ کہنے سننے کے لئے نہیں تھا۔

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھے رہے اور دل ہی دل میں لرزتے اور کانپتے رہے۔

ان دونوں کا ایک ایک لمحہ سولی پر گزر رہا تھا۔ وہ آنے والے بدترین وقت کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔ خیر زماں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اس کو کیا کرنا چاہئے۔ اگر افضل خان کو یہ علم ہو جاتا کہ خیر زماں زرینہ کو یہاں سے بھگا کر لے جا رہا ہے تو اس وقت وہاں ایک قیامت برپا ہو سکتی تھی اور افضل خان اور مراد خان زرینہ کو اس کے گھر واپس چلنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ وہاں بسوں کے اڈے پر موجود سارے لوگ افضل خان اور مراد خان کا ہی ساتھ دیتے اور پھر پولیس والے بھی اس معاملے میں دخل اندازی کر سکتے تھے۔ ویسے تو ان لوگوں میں اپنے جھگڑوں اور تنازعوں کے سلسلے میں پولیس سے رجوع کرنے کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ یہ لوگ اپنے معاملات خود ہی طے کر لیتے تھے۔ خواہ زبان سے طے کرنا پڑیں یا گولی سے اور خون بہا کر لیکن پھر بھی کبھی کبھار پولیس سے بھی سابقہ پڑ جاتا تھا۔

ان دونوں کو سب کچھ ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ زرینہ کو اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ کوئی لڑکی جب رات کی تاریکی میں گھر والوں سے چھپ کر اپنے گھر کی دہلیز پار کر جائے تو پھر اس گھر کے اور تمام گھروں کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں اور خاص طور سے اس صورت میں جبکہ وہ مرد کے ساتھ بھاگی ہو۔ تو پھر تو اس کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہوتا سوائے ایک تنگ و تاریک قبر کے جس میں اس کے باپ' بھائی اور دوسرے مرد رشتے دار خود ہی اس کو اتار دیتے تھے اور زرینہ کو اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا۔

خیر زماں کی آنکھوں کے سامنے بھی موت ناچ رہی تھی۔ وہ زرینہ کو چھوڑ کر وہاں سے بھاگ تو نہیں سکتا تھا۔ نہیں' ہرگز نہیں۔ اس کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی ذلت آمیز زندگی تو اس کو کسی طرح بھی قبول نہیں تھی۔ اگر زرینہ کو مرنا تھا تو پھر اس کو

بھی مرنا تھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی کے برابر تھا اور ان دونوں کو اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اسی وقت وہاں ایک بس آ گئی اور بس کو آتا دیکھ کر وہاں موجود مسافر پہلے سے ہی اس میں سوار ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ زرینہ کے جسم میں بھی حرکت پیدا ہوئی اور خیر زماں نے کنکھیوں سے افضل خان اور مراد خان کو بھی آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں اپنے دائیں بائیں دیکھے بغیر سیدھے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے سڑک کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں آ کر بس رکنے والی تھی۔

اچانک خیر زماں کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔ افضل خان اور مراد خان اس آنے والی بس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس میں سوار ہونے جا رہے تھے۔ ان دونوں کا رخ سامنے کی طرف تھا۔ زرینہ نے اپنی جگہ سے حرکت کی تھی اور وہ بھی اٹھ کر بس میں سوار ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔

اس نے جلدی سے زرینہ کو روکا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے بینچ پر سے اٹھا اور اس کو ساتھ لئے ہوئے ایک دم گھوم کر مخالف سمت میں جانے لگا۔ اس طرح یہ ہوا کہ جدھر آ کر بس رک رہی تھی اس طرف سے ان دونوں کی پشت ہو گئی اور ان کے چہرے مخالف سمت میں ہو گئے۔ اب اگر افضل خان اور مراد خان بس میں داخل ہو کر کھڑے رہتے یا بیٹھ جانے کے بعد بینچوں کی طرف رخ کر کے دیکھتے بھی' تو بھی ان کو خیر زماں اور زرینہ کے چہرے نظر نہیں آ سکتے تھے۔

زرینہ تیز اور ہوشیار لڑکی تھی۔ بغیر ایک لفظ کہے سنے وہ خیر زماں کا مطلب سمجھ گئی اور تیزی سے مخالف سمت میں چلنے لگی۔

دونوں چلتے ہوئے بینچوں کے پاس سے کافی دور نکل گئے تھے اور انہوں نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے چہروں کو اس طرف کیا ہی نہیں تھا جدھر بس آ کر کھڑی ہوئی تھی اور اس میں سے مسافر چڑھ اتر رہے تھے۔

ہوٹلوں اور پیٹرول پمپ کے پاس کافی رونق ہو چکی تھی۔ وہاں بہت سارے لوگ موجود تھے۔ ہوٹلوں میں چائے ناشتے کا دور چل رہا تھا لیکن اس تمام مجمع میں عورتوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ زرینہ کے علاوہ صرف دو تین' چادروں میں لپٹی ہوئی

عورتیں نظر آ رہی تھیں جو اپنے اپنے مردوں کے ساتھ تھیں۔ اکیلی عورت تو کہیں کوئی تھی ہی نہیں۔

"بس کی طرف رخ مت کرنا۔" خیر زماں نے زرینہ کے کان میں سرگوشی کی اور زرینہ نے جواب میں صرف آہستہ سے گردن ہلا دی۔ وہ سیدھا سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی اور خیر زماں کا رخ بھی سامنے کی طرف تھا۔

وہ دونوں چلتے ہوئے ہوٹلوں اور پمپ کے قریب آ کر اس طرح کھڑے ہو گئے تھے جیسے کسی آنے والے کا انتظار کر رہے ہوں۔ ظاہر تھا کہ وہ بس کا انتظار کرتے ہوئے تو نہیں لگ سکتے تھے کیونکہ وہ اس طرف سے پیٹھ کئے ہوئے تھے جدھر بسیں آتی تھیں۔

ذرا سی دیر بعد انہوں نے بس کے روانہ ہونے کی آواز سنی لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی فوری طور پر اپنا رخ تبدیل نہیں کیا۔

"تم ذرا مڑ کر دیکھو۔" کچھ دیر کے بعد خیر زماں نے بہت آہستہ سے زرینہ سے کہا۔

"بس چلی گئی؟ وہ دونوں بھی چلے گئے؟"

زرینہ دیکھ سکتی تھی کیونکہ اس کا چہرہ تو تقریباً پورے طور سے چادر میں چھپا ہوا تھا اور اسے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بس جا چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ دونوں بھی وہاں سے جا چکے تھے۔ افضل خان اور مراد خان دونوں بس میں بیٹھ کر وہاں سے جا چکے تھے۔

"بس بھی گئی اور وہ لوگ بھی گئے۔" زرینہ نے آہستہ سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے۔" خیر زماں نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "آؤ .... اب ہم وہاں چل کر دوسری بس کے آنے کا انتظار کریں گے۔"

یہ صورت حال ان دونوں کے لئے پریشان کُن تھی۔ اصل مسئلہ وقت کا تھا۔ انہیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا تھا۔ وہ تو رات کے آخری حصے میں ہی یہاں پہنچ گئے تھے اور پہلی آنے والی بس میں بیٹھ کر یہاں سے جا سکتے تھے لیکن ان کی بدقسمتی کہ انہیں پہلی بس چھوڑ دینی پڑی اب انہیں دوسری بس کا انتظار کرنا تھا اور جو وقت بھی یہاں گزر رہا تھا وہ خطرے سے خالی نہیں تھا۔

وہ دونوں اب پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ محتاط تھے۔ زرینہ نے تو اپنے چہرے کو تقریباً بالکل ہی چھپا لیا تھا۔ خیر زمان نے بھی اپنے چہرے کو کافی چھپا رکھا تھا اور اس بار

انہوں نے ایک احتیاط اور بھی کی تھی اور وہ یہ کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب قریب نہیں بیٹھے تھے بلکہ تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ دیکھنے والے کو یہ سمجھنے میں کچھ دشواری پیش آ سکتی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں یا ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

دوسری بس کے آنے میں زیادہ وقت نہیں لگا اور انہیں بہت دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر کے بعد بس آ گئی اور وہ دونوں جلدی سے اس میں سوار ہو گئے۔

دونوں نے ہی اور خاص طور سے خیر زماں نے بس میں سوار ہونے سے پہلے چاروں طرف نظریں دوڑا دوڑا کر اچھی طرح سے یہ دیکھ لیا تھا کہ کوئی جاننے والا تو آس پاس کہیں موجود نہیں ہے اور انہیں کوئی نہیں نظر آیا تھا۔ خیر زماں نہ صرف اپنے گاؤں کے سارے لوگوں کو جانتا تھا بلکہ بابر خیل اور آس پاس کے کئی دوسرے گاؤں کے بہت سے لوگوں کو بھی پہچانتا تھا۔ جنہیں زرینہ نہیں پہچانتی تھی۔

بس جب تک بس اڈے سے روانہ نہیں ہو گئی اس وقت تک ان دونوں کی جان لبوں پر رہی۔ خیر زماں کھڑکی سے باہر جھانک جھانک کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور اپنے اردگرد نظر آنے والے چہروں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ ان میں اسے جان پہچان کا کوئی بھی چہرہ نظر نہیں آیا۔

بس چل پڑی' پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز اور تیز تر یہاں تک کہ کچھ دیر کے بعد وہ خالی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

"ہماری زندگیوں کا نیا سفر شروع ہو چکا ہے۔" زرینہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔
"اس کا انجام کیا ہو گا اور یہ سفر کہاں جا کر اور کس شکل میں ختم ہو گا اس کے بارے میں تو ہم کچھ بھی نہیں جانتے' کون جانے' کون جانے آگے مقدر میں کیا لکھا ہے۔"

ذہن کو جب تھوڑا سا سکون حاصل ہوا تو زرینہ فوراً ہی اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگی۔

صبح ہوئے تو کتنی دیر ہو چکی تھی اور اب اس کے گھر میں کیا عالم ہو گا؟ علی الصبح جب اس کی ماں نے بیدار ہو کر اسے اس کے بستر پر نہیں پایا ہو گا تو پھر کیا ہوا ہو گا؟

پہلے تو اس کو گھر میں اِدھر اُدھر تلاش کیا ہو گا اور پھر جب وہ نہیں ملی ہو گی تو اماں کا ماتھا ٹھنکا ہو گا اور انہوں نے فوراً ہی فیروزہ کو گھر کے باہر بھیجا ہو گا تاکہ وہ اِدھر اُدھر اس کو

تلاش کرے۔

اور پھر ذرا ہی دیر میں گھر میں قیامت برپا ہو گئی ہو گی۔ اماں اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہی ہوں گی اور اس کو گالیاں اور کوسنے دے رہی ہوں گی۔ فیروزہ بھی ان کے ساتھ رونے دھونے میں شریک ہو گی اور بابا کا تو غصے کے عالم میں خدا جانے کیا حال ہو گا............

وہ چشم تصور سے اپنے گھر کے اس وقت کے نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے فرار کی خبر کو چھپانا تو ناممکن تھا۔ گاؤں کے گھروں میں ایسی باتیں چھپا نہیں کرتیں۔ اب تک تو سارے گاؤں میں اس کی گمشدگی کی خبر پھیل چکی ہو گی اور کھلم کھلا خیر زماں کو ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہو گا اور اب تک تو لوگ ڈیرہ امین گل پہنچ کر بخت خان سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ بھی کر چکے ہوں گے اور یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہو گی کہ بخت خان کا بڑا بیٹا خیر زماں بھی گزشتہ رات سے اپنے گھر سے غائب ہے اور اب تک تو دونوں گاؤں میں ایک ہلچل مچ چکی ہو گی۔ نہ جانے کتنے بہت سے بندوق بردار ان دونوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر روانہ ہو چکے ہوں گے۔ اس کام میں تو دونوں ہی خاندانوں کے لوگ ایک دوسرے کے شریک ہوں گے۔ وہ ایک ساتھ مل کر دونوں تلاش کر رہے ہوں گے اور ہمیں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا فیصلہ کر چکے ہوں گے۔

بس برق رفتاری کے ساتھ اڑی چلی جا رہی تھی اور وہ دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔ کل کی صبح سے آج کی صبح تک ان کی زندگی میں کتنا فرق پیدا ہو چکا تھا۔ سب کچھ کس قدر بدل چکا تھا۔ حالات کیا سے کیا ہو گئے تھے۔

زرینہ کے تو وہاں جانے کا بھلا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔ خود خیر زماں بھی کبھی پشاور نہیں گیا تھا۔ اس نے پشاور کے بارے میں سنا تھا۔ لوگوں سے اس شہر کی بہت ساری باتیں سنی تھیں لیکن وہ خود کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔ ان لوگوں کا پشاور میں کوئی نہیں تھا۔ اس کے خاندان کا کوئی فرد وہاں نہیں رہتا تھا اور ان لوگوں کو وہاں جانے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

خیر زماں نے پشاور کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات' اپنی مرضی کی معلومات اپنے ماموں دراز گل سے حاصل کی تھیں۔ دراز گل کے کراچی روانہ ہونے سے پہلے اس نے اس سے کراچی کے بارے میں اور پشاور کے بارے میں بہت کچھ پوچھا تھا اور وہ ان

ساری معلومات کو اپنے ذہن میں محفوظ کرتا رہا تھا۔ دراز گل کو اس وقت اس کے عزائم کا قطعی کوئی علم نہیں تھا ورنہ وہ اس کو سختی کے ساتھ روکنے کی کوشش کرتا۔ اس وقت جو کچھ خیر زماں کے دل میں تھا اس کو اس نے ایک نہایت درجہ بیش بہا خزانے کے طور پر چھپا کر رکھا تھا اور وہ اس خزانے میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی کو بھی اس خزانے میں شریک کرنے سے یہ سارا خزانہ کھڑے کھڑے لٹ جائے گا اور پھر اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔

وہ تو بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی ذہنی تیاریوں میں مصروف تھا اور اس وقت تک تو اس کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کی تجویز پر زرینہ کا کیا ردِ عمل ہو گا۔ ان ساری چیزوں نے ایک واضح شکل و صورت تو اس وقت اختیار کی جب فیروزہ نے اس سے ملاقات کی تھی اور وہ ان دونوں کے مابین رابطے کا واحد ذریعہ بن گئی تھی۔

بس جگہ جگہ رکتی ہوئی مسافروں کو اتارتی اور نئے نئے مسافروں کو بٹھاتی ہوئی اپنی منزل کی طرف روانہ تھی۔ زرینہ اور خیر زماں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ انہوں نے ایک پیالی چائے بھی نہیں پی تھی۔ اگرچہ وہاں بسوں کے اڈے پر چائے اور کھانے پینے کی دیگر چیزوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ لوگ بڑی آسانی سے کچھ کھا پی سکتے تھے لیکن وہ ایسی پریشانی اور خوف کا عالم تھا کہ کھانے پینے کے بارے میں تو کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس وقت تو بس ایک ہی بات سوچی جا سکتی تھی۔ اس علاقے سے جلد از جلد باہر نکل جانا اور ان دونوں کی پوری توجہ اس پر ہی مرکوز تھی۔

اب وہ اپنے علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے۔ بس میں بھی جہاں تک خیر زماں کے لئے دیکھنا ممکن تھا' اس نے دیکھ لیا تھا کہ کوئی جاننے والا موجود نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے زرینہ سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنے چہرے کو پوری طرح سے چھپائے رکھے اور وہ خود بھی کافی محتاط تھا۔ تاہم اب کچھ کھانے پینے کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔

ایک سٹاپ پر بس رکی تو خیر زماں نے بس میں بیٹھے بیٹھے دو کپ چائے اور کچھ بسکٹ خرید لئے اور ان دونوں نے چائے پی لی اور بسکٹ کھا لئے۔

بس تھوڑی دیر رک کر پھر روانہ ہو گئی تھی۔ زرینہ اور خیر زماں ایک نئی اور ان جانی دنیا میں سفر کر رہے تھے۔ ان کا اپنا علاقہ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اب وہ ایک ایسی اجنبی سرزمین پر سفر کر رہے تھے جس کے بارے میں انہیں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ ان کے

اردگرد جو تیزی سے بدلتے ہوئے مناظر تھے وہ سب کے سب ان کے لئے نئے اور انجانے تھے۔

بالآخر کئی گھنٹے کے طویل سفر کے بعد وہ دونوں پشاور پہنچ گئے۔ بس' بسوں کے اڈے پر رکی اور خالی ہونے لگی' تمام مسافر بس سے اتر رہے تھے' پشاور آ گیا تھا۔

زرینہ کے دل میں خوشی اور سرور کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اپنے چہرے کو چادر سے اچھی طرح ڈھکا اور اپنی حیران حیران آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ کتنے بہت سارے لوگ ہر طرف چلتے پھرتے' گھومتے نظر آ رہے تھے اور کتنی بہت سی سواریاں۔ ان میں سے بہت ساری تو ایسی شکل کی موٹر گاڑیاں تھیں جو زرینہ نے اس سے پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں تھیں اور بازار میں کتنا ہجوم تھا۔ کتنے بہت سارے لوگ سڑکوں پر چل رہے تھے اور دکانوں میں آ جا رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے اتنے بہت سارے لوگ۔

خیر زماں خود بھی پہلی بار پشاور آیا تھا اور وہ کافی گھبرایا ہوا تھا۔ یہاں کی ہر چیز اس کے لئے نئی تھی۔ اگر وہ عام حالات میں اکیلا یا کسی اور کے ساتھ پشاور آیا ہوتا تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ بہت خوش ہوتا اور کسی قسم کی گھبراہٹ محسوس نہ کرتا لیکن موجودہ نامساعد حالات میں تو اس کے لئے خطرہ ہی خطرہ تھا اور جب آدمی کے سر پر مستقل خطرہ منڈلا رہا ہو تو پھر بھلا وہ کس چیز سے لطف اندوز کس طرح ہو سکتا ہے؟

خیر زماں اگرچہ پہلی بار پشاور آیا تھا لیکن اس نے اپنے ماما دراز گل سے اس شہر کے بارے میں اتنی باتیں پوچھ لی تھیں اور اتنی معلومات حاصل کر لی تھیں کہ اس کو یہ شہر جانا پہچانا سا لگتا تھا۔ یہاں کے بسوں کے اڈوں کے بارے میں' یہاں کے ریلوے اسٹیشن کے بارے میں' آنے جانے والی ریل گاڑیوں کے بارے میں اور دوسری بہت ساری چیزوں کے بارے میں اس کے پاس پہلے سے معلومات موجود تھیں۔

بس اسٹاپ پر اترنے کے بعد وہ زرینہ کو لے کر سیدھا ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس بات کا اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اس کو اور زرینہ کو تلاش کرنے والے لوگ بس میں بیٹھ کر پشاور تک آ سکتے ہیں اور یہاں آنے کے بعد وہ سب سے پہلے ان دونوں کو ریلوے اسٹیشن پر تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس نے سارا حساب لگا لیا تھا۔ اس نے یہ حساب لگا کر دیکھ لیا تھا کہ اگر وہ لوگ علی الصبح گاؤں سے روانہ ہوں تو ان کو گاؤں سے بس کے اڈے تک پہنچنے میں اور پھر وہاں سے بس کے ذریعے پشاور تک آنے میں کتنا وقت لگے گا اور اس نے اپنے ماما دراز گل سے یہ بات بھی معلوم کر لی تھی کہ پشاور کے ریلوے اسٹیشن سے کراچی جانے والی گاڑی کس وقت ملتی ہے اور اس گاڑی میں کس طرح بیٹھا جاتا ہے۔ ریل کا سفر کس طرح کیا جاتا ہے اور ماما دراز گل نے اس کو یہ بھی بتایا تھا کہ اگر پشاور سے کراچی جانے والی ٹرین اتفاق سے نہ مل سکے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی پشاور سے لاہور چلا جائے اور لاہور سے کراچی جانے والی ٹرین پکڑ لے۔ خیر زماں نے ساری ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں۔

اس نے بہت بڑی جرأت کی تھی۔ ایک ایسے نوجوان نے جس کے گاؤں تک کوئی بس بھی نہیں جاتی تھی' کوئی موٹر گاڑی بھی ادھر نہیں چلتی تھی۔ جس نے اپنی زندگی میں آج تک ٹرین بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک لڑکی کو ساتھ لے کر کراچی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ خیر زماں جیسے نوجوان کے لئے یہ غیر معمولی نوعیت کا فیصلہ تھا اور شاید عام حالات میں تو وہ یہ فیصلہ کبھی بھی نہ کر پاتا۔ اگر اس کے پس پشت جنونِ عشق کی کارفرمائی موجود نہ ہوتی۔ اس نے تو سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

جب شمروز خان نے افضل خان اور جہاں زیب کی بھی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور ان دونوں بزرگوں کو بھی اپنے دروازے سے خالی ہاتھ لوٹا دیا تھا تو اس وقت خیر زماں نے یہ سوچا تھا کہ وہ زرینہ سے کہے گا کہ اس کے ساتھ یہاں سے نکل چلے۔ اسے امید تھی کہ زرینہ اس کے لئے راضی ہو جائے گی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ زرینہ اس کے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ زرینہ نے جس قدر شدت کے ساتھ' جس قدر ڈوب کر اس کو چاہا تھا وہ خیر زماں اچھی طرح جانتا تھا اور وہ خود بھی دیوانگی کی حد تک زرینہ کے عشق میں گرفتار تھا۔ عشق کا یہ جذبہ اتنا شدید اور گہرا تھا کہ ساتھ ساتھ مر جانا بھی ایک نشاط انگیز عمل معلوم ہوتا تھا۔

خیر زماں کے دل میں یہ بات تھی کہ اگر زرینہ مانے گی تو وہ اس کو ساتھ لے کر یہاں سے نکل جائے گا اور ماما دراز گل کے پاس کراچی پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ کراچی بہت دور تھا اور کراچی تک پہنچنے کے لئے نہ جانے کیا کیا جتن کرنے پڑتے تھے۔ جن سے وہ بالکل بھی واقف نہیں تھا لیکن عشق نے اس کو فقید المثال حوصلہ اور ولولہ عطا کر دیا تھا۔

وہ سارے ہفت خواں طے کر کے کراچی پہنچنے کے لئے تیار تھا۔

چنانچہ اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ماما دراز گل سے جو کہ ان دنوں گاؤں میں ہی موجود تھا کراچی کے بارے میں' کراچی پہنچنے کے طریقے کے بارے میں' گاؤں سے لے کر کراچی تک کے سفر کے بارے میں' ساری ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں اور اس نے یہ سب کچھ اتنی تفصیل سے معلوم کر لیا تھا کہ اس کو یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ کراچی جا چکا ہو۔ اس شہر سے واقف ہو اور یہاں رہ چکا ہو۔

دراز گل کے جانے کے بعد وہ کسی طرح سے بھی زرینہ سے رابطہ نہیں قائم کر پا رہا تھا۔ زرینہ اس طرف تو آ ہی نہیں رہی تھی اور وہ کہیں آس پاس بھی نہیں دکھائی دی۔ وہ خود تو اس کے گھر جا نہیں سکتا تھا' ناممکن تھا۔ کوئی اور بھی ایسا نہیں تھا جس کے ذریعے وہ زرینہ کو پیغام بھیج کر بلوا سکے اور اس سے بات کر سکے۔ وہ سخت پریشانی اور اذیت کے عالم میں تھا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی سوائے اس کے کہ روزانہ اس جگہ جا کر زرینہ کی آمد کا انتظار کرے جہاں اس کی اور زرینہ کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور وہ یہی کیا کرتا تھا کہ ایک دن اچانک فیروزہ وہاں آن پہنچی۔

فیروزہ کی وہاں آمد اس کے لئے غیر معمولی خوشی کی بات تھی۔ گو کہ یہ ایسی خوشی تھی جو غم کی دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے فیروزہ کی آمد سے چاروں طرف زرینہ کی خوشبو کو پھیلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

اور پھر جب فیروزہ نے اس کو زرینہ کی طرف سے یہ پیغام دیا کہ زرینہ یہ چاہتی ہے کہ وہ دونوں یہاں سے نکل کر کہیں اور چلے جائیں اور اپنی الگ دنیا بسا لیں تو خیر زماں کے سارے جذبوں کو اس کے سارے خوابوں اور سارے عزائم کو ایک نئی اور اضافی توانائی حاصل ہو گئی۔ یہی تو وہ بات تھی جو وہ خود سوچ رہا تھا اور زرینہ نے تو گویا اس کے ہی جذبوں کو زبان دے دی تھی۔

پھر ان دونوں کے درمیان منصوبہ تشکیل پاتا رہا۔ خیر زماں نے اپنا دل نکال کر اس کے سامنے رکھوا دیا جو کچھ بھی اس نے سوچا تھا' جس طرح وہ چاہتا تھا اور ذہنی طور پر جو تیاریاں کی تھیں ان سب کے بارے میں اس نے زرینہ کو فیروزہ کے ذریعے آگاہ کر دیا اور زرینہ نے اس کے اس منصوبے سے پوری طرح اتفاق کیا۔

"میرے پاس تو اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔" زرینہ نے فیروزہ کے ذریعے اس کو

کہلوا دیا۔ "نہ کسی دوسری جگہ کوئی ایسا گھر موجود ہے جہاں میں جا سکوں اور پناہ لے سکوں۔ والدین کے گھر کے علاوہ دنیا میں میرا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اب تم جہاں بھی مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے میں چلوں گی اور اگر لوگ ہم دونوں کو پکڑ کر گولی مار دیں گے تو میں اس کے لئے بھی بخوشی تیار ہوں۔ تمہارے بغیر جینے کے بجائے تمہارے ساتھ مر جانا مجھے زیادہ قابلِ قبول ہے۔"

خیر زماں کے لئے ماما دراز گل کا سہارا بہت بڑا اور واحد سہارا تھا۔ دراز گل وہ واحد آدمی تھا جس نے اس کے جذبات کو سمجھا تھا' اس کے دل کی تڑپ کو سمجھا تھا' اس کی محبت کی قوت کو سمجھا تھا اور اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم جو کچھ اس سے ہو سکا تھا اس نے بڑی سنجیدگی اور آمادگی کے ساتھ کیا تھا۔ اب اگر شمروز خان کسی طرح سے تیار ہی نہیں ہوا تو پھر دراز گل کیا کر سکتا تھا!

خیر زماں نے آخری فیصلہ یہ کیا تھا کہ وہ زرینہ کو ساتھ لے کر کراچی ماما دراز گل کے پاس پہنچ جائے گا اور وہاں پہنچتے ہی وہ دونوں شادی کر لیں گے۔ ایک دو بار اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ کیوں نہ کراچی کے لئے روانہ ہونے سے پہلے ہی پشاور میں ہی وہ دونوں کسی مسجد میں جا کر مولوی صاحب سے نکاح پڑھوا لیں اور اس کے بعد وہ کراچی کے لئے روانہ ہوں لیکن اس میں کافی قباحتیں تھیں جنہیں وہ با آسانی محسوس کر سکتا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ تو وقت کا تھا۔ معلوم نہیں اسے کسی مولوی کو تلاش کرنے میں کتنا وقت لگ جاتا جو لڑکا اور لڑکی دونوں کے والدین اور بزرگوں کی مکمل عدم موجودگی میں یہ نکاح پڑھانے کے لئے تیار ہو جاتا اور پھر کتنے سوالات' کتنے شبہات و شکوک .... کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ گواہ کون ہے؟ وکیل کون ہے؟ بزرگ کہاں ہیں؟ .... نہیں نہیں' یہ سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اس میں تو سخت گڑبڑ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ بہتر یہی تھا کہ کراچی جا کر ہی نکاح کیا جائے۔

اسے پورا یقین تھا کہ ماما دراز گل اس کو اور زرینہ کو اپنے گھر میں پناہ دیں گے اور ان کی ہر طرح سے مدد بھی کریں گے۔ ماما دراز گل تو ویسے بھی اس سے بار بار کہہ رہے تھے کہ وہ ان کے ساتھ کراچی چلے تو وہ تو ایک طرح سے ان کی دعوت پر ہی کراچی جا رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اکیلا نہیں جا رہا تھا بلکہ اپنے ساتھ اپنی ہونے والی بیوی کو بھی

لے جا رہا تھا۔

اسے اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ وہ ماما دراز گل پر بوجھ نہیں بنے گا۔ وہ جوان' صحت مند اور کام کرنے کے قابل تھا۔ محنتی اور جفاکش تھا اور ہر قسم کے کام کر سکتا تھا۔ اس نے تو ماما دراز گل سے پہلے ہی یہ بات پوچھ لی تھی کہ آیا کراچی میں اس کے لئے کام ہے اور ماما دراز گل نے بتایا تھا کہ کراچی میں اس کے لئے کام کی کمی نہیں ہے۔ بس' وہ کام کرے گا۔ ماما دراز گل اس کو کام دلوا دیں گے اور وہ کمائی کرے گا۔ اپنا اور اپنی بیوی کا سارا خرچہ خود اٹھائے گا۔ کسی پر بوجھ نہیں بنے گا۔ بس چند روز کی بات ہو گی اور پھر کچھ نہیں۔ پھر تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

"ایک بار شادی ہو جائے گی تو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے اپنے آپ کو اور خود زرینہ کو بھی تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک ایسی خود فریبی تھی جس کا وہ خود بھی شکار رہنا چاہتا تھا اور زرینہ کو بھی اس کا شکار رکھنا چاہتا تھا۔

خیر زماں نے یہ حساب لگا لیا تھا کہ اس کے اور زرینہ کے گاؤں والوں کے پشاور پہنچنے سے کافی پہلے وہ دونوں کراچی جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر کراچی کے لئے روانہ ہو چکے ہوں گے اور اگر اتفاق سے کراچی جانے والی ٹرین نہیں مل سکی تو لاہور جانے والی ٹرین مل جائے گی اور وہ دونوں یہاں سے لاہور چلے جائیں گے اور پھر وہاں سے کراچی۔

"ہر ریلوے اسٹیشن پر مسافر خانے موجود ہوتے ہیں۔" دراز گل نے خیر زماں کو بتایا تھا۔ "ٹرین کا انتظار کرنے والے مسافر جب تک چاہیں ان مسافر خانوں میں قیام کر سکتے ہیں۔ ان مسافر خانوں کا کوئی کرایہ نہیں ہوتا اور یہ مسافروں کی سہولت کے لئے بنائے جاتے ہیں۔"

خیر زماں نے ماما دراز گل کی بتائی ہوئی ایک ایک بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر رکھی تھی اور جہاں تک ممکن ہو سکا تھا زرینہ کو بھی اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔

ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ان کے لئے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ خیر زماں اپنے آپ کو پوری طرح سنبھالے ہوئے تھا اور اس نے زرینہ کو بھی ضروری ہدایات دے دی تھیں۔

"ہماری کسی بھی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونا چاہئے کہ ہم لوگ پہلی بار کسی بڑے شہر میں آئے ہیں۔" اس نے زرینہ سے کہا تھا اور وہ خود بھی پوری طرح محتاط تھا۔ یہاں اس

بڑے شہر میں قدم قدم پر اس کو حیران کرنے والی بے شمار چیزیں موجود تھیں لیکن وہ خود کو حیران ہونے سے بچا رہا تھا اور جہاں تک زرینہ کا تعلق تھا تو اس نے تو اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا اور وہ خیر زماں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ہر ہر قدم پر اس کو حیران کر دینے والے مناظر موجود تھے اور وہ حیران ہو بھی رہی تھی لیکن حیرت اپنے اظہار کے لئے کوئی راستہ تلاش نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ خاموش تھی اور ایک متوازن چال کے ساتھ چلتی ہوئی خیر زماں کے قدم بقدم جا رہی تھی۔

خیر زماں اپنے دل کو مضبوط رکھے ہوئے تھا اور جب وہ پشاور ریلوے اسٹیشن پہنچا تو حیرتوں کے سمندر میں ڈوب جانے کے باوجود وہ حیرتوں کے اظہار کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے اپنے گاؤں میں، گاؤں کے قریبی قصبے میں کوئی بھی تو ایسی چیز نہیں تھی۔ یہ تو کوئی طلسم کدہ معلوم ہوتا تھا۔

وہ دونوں اس طلسم کدے میں داخل ہو گئے۔ یہاں چاروں طرف اتنے بہت سارے لوگ تھے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی میں کبھی اتنے بہت سارے لوگوں کو اکٹھا نہیں دیکھا تھا اور کس قدر شور مچا ہوا تھا۔ لوگ جوق در جوق اپنے اپنے سامان کے ساتھ وہاں آ رہے تھے۔

خیر زماں پر سخت گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ طاری تھی۔ ایک دور افتادہ پہاڑی گاؤں کا رہنے والا بالکل ان پڑھ نوجوان جس نے اپنی زندگی میں کوئی شہر نہیں دیکھا تھا، اچانک پشاور جیسے بڑے شہر کے پُرہجوم ریلوے اسٹیشن پر آن پہنچا تھا۔ ایک بھگائی ہوئی لڑکی کے ساتھ اور اب اسے لے کر کراچی جا رہا تھا۔ اسے اس اجنبی، نامانوس، پس منظر اور نامہربان فضا میں سے اپنا راستہ بنانا تھا۔

وہ دونوں ابھی اسٹیشن کے اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ اچانک انہیں ایسا لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ بڑی خوفناک گڑگڑاہٹ تھی اور زمین پیروں کے نیچے ہلتی ہوئی لگ رہی تھی۔ زرینہ ایک دم سے اچھل پڑی اور اس نے گھبرا کر خیر زماں کا بازو کس کے پکڑ لیا۔
اس کو یہی لگا کہ زلزلہ آ گیا ہے۔

اس کو بہت ہلکا ہلکا یاد تھا۔ وہ بہت چھوٹی سی تھی جب اس کے علاقے میں زلزلہ آیا تھا۔ بزرگوں کا کہنا تھا کہ وہ زیادہ شدت کا زلزلہ نہیں تھا لیکن پھر بھی کئی مکانات گر گئے تھے اور پہاڑوں کے اوپر سے ٹوٹ ٹوٹ کر بڑے بڑے پتھر نیچے گرے تھے اور بڑے بے

ڈھب انداز میں دور تک لڑھکتے چلے گئے تھے۔ انسانوں نے تو بھاگ کر اپنی جانیں بچا لی تھیں لیکن کچھ مویشی ان بھاری بھاری پتھروں کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے تھے۔ زمین بڑے زور سے ہلی تھی اور زرینہ کو اتنا یاد تھا کہ اسے یوں لگا تھا جیسے کوئی اس چارپائی کو الٹا کئے دے رہا ہے جس پر وہ اس وقت اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ زلزلے کے جھٹکے کے ساتھ بڑے زور کی خوفناک گڑگڑاہٹ کی آواز بھی بلند ہوئی تھی۔

اس دن کے بعد سے اس علاقے میں پھر اب تک کوئی زلزلہ نہیں آیا تھا۔

اور آج ایک بار پھر زلزلہ آ گیا تھا۔ پشاور ریلوے اسٹیشن پر، جہاں اس وقت وہ دونوں موجود تھے۔ ایک دم بڑے زور کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی تھی اور زمین پر لرزش سی طاری ہو گئی تھی۔

چند لمحوں کا معاملہ تھا۔ خیر زماں نے بھی زرینہ کا ہاتھ کس کے پکڑ لیا تھا اور ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرف کو بھاگے کہ اچانک ایک نئے احساس نے اس کو کوئی بھی اگلا قدم اٹھانے سے روک دیا۔

اور تو کوئی بھی نہیں بھاگ رہا تھا!

کوئی سراسیمگی نہیں پھیلی تھی۔ سروں پر سامان اٹھائے ہوئے قلی اسی طرح چل رہے تھے۔ لوگ اسی طرح، بغیر کسی خوف و ہراس کے چل پھر رہے تھے۔ سودا بیچنے والے اسی طرح آوازیں لگا رہے تھے اور کہیں بھی بھگدڑ نہیں مچی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔

پلیٹ فارم پر آنے والی ٹرین شور مچاتی، گڑگڑاتی زمین میں لرزش کی لہریں پیدا کرتی آ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

ان دونوں نے اس سے پہلے کبھی ٹرین نہیں دیکھی تھی لیکن خیر زماں نے اپنے ماما دراز گل سے ٹرین کے بارے اتنا کچھ سنا تھا کہ اس کے ذہن میں ٹرین کا ایک نقشہ قائم ہو گیا تھا اور جب اس نے ٹرین کو دیکھا تو اس نے اس کو پہچان لیا۔ ہاں، تو .... تو یہ تھی ٹرین .... ایسی ہوتی ہے ٹرین۔

"یہ ٹرین ہے۔" اس نے دور سے زرینہ کو ٹرین دکھاتے ہوئے کہا۔ "جب چلتی ہے تو اس سے ایسا ہی شور پیدا ہوتا ہے۔"

"میرے خدا!" زرینہ نے خوف سے سہمی ہوئی آواز میں بہت آہستہ سے کہا۔ "میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ زلزلہ آ گیا .... اور ابھی یہ

عمارت گر پڑے گی۔ زمین اوپر نیچے ہونے لگے گی اور قیامت برپا ہو جائے گی۔ مگر ایسا تو کچھ نہیں ہوا' خدا کا شکر ہے۔"

ڈر تو وہ خود بھی گیا تھا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل بھی گیا تھا اور اب وہ زرینہ کے سامنے اس بات کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ بھی ڈر گیا تھا۔

ٹکٹ خریدنے تک کا مرحلہ بغیر کسی خاص دشواری کے طے ہو گیا۔ ماما دراز گل سے حاصل کردہ معلومات ہر قدم پر خیر زماں کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ بس' صرف اتنا کرنا پڑ رہا تھا کہ کسی سے پوچھنا پڑتا تھا اور اس کے لئے قلیوں سے زیادہ بہتر اور کوئی نہیں تھا۔ قلی تو ہر طرف موجود تھے اور وہ معلومات کا خزانہ تھے۔ وہ سب کچھ بتا سکتے تھے کہ کراچی جانے والی گاڑی کس وقت اور کس جگہ پر آئے گی' ٹکٹ کہاں ملے گا اور یہ گاڑی لیٹ تو نہیں ہو گی۔

ان لوگوں کے پاس کوئی ایسا سامان نہیں تھا جس کے لئے انہیں کسی قلی کی ضرورت ہوتی۔ کپڑوں کی ایک گٹھڑی زرینہ کے پاس تھی اور ایک خیر زماں کے پاس جس میں اس کے اپنے کپڑے اور معمولی سامان وغیرہ تھا۔ پھر بھی خیر زماں نے کچھ پیسے دے کر ایک قلی کو اپنے ساتھ لگا لیا کہ وہ ان دونوں کو کراچی جانے والی گاڑی میں بٹھا دے۔

قلی نے ان کو کراچی جانے والی گاڑی میں بٹھا دیا جس میں پہلے سے ہی کافی بھیڑ بھاڑ تھی۔ تاہم ان دونوں کو جگہ مل گئی تھی۔ قلی نے پیسے لے کر ان کو اچھی دلا دی تھی۔

دونوں بدحواس ہو رہے تھے۔ یہ تو ایک اچھا خاصہ کمرہ تھا جس میں وہ دونوں آ کر بیٹھ گئے تھے اور یہاں اور بھی بہت سارے لوگ پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈبے کے اندر باہر' پلیٹ فارم پر' ہر طرف ایک چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔

اور یہاں پشاور ریلوے اسٹیشن پر انہوں نے پہلی بار کچھ ایسی بولیاں بھی سنیں جو ان کے لئے بالکل اجنبی تھیں۔ بہت سارے لوگ ایسے تھے جو پشتو نہیں بول رہے تھے۔ یہ تو کوئی اور ہی بولیاں بول رہے تھے جن کا ایک لفظ بھی خیر زماں اور زرینہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

دنیا سے کٹے ہوئے اس دور افتادہ پہاڑی گاؤں کے رہنے والے خیر زماں اور زرینہ کو پشتو کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ ان کے بلند و بالا اور دشوار گزار پہاڑی گاؤں میں باہر کا کوئی آدمی نہیں آتا تھا۔ قریبی قصبے میں البتہ اکثر باہر کے لوگ بھی آتے رہتے

تھے لیکن قریبی قصبہ بھی گاؤں سے بہت دور تھا اور گاؤں والوں کو وہاں جانے کے لئے خاصا لمبا اور مشکل راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔

وہ دونوں گاڑی کے جس ڈبے میں بیٹھے تھے اس میں بھی بہت سارے لوگ بعض ایسی زبانیں بول رہے تھے جو ان کے لئے اجنبی تھیں۔

زرینہ کو اس ماحول سے بڑی وحشت ہو رہی تھی۔ اس کے گاؤں میں دو ایک گھروں میں ٹرانزسٹر تھے جو بیٹری سے چلتے تھے۔ ان سے اکثر پشتو کے علاوہ کچھ دوسری زبانوں کے پروگرام اور گانے وغیرہ بھی آتے تھے۔ کبھی کبھار زرینہ کو بھی ٹرانزسٹر سننے کا موقع مل جاتا تھا لیکن یہ نامانوس زبانیں تو اس کی سمجھ میں بالکل ہی نہیں آتی تھیں۔ ہاں' جب پشتو بولی جا رہی ہوتی تھی تو وہ خوب سمجھ لیتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔

پریشان تو خیر زماں بھی تھا لیکن اس کو اس صورت حال کا پہلے سے اندازہ تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ پشاور سے آگے جانے کے بعد تو یہ صورت حال اور بھی زیادہ سنگین ہو جائے گی۔ ماما دراز گل نے اس کو بتایا تھا کہ کراچی تک پہنچنے کے لئے پنجاب سے گزرنا پڑتا ہے جہاں پشتو نہیں بولی جاتی۔ وہاں کے لوگ پنجابی بولتے ہیں اور اردو بولتے ہیں۔ "اردو اور پنجابی نہ سمجھنے والوں کو مشکلات تو ضرور پیش آتی ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح کام چل ہی جاتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی پشتو بولنے والا مل ہی جاتا ہے۔" دراز گل نے اس کو بتایا تھا۔ "اور جہاں تک کراچی کا تعلق ہے تو وہاں تم کو قدم قدم پر پشتو بولنے والے ملیں گے۔ تمہارا کام تو چل جائے گا لیکن شہر میں رہنے سہنے اور کام کرنے کے لئے اردو جاننا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر تم کراچی میں نہ کوئی نوکری کر سکتے ہو نہ کوئی کام کر سکتے ہو۔"

خیر زماں کے دماغ میں یہ ساری باتیں موجود تھیں۔ اس نے تو بہت پہلے سے ہی یہ سوچ رکھا تھا کہ وہ کراچی پہنچتے ہی اردو سیکھنا شروع کر دے گا۔ ماما دراز گل کے بچے تو اکثر اپنی ماں سے اور آپس میں بھی اردو میں باتیں کرتے تھے۔ عجب عادتیں تھیں ان لوگوں کی اور ماما دراز گل بھی ان میں شامل تھے۔ وہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوتے تھے تو پشتو بولتے بولتے اچانک اردو بولنا شروع کر دیتے تھے اور گھر میں موجود دوسرے لوگ ان کی باتیں بالکل نہیں سمجھ پاتے تھے۔ پھر اردو بولتے بولتے پشتو بولنا شروع کر دیتے اور دونوں ہی زبانیں بڑی روانی اور عمدگی کے ساتھ بولتے تھے۔

"میں تو کراچی پہنچتے ہی اردو سیکھنا شروع کر دوں گا۔" خیر زماں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ "اور زرینہ سے کہوں گا کہ وہ بھی جلدی جلدی اردو سیکھنا شروع کر دے۔ ماما دراز گل کے بچے تو سب ہی اردو جانتے ہیں۔ وہ ہم کو اچھی طرح سے اردو سکھا دیں گے۔ سب کے سب پڑھے لکھے ہیں۔ پڑھ رہے ہیں۔"

ڈبے میں زیادہ تر لوگ تو پشتو ہی بول رہے تھے اور یہ امر خیر زماں کے لئے اطمینان کا باعث تھا۔ ڈبے میں پشتو بولنے والے موجود تھے جو کسی بھی مشکل وقت میں اس کی مدد کر سکتے تھے۔

جب تک گاڑی اسٹیشن سے روانہ نہیں ہو گئی تب تک ان دونوں پر خوف، دہشت اور وحشت کا عالم طاری رہا۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ انہوں نے اپنے معاشرے کی مروجہ اخلاقی اور سماجی اقدار کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں اور وہ معاشرہ ان کو معاف کرنے والا نہیں تھا لیکن ان مروجہ اخلاقی اقدار کی دھجیاں بکھیرنے والے وہ کوئی پہلے لوگ تو نہیں تھے۔

دونوں میں سے کوئی بھی اس سے پہلے ٹرین میں نہیں بیٹھا تھا اور اب ان کے جسموں میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ ٹرین ابھی روانہ نہیں ہوئی تھی لیکن ریلوے اسٹیشن کی گہما گہمی اور نئی نئی چیزوں کی دید انہیں مسرت آمیز حیرت سے دوچار کر رہی تھی۔ خوف اور دہشت کے ساتھ ساتھ حیرت اور مسرت کا احساس بھی پوری طرح طاری تھا۔

کچھ دیر کے بعد گاڑی نے سیٹی دی اور زرینہ ایک دم چونک پڑی۔ گاڑی کے سیٹی دیتے ہی پلیٹ فارم پر ایک نئی ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے تھے۔ کچھ لوگ جلدی جلدی لپک کر ڈبوں میں سوار ہو رہے تھے اور کچھ جلدی جلدی ڈبوں میں سے نیچے اتر رہے تھے۔ ہر شخص جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ٹرین چل پڑی اور خیر زماں نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے ان سارے مناظر پر ایک الوداعی نظر ڈالی جنہیں اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ آئندہ کبھی دوبارہ ان مناظر کو دیکھ سکے گا یا نہیں۔ اس نے زرینہ کے ساتھ زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔ آغاز تو ہو ہی گیا تھا اب دیکھنا یہ تھا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا تھا۔

زرینہ کے لئے یہ تجربہ نہایت درجہ حیرت ناک اور دلفریب تھا۔ تمام تر خوف و

دہشت کے باوجود وہ ایک ایسی منفرد قسم کی مسرت محسوس کر رہی تھی جس کا اسے اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بہت سارے لوگوں کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ کمرہ چل رہا تھا۔ وہ کمرہ خود بخود چل رہا تھا اور اس میں بیٹھے ہوئے سارے لوگ بھی چل رہے تھے۔ ان لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں چل رہا تھا مگر سب چل رہے تھے۔

گاڑی کی رفتار شروع شروع میں تو دھیمی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ اس میں تیزی آتی گئی۔ اس کی آواز بھی بدلتی گئی اور زیادہ تیز ہوتی گئی۔ باہر کے مناظر اس قدر تیزی کے ساتھ بدلتے جا رہے تھے کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

"وہ کون سی چیز ہے جو ٹرین کو اس قدر قوت کے ساتھ اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ چلاتی اور دوڑاتی ہے؟" حیران و ششدر زرینہ اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی۔ جب وہ پلیٹ فارم پر موجود تھی تو اس نے پوری ٹرین کو ایک نظر غور سے دیکھا تھا۔ کتنے بہت سارے کمرے تھے جو ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ کمروں کا ایک طویل سلسلہ تھا اور ہر کمرے کے اندر اتنے بہت سارے لوگ بھرے ہوئے تھے۔ زرینہ یہ دیکھ دیکھ کر سخت حیران ہو رہی تھی کہ یہ سارے کمرے ہی آپس میں کس طرح جڑے ہوئے تھے اور وہ کون سی جادوئی طاقت ہے جو ان سارے کمروں کو ایک ساتھ گھسیٹتی ہوئی، کھینچتی ہوئی، آگے لے جائے گی۔

تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہوئی ٹرین میں سے باہر کے بہت تیزی کے ساتھ بھاگتے ہوئے مناظر کو دیکھنا ایک بالکل نئی اور انوکھی بات تھی۔ زرینہ اس مشغلے کی رنگینی اور رعنائی میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ ان ساری چیزوں کی عادی ہو گئی اور جو کچھ دیر پہلے بے حد نیا، بالکل نیا، منفرد اور انوکھا تھا وہ اتنا زیادہ انوکھا نہیں رہا۔ پھر ہر شے میں جیسے ایک یکسانیت سی آ گئی۔ تاہم غیر معمولی دلچسپی کا عنصر ابھی بھی برقرار تھا۔

پشاور سے کراچی تک کا ٹرین کا سفر بہت طویل اور تھکا دینے والا تھا اور ان دونوں کو اس طویل سفر کے دوران طرح طرح کے نت نئے تجربات سے گزرنا پڑا تھا۔ گاڑی اسٹیشنوں پر رکتی ہوئی جا رہی تھی اور ہر اسٹیشن پر گاڑی کے پہنچتے ہی جیسے وہاں ایک زبردست ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ پلیٹ فارم پر لوگ اِدھر سے اُدھر بھاگتے، دوڑتے، زور زور سے بولتے، چیختے چلاتے، نظر آتے۔ سامان سے لدے پھندے مسافروں کی ٹولیاں گاڑی

کے رکتے ہی ڈبوں کے اندر گھسنے کی کوشش کرتیں اور زبردست دھکم پیل شروع ہو جاتی۔ آنے جانے والے، کھانے والے اور دوسری طرح طرح کی چیزیں بیچنے والے لوگ آوازیں لگاتے ہوئے پلیٹ فارم پر اِدھر سے اُدھر تیز تیز چلتے ہوئے دکھائی دیتے اور وہ دونوں ان سارے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

"خدا کی زمین کس قدر وسیع ہے۔" زرینہ ٹرین کے دونوں طرف پھیلے ہوئے لامتناہی وسیع وعریض میدانوں کو دیکھتے ہوئے سوچتی جن کا سلسلہ تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ "کتنی زمین ہے انسان کے پاس .... اور خالی پڑی ہے .... اگر اس ساری زمین پر انسان آباد ہو جائیں تو کتنا اچھا ہو!"

خود اس کے اپنے پہاڑوں میں بھی کتنی زمین تھی جو خالی پڑی ہوئی تھی۔ اونچی نیچی، ناہموار برف سے ڈھکی ہوئی دور دور تک پھیلی ہوئی زمین.........

گاڑی بڑے اسٹیشنوں پر زیادہ دیر اور چھوٹے اسٹیشنوں پر کم دیر رکتی ہوئی، چیختی چنگھاڑتی ہوئی، آگے بڑھتی چلی گئی۔ پھر دن تمام ہونے لگا۔ شام کی آمد آمد تھی ٹرین کے اندر ڈبے میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا لیکن باہر ابھی پوری طرح اجالا تھا۔

پھر سورج غروب ہونے لگا۔ وہ گہرے نارنجی رنگ کا ہو کر دور افق میں غائب ہو رہا تھا۔

"گاؤں میں تو سورج پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہو چکا ہو گا اور برف پوش سفید چوٹیوں میں آگ لگی ہوئی ہو گی۔" زرینہ نے سوچا۔ "گھر پر اس وقت کیا ہو رہا ہو گا؟ اماں، بابا، فیروزہ، سب لوگ کیا کر رہے ہوں گے؟" اس کا ذہن دور، بہت دور، اپنے پہاڑی گاؤں کی بلندیوں میں کہیں جا کر بھٹکنے لگا .... نہ جانے کتنا فاصلہ طے ہو چکا اور وہ اپنے گاؤں سے کتنی دور نکل آئی تھی۔ کسی کسی وقت تو اس کو یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح لگنے لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک خواب دیکھ رہی ہو۔ ابھی ذرا دیر میں اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ خواب کا سحر ٹوٹ جائے گا اور وہ اپنے آپ کو اپنے گاؤں میں اپنے بستر پر پڑا ہوا پائے گی۔ اس کے چاروں طرف صبح کا اجالا پھیل رہا ہو گا اور آخر شب کا دیکھا ہوا یہ خواب ریزہ ریزہ ہو کر اس کے اردگرد بکھر چکا ہو گا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ یہ تو ایک بڑی ہی واضح اور ٹھوس

قسم کی حقیقت تھی۔ وہ اپنا گھر بار، اپنا گاؤں، سب کچھ چھوڑ آئی تھی اور اپنے چاہنے والے کے ساتھ کراچی جا رہی تھی۔

کافی رات گئے خیر زماں نے اس کے لئے سیٹ پر کچھ جگہ بنا دی اور وہ گٹھری سی بن کر وہاں لیٹ گئی تھی۔ خیر زماں کے اصرار پر اس نے سونے کی کوشش کی تھی لیکن اسے ٹھیک سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ٹرین کے ڈبے میں تو روشنی تھی لیکن باہر بالکل اندھیرا تھا۔ البتہ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں قریب کے مناظر کسی حد تک صاف نظر آ جاتے تھے لیکن اب تو سارے مناظر ایک ہی جیسے لگ رہے تھے۔ جب بھی ذرا سی دیر کے لئے اس کی آنکھ لگتی کوئی نہ کوئی بھیانک خواب اس کو جگا دیتا۔ کبھی وہ دیکھتی کہ اس کے باپ شمروز خان نے اسے اور خیر زماں کو پکڑ لیا ہے اور دونوں کو گولی مار دی ہے۔ ان دونوں کی لاشیں شمروز خان کے قدموں میں پڑی ہوئی ہیں اور وہ خود مر جانے کے باوجود اپنی لاش کے پاس بیٹھی ہوئی اپنی اور خیر زماں کی موت پر آنسو بہا رہی ہے۔ گریہ کر رہی ہے۔ کبھی وہ دیکھتی کہ زلزلہ آ گیا ہے اور ٹرین الٹ گئی ہے۔ وہ اور خیر زماں زخموں سے چُور چُور کسی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے ہیں اور شمروز خان اپنی بندوق کے کندے سے ان دونوں کے سروں پر زور زور سے ضربیں لگا رہا ہے۔ گھبرا کر اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ تیزی سے حرکت کرتی ہوئی ٹرین میں اپنے جسم کو ہلتا ہوا محسوس کرتی اور ٹرین کی خاص قسم کی یکسانیت سے بھرپور آواز اس کے کانوں میں آ رہی ہوتی۔

اسی طرح سوتے جاگتے، جاگتے سوتے، اس نے رات گزار دی۔ خیر زماں بھی ذرا دیر کے لئے سو گیا تھا۔ پھر صبح ہو گئی اور ایک نیا دن طلوع ہو گیا۔

بالآخر ٹرین کراچی کے کینٹ ریلوے اسٹیشن پر آ کر رک گئی۔ ڈبے میں موجود کئی پشتو بولنے والوں سے خیر زماں کی دعا سلام ہو گئی تھی۔ یہ لوگ کراچی میں ہی رہتے تھے اور اس شہر سے بخوبی واقف تھے۔ خیر زماں نے ان لوگوں کو اپنے بارے میں یہی بتایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ پہلی بار کراچی جا رہا ہے۔ ان لوگوں کو اپنے بارے میں کچھ بتانے سے پہلے اس نے ان لوگوں سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ خود ان کا تعلق کس علاقے سے ہے اور وہ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ یہ سارے لوگ دوسرے علاقوں کے تھے اور یہ اس علاقے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے جس سے خیر زماں اور زرینہ کا تعلق تھا۔ ان لوگوں میں ایک باریش بوڑھا نذیر خان بھی شامل تھا جو کراچی کے علاقے اورنگی ٹاؤن میں کہیں رہتا

تھا اور پچھلے بیس سال سے کراچی میں ہی رہ رہا تھا۔ نذیر خان ایک مہربان اور نرم مزاج آدمی تھا اور اس نے خیر زماں کو کراچی کے بارے میں بہت سی باتیں بتا دی تھیں۔

"ہمیں پیر کالونی جانا ہے۔" خیر زماں نے نذیر خان سے کہا۔ "اور مجھے پشتو کے علاوہ اور کوئی زبان بولنی نہیں آتی۔ آپ کو میری مدد کرنی ہو گی۔"

"بالکل فکر مت کرو۔" بوڑھے باریش نذیر خان نے جواب دیا۔ "تم سیدھے پیر کالونی میں جا پہنچو گے۔ مگر ایک بات جان لو۔ اگر کراچی میں رہنا ہے تو پھر تھوڑی بہت اردو ضرور سیکھ لو۔ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اردو جانے بغیر تم کو کراچی میں بڑی مشکل درپیش آئے گی۔"

"میں سیکھ لوں گا۔ ضرور سیکھ لوں گا۔" خیر زماں نے فوراً آمادگی کے ساتھ کہا۔ "میں تو خود بھی اردو سیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو اب کراچی میں ہی رہنا اور کام کرنا ہے۔"

"یہاں رہو گے تو سیکھ جاؤ گے۔" نذیر خان نے کہا۔ "کچھ مشکل نہیں ہے۔ تمہاری طرح میں بھی جب پہلی بار کراچی آیا تھا تو مجھ کو اردو کا ایک لفظ بھی بولنا یا سمجھنا نہیں آتا تھا لیکن اب میں بہت اچھی طرح اردو جانتا ہوں۔"

"بس، میں بھی سیکھ جاؤں گا۔" خیر زماں نے گہری آرزومندی کے ساتھ کہا۔

جب لانڈھی کا ریلوے اسٹیشن آیا تو نذیر خان اس وقت ان لوگوں کو بتا رہا تھا کہ اب کراچی کینٹ کا اسٹیشن آنے والا ہے۔ خیر زماں اپنے چاروں طرف ایک نئی دنیا کو دیکھ رہا تھا۔

پھر جب گاڑی کینٹ اسٹیشن پر رکی تو وہ دونوں نذیر خان کے ساتھ ہی نیچے اترے۔

"میں تمہارا ہاتھ پکڑ لیتا ہوں اور تم اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ لو۔" نذیر خان نے خیر زماں سے کہا۔ "اگر تم لوگ بچھڑ گئے تو ایک دوسرے کو تلاش بھی نہیں کر پاؤ گے۔ تمہیں یہاں کی زبان بھی نہیں آتی۔"

خیر زماں نے اپنے ایک ہاتھ سے زرینہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرا ہاتھ نذیر خان کے ہاتھ میں دے دیا۔ سامان کی دونوں پوٹلیاں زرینہ نے سنبھال لی تھیں۔

زرینہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور اس کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ اس کے چاروں طرف اس قدر لوگ تھے، اس قدر لوگ تھے کہ ان سے زیادہ لوگوں کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی

تھی۔

وہ حیران تھی کہ آخر اس قدر بہت سارے لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ وہ کیوں یہاں آئے ہیں؟ ایک ہی وقت میں اتنے بے اندازہ لوگوں کی بھیڑ یہاں کیا کر رہی ہے؟

اس نے پشاور کا ریلوے اسٹیشن بھی دیکھا تھا اور وہاں کی بھیڑ بھاڑ سے بھی وہ سخت پریشان اور متعجب ہوئی تھی لیکن کراچی کینٹ اسٹیشن کی بھیڑ بھاڑ نے تو اسے بالکل ہی پاگل کر کے رکھ دیا۔

"اگر .... اگر میں خدا نخواستہ اس بھیڑ میں گم ہو جاؤں تو؟" اس نے دل میں سوچا اور اس کے ساتھ ہی اس پر ایک وحشت انگیزی طاری ہو گئی۔ "اف میرے خدا! پھر کیا ہو گا؟ اس بھیڑ میں تو بس ایک منٹ میں آدمی کہیں کا کہیں پہنچ جائے اور اس کے ساتھ والے اس سے اتنی دور نکل جائیں گے کہ پھر وہ زندگی بھر ایک دوسرے کو تلاش کرتے رہیں .... اور میں .... میں تو کسی کو کچھ بتا ہی نہیں سکتی۔ میں یہاں کی زبان بھی نہیں جانتی .... اور میں کسی کو کیا بتاؤں گی؟"

خیر زماں نے کافی سمجھداری سے کام لیا تھا۔ اس نے زرینہ کو بھی ماما دراز گل کے مکان کا نمبر اور پتہ یاد کرا دیا تھا۔ اچھی طرح سے، طوطے کی طرح رٹا دیا تھا۔

"اگر خدا نخواستہ، کوئی ایسی بات ہو جائے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو تم اس پتے پر ماما دراز گل کے پاس پہنچنے کی کوشش کرنا۔" اس نے زرینہ سے کہا تھا۔ "کوئی نہ کوئی پشتو بولنے والا تم کو مل جائے گا اور وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا لیکن ہوشیار رہنا۔ کسی کی باتوں میں مت آ جانا۔" اور اس نے کچھ پیسے بھی زرینہ کو دے دیئے تھے کہ وہ انہیں اپنے پاس رکھ لے۔

یہ سب کچھ تو تھا، لیکن اس کے باوجود زرینہ خوف کے عالم میں کسی پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ یہ تصور ہی اس کے لئے حد درجہ ہلاکت انگیز تھا کہ وہ اس اجنبی ہجوم میں گم ہو جائے اور خیر زماں سے بچھڑ جائے .... وہ ایسے کسی آدمی کو کہاں تلاش کرتی پھرے گی جو پشتو بولنا جانتا ہو اور کیا پشتو بولنے والے کی پیشانی پر لکھا ہوتا ہے کہ وہ پشتو بولنا جانتا ہے؟ اس نے گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں خیر زماں کے ہاتھ کو خوب کس کے پکڑ رکھا تھا اور اس نے نذیر خان کی شکل و صورت کو بھی بہت اچھی طرح سے اپنے ذہن میں بٹھا لیا تھا۔

کئی بار ہجوم کے ریلے میں اس کا ہاتھ خیر زماں کے ہاتھ سے چھوٹتے سے بال بال بچا لیکن ہر بار اس نے اور خیر زماں نے دونوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے سے جدا ہونے سے بچا لیا۔ ہجوم تھا کہ چاروں طرف سے ٹوٹا پڑتا تھا۔ اس قدر لوگ تھے کہ زرینہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے سارا شہر اس جگہ پر امنڈ کر آ گیا ہو۔ اس شہر کا ایک ایک شخص اپنے گھر سے نکل کر یہاں آ گیا ہو اور بلاوجہ نامانوس زبانوں میں شور مچا رہا ہو۔

طرح طرح کے لوگ تھے اور عورتیں بھی کتنی بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ اس نے کچھ عورتوں کو ساڑھی پہنے ہوئے دیکھا اور اپنی تمام تر گھبراہٹ اور پریشانی کے باوجود وہ سخت حیران ہو کر ان کے لباس کو دیکھنے لگی۔ یہ کیا عجیب و غریب قسم کا لباس تھا۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ایک۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ یہ کہاں سے شروع ہوتا تھا اور کہاں ختم ہوتا تھا۔ اس کے کسی سرے کا ہی پتہ نہیں چلتا تھا۔

اس وقت وہ کسی سے بڑے زور سے ٹکرائی اور گرتے گرتے بچی۔ خیر زماں نے اس کو جلدی سے سنبھال لیا۔ دھکا دینے والا ایک قلی تھا جو سرخ رنگ کی قمیض پہنے سر اور کندھوں پر بہت سارا سامان لادے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا جا رہا تھا اور بہت سارے بوجھ تلے دبا ہوا ہونے کے باعث اسے جلدی جلدی چلنے کی اور اپنے لئے راستہ بنائے جانے کی ضرورت تھی۔

زرینہ سنبھل گئی اور پھر وہ اِدھر اُدھر کے لوگوں کو دیکھنے کے بجائے اپنی ساری توجہ راستے پر مرکوز رکھنے لگی۔

بالآخر وہ لوگ گیٹ پر پہنچ گئے اور پھر وہاں سے باہر نکلے۔ کینٹ اسٹیشن کا وسیع و عریض، بلند و بالا چبوترہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور لوگ برابر آ جا رہے تھے۔ یہاں ریلوے پلیٹ فارم کے مقابلے میں چلنا ذرا زیادہ آسان تھا۔

وہ لوگ وہاں چبوترے پر رکے نہیں بلکہ چلتے ہوئے سیڑھیوں تک آن پہنچے اور پھر وہاں سے نیچے اتر آئے۔ خیر زماں اور زرینہ اس طلسماتی شہر کی ہر چیز کو حیرت اور بے یقینی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

طویل سیڑھیاں طے کر کے وہ نیچے اترے اور انہیں اپنے سامنے اِدھر اُدھر پھیلا ہوا شہر دکھائی دے رہا تھا۔ سڑک پر بہت ساری گاڑیاں موجود تھیں اور ان کے علاوہ بہت ساری بسیں بھی تھیں جو آ رہی تھیں اور جا رہی تھیں۔

"تو یہ ہے کراچی.........." خیر زماں نے دل ہی دل میں کہا۔ "ماما دراز گل کا کراچی .... معلوم نہیں، پیر کالونی کا محلّہ کیسا ہو گا اور یہاں سے کتنی دور ہو گا.........."

نذیر خان ان دونوں کو ساتھ لئے ہوئے نیچے سڑک پر آ گیا تھا اور پھر وہ انہیں ساتھ لئے ہوئے اس طرف چلا جدھر کئی موٹر رکشے کھڑے ہوئے تھے۔

پھر وہ وہاں رک کر ایک رکشے والے سے پشتو میں باتیں کرنے لگا۔ خیر زماں اور زرینہ پاس ہی موجود تھے۔ رکشے والا ایک عمر رسیدہ پٹھان تھا اور اس کے چہرے پر چھوٹی سفید داڑھی تھی جس کو اس نے مہندی سے رنگ کر سرخ کر لیا تھا۔ اس کے سر پر پٹھانوں والی گول ٹوپی تھی۔

"ان دونوں کو پیر کالونی لے جانا ہے۔" نذیر خان ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رکشتہ ڈرائیور سے پشتو میں کہہ رہا تھا۔ "یہ یہاں نئے ہیں اور انہیں یہاں کے راستوں وغیرہ کا ٹھیک سے علم نہیں ہے۔ انہیں سلامتی کے ساتھ پیر کالونی پہنچا دو۔ مکان نمبر تلاش کرنے میں ان کی مدد کر دینا۔ پردیسی ہیں۔ ان کا کام کرو گے تو خدا تم سے خوش ہو گا۔"

"ہاں، پہنچا دوں گا۔" رکشتہ ڈرائیور نے پشتو میں جواب دیا اور اس کے بعد وہ کرایہ طے کرنے لگا۔ کرایہ طے ہو گیا۔

"سامان کدھر ہے؟" رکشہ ڈرائیور نے پوچھا۔ "کتنا سامان ہے ساتھ میں؟"

"سامان بس یہی ہے بابا!" خیر زماں نے جلدی سے دونوں گٹھریاں اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ اور کوئی سامان نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، بیٹھو۔" رکشہ ڈرائیور نے اس سے کہا۔

رکشہ میں بیٹھنے سے پہلے خیر زماں نے نذیر خان سے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کا پتہ وہ پہلے ہی پوچھ چکا تھا۔

"میں کبھی آپ سے ملنے آؤں گا ماما!" اس نے بوڑھے نذیر خان سے کہا۔

"ہاں ہاں، ضرور آنا۔" نذیر خان نے کہا۔ "میں تم کو ادھر ڈیرے پر ہی ملوں گا۔ سارا دن ادھر ہی ہوتا ہوں۔"

نذیر خان نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اورنگی ٹاؤن میں رہتا ہے جہاں اس کا سیمنٹ کے بلاک وغیرہ بنانے کا ٹھلا ہے اور وہ سارا دن اپنے ٹھلے پر موجود رہتا ہے۔ ٹھلا

اور گھر دونوں ایک ہی جگہ پر ہیں۔ اس نے اپنا پتہ خیر زماں کو اچھی طرح یاد کرا دیا تھا۔ خیر زماں نے پوری کوشش کر کے اس پتے کو یاد کر لیا تھا۔

زرینہ حیرت' شوق اور تجسس بھری نظروں سے موٹر رکشے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے سے کئی موٹر رکشے گزر چکے تھے جن میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ خود کسی بھی موٹر رکشہ میں نہیں بیٹھی تھی۔ اپنے گاؤں میں تو اس نے کبھی موٹر رکشہ دیکھا ہی نہیں تھا۔

جب وہ اس عجیب و غریب قسم کی سواری میں بیٹھی تو ایک خاص قسم کی اضطرابی کیفیت کا شکار تھی۔ وہ بس اور تانگے وغیرہ کا سفر کر چکی تھی لیکن اس سواری میں وہ اب تک نہیں بیٹھی تھی۔ صرف دو تین دن کے اندر اندر اس کی زندگی میں زبردست تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں اور اس کے تجربات کے ذخیرے میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیسے دنیا بدل گئی تھی۔ وہ ایسی ایسی چیزوں سے روشناس ہو رہی تھی اور انہیں برت رہی تھی جن کے بارے میں اس سے پہلے اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

وہ دونوں رکشہ میں بیٹھ گئے۔ اپنی اپنی پوٹلیاں سنبھال کر اور رکشہ ایک خوفناک آواز کے ساتھ اسٹارٹ ہو گیا۔ چلتے چلتے نذیر خان نے ایک بار پھر پٹھان رکشہ ڈرائیور کو تاکید کی کہ وہ ان دونوں کو خیریت کے ساتھ ان کی منزل پر پہنچا دے۔

رکشہ چلا اور چند ہی منٹ میں جیسے ہوا میں اُڑنے لگا اور اس کے ساتھ ہی زرینہ کے ہوش بھی اُڑنے لگے۔ خوف کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ اسے بس یا ٹرین میں سفر کرتے ہوئے بالکل خوف نہیں محسوس ہوا تھا لیکن رکشہ میں بیٹھنے کے بعد تو اس کو یوں لگا تھا جیسے ابھی ابھی وہ شیطانی سواری میں سے اچھل کر دور جا گرے گی یا قریب سے گزرنے والی کوئی بھاری بھرکم گاڑی اس چھوٹے سے رکشے کو کھینچتی ہوئی چلی جائے گی اور وہ اور خیر زماں' مع اس ڈرائیور کے 'گوشت کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائیں گے۔ بڑی بڑی بسیں اور دیوہیکل گاڑیاں رکشہ کے پاس سے زن زن کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اب کوئی گاڑی رکشہ سے ٹکرائی اور اب ٹکرائی لیکن پھر رکشہ دندناتا ہوا گزر جاتا تھا اور بھاری گاڑی بھی اس سے ٹکرائے بغیر آگے نکل جاتی تھی۔

پھر جب رکشہ شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر سے گزرا اور ایمپریس مارکیٹ سے ہوتا ہوا بندر روڈ' گرو مندر اور جمشید روڈ سے گزر کر پیر کالونی تک پہنچا تو خیر زماں اور زرینہ دونوں

ہی حیرت' تجسس اور خوف کے مارے بے ہوش ہوئے جا رہے تھے۔ انہوں نے زندگی کی یہ عجیب و غریب اور ناقابل تصور شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انسانوں اور طرح طرح کی گاڑیوں کے اتنے بڑے ہجوم بھی سڑکوں پر موجود ہو سکتے ہیں۔ انہیں اس بات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے ایک ایسی نرالی اور انوکھی دنیا تھی جس کے نظاروں میں کھو کر وہ اور سب کچھ بھول گئے تھے۔ بندر روڈ سے گزرتے وقت انہوں نے بعض اس قدر بلند و بالا عمارتیں دیکھیں کہ ان پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ تو ساری دنیا ہی عجیب تھی۔ وہ دونوں جیسے ہوا کے گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اڑتے چلے جا رہے تھے اور طویل سفر تھا کہ جیسے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ کئی جگہ تو بدحواسی اور خوف کے عالم میں زرینہ کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی لیکن رکشے والا تو اسی انداز سے رکشہ چلاتا رہا اور بالآخر اس نے ان کو پیر الٰہی بخش کالونی پہنچا دیا۔

رکشہ پیر کالونی کے بس اسٹاپ کے پاس سے گزر کر کالونی کی واحد مین روڈ پر آ گیا اور پھر وہاں رکشہ والے نے ایک جگہ رکشہ روک کر ایک دُکان والے سے مکان نمبر پوچھا۔ خیر زماں نے اس کو مکان نمبر بتا دیا تھا۔

یہ مکان نیا بازار کے پیچھے ایک گلی میں واقع تھا اور کالونی کے اس حصے میں تھا جس کے بعد تھوڑا سا آگے نشیب میں اترنے کے بعد نشتر بستی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ رکشہ ڈرائیور نے مکان کا پتہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور اس نے ان دونوں کو ٹھیک اسی مکان پر لے جا کر اتار دیا۔

"یہ ہے وہ مکان۔" اس نے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خیر زماں سے کہا۔

"جو نمبر تم نے بتایا تھا اس نمبر کا مکان یہی ہے۔"

"بڑی مہربانی بابا!" خیر زماں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا اور اسے کرایہ ادا کر دیا۔ رکشہ ڈرائیور کرایہ لے کر وہاں سے چلا گیا۔

خیر زماں نے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر ایک نظر ڈالی۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا اور اس کا دروازہ کافی بڑا اور خوبصورت تھا۔ اس علاقے میں ان دونوں کو ہر طرف مکانات ہی مکانات دکھائی دے رہے تھے۔ بس اسٹاپ سے لے کر یہاں تک جہاں کہ وہ آ کر رک گئے تھے' مکانات کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ زرینہ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کتنے بہت سے مکانات تھے۔ یہ علاقہ تو اپنی جگہ پر خود ایک پورا شہر معلوم ہو رہا تھا۔

ایک بے حد گھنی آبادی والا شہر جہاں سینکڑوں مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور جہاں کے بازار میں اور دکانوں میں بہت رونق تھی۔

ان دونوں پر اس وقت شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ ان کے ہر دوسرے جذبے پر اب صرف خوشی کا جذبہ غالب تھا۔ تحیر' خوف' تجسّس' ہر چیز کو اب خوشی کے جذبے نے مغلوب کر کے رکھ دیا تھا۔ بالآخر یہ خطرناک سفر تمام ہوا تھا۔ ایک بے حد دشوار گزار اور جان لیوا مرحلہ طے ہو گیا تھا اور وہ دونوں صحیح و سالم کراچی' ماما دراز گل کے گھر کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔

خیر زماں نظریں دوڑا دوڑا کر اپنے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ کتنے بہت سارے لوگ چلتے پھرتے' آتے جاتے اور مختلف کاموں میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ ایک دکان میں کچھ لوگ لوہے کا کام کر رہے تھے۔ ایک اور دکان میں سائیکلوں کی مرمت ہو رہی تھی۔ اسی طرح کے کئی مناظر تھے جو ان کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرا رہے تھے۔

اگرچہ اس طویل بوجھل اور خطروں سے بھرپور سفر نے ان دونوں کو تھکا دیا تھا لیکن ماما دراز گل کے دروازے پر پہنچتے ہی وہ جیسے راستے کی ساری تھکن اور شدید ذہنی اذیت کو بالکل بھول گئے تھے اور ان کے نوجوان اور صحت مند جسم ایک بار پھر یکبارگی توانائی سے بھر گئے تھے اور یہ ایسی توانائی تھی جو نہ صرف یہ کہ ان کے جسموں کو تقویت بخش رہی تھی بلکہ اس نے ان کے دماغوں کو بھی روشن کر ڈالا تھا اور وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔

خیر زماں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے پر دستک دی اور اس دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے والا دراز گل کا سب سے بڑا بیٹا شہزاد آیا تھا۔ شہزاد' خیر زماں کو پہچانتا تھا مگر اچانک یوں بالکل غیر متوقع طور پر اسے اپنے گھر کے دروازے پر چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت کے ساتھ کھڑا دیکھ کر وہ اس کو فوری طور پر پہچان نہیں سکا۔ ویسے بھی ان دونوں کی آخری ملاقات کو تقریباً دو سال کا عرصہ گزر گیا تھا اور اس دوران ان دونوں کے ہی اندر کافی تبدیلیاں نمودار ہو چکی تھیں۔ خیر زماں نے تو شہزاد کو فوراً ہی پہچان لیا کیونکہ اس کو تو معلوم تھا کہ یہ شہزاد ہی کا گھر ہے لیکن شہزاد کو تو نہیں معلوم تھا کہ اس کی پھوپھی کا بیٹا خیر زماں آنے والا ہے۔

"جی؟" شہزاد نے اردو میں کہا۔ "کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"تم شہزاد ہو نا؟" خیر زماں نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے پشتو میں اس سے پوچھا اور شہزاد چونک پڑا اور تب اس نے خیر زماں کو پہچان لیا۔

"تم .... خیر زماں ہو؟" اس نے چونک کر پشتو میں کہا اور خیر زماں جوش مسرت میں آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گیا۔ "ہاں' میں خیر زماں ہوں شہزاد! میں خیر زماں ہوں۔"

"ارے' تو آؤ آؤ..........." شہزاد نے جلدی سے کہا۔ "اندر آؤ..........."

خیر زماں' زرینہ کو اپنے ساتھ لئے ہوئے مکان کے اندر داخل ہوا اور شہزاد نے ان دونوں کے پیچھے دروازے کو بند کر دیا۔ وہ دونوں کو ساتھ لئے ہوئے مکان کے اندر چلا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ خیر زماں کے ساتھ آنے والی عورت کون ہے۔

دراز گل کی بیوی اور شہزاد کی ماں تاجور سامنے ہی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے آنے والوں کو دیکھا اور ایک دم ٹھٹک گئی۔ اس نے بھی خیر زماں کو آج سے تقریباً دو سال پہلے دیکھا تھا اور تب سے اب تک خیر زماں کی شکل و صورت میں خاصی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں اور وہ فوری طور پر خیر زماں کو پہچان نہیں سکی۔ اور پھر نو وارد کے ساتھ ایک لڑکی کی موجودگی معاملے کو اور بھی زیادہ پُراسرار اور ناقابل فہم بنا رہی تھی۔

لیکن خیر زماں نے تو اپنی ممانی کو فوراً ہی پہچان لیا اور اس نے بڑے ادب سے اس کو سلام کیا۔ اس کے اور اس اجنبی لڑکی کے سلام کا جواب دے کر وہ ابھی خیر زماں کو پہچاننے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اس کے بیٹے شہزاد نے اس کی مشکل حل کر دی۔

"اماں! خیر زماں آیا ہے .... گاؤں سے..........." اس نے خیر زماں اور زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ .... خیر زماں!" تاجور نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔ "دو سال کے اندر تم کتنے زیادہ بدل چکے ہو۔ میں تو تمہیں پہچان ہی نہیں سکی۔ آؤ .... آؤ اور .... اور یہ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"یہ .... یہ .... زرینہ ہے مامی!" خیر زماں نے جواب دیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مزید کیا کہے۔ زرینہ کا تعارف کروانا ایک بڑا مشکل معاملہ تھا۔ جہاں تک ماما دراز گل کا تعلق تھا تو ان کو تو ہر بات پوری تفصیل کے ساتھ معلوم تھی لیکن مامی کو تو کچھ نہیں معلوم تھا اور وہ مامی کو بتائے بھی تو کیسے بتائے' اور کیا بتائے۔

وہ دونوں اندر آ کر برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے اور شہزاد اور تاجور ان کے پاس تھے۔ تاجور بڑے غور اور تعجب کے ساتھ زرینہ کو دیکھ رہی تھیں وہ زرینہ کو نہیں پہچانتی تھی لیکن اس معاملے کے بارے میں کچھ تھوڑا بہت جانتی ضروری تھی۔ اس کے شوہر نے ابھی کچھ ہی دن پہلے گاؤں سے واپس آنے کے بعد اس کو اپنے بھانجے خیر زماں اور بابر خیل کے شمروز خان کی بیٹی زرینہ کے والہانہ عشق کے بارے میں بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے یہ رشتہ طے کروانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن شمروز خان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کچھ نہیں ہو سکا تھا۔

"یہ دشمنیاں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔" تاجور نے اپنے شوہر کی زبانی اس سارے معاملے کا مختصر احوال سننے کے بعد کہا تھا۔ "ان لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ صدیوں سے جہاں کھڑے ہوئے تھے وہیں کھڑے ہوئے ہیں اور اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے۔ یہ لوگ اپنی فرسودہ روایات میں اسی طرح الجھے رہیں گے۔" نوعمری میں ہی شہر آ جانے اور یہاں مستقل رہائش اختیار کر لینے کے بعد تاجور بھی اپنے شوہر کی طرح کافی بدل گئی تھی اور اس کی سوچ میں بہت سی تبدیلیاں نمودار ہو گئی تھیں۔

اور اب اپنے شوہر کے بھانجے خیر زماں کو ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ اپنے گھر میں دیکھ کر تاجور کو وہ ساری باتیں یاد آ گئیں جو اس کے شوہر نے خیر زماں اور زرینہ کے حوالے سے اس کو بتائی تھیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ تاجور زرینہ کو نہیں پہچانتی تھی لیکن موجودہ صورت حال میں وہ زرینہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی اور پھر تو خود خیر زماں نے بھی اس امر کی تصدیق کر دی تھی کہ وہ زرینہ ہی تھی۔

خیر زماں کی زبانی یہ الفاظ سن کر کہ "یہ زرینہ ہے" تاجور کا سر گھومنے لگا۔ اسے ساری صورت حال کو سمجھنے میں ایک منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں لگا۔ زرینہ تنہا خیر زماں کے ساتھ اچانک کراچی میں اس کے گھر میں موجود تھی۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ خیر زماں زرینہ کو بھگا کر لے آیا ہے۔ ایک انجانے خوف سے تاجور کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے نوجوان بیٹے شہزاد کی طرف دیکھا' جو زرینہ اور خیر زماں کے معاشقے سے بالکل ناواقف تھا اور ان دونوں کی اچانک' غیر متوقع اور ناوقت آمد سے سخت حیران ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی نو عمر بیٹی دردانہ کی طرف دیکھا جو مکان کے

دوسرے حصے سے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی اور گاؤں سے آنے والے مہمانوں سے ملنے کے لئے ان کے قریب آ رہی تھی۔

چار بچوں کی ماں تاجور کے لئے یہ بڑا خوفناک اور خطرناک واقعہ تھا۔ اس واقعے نے اس کے شوہر اور اس کے بچوں کی زندگی کو اور خود اس کی اپنی زندگی کو سخت خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ایک ایسی لڑکی نے اس کے گھر میں آ کر پناہ لی تھی جسے اس کے شوہر کا بھانجا گاؤں سے بھگا کر لایا تھا۔ اس کا انجام کیا ہو گا؟ انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کتنے گھروں کو بھسم کرتی چلی جائے گی اور کتنی انسانی زندگیاں اس کی لپیٹ میں آتی چلی جائیں گی؟ نہیں نہیں .... وہ اپنے گھر کو برباد نہیں ہونے دے گی مگر........... وہ کیا کرے گی؟ گھر آئے ہوئے مہمانوں کو نکالا بھی تو نہیں جا سکتا..........

اس نے فی الوقت تو مصلحت سے کام لیا اور اپنے بچوں کی موجودگی میں خیر زماں سے زرینہ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اس معاملے پر وہ اب اپنے شوہر کی موجودگی میں ہی بات کرنا چاہتی تھی اور ابھی تو صورت حال پوری طرح واضح بھی نہیں تھی۔

"ماما کہاں ہیں؟" خیر زماں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تاجور سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"ابھی ذرا دیر میں آ جائیں گے۔" تاجور نے جواب دیا۔ "ذرا کسی کام سے منڈی تک گئے ہیں۔ تم سناؤ' تم دونوں گاؤں سے اکیلے ہی آئے ہو یا کوئی اور بھی تمہارے ساتھ آیا ہے؟" اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"ہم دونوں اکیلے ہی آئے ہیں مامی!" خیر زماں نے جواب دیا۔ "اصل میں' ماما جب گاؤں تھے تو مجھ سے بہت کہہ رہے تھے کہ میں ان کے ساتھ ہی کراچی چلوں لیکن میں نے ماما سے کہا تھا کہ بعد میں کراچی آؤں گا۔ تو میں آ گیا۔" اور وہ آہستہ سے ہنسا لیکن تاجور اس کی ہنسی میں شریک نہیں ہوئی۔ کوئی بھی اس کی ہنسی میں شریک نہیں ہوا۔

شہزاد اور دردانہ دونوں بڑی عمر کے اور سمجھدار بچے تھے اور وہ اس قسم کی باتوں کو بخوبی سمجھ سکتے تھے ان دونوں کو یہ بات تو بہت اچھی طرح سے معلوم تھی کہ یہ لڑکی جو خیر زماں کے ساتھ گاؤں سے آئی ہے اُن کے رشتے داروں میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ گاؤں میں موجود اپنے سارے رشتے داروں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جب بھی گاؤں جاتے تھے سارے ہی رشتے داروں سے ان کی ملاقات ہوتی تھی اور ان تمام رشتے داروں میں زرینہ

نامی کوئی لڑکی شامل نہیں تھی ان دونوں کی آنکھوں میں شکوک و شبہات کے سائے لرز رہے تھے وہ اس لڑکی کے بارے میں پوچھنا اور جاننا چاہتے تھے۔ وہ کون تھی؟ اور اکیلی خیر زماں کے ساتھ کیوں آئی تھی؟ خیر زماں تو اپنے گھر سے نکل کر آج تک کسی بڑے شہر میں نہیں گیا تھا وہ ایک دم سے کراچی کیسے آگیا؟ اور اس کے والدین نے اس کو تنہا ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ کراچی جانے کی اجازت کیوں کر دی؟ دونوں بچوں کے دل و دماغ میں بہت سارے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔

"تم .... تم زرینہ ہو؟" تاجور نے قدرے توقف کے بعد زرینہ سے براہ راست سوال کیا۔ "تم شمروز خان کی بیٹی ہو نا؟"

"جی ہاں۔" زرینہ نے بہت آہستہ آواز میں جواب دیا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں ڈوب رہا تھا اور چہرہ ایک دم سرخ ہو کر پسینے میں بھیگ کر یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے ابھی ابھی منہ دھویا ہو ان سب کو لوگوں کی سوالیہ نظریں اسے تیروں کی طرح اپنے جسم کے اندر چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ کس قدر مشکل تھا ان نظروں کا سامنا کرنا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا اس کا کسی قدر اظہار ان کی نظروں سے ہو رہا تھا اور زرینہ سے یہ نظریں برداشت نہیں ہو رہی تھیں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جلدی سے یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے اور اپنے آپ کو ان لوگوں کی نظروں سے چھپا لے سب کی نظروں سے چھپا لے اور کہیں جا کر روپوش ہو جائے کسی کونے میں چھپ جائے۔

"تمہارے گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟" تاجور نے اگلا سوال کیا۔

"جی .... وہ بھی ٹھیک ہے۔" زرینہ نے اسی طرح زمین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہو رہا تھا اس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی جان جا رہی ہو۔ وہ تاجور کے اگلے زیادہ مشکل سوال کا انتظار کر رہی تھی اور جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اپنے والدین یا بہن کے بغیر کراچی کیوں آئی ہے۔

وہ خیر زماں کے ساتھ اکیلی کراچی کیوں آئی ہے؟ کیا اس کے والدین کو اس بات کا علم ہے کہ وہ خیر زماں کے ساتھ کراچی گئی ہے؟ کیا وہ اپنے والدین کی اجازت سے یہاں آئی ہے؟

اور اس قسم کا کوئی بھی سوال ہو سکتا تھا جو اس سے پوچھا جا سکتا تھا اور اس کے

جواب میں اسے کیا کہنا چاہئے تھا؟ معلوم نہیں مگر کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

اصل میں ان دونوں کو یعنی خیر زماں اور زرینہ کو اتنی بہت ساری دوسری اور اہم باتوں کے بارے میں سوچنا تھا فیصلہ کرنا تھا اور اپنے آپ کو تیار کرنا تھا کہ اس بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا کہ اگر ان کے کراچی پہنچنے پر ماما دراز گل گھر پر نہیں ملے، تو مامی اور دوسرے لوگوں کو اپنی آمد کے بارے میں کیا بتایا جائے گا اور اب وہی صورت حال درپیش آگئی تھی۔ اگر ماما دراز گل موجود ہوتے تو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی وہ تو ان دونوں کی صورت دیکھ کر ہی سارے معاملے کو فوری طور پر سمجھ جاتے اور معاملہ سنبھال بھی لیتے۔ ماما دراز گل کی موجودگی میں تو کچھ سوچنے کی اور پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

لیکن تاجور نے زرینہ سے اس کے بارے میں اس کے علاوہ اور کوئی سوال نہیں پوچھا۔ تاہم اس کے چہرے کا تاثر زرینہ کو واضح طور پر یہ بتا دے رہا تھا کہ وہ اس سارے معاملے میں پوری طرح واقف ہو چکی ہے اور یہ کہ اس نے اس کو پسند نہیں کیا ہے۔

"تم دونوں ٹرین سے آ رہے ہو؟" تاجور نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا اور خیر زماں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ "جی مامی!"

"اور .... سیدھے یہیں آ رہے ہو۔" تاجور نے تیز نظروں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے اگلا سوال پوچھا۔ "میرا مطلب ہے .... کسی اور کے گھر تو نہیں گئے تھے؟"

"نہیں مامی!" خیر زماں نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں کراچی میں بھلا آپ لوگوں کے علاوہ اور کس کو جانتا ہوں؟ میرا تو یہاں اور کوئی بھی نہیں ہے۔"

"میرا مطلب ہے شاید زرینہ کے کوئی رشتے دار وغیرہ۔" تاجور نے کہا۔

"نہیں مامی!" خیر زماں نے کہا۔ "ہم لوگ تو ٹرین سے اتر کر سیدھے آپ ہی کے گھر آ رہے ہیں۔"

"اچھا تو ایسا کرو پہلے تم دونوں نہا دھو لو، ہمارے گھر میں تین باتھ روم ہیں تم دونوں نہانے چلے جاؤ کپڑے تو ہیں تمہارے پاس، لائے ہو کپڑے؟"

تاجور کے اس سوال میں چھپی ہوئی چبھن نے زرینہ کو بری طرح زخمی کر کے رکھ دیا۔ وہ دل ہی دل میں کٹ کر رہ گئی اس کے بارے میں کیسی کیسی خوفناک باتیں سوچی جا

رہی تھیں لیکن کیا کوئی غلط بات بھی تھی' کیا وہ لوگ ایسا سوچنے میں حق بجانب نہیں تھے؟

"کپڑے ہیں ہمارے پاس مامی!" خیر زماں نے جلدی سے کہا۔ "بھلا کپڑے کیوں نہیں ہوں گے۔"

"دردانہ!" تاجور نے اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "زرینہ کو اپنے والے باتھ روم میں لے جاؤ اور دیکھو جس چیز کی اسے ضرورت ہو اس سے پوچھ لینا اور تم خیر زماں کو دوسرے والے باتھ روم میں لے جاؤ۔" اس نے اپنے بیٹے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں مکسر کے استعمال کے بارے میں بتا دینا تم بھی دردانہ ایسا نہ ہو غلطی سے صرف گرم پانی کا نل کھول دیں اور جل جائیں۔"

دردانہ زرینہ کو اپنے ساتھ باتھ روم میں لے گئی اور اسے نلوں کو کھولنے بند کرنے کا طریقہ اور ٹھنڈے گرم پانی کو حسب منشا آپس میں ملانے کی ترکیب بتانے لگی۔ زرینہ یہ سب کچھ بڑی حیرت اور تجسس کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

"خیال رکھنا؟" دردانہ نے اس سے کہا۔ "اگر صرف گرم پانی والا نل کھولو گی تو گرم پانی ہی آئے گا جو اتنا گرم ہو گا کہ تمہارا جسم جل جائے گا۔ گرم کے ساتھ ٹھنڈے پانی کا نل بھی کھولنا اور پھر اس نل کو کھولنا۔" وہ اسے بتا رہی تھی اور زرینہ پوری توجہ کے ساتھ یہ سب کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دوسری طرف دوسرے باتھ روم میں شہزاد یہی سب کچھ خیر زماں کو سمجھا رہا تھا اور خیر زماں حیرت سے ان نلوں کو دیکھ رہا تھا جن میں حسب منشا گرم اور ٹھنڈے پانی کو آپس میں ملایا جا سکتا تھا۔

"اماں' یہ لڑکی کون ہے؟" شہزاد نے خیر زماں کو باتھ روم میں چھوڑنے کے بعد اپنی اماں کے پاس آ کر رازدارانہ لہجے میں پوچھا اس وقت تک دردانہ بھی زرینہ کو دوسرے باتھ روم میں چھوڑ کر وہاں آ چکی تھی۔ "یہ ہمارے رشتے داروں میں سے تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" تاجور نے سنبھل کر جواب دیا۔ "وہ ہمارے رشتے داروں میں سے نہیں ہے وہ ہمارے گاؤں کی بھی نہیں ہے۔ پڑوس کے کسی گاؤں کی ہے اور.........."

"تو پھر وہ خیر زماں کے ساتھ کیسے یہاں آ گئی اماں!" دردانہ نے جلدی سے سوال کیا۔ "وہ اپنے والدین کی اجازت کے بغیر آئی ہے کیا؟"

"شاید!" تاجور نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "تمہارے ابا آ جائیں تو پھر وہ خود ہی

اس سے پوچھیں گے کہ وہ اس اجنبی لڑکی کو کیوں اپنے ساتھ لایا ہے؟"

"یا یہ کہ وہ لڑکی کیوں اس کے ساتھ یہاں آئی ہے؟" دردانہ نے اس بات کو دوسرے انداز میں کہا اور تاجور نے اس کو گھور کر دیکھا۔ تاجور کے دل و دماغ میں سنسنی دوڑ رہی تھی' دونوں بڑے بچے صورتِ حال کو پوری طرح سمجھ رہے تھے۔ "یاخدا! ہمیں آنے والے دنوں سے محفوظ رکھنا۔" وہ دل ہی دل میں خاموشی سے کہہ رہی تھی۔

"تم باورچی خانے میں جاؤ دردانہ!" اس نے اپنی بیٹی سے کہا۔ "چائے بنا لو تمہارے ابا جی بس آنے ہی والے ہوں گے' کہہ کر گئے تھے کہ جلد آ جاؤں گا۔ مہمانوں کے ساتھ وہ بھی چائے پی لیں گے۔" تاجور چاہتی تھی کہ اس کی نوعمر بیٹی اس وقت اس کے پاس سے چلی جائے اور اس کو زیادہ سوالوں سے تنگ نہ کرے۔ وہ پوری طرح صورت حال سے باخبر ہوئے اور اپنے شوہر کے ساتھ مشورہ کئے بغیر اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا دماغ تو اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے' یہ کیسی افتاد گھر پر نازل ہو گئی تھی اور آگے کیا ہونے والا تھا۔

"بڑے تعجب کی بات ہے اماں!" شہزاد نے اپنی ماں سے کہا۔ "خیر زماں اکیلا اس لڑکی کو لے کر گاؤں سے کراچی آن پہنچا اور اب وہ واپس بھی شاید اس کے ساتھ جائے گی؟" شہزاد معنی خیز انداز میں اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا وہ اپنی زبان سے کچھ کہے بغیر ہی سب کچھ کہے ڈال رہا تھا۔

تاجور نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے شوہر کی آمد تک خاموش ہی رہنا چاہتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد خیر زماں اور زرینہ دونوں نہا دھو کر باتھ روموں سے نکل آئے' دردانہ نے چائے تیار کر کے رکھ لی تھی۔ تاجور نے ان دونوں کو ڈائننگ روم میں لے جا کر میز کے گرد بٹھا دیا جہاں چائے کا سامان رکھا ہوا تھا۔

زرینہ کے لئے اور خیر زماں کے لئے بھی یہ سب کچھ نیا تھا۔ رہنے بسنے کا یہ انداز ان کے اپنے طرز زندگی سے قطعی طور پر مختلف تھا اور اس میں کتنی ہی چیزیں ایسی تھیں جن کے بارے میں وہ دونوں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ اتنی ذرا سی دیر میں ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کتنی اشیاء ایسی تھیں جن کے استعمال سے وہ لوگ بالکل ناواقف تھے۔

وہ دونوں میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ دراز گل آ گیا۔

دراز گل جب اس کمرے کے اندر داخل ہوا اور اس نے وہاں ان دونوں کو میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھا ہوا پایا تو اسے فوری طور پر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

وہ دونوں نہائے دھوئے بیٹھے تھے اور خاصے تر و تازہ نظر آ رہے تھے۔ خیر زماں اور زرینہ وہ دونوں اس کی نظروں کے سامنے اپنے گاؤں سے سینکڑوں میل دور کراچی میں اس کے گھر کے ڈائننگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہ انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

"ارے .... تم؟" ان دونوں کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے سخت حیرت کے عالم میں کہا۔ "تم لوگ کب آئے اور کیسے آئے؟"

"ہم .... ہم لوگ ابھی تھوڑی دیر پہلے آئے ہیں ماما!" خیر زماں نے سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ "اور ٹرین کے ذریعے کراچی آئے ہیں۔"

"لیکن تم یہاں پہنچ کس طرح گئے؟" دراز گل کی حیرت میں کمی نہیں آئی تھی۔ "تم نے گھر کس طرح تلاش کیا؟"

"رکشہ والے نے یہاں تک پہنچا دیا۔" خیر زماں نے کہا اور مختصراً دراز گل کو اپنے یہاں تک پہنچنے کی داستان سنائی۔

"آپ کہہ رہے تھے ماما کہ میں آپ کے ساتھ کراچی چلوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "اور میں نے کہا تھا کہ میں کچھ دنوں کے بعد آؤں گا تو دیکھ لیجئے میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا .... میں .... میں کراچی آ گیا ہوں۔"

دراز گل نے اس کی بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے زرینہ کی طرف دیکھا جو کرسی پر سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں نیچے کو جھکی ہوئی تھیں۔

اس وقت گھر کے سارے افراد جن میں چاروں بچے شامل تھے اس کمرے میں موجود تھے۔ شہزاد اور دردانہ کے علاوہ فائزہ اور افراسیاب بھی موجود تھے۔

دراز گل سخت بوکھلایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات چیت کا آغاز کس سے کرے اور کہاں سے کرے۔ اس کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ خیر زماں زرینہ کو ساتھ لے کر یہاں آن پہنچے گا۔ اس میں تو رتی برابر شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ زرینہ کو بھگا کر لایا تھا اور دونوں نے ایسا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں ان کو ہلاک کیا جا سکتا تھا۔

چند لمحوں کے اندر اندر دراز گل کے دماغ میں صدیوں پرانی خوں چکاں روایات کی لہو روتی ہوئی ان گنت تصاویر گھومتی چلی گئیں۔

زرینہ کا اب دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں تھا' اپنے والدین کے گھر کی دہلیز کو خفیہ طور پر پار کر کے اس نے اپنے آپ کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کر دیا تھا۔ وہ اب سب کے لئے ناقابل قبول تھی۔ اگر اس کو اس کے والدین کے حوالے کر بھی دیا جاتا تو بھی وہ اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیتے۔ وہ اسے دوبارہ اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے تھے اور نہ صرف یہ کہ اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے تھے' اسے کہیں بھی زندہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی اس کو پائیں گولی مار دیں اور یہی حشر خیر زماں کے لئے بھی مقسوم تھا۔ اس نے شمروز خان کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا' اس کی غیرت کو للکارا تھا اور اس کی سزا اس سے کم نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کو گولی مار دی جائے۔

اپنے معاشرے کے دونوں مجرم اپنے گاؤں سے بہت دور کراچی میں دراز گل کے مکان میں بیٹھے ہوئے تھے اور دراز گل کے لئے یہ صورتِ حال قطعی طور پر خوش آئند نہیں تھی۔ اس نے خیر زماں کو یہ مشورہ تو ہرگز نہیں دیا تھا کہ وہ زرینہ کو بھگا لے جائے۔ ایسی حماقت آمیز اور خطرناک بات تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شمروز خان کو راضی کرنے میں ناکامی کے بعد اس نے خیر زماں سے یہی کہا تھا کہ وہ اس سارے قصے کو بھول جائے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے اور اسی لئے اس نے اس سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ کراچی چلا چلے۔

اور اب خیر زماں کراچی میں موجود تھا لیکن وہ تنہا نہیں تھا' موت اس کے ساتھ موجود تھی۔ اس کے ساتھ بھی اور زرینہ کے ساتھ بھی۔

دراز گل ایک طویل عرصہ سے گاؤں سے اور اس معاشرے سے جس کا کہ وہ ایک حصہ تھا عملی طور پر اپنا ناطہ تقریباً توڑ چکا تھا وہ پندرہ سال کی عمر سے کراچی میں رہ رہا تھا اس کی بیوی بھی کراچی میں ہی رہ رہی تھی۔ ان کے سارے بچے کراچی میں پیدا ہوئے اور کراچی کے معاشرے کا ہی حصہ تھے وہ اور اس کی اولادیں قتل و غارت گری کی کسی واردات میں شریک نہیں تھے۔ ربع صدی سے زیادہ کا عرصہ گزرا کہ دراز گل کا خاندان کراچی میں مکمل طور پر امن و سکون کی زندگی گزار رہا تھا ان لوگوں کی کسی سے دشمنی نہیں تھی اور وہ اپنی جانوں کے لئے کسی سے خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے لیکن اب

اچانک خیر زماں اور زرینہ کی صورت میں ایک بہت بڑا اور جان لیوا خطرہ ان کے گھر پر نازل ہو چکا تھا۔

بات چیت کا آغاز کیسے اور کہاں سے کیا جائے؟ دراز گل کے دماغ میں بار بار یہ سوال اٹھ رہا تھا۔ اس کی بیوی وہاں موجود تھی' چاروں بچے موجود تھے۔ دراز گل اور اس کی بیوی تاجور دونوں اپنے آپ کو سخت عذاب میں مبتلا پا رہے تھے۔

اچانک دراز گل نے ایک فیصلہ کیا۔ وہ چائے ختم کرنے کے بعد خیر زماں کو الگ کمرے میں لے جائے گا اور وہاں اس کے ساتھ بیٹھ کر بات کرے گا اور اس نے اپنے اس خیال اور فیصلے کا اظہار بھی کر دیا۔

"چائے پینے کے بعد میرے کمرے میں چلنا خیر زماں!" اس نے کہا۔ "وہاں بیٹھ کر ہم اطمینان کے ساتھ باتیں کریں گے۔ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

"جی ماما!" خیر زماں نے جلدی سے کہا۔ زرینہ کی جھکی ہوئی نظریں اور زیادہ جھک گئیں اور اس کے چہرے کا گلابی رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا۔ وہ یہاں آنے کے بعد خود کو بے بس محسوس کرنے لگی تھی' اس نے اس بات کا پہلے اندازہ نہیں لگایا تھا کہ وہاں خیر زماں کے ماموں دراز گل کے گھر اس کا گرم جوشی اور باعزت خیر مقدم نہیں کیا جائے گا بلکہ کہیں بھی اس کا باعزت خیر مقدم نہیں کیا جائے گا کہ یہاں ابھی تک کسی نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا نہ کچھ پوچھا تھا نہ کوئی رائے زنی کی تھی لیکن ہر بات زبان سے تو نہیں کہی جاتی' آدمی کے تیور تو بولتے ہیں' آدمی کے ماتھے کی لکیریں بولتی ہیں' آدمی کا رویہ بولتا ہے۔

زرینہ جو کچھ محسوس کر رہی تھی وہ اس کے دل و دماغ کو اس کی روح تک کو زخمی کئے ڈال رہا تھا لیکن اس سب کو برداشت کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اس راستے کا انتخاب تو اس نے خود ہی کیا تھا۔ کسی نے اس کو ایسا کرنے کے لئے مجبور تو نہیں کیا تھا۔ یہ سب کچھ تو محبت کی قوت تھی۔ محبت' ہاں محبت کی خاطر تو یہ سب کچھ کیا جا سکتا تھا اور وہ یہ سب کچھ کر گزری تھی۔ اب انجام جو ہو سو ہو۔

وہ ایک لڑکی تھی' شیشے سے زیادہ نازک اور پھول سے زیادہ نرم۔ شیشے پر بال آ جائے تو پھر دوبارہ اپنی اصلی حالت میں واپس نہیں آتا' پھول مرجھا جائے تو پھر وہ دوبارہ شاداب ہو کر اپنے حسن گم گشتہ کو حاصل نہیں کر سکتا اور زرینہ نے یہ سب جانتے بوجھتے

اپنی محبت کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیا' راہِ عشق میں اپنے آپ کو مٹا دیا تھا۔ اب تو جو کچھ بھی ہونے والا تھا' اس کو برداشت کرنا ہی تھا۔

"تمہارے والدین تو ٹھیک ہیں زرینہ!" دراز گل نے کچھ دیر کے بعد چائے پینے کے دوران زرینہ سے سوال کیا۔

"جی .... جی ہاں ماما!" زرینہ نے مختصر سا جواب دیا اور اس کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔

کچھ دیر کے بعد چائے ختم ہو گئی اور دراز گل خیر زماں کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا جہاں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

"یہ کیا غضب کر دیا تم نے؟" دراز گل نے سخت ناگواری اور غصے کے ساتھ کہا۔

"تم اس کو بھگا لائے ہو اپنے ساتھ؟"

"اس کے سوا اور کیا صورت تھی ماما؟" خیر زماں نے بڑی بے چارگی کے ساتھ کہا۔

"میں نے تو آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں ماما کہ وہاں سے نکل چلنے کی تجویز پہلے خود زرینہ کی طرف سے آئی تھی۔"

"تم دونوں احمقوں کو اس کا انجام معلوم ہے؟" دراز گل نے بدستور خفگی کے ساتھ کہا۔ "تم دونوں نے اپنی موت کو دعوت دی ہے اور............"

"ہمیں معلوم ہے ماما!" خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔ "ہمیں معلوم ہے ماما کہ ہمارے لئے زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا اور بہت کم ہے۔ ہم جانتے ہیں شمروز خان اور اس کے آدمی ہم دونوں کو گولی مار سکتے ہیں اور شاید مار بھی دیں اور ہم اس کے لئے تیار ہیں ماما! اگر ہم ایک دوسرے سے الگ رہتے اور زرینہ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کہیں اور کر دی جاتی تو بھی ہم دونوں ہی مر جاتے ماما! اب تو جب مرنا ہی ٹھہرا تو زندہ رہنے کے لئے لڑ کر کیوں نہ مریں؟ یہی ہم نے سوچا تھا اور یہی سوچ کر ہم یہاں آپ کے پاس آ گئے ہیں لیکن میں آپ کو ایک بات بتا دوں ماما! ہم آپ پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ میں نے پہلے ہی آپ سے پوچھا تھا کہ مجھے کراچی میں کام مل جائے گا اور یاد ہے آپ نے کیا کہا تھا؟"

"وہ سب مجھے یاد ہے۔" دراز گل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ کیا

تم دونوں نے نکاح کر لیا ہے؟"

"نہیں۔" خیر زماں نے جواب دیا۔ "ابھی نہیں ماما! میں نے سوچا کہ ہم پشاور میں نکاح کر لیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ وہاں کس طرح ہو سکے گا۔ میں وہاں کسی کو بھی نہیں جانتا تھا اور پھر ہم دونوں کے کسی بھی بزرگ کی عدم موجودگی میں یہ معاملہ شکوک و شبہات جنم دے سکتا تھا اور ہم کسی مصیبت میں مبتلا ہو سکتے تھے اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں پشاور میں اپنے آپ کو کسی نئی الجھن میں نہ ڈالوں اور کراچی جا کر ہی زرینہ سے نکاح کروں۔ کراچی میں تو میرے لئے سب کچھ تھا کیونکہ کراچی میں آپ تھے اور جہاں آپ موجود ہوں وہاں پھر مجھے ڈرنے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"نکاح تو ہو جائے گا۔" دراز گل نے کہا۔ "اس میں کوئی مشکل نہیں ہے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ نہ تو تمہارے والدین اس بات سے راضی ہوں گے اور نہ زرینہ کے والدین۔ زرینہ ابھی نابالغ لڑکی ہے۔ قانونی طور پر وہ بالغ نہیں ہوئی ہے اور اگر اس کے والدین چاہیں تو تمہارے خلاف اس کے اغوا کا مقدمہ بھی درج کرا سکتے ہیں۔ وہ تو ہم لوگوں میں اپنے معاملات میں پولیس سے رجوع کرنے کا رواج نہیں ہے اور ہم اپنے جھگڑے قصے خود ہی نمٹا لیتے ہیں۔ ورنہ شمروز خان اپنی بیٹی کے اغوا کے جرم میں تم کو ہتھکڑیاں لگوا سکتا تھا لیکن وہ تو اپنی بے عزتی کا بدلہ خود لینے کی کوشش کرے گا۔ پولیس کو درمیان میں نہیں ڈالے گا۔ میں جانتا ہوں اور تمہارے والدین بھی اس معاملے میں تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔"

"کوئی بھی ہمارا ساتھ نہیں دے گا ماما!" خیر زماں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے اور زرینہ کو یہ بات معلوم ہے۔ کوئی بھی ہمارا ساتھ نہیں دے گا سوائے آپ کے' ہم جانتے ہیں کہ صرف آپ ہمارا ساتھ دیں گے' صرف آپ ہماری مدد کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ ہی کے بھروسے پر ہم نے اتنی محنت کی ماما کہ وہاں سے بھاگ کر کراچی آ گئے۔ اگر یہاں ہمارا کوئی ٹھکانہ موجود نہ ہوتا تو بھلا ہم یہاں کیوں آتے؟ میں.......... میں جانتا ہوں ماما کہ یہ سب کچھ آپ کے لئے بھی تکلیف دہ ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا' بس آپ سے مجھے اتنی مدد چاہئے کہ مجھے کہیں کام دلوا دیجئے اور جب تک میرے کہیں اور رہنے کا بندوبست نہیں ہو جاتا مجھے

یہاں رہنے کی اجازت دے دیں بلکہ خود ہی میرے کہیں اور رہنے کا بندوبست کرا دیں۔ میں اپنے ساتھ زیادہ پیسے نہیں لایا ہوں لیکن یہاں رہ کر کام کروں گا تو.........."

"وہ تو ٹھیک ہے خیر زماں!" دراز گل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ سب کچھ تو میں کر دوں گا لیکن تمہیں اتنا جان لینا چاہئے کہ تم اور زرینہ کہیں بھی اور کبھی بھی محفوظ نہیں۔"

"ہاں ماما!" خیر زماں نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔ "بس اگر قسمت میں یہی لکھا ہے تو پھر ایسا ہی سہی' کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "پھر میں سب سے پہلے تو تم دونوں کے نکاح کا بندوبست کرتا ہوں بلکہ آج ہی تم دونوں کا نکاح کروائے دیتا ہوں اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ کم از کم تم دونوں یہ تو ثابت کر سکو گے کہ تم قانونی اور شرعی طور پر میاں بیوی ہو اور تم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے' بعد میں جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔"

خیر زماں نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

"اب تو جو ہونا تھا سو ہو چکا ہے۔" دراز گل نے قدرے دھیمے انداز میں کہا۔ "جو کچھ ہو چکا ہے اس کو واپس نہیں لوٹایا جا سکتا' اسے ختم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ آگے ہونے والا ہے اس کو برداشت کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے تو سب سے پہلے تو تم اور زرینہ نکاح کے لئے تیار ہو جاؤ۔ زرینہ کو بھی بتا دو اور اس سے پوچھ بھی لو۔"

"پوچھنے کی تو کوئی ضرورت نہیں ہے ماما!" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ "ہم دونوں اس بارے میں آپس میں پہلے ہی بات کر چکے ہیں۔ زرینہ کو اس رائے سے بالکل اتفاق ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "پھر تم اب آرام کر لو' زرینہ سے بھی کہہ دو کہ آرام کر لے۔ تم دونوں بڑے لمبے اور تھکا دینے والے سفر سے آ رہے ہو۔"

خیر زماں دراز گل کے کمرے سے نکل کر گیا اور اس کے ساتھ ہی تاجور اندر داخل ہوئی۔ جب تک وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے تاجور نے مداخلت نہیں کی تھی اور انہیں پورا موقع دیا تھا کہ وہ تفصیل کے ساتھ آپس میں باتیں کر لیں اور خیر زماں کو جو کچھ بھی کہنا سننا ہے وہ آزادی کے ساتھ اپنے ماموں سے کہہ لے۔ ان کے درمیان جو کچھ

بھی گفتگو ہوئی اس کا تاجور کو پتہ تو بہرحال چلنا ہی تھا۔

"یہ کیا کیا ہے ان دونوں نے؟" کمرے میں داخل ہوتے ہی تاجور نے سخت پریشانی' اضطراب' خوف اور غصے کے عالم میں اپنے شوہر سے کہا۔ "خود تو تباہ ہوئے سو ہوئے ہمیں بھی اپنے ساتھ تباہ کر دیں گے۔ وہ لوگ ہمیں کب چھوڑیں گے؟"

"ان سب لوگوں کو جلد ہی اس بات کا علم ہو جائے گا کہ یہ دونوں کراچی آ گئے ہیں۔" دراز گل نے کہا۔ "وہاں یہ بات تو سب کو ہی معلوم ہے کہ اور کوئی جگہ ایسی ہے ہی نہیں جہاں خیر زماں زرینہ کو لے جا سکے۔ لے دے کے صرف میرا ہی گھر رہ جاتا ہے' کراچی میں اور لامحالہ سب کا دھیان اسی طرف جائے گا۔"

"میں تو خوش تھی کہ ہم لوگ دشمنیوں کے چکر سے آزاد ہو چکے ہیں اور یہاں کراچی میں اپنے بچوں کے ساتھ امن و سکون کی زندگی گزار رہے ہیں اور یہ کہ ہمارے بچوں کی کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ کوئی ان کے خون کا پیاسا نہیں ہے اور ہم ان خوفناک روایات سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے الگ کر چکے ہیں مگر.......... یہ نئی مصیبت ہمارے پیچھے لگ گئی۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ شمروز خان ہم لوگوں کو چھوڑے گا نہیں۔ یا خدا میرے بچوں کی جان سلامت رہے انہوں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔"

"اتنا زیادہ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے تاجور!" دراز گل نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ہم سب سے پہلا کام تو یہ کرتے ہیں کہ فوری طور پر ان دونوں کا نکاح کروا دیتے ہیں۔ اس طرح یہ ہو گا کہ ان پر بدکاری کا الزام نہیں لگایا جا سکے گا اور قانونی لحاظ سے وہ بڑی حد تک محفوظ ہو جائیں گے اور پھر میں کوشش کروں گا کہ ان کی رہائش کا کہیں اور بندوبست کروا دوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ فوری طور پر ایسا ممکن نہیں ہے ان دونوں کو پشتو کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں آتی ہے جہاں تک کام کا تعلق ہے تو میں خیر زماں کو اپنے ساتھ ہی کام پر لگا سکتا ہوں یا کسی دوسری جگہ بھی اس کو کام دلوا سکتا ہوں جہاں زبان کا مسئلہ اس کے لئے دشواری کا باعث نہیں بنے گا لیکن ان دونوں کی الگ رہائش کے بندوبست میں مجھے کچھ وقت لگے گا۔ بیوی کے ساتھ علیحدہ رہائش میں خرچہ بھی کافی ہو گا' یوں سمجھ لو کہ پورے گھر کا خرچہ ہو گا۔"

"ہاں۔" تاجور نے کہا۔ "انہیں تو پوری گرہستی ہی نئے سرے سے بنانی ہو گی' وہ تو بس چند جوڑے کپڑوں کے ساتھ یہاں لائے ہیں۔"

"میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔" دراز گل نے کہا۔

"جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی سے کر ڈالو۔" تاجور نے سہم کر کہا۔ "ہم اپنے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے ہم بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں اگر یہ معاملہ پولیس کچہری کا ہوتا تو غنیمت تھا' اس صورت میں ہم اپنا دفاع بخوبی کر سکتے تھے مگر یہ لوگ پولیس اور کچہری کے ذریعے اپنے معاملات طے نہیں کرتے۔ یہ تو صرف گولی کی زبان سے اپنے معاملات طے کرتے ہیں۔ خیر زماں نے یہاں زرینہ کے ساتھ آ کر ہمیں بہت بڑی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔"

"بہت زیادہ پریشان مت ہو۔" دراز گل نے اس کو تسلی دی' وہ اس کی تشویش اور خوف کو بالکل حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ شمروز خان کے خاندان کی دشمنی بخت خان کے خاندان سے تھی۔ دراز گل کے خاندان سے نہیں تھی اور دراز گل کو شمروز خان کے خاندان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اب یہ اچانک بالکل نیا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ غیظ و غضب کے عالم میں پاگل ہو کر شمروز خان کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا تھا۔ جہاں تک خیر زماں کا تعلق تھا تو اس کو تو شمروز خان کے قہر و غضب کا نشانہ بننا ہی تھا لیکن خیر زماں اور زرینہ کے ساتھ وہ لوگ بھی موردِ عتاب ہو سکتے تھے جنہوں نے ان کی مدد کی تھی لیکن اب اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں تھا۔ یہ سب کچھ تو ہو چکا تھا اور اب آگے جو کچھ ہونے والا تھا اس کا مقابلہ کرنا تھا وہ اپنے بھانجے اور اس لڑکی کو اپنے گھر سے نکال تو نہیں سکتا تھا انہیں اس اجنبی شہر میں باہر سڑک پر تو کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔

"ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔" دراز گل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے تاجور سے کہا۔ "ہم کوئی ان دونوں کو بلانے کے لئے تو نہیں گئے تھے اور نہ ہم نے ان سے کہا تھا کہ وہ بھاگ کر ہمارے گھر آ جائیں لیکن جب ایک بار وہ ہمارے گھر آ گئے تو پھر ان کو پناہ دینا ہمارا اخلاقی فرض بنتا ہے۔ آخر یہ بھی تو ہماری ایک دیرینہ روایت ہے اور وہ سب لوگ بھی اس سے بخوبی واقف ہیں۔ ہم گھر آئے مہمانوں کو دھتکار تو نہیں سکتے۔"

"ہاں .... اب تو ہم اس مصیبت میں پھنس گئے ہیں لیکن دیکھو میں تم سے ایک بات کہتی ہوں اگر شمروز خان یا اس کا کوئی آدمی ان دونوں کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک آن پہنچے تو تم اس سے صاف صاف کہہ دینا کہ ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ کہ ہم کو اس سلسلے میں بالکل ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔"

"جب کوئی آئے گا تو موقع محل کی مناسبت سے اس سے بات چیت کر لیں گے۔" دراز گل نے کہا۔ "فی الحال تو سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ان دونوں کا نکاح کروا دیا جائے تاکہ اغوا وغیرہ کا کوئی معاملہ نہ بن سکے۔ تم ذرا زرینہ کو ٹھیک ٹھاک کر دو میرا مطلب ہے وہ کچھ تو دلہن کی طرح لگے۔ میں کچھ لوگوں کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"یہ نکاح کروانے کی ذمہ داری بھی تمہاری ہی ہو گی۔" تاجور نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ "بعد میں کہنے والے یہی کہیں گے تاکہ تم نے نکاح کروایا تم ذمہ دار ہو اس کے۔"

"کہہ لینے دو۔" دراز گل نے کہا۔ "نکاح کرا دینا بہت ضروری ہے اس سے قانونی اور شرعی مضبوطی ہو جائے گی اور میں کون سا گناہ کر رہا ہوں؟ میں ان دونوں کی مرضی اور منشا کے مطابق ان کا نکاح ہی تو کروا رہا ہوں ان کے وہاں سے یہاں آنے میں تو میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ نکاح تو جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اچھا میں اب چلتا ہوں تم زرینہ کو ذرا تیار کر دو۔"

دراز گل گھر سے نکل کر چلا گیا اور تاجور اپنی بڑی بیٹی دردانہ کی مدد سے زرینہ کو بنانے سنوارنے میں لگ گئی۔ چھوٹی بیٹی فائزہ بھی بڑی خوشی خوشی اس کام میں شریک ہو گئی۔ سارے گھر کے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ خیر زماں اور زرینہ کی شادی ہونے والی ہے۔ بچے بہت خوش تھے ان کے گھر میں آج تک کوئی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلی شادی تھی جو ان کے گھر میں ہو رہی تھی۔

بڑے بچے سارے معاملے کو پوری طرح سمجھ چکے تھے۔ شہزاد اور دردانہ کو اس بارے میں اپنی ماں سے یا کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خیر زماں اپنے ساتھ گاؤں سے کوئی لڑکی بھگا کر لایا تھا جس کا نام زرینہ تھا اور اب یہاں کراچی میں ان دونوں کی شادی ہو رہی تھی۔ گھر میں ان دونوں بن بلائے مہمانوں کی آمد سے ابا اور ماں میں کھسر پھسر کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور جس طرح سے بار بار رازدارانہ گفتگو ہو رہی تھی اس کا مطلب وہ دونوں خوب سمجھ رہے تھے بلکہ چھٹی کلاس میں پڑھنے والی فائزہ بھی بہت حد تک ساری بات کو سمجھ رہی تھی اور بات تو کوئی ایسی لمبی چوڑی تھی بھی نہیں۔ سیدھا سادہ سا معاملہ تھا وہ دونوں گاؤں سے اپنے والدین سے چھپ کر یہاں کراچی بھاگ آئے تھے اور اب یہاں ان کی شادی ہو رہی تھی۔ بس اتنی سی بات تھی کہ وہ اپنے گھر والوں سے چھپ کر شادی کر رہے تھے۔

لیکن اس بظاہر سیدھے سادے اور معمولی نظر آنے والے واقعے کے پیچھے چھپے خون کے کیسے کیسے دریا جوش مار رہے تھے اس کا ان بچوں کو کوئی اندازہ نہیں تھا کیونکہ یہ اس قسم کے حالات سے کبھی نہیں گزرے تھے اور انہیں اپنے علاقے کی روایات کا عملی تجربہ حاصل نہیں تھا۔

دراز گل تقریباً ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا اس نے گھر آ کر بتایا کہ نکاح کے انتظامات ہو گئے ہیں اور وہ تھوڑی دیر میں قاضی کو لے کر آ جائے گا۔ وکیلوں اور گواہوں وغیرہ کا بندوبست بھی ہو چکا تھا اور وہ سب لوگ ذرا دیر میں پہنچنے والے تھے۔

اس اثنا میں تاجور اور اس کی بیٹیوں نے زرینہ کو کافی حد تک سجا بنا دیا تھا اور وہ یکایک اس قدر خوبصورت نظر آنے لگی تھی کہ اس کے چہرے پر نظریں نہیں ٹھہرتی تھیں۔

"کاش .... کاش وہ اس طرح سے اپنے گھر میں دلہن بنی ہوتی۔" وہ گہرے دکھ کے احساس کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ "کتنا اچھا ہوتا اس وقت' کتنا اچھا لگتا اور کتنا مزا آتا۔ سارا گاؤں اکٹھا ہوتا بلکہ آس پاس کے گاؤں کے بھی بہت سارے لوگ اس موقع پر موجود ہوتے۔ یہ سب کچھ ہو سکتا تھا بالکل اس طرح ہو سکتا تھا جس طرح وہ چاہتی تھی مگر صرف ایک فرق کے ساتھ اور وہ یہ کہ دولہا خیر زماں کے بجائے کوئی اور ہوتا اور اگر دولہا خیر زماں کے بجائے کوئی اور ہوتا تو پھر وہ اس صورت میں دلہن نہ ہوتی بلکہ ایک زندہ لاش ہوتی جسے سجا بنا کر کسی غیر مرد کے حوالے کر دیا جاتا ایسا مرد جو زندگی کے آخری لمحوں تک اس کے لئے غیر ہی رہتا کوئی بھی قانون اس کو مجبور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس مرد کو اپنا تسلیم کر لے وہ کبھی بھی اس کی نہیں بن سکتی تھی۔

اور اب جو شادی ہو رہی تھی وہ تو جیسے پل صراط پر کھڑے ہو کر ہو رہی تھی کسی بھی وقت کسی بھی آن تیر قضا اس کے یا اس کے ہونے والے شوہر کے یا دونوں کے سینوں میں پیوست ہو سکتا تھا اور وہ اس کے لئے تیار تھی اس منزل تک پہنچنے کے لئے تو اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں مہندی نہیں رچی اس کا وقت نہیں تھا۔ سب کچھ بہت جلدی جلدی کرنا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں نکاح ہونے والا تھا۔ وہ اپنے ساتھ جو چند جوڑے لے کر آئی تھی وہ سب کے سب بالکل معمولی قسم کے تھے اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا

جسے شادی کا جوڑا قرار دیا جا سکتا اور شادی کا جوڑا اتنی جلدی تیار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔
تاجور نے دردانہ کا ایک بہت عمدہ اور قیمتی جوڑا جو دردانہ نے پچھلی عید پر بنوایا تھا اور جس کو اس نے اپنی ایک سہیلی کی بڑی بہن کی شادی میں پہنا تھا زرینہ کو پہنا دیا بالکل نئی وضع اور نئے اسٹائل کا جوڑا تھا اور زرینہ جس علاقے سے آئی تھی وہاں کی عورتوں کے لئے یہ اسٹائل بالکل اجنبی تھا۔ زرینہ نے اس لباس کو بڑی حیرت سے دیکھا اور جب اس نے اس کو پہننے کے بعد خود کو آئینے میں دیکھا تو بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایک دم مختلف وہ صوبہ سرحد کے کسی دور افتادہ پسماندہ دشوار گزار پہاڑی گاؤں کی لڑکی لگ ہی نہیں رہی تھی وہ تو کراچی کی کوئی فیشن ایبل لڑکی لگ رہی تھی۔

زرینہ اپنے ساتھ کوئی زیور لے کر نہیں آئی تھی۔ خیر زماں نے اس کو سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ وہ کوئی زیور اپنے ساتھ لے کر نہ آئے۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم اور میں تمہارے والدین کی نظروں میں چور ٹھہریں۔" خیر زماں نے کہا تھا۔ "بس چند جوڑے اپنے ساتھ لے لینا تاکہ کچھ دن تک کام چل جائے پھر جب میں کام کرنا شروع کر دوں گا تو تمہارے لئے دوسرے کپڑے بنوا دوں گا۔ کپڑے بھی زیور بھی سب کچھ بنوا دوں گا جو کچھ بھی کماؤں گا تمہارے لئے ہی تو کماؤں گا۔"

"مجھے زیور اور کپڑے کی کوئی تمنا بھی نہیں ہے۔" زرینہ نے کہا تھا۔ "میرے لئے زندگی کی سب سے بڑی خوشی یہ ہو گی کہ تم میرے ہو جاؤ اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زندہ رہیں گے۔"

"زیور کے بغیر دلہن بھلا کیسے لگے گی؟" تاجور نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کے اندر کا عورت پن بیدار ہو چکا تھا اور وہ ذرا دیر کے لئے باقی ساری کلفتوں کو بھول گئی تھی اس وقت اس کی ساری توجہ ایک خوبصورت دلہن سجانے پر مرکوز تھی اور وہ دلہن کو زیادہ سے زیادہ حسین و جمیل بنانا چاہتی تھی۔

اس نے اپنے شوہر کو بتا کر اپنے دو ایک معمولی سے زیور دلہن کو پہنا دیئے اور پھر جب اس نے اپنا سارا کام ختم کرنے کے بعد زرینہ کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا تو وہ عش عش کر اٹھی۔ زرینہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی جیسے سچ مچ کوئی آسمان سے اتری ہوئی پری۔ وہ خیر زماں کے انتخاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکی۔ اس نے واقعی ایک ایسی لڑکی کو چنا تھا جو ہزاروں میں ایک تھی۔ کاش اس کا تعلق ایک دشمن خاندان سے نہ ہوتا۔

کاش یہ ایک باقاعدہ شادی ہوتی تو سب کچھ کتنا اچھا ہوتا۔ سارے رشتے دار اس شادی میں شریک ہوتے۔

کچھ ہی دیر کے بعد لوگ آ گئے' قاضی بھی آ گیا' وکیلوں اور گواہوں کا تقرر ہوا جو سب کے سب پشتو بولنے والے لوگ تھے' خود قاضی بھی تھوڑی بہت پشتو بول سکتا تھا۔ ویسے تو اس کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے تھا اور وہ سرائیکی اور پنجابی بولتا تھا لیکن اسے اچھی خاصی پشتو بھی آتی تھی۔ دراز گل بہت مطمئن تھا کہ اس کو ایسا قاضی مل گیا تھا۔

نکاح ہو گیا اور قاضی سمیت آنے والے مہمانوں کو جن کی کل تعداد سات تھی کھانا کھلایا گیا جس کا فوری بندوبست دراز گل نے پیر کالونی کے ایک ہوٹل سے کر لیا تھا جو اس کے گھر کے قریب ہی واقع تھا۔

"یہ لڑکا میرا بھانجا ہے۔" اس نے مہمانوں کو بتایا۔ "اور لڑکی بھی ہمارے جاننے والوں کے خاندان کی ہے۔ ان کے والدین اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر اس نکاح میں شریک نہیں ہو سکے۔"

"آپ تو موجود ہیں۔" ایک مہمان نے کہا۔ "آپ بزرگ ہیں' لڑکا اور لڑکی دونوں ہی کے بزرگ ہیں۔ پھر بھابی بھی موجود ہیں انہیں لڑکی کی ماں سمجھنا چاہیئے۔"

"جی ہاں .... جی ہاں............" دراز گل نے جلدی سے کہا۔

مہمان کھانا وغیرہ کھا کر رخصت ہوئے۔ قاضی صاحب بھی اپنا محنتانہ لے کر چلے گئے اور تب گھر کے لوگوں نے وقتی طور پر سکون و اطمینان کا سانس لیا۔

ایک بڑا مرحلہ خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہو چکا تھا۔ خیر زماں اور زرینہ کا نکاح ہو چکا تھا اور اب وہ دونوں قانونی اور شرعی طور پر میاں بیوی بن چکے تھے۔ نکاح باقاعدہ رجسٹرڈ نکاح خواں نے پڑھایا تھا اور وکیل اور گواہ وغیرہ سب موجود تھے' کوئی بھی کام جعلی نہیں تھا۔ سب کچھ بالکل اس طرح سے ہوا تھا جس طرح ہونا چاہیئے تھا اور اب اس نکاح کی قانونی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

☆======☆======☆

زرینہ کو یہ سب کچھ جیسے ایک خواب کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ حالات و واقعات میں کس قدر تیز رفتاری سے تبدیلی آئی تھی' دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا۔ کہاں تو وہ دونوں اپنے اپنے گاؤں میں' اپنے اپنے گھروں میں ہجر کی آگ میں جل رہے تھے اور انہیں دور تک امید کی کوئی کرن نہیں دکھائی دے رہی تھی اور کہاں یہ' کہ وہ ایک دم سے میاں بیوی بن گئے تھے۔ ان کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ملک کے سب سے بڑے سب سے زیادہ حیرت انگیز اور طلسماتی شہر کراچی میں موجود تھے۔ جہاں آنے کا زرینہ نے تو کبھی خواب تک نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کراچی کے بارے میں زیادہ تر تو خیر زماں سے ہی سنا تھا جس کا ماما دراز گل اپنے بیوی بچوں سمیت کراچی میں رہتا تھا۔

خیر زماں جیسے ہواؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور بظاہر کسی بڑی مشکل کے بغیر ہو جائے گا اس کا تو اس کو اندازہ ہی نہیں تھا۔ زرینہ کی طرح اسے بھی یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ بار بار یقین کرنے کی کوشش کے باوجود جیسے یقین سا نہیں آتا تھا۔

اور جب اس کا نکاح ہو رہا تھا تو اس وقت اس نے بڑے دکھ کے ساتھ اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچا اپنے باپ کے بارے میں' اپنی ماں کے بارے میں' اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں اور اپنی چھوٹی بہن کے بارے میں۔ اگر یہ شادی باقاعدگی کے ساتھ ہوتی تو وہ سب لوگ اس میں شریک ہوتے اور کس قدر خوشی ہوتی۔ خاص طور سے اس کی ماں تو بہت ہی زیادہ خوش ہوتی۔ وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا اور اس کی ماں کو اس کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ اس کے والدین تو زرینہ کے ساتھ اس کی شادی کے لئے راضی ہو گئے تھے' وہ اس کو اپنی بہو بنانے پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن یہ تو شمروز خان تھا جس نے اس کو اپنا داماد بنانے سے انکار کر دیا تھا اور کئی لوگوں کی کوششوں کے باوجود نہیں مانا تھا جس کے بعد ان دونوں چاہنے والوں کو یہ

انتہائی قدم اٹھانا پڑا تھا۔

دراز گل کے گھر میں اس رات اچھی خاصی چہل پہل رہی۔ دراز گل اور اس کی بیوی تاجور ملنسار طبیعت کے لوگ تھے اور اپنے پاس پڑوس والوں کے ساتھ ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اگرچہ عجلت کی وجہ سے پڑوسیوں کو نکاح کی اس تقریب میں بلایا تو نہیں گیا تھا تاہم کئی پڑوسیوں کے علم میں یہ بات تھی کہ دراز گل کے بھانجے کا یہاں نکاح ہو رہا تھا۔

خیر زماں اور زرینہ کے لئے یہاں کی ہر چیز نئی' انوکھی اور حیرت انگیز تھی اور انہیں قدم قدم پر اس چیز کا احساس ہوتا تھا کہ انہیں تو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ یہاں کتنی چیزیں ایسی تھیں جن کی انہوں نے اس سے پہلے شکل بھی نہیں دیکھی تھی اور جن کے استعمال سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ ان کے گاؤں میں بجلی نہیں تھی اور وہ بجلی کے استعمال سے' بجلی کی چیزوں کے استعمال سے بالکل ناواقف تھے۔ ان کے گاؤں میں تو شام ہوتے ہی جیسے دنیا ختم ہو جاتی تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا پھیل جاتا تھا اور گھروں میں تھوڑی دیر کے لئے چراغ جلتے تھے اور پھر سب لوگ جلدی جلدی سونے کے لئے لیٹ جاتے اس کے ساتھ چراغ گل کر دیئے جاتے تھے اور ہر طرف مکمل تاریکی پھیل جاتی تھی۔

لیکن یہاں .... کراچی کے اس مکان میں ان کی پہلی ہی شام ان کے لئے حیرت انگیز تھی غروب آفتاب سے پہلے ہی سارا گھر بجلی کے بلبوں سے روشن ہو گیا تھا اور بجلی کی روشنی اتنی تیز تھی کہ چراغوں کی روشنی تو اس کے آگے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی تھی۔ بجلی کی اس روشنی میں تو ہر کام کیا جا سکتا تھا' سوئی میں دھاگہ بھی ڈالا جا سکتا تھا اور کپڑے بھی سئے جا سکتے تھے۔ بجلی کی روشنی میں تو یہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ رات کا وقت ہے دن کا وقت معلوم ہوتا تھا۔ وہ سارے کام بڑی آسانی کے ساتھ کئے جا سکتے تھے جو دن کے وقت کئے جاتے ہوں۔

ان دونوں کے لئے سب سے زیادہ حیرت انگیز اور طلسماتی چیز ٹی وی تھا' انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی ٹی وی نہیں دیکھا تھا کیونکہ ان کے دشوار گزار دور افتادہ گاؤں میں تو بجلی ہی نہیں تھی اور دور دور تک بجلی نہیں تھی چنانچہ بجلی سے وابستہ تو ہر چیز سے ہی یہ لوگ ناواقف تھے۔

خیر زماں اور زرینہ نے انتہائی حیرت اور تجسّس کے ساتھ اس ڈبے کو دیکھا جس پر چلتی پھرتی، بنتی، بھاگتی دوڑتی تصویریں نظر آتی تھیں۔ انسانوں کی یہ تصویریں کٹھ پتلیوں کی طرح نہیں تھیں یہ تو سچ مچ کے انسانوں کی طرح تھیں ان میں اور سچ مچ کے انسانوں میں کوئی فرق نہیں تھا جو زبان یہ پتلیاں بولتی تھیں وہ ابھی خیر زماں اور زرینہ کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن ماما دراز گل کے گھر کا تو بچہ بچہ اس زبان سے بخوبی واقف تھا۔ وہ سب لوگ تو کیسی عمدگی اور روانی کے ساتھ اس زبان کو بولتے اور سمجھتے تھے۔

ماما دراز گل کا گھر کیا تھا ایک طلسم کدہ تھا ایک حیرت کدہ تھا جہاں کسی قدر بہت ساری حیران کر دینے والی چیزیں موجود تھیں۔ باورچی خانے میں گیس کے چولہے تھے، ان میں ایندھن نہ جانے کہاں سے آتا تھا بس ماچس کی تیلی جلانے کی دیر تھی کہ فوراً ہی آگ بھڑک اٹھتی تھی اور پھر بٹن گھما کر آگ کو جتنا چاہو تیز یا ہلکا کر لو یہ سب کچھ کس قدر ناقابل یقین تھا۔

وہ لوگ جب اپنے علاقے سے روانہ ہوئے تھے تو خوب کڑاکے کی سردی ہو رہی تھی اور انہوں نے بھاری گرم کپڑوں میں لپٹ کر رات کے وقت سفر کیا تھا اور وہ سردی سے کانپتے رہے تھے لیکن یہاں کراچی میں گرمی سے جسم پسینے میں شرابور رہتا تھا اور یہ عجیب قسم کی گرمی تھی۔ اس میں کپڑے جسم سے چپکتے تھے ہر چیز چپکتی تھی جس سے پسینے کی دھاریں بہتی تھیں۔ سردی کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا اور چھتوں پر لٹکے ہوئے پنکھے تھے ایک بٹن دبا دیتے ہی پنکھا چل پڑتا تھا اور سارا کمرہ ہوا سے بھر جاتا تھا۔ اس قدر تیز ہوا نکلتی تھی پنکھے سے کہ ہلکی پھلکی چیزیں اڑنے لگتی تھیں اور انہیں سنبھالنا پڑتا تھا۔

ان دونوں کو طرح طرح کی انجانی چیزوں سے بھرا ہوا گھر کسی عجائب خانے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ وہ حیرت کرتے کرتے تھکے جا رہے تھے۔ کتنی بہت ساری چیزیں تھیں جن پر حیرت کی جانی چاہئے تھی لیکن رفتہ رفتہ ان کو ان ساری چیزوں کا عادی ہو جانا تھا اور اگلے چند روز میں وہ بہت ساری چیزوں سے کافی واقف اور ان کے عادی ہو گئے۔

چند روز کے بعد چھٹی کا دن تھا اور دراز گل نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اگلے دن سارے لوگ گھومنے چلیں گے۔ "تم لوگوں کو سمندر دکھائیں گے۔" اس نے دونوں سے کہا۔ "تم تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ سمندر کیا ہوتا ہے؟"

اور واقعی وہ دونوں سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سمندر کیا ہوتا ہے انہوں نے تو اپنی

زندگی میں کوئی دریا بھی نہیں دیکھا تھا ان کے علاقے میں صرف پہاڑی چشمے تھے اور ایک چشمہ بابر خیل کے بالکل قریب تھا اس علاقے کے رہنے والوں کی پانی کی ضروریات انہی چشموں سے پوری ہو جاتی تھیں۔ اوپر نہ جانے کہاں سے کون سی نامعلوم اور غیر مرئی بلندیوں سے بہتا ہوا پانی، پہاڑیوں کے اندر ہی اندر سے ہوتا ہوا مضبوط پتھروں کو کاٹ کاٹ کر اپنا راستہ بناتا ہوا ان کے علاقے تک آتا تھا اور چشموں کی صورت میں پھوٹ کر پھر سے پہاڑوں کے اندر غائب ہو کر بہت دور نیچے کہیں میدانی علاقوں میں چلا جاتا تھا جہاں جا کر وہ کسی دریا میں شامل ہو جاتا تھا اور پھر دریا سے سمندر میں چلا جاتا تھا۔

انہوں نے سمندر کا صرف نام سنا تھا اور ان لوگوں میں سے کچھ کی زبانی جنہوں نے کراچی جا کر سمندر دیکھا تھا۔ سمندر کے بارے میں بڑی ناقابل یقین حیرت انگیز اور ہولناک قسم کی باتیں سنی تھیں۔

اگلے روز دراز گل نے ایک جاننے والے کی سوزوکی کرائے پر حاصل کر لی اور سارے گھر کے لوگ سوزوکی میں بیٹھ کر گھومنے پھرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

وہ دونوں دراز گل کے مکان میں آنے کے بعد سے اور کہیں نہیں گئے تھے، گھر میں ہی رہے تھے۔ خیر زماں دن میں یا شام کو اکثر گھر سے باہر نکل کر گلی میں اِدھر اُدھر گھوم پھر لیتا تھا یا سڑک تک چلا جاتا تھا لیکن وہ زیادہ دور نہیں جاتا تھا۔ نئی جگہ تھی، نئے لوگ تھے وہ یہاں کے طور طریقوں اور آداب سے واقف نہیں تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ یہاں کی زبان سے واقف نہیں تھا اس لئے وہ محتاط رہتا تھا۔ خود دراز گل نے بھی اس سے کہا تھا کہ وہ زیادہ دور نہ جائے اور گھر کے آس پاس ہی رہے۔

چنانچہ ان گزشتہ چند دنوں کے دوران خیر زماں صرف پیر کالونی کے ایک چھوٹے سے حصے کی ہی رونقیں دیکھتا رہا اور اس کے لئے تو یہ بھی بہت تھا اس طرح کی گہما گہمی اور چہل پہل خاص طور سے رات کے وقت اس نے اپنے گاؤں میں کبھی نہیں دیکھی۔

وہ سب لوگ سوزوکی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور زرینہ اور خیر زماں راستے کی تمام چیزوں سے لطف اندوز ہوتے گئے۔ چھٹی کی وجہ سے اس روز ٹریفک نسبتاً کم تھا لیکن پھر بھی سڑکیں گاڑیوں سے بھری ہوئی تھیں طرح طرح کی گاڑیاں تھیں جو سڑکوں پر دوڑ رہی تھیں اور وہ دونوں خوش ہو ہو کر ان ساری چیزوں کو دیکھ رہے تھے۔

انہیں اس شہر کو دیکھنے کا موقع دوسری بار مل رہا تھا۔ پہلی بار انہوں نے اس کی

وسعتوں کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ ریلوے اسٹیشن سے پیر کالونی تک آئے تھے اور آج چند روز کے بعد وہ دوبارہ اس کی پہنائیوں اور رعنائیوں کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

اور ان چند دنوں کے اندر اندر ان کی زندگی میں کتنی بڑی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی بن چکے تھے اور انہیں اپنے خواب کی تعبیر مل گئی تھی لیکن سب کچھ اس طرح سے نہیں تھا جس طرح انہوں نے سوچا تھا۔ خوشی' مسرت' تعبیر جو کچھ بھی تھی وہ خوف کی ہلکی ہلکی اور نامعلوم دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ ان کے جو جی میں آیا تھا وہ کر گزرے تھے اور یہ تو کہانی کا محض آغاز تھا انجام کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پہاڑی گاؤں کی صدیوں پرانی دنیا سے نکل کر وہ ایک دم ایک جدید شہر میں آن پہنچے تھے اور محبت کا ہی کرشمہ تھا جس نے ان کو اس انجانی دنیا میں لا پھینکا تھا لیکن محبت ابھی اور کتنے کرشمے دکھانے والی تھی اس کا انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔

سوزوکی تھی کہ چلے ہی جا رہی تھی اور سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ وہ دونوں اپنے آس پاس کی دنیا کو غور و دلچسپی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان کے میزبان انہیں مختلف جگہوں اور مختلف چیزوں کے بارے میں بتاتے جا رہے تھے۔ سڑکوں اور عمارتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور ہر جگہ زندگی تھی' لوگ تھے' گاڑیاں تھیں اور کوئی بھی جگہ سنسان نہیں تھی۔ ان کے گاؤں کے آس پاس کے علاقوں جیسی کوئی بھی خالی اور سنسان جگہ نہیں تھی ہر طرف زندگی رواں دواں تھی۔

بالآخر وہ لوگ سمندر کے کنارے پہنچ گئے اور زرینہ اور خیر زماں نے جب سمندر کو دیکھا تو انہوں نے اس کو اپنے تصور سے بھی کہیں زیادہ بڑا' وسیع و عریض' لامتناہی اور خوفناک پایا۔ ان کی آنکھوں نے ایسا نظارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ تو جیسے پانی کی دنیا تھی سامنے جہاں تک نظر کام کرتی تھی پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ ساحل کے اس حصے کے علاوہ جہاں وہ دونوں کھڑے ہوئے تھے ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ نظروں کے سامنے پانی کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ اس کے سامنے دنیا کی ہر چیز ہیچ معلوم ہوتی تھی۔

"اف میرے خدا!" زرینہ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "تو یہ ہے سمندر' ایسا ہوتا ہے سمندر؟"

"ہاں زرینہ!" دراز گل نے کہا جو اس کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ "ایسا ہوتا ہے سمندر اور وہ دیکھو دور بہت دور۔" اس نے انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک جہاز

جا رہا ہے اور اس سے بھی آگے ایک اور جہاز ہے اور ان دونوں سے آگے کافی آگے ایک اور جہاز' ذرا غور سے دیکھو۔"

زرینہ غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے نہ کبھی جہاز کی تصویر دیکھی تھی اور نہ اس کے دماغ میں جہاز کی شکل و صورت کے بارے میں کوئی تصور تھا۔ دراز گل نے جس طرف اشارہ کیا تھا ادھر سے ایک دھندلی دھندلی سی لمبی سی شے پانی میں کھڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے آگے ایسی ہی ایک اور شے زیادہ دھندلی زیادہ مبہم پانی پر کھڑی ہوئی تھی اور اس سے بھی کافی آگے بس ہلکے ہلکے مدھم سے نقوش نظر آ رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے پانی کے اوپر دھندلی دھندلی سی لکیریں کھینچی ہوئی ہوں اور یہ سارے نقوش اور لکیریں بالکل ساکت لگ رہے تھے۔

"یہ .... یہ جہاز ہیں؟" زرینہ نے اپنے ہاتھ کا چھجہ بنا کر اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ایسے ہوتے ہیں جہاز؟"

"ہاں یہ جہاز ہیں۔" دراز گل نے کہا۔ "اور یہ تمہیں بالکل چھوٹے چھوٹے اس لئے نظر آ رہے ہیں کیونکہ یہ تم سے بہت دور ہیں لیکن اگر تم ان کو قریب سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ ان کے اندر پورا شہر آباد ہے۔"

"پورا شہر!" خیر زماں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "اور .... وہ پورا شہر پانی کے اندر .... یعنی پانی کے اوپر ہوتا ہے؟ اور اس میں موجود سارے لوگ.........."

"وہ سارے لوگ جہاز کے اندر ہوتے ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں مسافر اور جہاز پانی کے اوپر ہوتا ہے اور تیرتا ہوا بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔"

"ہائے اللہ .... پانی کے اوپر جہاز اور جہاز کے اندر آدمی اور چاروں طرف پانی ہی پانی .... کتنا ڈر لگتا ہو گا ماما!"

"ڈر کی کیا بات ہے بھلا؟" دراز گل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہزاروں لاکھوں لوگ ان جہازوں میں سفر کرتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد میں اور تمہاری مامی بھی ایسے ہی کسی جہاز میں سفر کریں۔"

"آپ اور مامی؟" خیر زماں نے سخت حیرت کے عالم میں کہا۔ "آپ' آپ کہاں جائیں گے جہاز میں بیٹھ کر؟"

"بیٹا ہم لوگوں کا ارادہ حج پر جانے کا ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "پچھلے سال بھی ہم نے درخواست دی تھی لیکن ہمارا نام قرعہ اندازی میں نہیں نکلا اس سال بھی درخواست دی تو ہے اب آگے اللہ مالک ہے۔ اگر اس کی مرضی ہوئی اور ہمارا نام قرعہ اندازی میں نکل آیا تو پھر ہم دونوں حج پر جائیں گے اور پانی کے جہاز سے جائیں گے۔"

"میں تو ابا سے کہتا ہوں کہ اگر درخواست منظور ہو جائے تو ہوائی جہاز سے جائیں۔" شہزاد نے کہا۔ "آج کل زیادہ تر لوگ تو ہوائی جہاز کے ذریعے ہی حج کا سفر کرتے ہیں۔ پانی کے جہاز سے جانے والوں کی تعداد اب کم ہوتی جا رہی ہے۔"

"پانی کے جہاز کے سفر کا مزا ہی کچھ اور ہے۔" دراز گل نے مسکرا کر کہا۔ "پانی کے جہاز کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے' میں اس دنیا کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ہائے اللہ کتنا مزا آئے گا پانی کے جہاز میں بیٹھ کر۔" زرینہ نے پُرشوق لہجے میں کہا۔ "چاروں طرف پانی ہی پانی اور پانی کے بیچ میں ایک چھوٹا سا شہر اور اس شہر کے اندر بہت سارے لوگ کتنا اچھا ہو گا یہ سب........."

دراز گل کے بچے تو اکثر سمندر کے کنارے آتے رہتے تھے اور سمندر سے ان کی دوستی تھی انہیں سمندر سے ڈر نہیں لگتا تھا لیکن خیر زماں اور زرینہ سمندر سے خوفزدہ تھے وہ سب لوگ ساحل پر کھڑے ہوئے تھے اور پانی کی موجیں بھاگ بھاگ کر ساحل تک آتی تھیں اوران لوگوں کے پیروں سے ٹکراتی تھیں۔ خیر زماں اور زرینہ اس سے ڈر جاتے تھے اور پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتے تھے۔

"یہاں تک کوئی خطرہ نہیں ہے۔" تاجور نے ان کو سمجھایا۔ "خطرہ آگے جانے میں ہے اگر کنارے پر ہی رہا جائے تو کوئی خطرہ نہیں۔"

"ماں! یہ سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں تک جاتا ہے؟" زرینہ نے تاجور سے سوال کیا اور یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب تاجور کو خود بھی نہیں معلوم تھا۔ وہ بے چاری کوئی پڑھی لکھی عورت تو تھی نہیں البتہ اس کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور اس نے کراچی میں اپنی شادی کے بعد ایک استانی گھر پر رکھ کر اردو لکھنا پڑھنا اور قرآن شریف پڑھنا سیکھ لیا تھا اور اب اردو کی کتابیں اور اخبارات وغیرہ پڑھ لیتی تھی۔ تھوڑی بہت اردو لکھنا دراز گل نے بھی کراچی میں سیکھ لی تھی اور کم از کم اتنا تھا کہ وہ اپنے کاروبار کے حساب کتاب کی پرچیاں وغیرہ لکھ لیتا تھا۔

لیکن زرینہ کے اس سوال کا جواب ان دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھا کہ سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے۔

مگر ان کے بچوں کے پاس زرینہ کے اس سوال کا جواب تھا۔ میٹرک میں پڑھنے والے شہزاد کے پاس اور آٹھویں کلاس میں پڑھنے والی دردانہ کے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا۔

دردانہ زرینہ کو یہ بتانے لگی کہ کرۂ ارض کا کتنا حصہ خشکی اور کتنا حصہ پانی پر مشتمل ہے اور دنیا کے بڑے بڑے سمندر کون سے ہیں اور ان کے نام کیا ہیں لیکن یہ ساری باتیں زرینہ اور خیر زماں کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں وہ دونوں حیرت سے دردانہ کی شکل دیکھ رہے تھے۔

"تم نے پوچھا کہ سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "بھئی سمجھ لو کہ سمندر یہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں ہم لوگ اس وقت کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ یہاں ساحل پر کھڑے ہوئے ہیں ناں' خشکی پر کھڑے ہیں اور ہمارے سامنے سے سمندر شروع ہو رہا ہے تو جو سمندر خشکی کے اس حصے سے شروع ہوتا ہے جس پر ہم کھڑے ہوئے ہیں وہ خشکی کے کسی اور حصے پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔"

"اور پھر اس کے آگے کیا ہے؟" زرینہ نے جلدی سے پوچھا۔

"جہاں خشکی ختم ہو جاتی ہے وہاں پھر سمندر آ جاتا ہے۔" شہزاد نے اس کو بتایا۔ "ہماری ساری زمین جو ہے نا وہ سمندر سے گھری ہوئی ہے۔ ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔"

سمندر کی موجیں دور سے بڑی تیزی کے ساتھ بھاگتی ہوئی آتی تھیں اتنی اونچی اونچی موجیں جیسے کہ چٹانیں۔ زرینہ اور خیر زماں کو بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے پتھر کی بڑی بڑی دور تک پھیلی ہوئی اونچی چٹانوں نے یکبارگی اپنی جگہ سے حرکت شروع کر دی اور وہ بھاگی ہوئی دوڑتی ہوئی سامنے کی طرف آ رہی ہوں لیکن کنارے تک آتے آتے ان بلند و بالا موجوں کا زور ٹوٹ جاتا تھا اور وہ پھیل کر نیچی ہو جاتی تھیں اور پھیلے ہوئے پانی کی شکل اختیار کر لیتی تھیں اور اس اثنا میں پیچھے سے اور نئی موجوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

یہ کھیل بڑا دلچسپ بھی لگتا تھا اور خوفناک بھی۔ ساحل تک آتے آتے موجوں کا زور ٹوٹ جاتا تھا اور ان کے پیچھے سے نئی موجوں کا ایک اور لشکر بھاگتا ہوا اس طرف آتا

نظر آتا تھا۔ دھوپ میں سمندر میں کتنے ہی رنگ نظر آ رہے تھے تیز چمکیلی دھوپ میں چمکتے ہوئے پانی کو دیکھ کر زرینہ کو اپنے علاقے کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں یاد آ رہی تھیں جو تیز دھوپ میں اسی طرح چمکتی تھیں ان میں بھی کئی طرح کے رنگ نظر آتے تھے کہیں ہلکا کہیں گہرا کہیں بالکل سفید کہیں ذرا ہلکا سرمئی کہیں کچھ زیادہ سرمئی۔ اس طرح سمندر میں بھی دھوپ کی تیز چمک میں طرح طرح کے رنگ نظر آ رہے تھے لیکن یہ برف کے رنگ سے بہت مختلف تھے سمندر کے پانی کا چمکتا ہوا رنگ کہیں ہرا تھا کہیں نیلا اور انہی رنگوں میں کہیں ہلکا کہیں گہرا۔

"ماما! یہ جہاز اپنی جگہ پر رکے ہوئے کیوں ہیں؟" خیر زماں نے سمندر میں بہت دور نظر آنے والے جہازوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ رکے ہوئے نہیں ہیں۔" دراز گل نے جواب دیا۔ "یہ چل رہے ہیں لیکن یہ ہم سے اتنی دور ہیں کہ ہم ان کو چلتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں دیکھ کر یہی لگتا ہے جیسے یہ اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے ہوں' رکے ہوئے ہوں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہ حرکت کر رہے ہیں چل رہے ہیں مگر ہم ان کی حرکت کو دیکھ نہیں سکتے۔"

وہ لوگ کافی دیر تک سمندر کے کنارے رہے زرینہ اور خیر زماں کی نظروں کے سامنے ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوا تھا ایک جہانِ نو تھا جو اپنے سربستہ اسرار و رموز کو آہستہ آہستہ ان کے سامنے کھول رہا تھا پہاڑوں کی بلندیوں سے سمندر کی سطح تک کا طویل فاصلہ طے کرتے کرتے وہ طرح طرح کی چیزیں دیکھتے چلے آئے تھے۔

سمندر کے کنارے کافی وقت گزرنے کے بعد وہ لوگ وہاں سے روانہ ہوئے اور شہر کے مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے گاندھی گارڈن پہنچے۔ دراز گل اور اس کے گھر والے ان دونوں کو راستے کی اہم چیزوں اور عمارتوں وغیرہ کے بارے میں بھی بتاتے رہے۔

گاندھی گارڈن کی ایک الگ دنیا تھی' یہاں انہوں نے ایسی ایسی مخلوق دیکھی جس کے بارے میں کبھی سنا بھی نہیں تھا۔ وہ تو صرف اپنے علاقے میں پائے جانے والے حیوانات سے واقف تھے اور یہاں .... یہاں اس جگہ تو نہ جانے کیسے کیسے جانور اور پرندے وغیرہ موجود تھے۔ یہ جگہ بھی ان کے لئے کسی حیرت کدے سے کم نہیں تھی اور وہ یہاں آ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ اردو اور انگریزی میں لکھے ہوئے جانوروں کے نام خود تو نہیں پڑھ سکتے تھے شہزاد اور دردانہ ان کو بتاتے جا رہے تھے۔

سہ پہر کے قریب وہ گھر واپس آئے تو انہوں نے کافی وقت باہر گزارا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی باہر ہی کھایا تھا۔

"میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شہر میں یہ سب کچھ ہو گا۔" گھر واپس آنے کے بعد زرینہ نے اپنے شوہر خیر زماں سے کہا۔ "اگر میں اپنے گاؤں میں رہ کر ساری زندگی شہر کے بارے میں سوچتی رہتی تو بھی میں ان ساری چیزوں کا واضح طور پر تصور نہیں کر سکتی تھی جو کہ میں یہاں دیکھ رہی ہوں۔ واقعی خیر زماں ہم لوگ کتنی پرانی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اور ہمارے لوگوں کو کچھ پتہ بھی نہیں ہے۔" خیر زماں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "کتنے کم لوگ ہیں ہمارے گاؤں میں جنہوں نے کراچی دیکھا ہے اور جو یہاں کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔"

"ماما دراز گل اور ان کے گھر والے خوش نصیب ہیں کہ وہ یہاں رہ رہے ہیں۔" زرینہ نے کہا۔ "کاش ہم سب لوگ بھی یہیں رہ رہے ہوتے' یہاں تو کیسی کیسی چیزیں موجود ہیں۔ آنکھوں کو یقین نہیں آتا۔"

"اور اب ہم کو تو یہیں رہنا ہے۔" خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔ "میرے خیال میں ہم کافی آرام کر چکے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ کام شروع کر دیا جائے۔ میں ماما سے کہوں گا کہ وہ مجھ کو اب کام پر لگا دیں مہمان داری بہت ہو چکی اور تم بھی اب گھر کے کام کاج میں مامی کا ہاتھ بٹانا شروع کر دو۔"

"تم نے تو خود دیکھا ہو گا۔" زرینہ نے کہا۔ "میں کئی بار کوشش کر چکی ہوں لیکن مامی تو مجھے ابھی باورچی خانے میں جانے ہی نہیں دیتیں۔ حالانکہ میرا تو خود بہت جی چاہتا ہے کہ میں اس باورچی خانے میں کام کروں۔ یہاں کتنی ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اور میں چاہتی ہوں کہ ان کا استعمال سیکھوں مجھے تو اس باورچی خانے میں کام کرنے کا بہت شوق ہے مگر وہ تو بس یہ کہہ کر مجھ کو روک دیتی ہیں کہ تم نئی دلہن ہو اور تمہیں ابھی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں خود ان سے کہوں گا۔" خیر زماں نے کہا۔ "آخر ہم لوگ یہاں کب تک مہمان بنے رہیں گے۔"

"میں تو مامی اور دردانہ کے ساتھ مل کر سارے گھر کا کام کاج سنبھال لوں گی۔"

زرینہ نے کہا۔ "اور تم ماما سے کہو کہ وہ تم کو بھی کام سے لگا دیں۔ ہمیں اب کام کرنا چاہئے۔"

"اور یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ ہم کو ہمیشہ یہاں نہیں رہنا۔" خیر زماں نے کہا۔ "جیسے ہی میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ الگ گھر لے سکوں ویسے ہی میں الگ گھر لے لوں گا ان لوگوں پر ہماری وجہ سے جو مصیبت آن پڑی ہے اس سے ان کو جلد از جلد چھٹکارا مل جانا چاہئے۔"

"ہاں' میں خود بھی یہی چاہتی ہوں۔" زرینہ نے اداسی سے کہا۔ "ہماری تقدیر میں تو جو کچھ لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ میرا باپ تو ہم دونوں کے خون کا پیاسا ہے اور میں جانتی ہوں اسے جب بھی موقع ملے گا وہ ہمیں گولی مار دے گا۔ وہ ہم کو معاف نہیں کرے گا۔ بس یہی ہے کہ وہ ہم کو تلاش نہ کرپائے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارا باپ لوگوں کے سمجھانے بجھانے سے ہم کو معاف کر دے۔" خیر زماں نے کہا۔ "آخر ہم نے شرعی طور پر نکاح کیا ہے کوئی جرم تو نہیں کیا۔ آخر لڑکی اور لڑکے کی کہیں نہ کہیں تو شادی ہوتی ہی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ کچھ لوگوں کو بیچ میں ڈال کر تمہارے باپ کو راضی کرلیں اور اس کا غصہ ٹھنڈا کروا دیں۔"

"خدا جانے۔" زرینہ نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تو جو کچھ کرنا تھا وہ ہم کر گزرے۔ خیر زماں! اب آگے جو ہو سو ہو جو ہماری تقدیر ہے ہم کو ہر قسم کی صورت حال کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ بدترین صورتِ حال کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھنا چاہئے۔"

"اب تو ظاہر ہے کہ ہم بدترین صورت حال کے لئے تیار ہی ہیں جو کچھ ہو گا سو دیکھا جائے گا۔" خیر زماں نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔

اگلے دن خیر زماں نے اپنی مامی تاجور کی موجودگی میں اپنے ماموں دراز گل سے کہا۔

"ماما' بس اب آپ مجھ کو کوئی کام دلوا دیجئے میں یہاں خالی بیٹھنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ آپ مجھے کام دلوا دیجئے میں کام کروں گا جو بھی کام ملے میں تو ہر قسم کا کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "میں ایک دو روز میں تم کو کام پر لگا دوں گا کام مشکل نہیں ہو گا صرف نیا ہو گا اور چند ہی روز کے اندر تم سب کچھ سیکھ جاؤ گے۔ پھر کوئی

دشواری نہیں ہو گی۔"

"میں بہت جلدی سب کچھ سیکھ لوں گا ماما!" خیر زماں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ اس بات کی تو فکر ہی مت کیجئے اور مامی! آپ زرینہ کو گھر کے کام کاج پر لگائیے' یہ سارا دن آخر کیا کرے گی؟"

"ہاں مامی!" زرینہ نے جلدی سے کہا۔ "مجھے تو خالی رہنے کی عادت ہی نہیں ہے بس اب آپ مجھ کو گھر کا کام کاج کرنے کی اجازت دیجئے۔"

"ٹھیک ہے۔" تاجور نے کہا۔ "تمہاری مرضی اگر تم گھر کے کام کاج میں حصہ لینا چاہتی ہو تو ضرور لو ورنہ ہم تو تم کو مہمان بنا کر رکھنے پر تیار ہیں۔"

"مہمان داری تو بس دو تین دن کی ہوتی ہے مامی!" خیر زماں نے کہا۔ "اتنی لمبی مہمان داری کون کرتا ہے؟"

زرینہ نے تو اس دن سے گھر کے کام کاج میں حصہ لینا شروع کر دیا اس گھر کے کام کاج گاؤں میں اس کے اپنے گھر کے کام کاج سے بہت مختلف تھے اور اسے بہت کچھ سیکھنا تھا اور وہ اس کے لئے بخوشی تیار تھی۔ اس نے ابھی تک ڈر کے مارے نہ تو فریج کو ہاتھ لگایا تھا نہ ڈیپ فریزر کو وہ ان چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اور اس لئے اس بات سے خوفزدہ تھی کہ اگر اس نے ان کو چھوا تو وہ ان کو خراب کر دے گی۔ حالانکہ دردانہ نے اس کو اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ ان چیزوں کو کس طرح سے کھولا اور بند کیا جاتا ہے اور ان میں چیزیں کس طرح رکھی اور نکالی جاتی ہیں اور اس نے اپنے ہاتھ سے اب تک گیس کا چولہا بھی روشن نہیں کیا تھا وہ ایک خاص فاصلے سے اس کو دیکھتی تھی اور اس سے ڈرتی رہتی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر وہ کیا چیز ہے وہ کون سا ایندھن ہے جو اس چولہے میں جلتا ہے۔ وہ ایندھن کہیں نظر بھی نہیں آتا تھا اور بس چولہا ایک دم سے جلنے لگتا تھا اور پھر وہ جلتا ہی رہتا تھا جب تک چاہو تب تک وہ جلتا رہتا تھا۔

یہ سارے اسرار و رموز اسے معلوم کرنے تھے اسے اب اس زندگی کی ساری باریکیوں سے واقف ہونا تھا جو کہ اب اس کو یہیں زندگی گزارنی تھی۔

زرینہ بہت مشکل سے یہ بات سمجھ سکی تھی کہ چولہے میں جلنے والی گیس یہاں سے سینکڑوں میل دور کسی جگہ سے آتی تھی کیونکر آتی ہے؟ کیسے آتی ہے؟ یہ سب کچھ

سمجھانے کے باوجود وہ پوری طرح نہیں سمجھ سکی۔

خیر زماں کے بارے میں دراز گل اور اس کی بیوی نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ کیا کرنا تھا۔

دراز گل اگر چاہتا تو خیر زماں کو اپنے ساتھ ہی کام پر لگا سکتا تھا اس کے پاس اس کی گنجائش نکل سکتی تھی لیکن تاجور سے مشورہ کے بعد اس نے ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”بس اس کو بہت زیادہ اپنے ساتھ نتھی نہیں کرنا چاہئے۔“ تاجور نے اس سے کہا تھا۔ ”بہتر ہو گا کہ تم اس کو اپنے ساتھ کام پر لگانے کے بجائے کسی دوسرے کے پاس کام پر لگا دو۔ اگر شمروز خان یا اس کے آدمی خیر زماں کی تلاش میں یہاں پہنچیں گے بھی تو وہ خیر زماں کو ہمارے ساتھ اتنا زیادہ منسلک تو نہیں پائیں گے۔ خیر زماں تمہارے ساتھ نہیں کسی اور کے ساتھ کام کر رہا ہو گا اور کم از کم یہ بات تو ان لوگوں کو نظر آ ہی جائے گی۔“

”تمہارا خیال ٹھیک ہے۔“ دراز گل نے جواب دیا۔ ”میں پہلے ہی اس بات کا فیصلہ کر چکا ہوں کہ اس کو اپنے ساتھ کام پر نہیں لگاؤں گا۔ میں اس کو کسی بھی دوسرے بیوپاری کے ساتھ کام پر لگا دوں گا یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ میں اپنی ذاتی ضمانت پر اس کو کسی کے پاس بھی کام پر رکھوا دوں گا اس کے ساتھ بس یہی ایک دشواری ہے کہ اس کو پشتو کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں آتی لیکن کچھ ہی دن میں وہ سیکھ جائے گا اور میں فی الحال اس کو ایسی جگہ لگاؤں گا جہاں اس کا تعلق زیادہ تر پشتو بولنے والوں کے ساتھ ہی رہے گا۔“

”اس کا کام چل نکلے اور وہ الگ گھر لینے کے قابل ہو جائے تو پھر اس کے لئے رہائش کا بندوبست کر دینا۔“ تاجور نے کہا۔ ”اور یہ سب کچھ جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں اپنے بچوں کی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ ہم لوگ نہ لینے میں نہ دینے میں ہم خواہ مخواہ کسی انتقامی کارروائی کا شکار کیوں ہوں؟“

”میری کوشش تو یہی ہو گی کہ جلد از جلد ان دونوں کی رہائش کا کہیں اور بندوبست کر دوں۔“ دراز گل نے کہا۔ ”لیکن جب تک وہ لوگ ہمارے گھر میں رہ رہے ہیں تب تک وہ ہماری پناہ میں ہیں اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری ہمارے اوپر عائد ہوتی ہے۔ ہم جتنی جلدی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔“

تاجور کی آنکھوں میں تشویش کے آثار تھے۔ دراز گل اس کے دل کی کیفیت کو

پوری طرح سے سمجھتا تھا اس کو معلوم تھا کہ تاجور اس کی طرف سے اور اپنے بچوں کی طرف سے پریشان ہے وہ لوگ انتقام اور خونریزی کی اس فضا سے جو ان کے علاقے کی اور ان کی خاندانی روایات کا ایک حصہ تھی، ہمیشہ کے لئے اپنا ناطہ توڑ چکے تھے اور وہ دوبارہ اس رشتے کو جوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

اگلے روز دراز گل خیر زماں کو اپنے ساتھ منڈی لے گیا اور دراز گل خود تو عام طور سے رات کے آخری پہر میں منڈی جاتا تھا اور دن کے پہلے پہر میں واپس آ جاتا تھا اس کے بعد بھی اس کے منڈی کے کئی چکر ہو جاتے تھے۔ گھر سے منڈی کا فاصلہ ہی کتنا تھا پیدل جانے میں چھ سات منٹ بھی نہیں لگتے تھے لیکن دراز گل نے خیر زماں کو پہلی بار دن کے وقت منڈی لے جانے کا فیصلہ کیا رات کے وقت نہیں۔

خیر زماں پہلی بار کراچی کی سبزی منڈی اور فروٹ منڈی میں داخل ہوا اور اس کا دماغ گھومنے لگا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ساری دنیا میں پیدا ہونے والے پھل اور سبزیاں کراچی کی سبزی منڈی میں ہی آ کر جمع ہو گئے ہیں اور منڈی تھی کہ شیطان کی آنت کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

دراز گل کا پھلوں کا کاروبار تھا اور اس نے خیر زماں کو پوری فروٹ مارکیٹ اچھی طرح گھمائی۔ اس نے اس کو وہ کولڈ اسٹوریج بھی دکھائے جن میں پھلوں کو محفوظ رکھا جاتا تھا۔ نیلامی وغیرہ کی جگہ بھی دکھائی۔ منڈی کیا تھی ایک پورا شہر تھا جس میں طرح طرح کے لوگ آباد تھے۔

دراز گل نے بہت سے لوگوں سے اس کا تعارف کروا دیا اور انہیں اس کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ اس کا بھانجا ہے اور گاؤں سے آیا ہے۔ یہاں زیادہ تر لوگ پشتو بولنے والے تھے اور ان کے ساتھ گفتگو میں خیر زماں کو کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی مگر کئی ایسے لوگ بھی تھے جن کو پشتو نہیں آتی تھی ان کے ساتھ خیر زماں کی ملاقات میں دراز گل نے ترجمانی کے فرائض سرانجام دیئے۔

”جلد ہی یہ اردو سیکھ جائے گا۔“ دراز گل نے اپنے ملنے جلنے والوں سے کہا۔ ”ابھی نیا نیا گاؤں سے آیا ہے سوائے پشتو کے اور کوئی زبان نہیں بول سکتا۔“

”بالکل سیکھ جائے گا۔“ ایک پٹھان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں بھی آج سے پندرہ سال پہلے جب کراچی آیا تھا تو مجھ کو پشتو کے سوا کسی دوسری زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا

تھا اور منڈی میں کام کرتے ہوئے مجھے بارہ سال ہو گئے ہیں اب اردو کے علاوہ پنجابی اور سندھی بھی بول اور سمجھ سکتا ہوں۔"

"آدمی کو سیکھنے کا شوق ہونا چاہئے۔" ایک اور شخص نے کہا۔ "وہ سب کچھ سیکھ سکتا ہے۔"

خیر زماں اپنے آپ کو ذہنی طور پر ان لوگوں کا حصہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا جن کا تعلق منڈی سے تھا اور جو منڈی میں کام کرتے تھے اور اس عمل میں اس کو ایک خاص قسم کی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ تھے وہ لوگ جن کے ساتھ اس کو کام کرنا تھا' اسے انہی جیسا بننا تھا۔

اس روز دراز گل نے منڈی میں اس کی ملاقات حاکم جان ثای ایک بیوپاری سے کروائی جس کا پھلوں کا بڑا کاروبار تھا۔ حاکم جان ایک پٹھان تھا اس کی رہائش بھی منڈی کے قریب پیر کالونی میں ہی تھی اس نے ایک کوارٹر کرائے پر لیا ہوا تھا جس میں اس کا دفتر بھی تھا اور وہ اپنے چند کارندوں کے ساتھ رہتا بھی وہیں تھا۔ اس کے گھر والے کوہاٹ میں رہتے تھے۔ وہ اکیلا یہاں رہتا تھا' یہاں اس کے ساتھ باہر سے آنے والے بیوپاری بھی رہتے تھے۔

"میں نے حاکم جان سے تمہارے لئے بات کی ہے۔" بعد میں دراز گل نے خیر زماں سے کہا۔ "حاکم جان کو ایک ایسے قابل اعتماد اور ایماندار آدمی کی ضرورت ہے جو دوسرے کام کرنے کے ساتھ ساتھ روپے پیسے کے معاملات کو بھی سنبھال سکے۔ آج سے کچھ عرصے پہلے اس کا ایک ملازم پچاس ہزار روپے لے کر بھاگ گیا تھا اور اس کا آج تک کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ تب سے حاکم جان لوگوں پر اعتماد کرنے کے معاملے میں بہت ہوشیار ہو گیا ہے اور وہ روپے پیسے کا سارا حساب کتاب صرف اپنے پاس رکھتا ہے لیکن اس کو کسی ایسے آدمی کی اشد ضرورت ہے جو اس کی مدد کر سکے لیکن اس شخص کا مکمل طور پر قابل اعتماد ہونا بہت ضروری ہے۔ میں تم کو حاکم جان کے پاس ملازم رکھوا رہا ہوں۔"

"لیکن ماما! مجھے تو روپے پیسے کے حساب کتاب کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں نے تو یہ کام کبھی نہیں کیا اور میں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"سب کچھ جان جاؤ گے۔" دراز گل نے اس کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "کچھ مشکل نہیں ہے حاکم جان خود ہی تم کو سارے کام کے متعلق سمجھا دے گا اور تم تیزی سے

سیکھتے چلے جاؤ گے صرف روپے اور لین دین کے بارے میں ہی نہیں بلکہ اور بہت سی چیزوں کے بارے میں بھی حاکم جان تم کو سکھا دے گا اور خود میں بھی تم کو سکھاتا رہوں گا۔"

"اچھا.......... تو مجھے حاکم جان کے ہاں اور کیا کام کرنا ہو گا ماما!" خیر زماں نے تجسس اور اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

"وہ خود ہی تم کو بتاتا جائے گا کہ تم کو کیا کیا کرنا ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "بس ایک بات اچھی طرح یاد رکھو کہ آدمی جب کسی کے پاس نوکری کرتا ہے تو اسے اپنے مالک کے مفادات کا پوری طرح سے خیال رکھنا چاہئے۔ تم حاکم جان کے پاس نوکری کرو گے تو تم کو اس کے فائدے کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے۔"

"ہاں ماما!" خیر زماں نے کہا۔ "میں ایسا ہی کروں گا۔ میں اگر حاکم جان کے ساتھ کام کروں گا تو پھر اس کے فائدے کا پوری طرح سے خیال بھی رکھوں گا۔"

"کوئی بھی کام مشکل نہیں ہوتا۔" دراز گل نے اس سے کہا۔ "تم چند دن حاکم جان کے ساتھ کام کرو گے اور سارا کام سیکھ لو گے۔ بس جو مشکل تمہیں درپیش آئے گی وہ صرف زبان کی وجہ سے اس پر جلد از جلد قابو پانے کی کوشش کرو جتنی جلدی تم اردو بولنا سیکھ لو گے اتنی ہی جلدی تمہاری مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

"میں جلد سے جلد اردو سیکھ لوں گا ماما!" خیر زماں نے کہا۔

"منڈی میں کاروبار کے دوران تمہارا واسطہ مختلف لوگوں سے پڑے گا۔" دراز گل نے اس کو بتایا۔ "یہاں تمہیں پاکستان کی ہر زبان بولنے والے لوگ ملیں گے۔ پشتو بولنے والے' پنجابی بولنے والے' سرائیکی' سندھی' بلوچی بولنے والے۔ منڈی میں تمہیں پاکستان بھر کی زبانیں بولنے والے لوگ ملیں گے لیکن وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ صرف ایک ہی زبان کے ذریعے مربوط اور متحد ہیں اور وہ زبان ہے اردو۔ اگر اردو آتی ہے تو پھر منڈی میں کام کرنا بہت آسان ہے لیکن اگر اردو نہیں آتی تو پھر بہت مشکل.........."

"تو پھر میں ابھی سے کام کر سکوں گا ماما!" خیر زماں نے قدرے تردد کے ساتھ پوچھا۔

"تم سیکھتے جاؤ گے اور کام کرتے جاؤ گے' کام کرتے جاؤ گے اور ساتھ میں سیکھتے جاؤ گے کوئی مشکل نہیں ہے۔"

اس رات خیر زماں اور زرینہ کی ملاقات کافی دیر سے ہو سکی کیونکہ زرینہ آج باورچی

خانے میں بہت مصروف رہی تھی۔ اس نے آج دن کا کافی حصہ باورچی خانے میں گزارا تھا اور رات کے کھانے کے بعد سے وہ ایک بار پھر باورچی خانے میں گھس گئی۔ جہاں بہت سارے کام اس کے منتظر تھے اور وہ ان کو انجام دینے میں ایک خاص قسم کی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ تاجور اس کو مختلف کاموں کے بارے میں بتا رہی تھی اور زرینہ بڑی دل جمعی اور انہماک کے ساتھ سب کچھ سیکھ رہی تھی۔ زرینہ نے اپنے ہاتھ سے چولہا جلانا اور بجھانا سیکھا اور گیس کی چابی بھی اپنے ہاتھ سے بند کی اور اس کا دل بے پایاں احساس مسرت سے لبریز ہو گیا۔ تو یہ تھی وہ ایسے نئے نئے اور پیچیدہ کام انجام دینے والی۔ وہ ایک دم سے بہت آگے بڑھ گئی تھی۔

چنانچہ اس رات خیر زماں سے اس کی ملاقات کافی دیر سے ہوئی جب وہ باورچی خانے کا سارا کام ختم کرنے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچی جہاں خیر زماں اس کا منتظر تھا تو اس کو ذرا سی بھی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی' اس کے برخلاف وہ خود کو بہت آرام دہ اور مسرور محسوس کر رہی تھی۔

خیر زماں نے اس کو بتایا کہ ماما دراز گل نے اس کو سبزی منڈی کے ایک بیوپاری حاکم جان کے ساتھ کام پر لگا دیا ہے اور اب وہ اس کے ساتھ کام شروع کر دے گا۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" زرینہ نے خوش ہو کر کہا۔ "آدمی کے لئے رزق وہی اچھا ہوتا ہے جو اپنے ہاتھ سے کمایا گیا ہو۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تم کو نوکری مل گئی' اب ہم مہمان نہیں رہے اور یہی میں چاہتی تھی۔"

اگلے روز دن میں دراز گل خیر زماں کو اپنے ساتھ دوبارہ منڈی لے گیا اور وہاں اس نے اس کو حاکم جان کے حوالے کر دیا۔

"اسے میں تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔" اس نے حاکم جان سے کہا۔ "اپنے ہی گھر کا بچہ ہے تم اس پر پورا بھروسہ کر سکتے ہو۔ بس یہ ہے کہ ابھی اس کو یہاں کا کام آتا نہیں ہے تم کو اسے کام سکھانا ہو گا اور ساتھ ساتھ اس کو اردو بھی سکھانی ہو گی۔ خیال رہے ابھی یہ پشتو کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں بول سکتا۔"

"ان سب باتوں کی فکر کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟" حاکم جان نے کہا۔ "میں اس کو سب کچھ سکھا دوں گا اور یہ سب کچھ سیکھ لے گا۔ بس تم اس کو اب میرے پاس چھوڑ دو۔"

دراز گل نے خیر زماں کو حاکم جان کے حوالے کر دیا۔ ان کے درمیان ضروری معاملات طے پا گئے اور ابتدائی تنخواہ وغیرہ کا تعین بھی ہو گیا۔

"تھوڑے دن کام کر لو اس کے بعد میں تمہاری تنخواہ اور بڑھا دوں گا۔" حاکم جان نے اس سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ کام کرتے رہو اور خوش رہو۔"

"میری کوشش ہو گی کہ میں آپ کو خوش رکھوں۔" خیر زماں نے جواب دیا۔

اس کے بعد حاکم جان نے اسے اپنے کام کے بارے میں بہت سی باتیں سمجھائیں اور وہ اسے منڈی میں ان مختلف جگہوں پر لے کر گیا جہاں اس کا کام تھا اور اسے لوگوں سے ملانا تھا نیز کام کے بارے میں بھی اس کو بتاتا رہا۔

خیر زماں نے کل بھی گھوم پھر کر منڈی دیکھی تھی اور آج بھی وہ اس کو دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اس جگہ کا موازنہ اپنے گاؤں سے کر رہا تھا اور یہ کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا کہ اس کے گاؤں جیسے تو نہ جانے کتنے گاؤں اس منڈی کے اندر سما سکتے تھے یہ کتنی وسیع جگہ پر پھیلی ہوئی تھی اور کس قدر لوگ موجود تھے یہاں چپے چپے پر آدمی ہی آدمی تھے' کاروبار کرنے والوں اور دکانداروں کے علاوہ خریداروں کا ایک ہجوم تھا جو ہر طرف رواں دواں تھا۔ کل بھی جب وہ یہاں آیا تھا تو اس نے یہاں خریداروں کے ایسے ہی ہجوم دیکھتے تھے اور اسے حیرت ہوئی تھی کہ آخر لوگ اتنی زیادہ خریداری کیوں کر رہے ہیں اور آج بھی دن کے وقت جب وہ یہاں موجود تھا تو اس کو ہر طرف خریداروں کی بھیڑ نظر آ رہی تھی۔ نہ جانے کہاں سے اتنے بہت سے خریدار آ گئے تھے جو منڈی کے سارے پھل ہی خرید لینا چاہتے تھے اور دلچسپ بات تو یہ تھی کہ اتنی زبردست خریداری کے باوجود دکانیں مال سے بھری پڑی تھیں۔

سہ پہر تک حاکم جان منڈی میں ہی رہا اور اس نے خیر زماں کو بھی اپنے ساتھ رکھا وہ اسے بہت سارے لوگوں سے ملواتا رہا اور اس کے بارے میں انہیں بتاتا رہا کہ وہ اس کا نیا کارکن ہے اور آئندہ اس کے ساتھ کام کرے گا۔ ملاقاتوں میں بہت سارے ایسے لوگ بھی تھے جن کو پشتو نہیں آتی تھی۔ خیر زماں ان کی بات سمجھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

"بس اب تم گھر جاؤ۔" سہ پہر کو حاکم جان نے اس سے کہا۔ "اور رات کے آخری پہر میں جب دراز گل منڈی آئے تو اس کے ساتھ ہی تم بھی آ جانا میں اپنی جگہ پر ملوں گا اور پھر ہم کام شروع کریں گے۔"

"ٹھیک ہے ماما!" خیر زماں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

اپنے گھر سے دور الگ ایک اجرتی کارکن کی حیثیت سے اس کے کام کا پہلا دن تھا اور وہ بہت خوش تھا کہ آج اس نے کوئی کام کیا تھا اور جتنا کام کیا تھا اس سے زیادہ کام کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اور زبان کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ آج اس نے بہت سارے پھلوں کے اردو نام سیکھ لئے تھے اور انہیں اچھی طرح سے یاد کر لیا تھا اور کئی دوسری ضروری چیزوں کے لئے بھی اردو کے الفاظ سیکھ لئے تھے اور اچھی طرح سے یاد کر لئے تھے۔ اس نے ایک نئی زبان اور ایک نیا کام سیکھنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ یہ کام ایسا تھا جس کے بارے میں وہ پہلے سے کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن اس نے اپنے ذہن اور جسم کی ساری قوتوں کے ساتھ اس کو سیکھنا شروع کر دیا تھا اس کو یہ بات اچھی طرح سے معلوم تھی کہ اس کے پاس اپنے ہاتھ پیروں کی قوت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ یہی قوت محنت تو تھی جس پر اس کی اور اس کی بیوی کی آئندہ زندگی کا دار و مدار تھا اپنا گاؤں چھوڑنے کے بعد حالات بالکل بدل چکے تھے۔ اب نہ اس کے پاس زمین تھی' نہ مویشی تھے اور نہ یہ چیزیں اس کے پاس ہو سکتی تھیں۔ اسے شہر میں رہ کر شہری انداز کی زندگی گزارنی تھی اور یہاں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی وہ تھی قوت' محنت' وسائل اس کے پاس نہیں تھے صرف قوت محنت تھی اور اس کو بیچ کر اسے اپنی روزی روٹی حاصل کرنی تھی۔

وہ جب گھر واپس پہنچا تو اس نے زرینہ کو اپنا منتظر پایا وہ بہت خوش تھا اور زرینہ بھی بہت خوش تھی۔ خیر زماں نے کام شروع کر دیا تھا اور نئی زندگی کے ایک اور مرحلے کا آغاز ہو چکا تھا۔

"اچھا اب مجھے شروع سے بتاؤ کہ تمہارا آج کا دن کیسا گزرا؟" زرینہ نے سراپا اشتیاق بن کر اس سے پوچھا۔ "تم نے کیا کیا کام کیا اور کس طرح کیا؟"

خیر زماں بہت زیادہ خوش ہو کر اس کو اپنی آج کے دن کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتا رہا اور اس نے اپنے سارے علم میں جو کہ اس نے آج حاصل کیا تھا زرینہ کو بھی شریک کیا اس نے زرینہ کو اردو میں پھلوں کے وہ سارے نام بھی بتا دیئے جو اس نے آج ہی سیکھے اور یاد کئے تھے اور اس کا دل فخر اور مسرت کے ایک گہرے احساس سے بھر گیا۔ زندگی اس کے سامنے ایک نیا چیلنج لے کر آئی تھی اور اس نے اس چیلنج کو قبول کر لیا تھا۔

اسے کام کرنا تھا نیا کام سیکھنا تھا نئی زبان سیکھنی تھی اور اس معاشرے میں اپنی جگہ بنانی تھی جہاں حالات نے اس کو لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

اس رات وہ رات کے آخری پہر میں اپنے ماموں دراز گل کے ساتھ منڈی گیا اور اس وقت یہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ فروٹ منڈی کی ساری عمارت بجلی کی روشنی سے جگمگا رہی تھی اور کاروباری سرگرمیاں بڑے زور و شور کے ساتھ جاری تھیں۔ حاکم جان اسے اپنی جگہ پر مل گیا اور دراز گل نے اس کو حاکم جان کے سپرد کر دیا۔

منڈی میں اس وقت اس قدر ٹرک تھے کہ خیر زماں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنے بہت سارے ٹرک اکٹھے نہیں دیکھتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ساری دنیا کے ٹرک یہیں اسی جگہ آ کر جمع ہو گئے ہوں۔ ٹرکوں میں اوپر تک ایک دوسرے سے اوپر تک طرح طرح کے پھلوں کی پیٹیاں بھری ہوئی تھیں اور پھلوں کا نیلام ہو رہا تھا۔ خیر زماں حاکم جان کے ساتھ تھا۔ خیر زماں کے علاوہ حاکم جان کے ساتھ اس کا ایک اور ملازم بھی تھا۔ پھلوں کی نیلامی ہو رہی تھی اور حاکم جان بھی اس میں حصہ لے رہا تھا۔

خیر زماں اس روز صبح کے گیارہ بجے تک منڈی میں رہا اور پھر حاکم جان نے اس کو گھر بھیج دیا۔

"اب شام کو چار بجے میرے گھر پر آنا۔" اس نے خیر زماں کو ہدایت کی۔ "وہاں بیٹھ کر حساب کتاب کریں گے اور کچھ بیوپاریوں سے بھی ملاقات کریں گے۔"

اس دن کے بعد سے خیر زماں نے حاکم جان کے ساتھ باقاعدہ کام شروع کر دیا۔

خیر زماں کو کبھی کسی دوسرے میدان میں اپنی صلاحیتوں کی آزمائش کا موقع نہیں ملا تھا۔ گاؤں میں ایک لگی بندھی بہت محدود قسم کی زندگی گزار رہا تھا جس کا تعلق ایک ہی جیسے صدیوں پرانے ایسے کاموں سے تھا جن میں کسی تبدیلی اور تنوع کی گنجائش نہیں تھی لیکن اب جبکہ اس کو ایک نئے کام سے وابستہ ہونے کا موقع ملا تو اس پر علم اور آگہی کے نئے افق روشن ہونا شروع ہوئے۔ اس کی خفیہ صلاحیتیں تیزی سے بیدار ہونے لگیں وہ چونکہ بڑی جانفشانی اور شوق کے ساتھ یہ کام کر رہا تھا اس لئے اس کو نہ صرف یہ کہ زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل ہوتی گئی بلکہ حاکم جان کی نظروں میں اس کی قدر و قیمت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ خیر زماں بڑی تیزی کے ساتھ کام سیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی وہ زبان بھی سیکھ رہا تھا اس نے کچھ ٹوٹی پھوٹی اردو بولنا شروع کر دی تھی۔ حاکم جان اس کی کارکردگی سے

بہت زیادہ مطمئن تھا۔ خیر زماں نے اپنے آپ کو ایک قابل اعتماد انسان ثابت کیا تھا اور حاکم جان کو ایک ایسے ہی آدمی کی تلاش تھی وہ دل ہی دل میں اپنے دوست دراز گل کا شکر گزار تھا کہ اس نے اس کو ایک ایسا آدمی دے دیا تھا اور اب وہ خیر زماں کو کھونا نہیں چاہتا تھا کہ اس کو جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ تربیت دے کر اپنے کام کا آدمی بنا لے اور پھر اس کو اپنے ہی ساتھ رکھے۔

دراز گل نے حاکم جان کو خیر زماں اور زرینہ کے معاملے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا یہ سب کچھ جاننا حاکم جان کے لئے غیر ضروری تھا یہ ان لوگوں کا ذاتی اور خاندانی مسئلہ تھا حاکم جان کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ خیر زماں اور اس کی بیوی زرینہ گاؤں سے آئے ہیں اور انہیں پشتو کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں آتی یہ کوئی ایسی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔

چنانچہ حاکم جان کو اکثر اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ دراز گل نے خیر زماں کو خود اپنے ساتھ کام پر کیوں نہیں لگا لیا جبکہ دراز گل کے پاس اس کی گنجائش بھی موجود تھی اور خیر زماں دراز گل کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ تاہم اس نے دراز گل سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ ہر آدمی کی اپنی کچھ نہ کچھ مصلحتیں ہوتی ہیں کیا معلوم کوئی ایسی وجہ ہو جس کی بناء پر دراز گل نے اپنے بھانجے کو اپنے ساتھ کام پر نہ لگانا چاہا ہو۔ کوئی خاندانی مسائل بھی ہو سکتے تھے بہرحال اس کے یعنی حاکم جان کے لئے تو ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا کہ دراز گل نے خیر زماں کو اپنے ساتھ لگانے کے بجائے اس کے ساتھ لگا دیا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اور خیر زماں منڈی میں حاکم جان کے ساتھ کام کرتا رہا۔

زرینہ گھر کے کام کاج میں بھرپور حصہ لیتی تھی بلکہ اب تو اس نے تقریباً سارا باورچی خانہ ہی سنبھال لیا تھا۔ وہ تاجور کو زیادہ کام نہیں کرنے دیتی تھی اور زیادہ سے زیادہ کام خود کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ لوگ اس کے اور اس کے شوہر کے محسن تھے اگر یہ ان دونوں کی مدد نہ کرتے تو شاید وہ کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتے تھے۔ ان دونوں کی نئی زندگی تو اسی خاندان کے مرہون منت تھی۔

زرینہ نے بہت جلد وہ ساری چیزیں جان لی تھیں اور سیکھ لی تھیں جن کا اس سے پہلے وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ ساری چیزیں اس کے تصور میں بھی نہیں تھیں۔

وہ چیزیں شروع شروع میں عجوبہ لگی تھیں اب عام زندگی کا حصہ معلوم ہونے لگی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تصورات کا رنگ کس قدر بدل گیا تھا۔

خیر زماں کو کام شروع کئے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس ایک ماہ کے عرصہ کے دوران وہ دونوں ایک لمحے کے لئے بھی اس خطرے سے غافل نہیں ہوئے تھے جو اس وقت سے ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا جب سے وہ اپنے گھروں سے بھاگے تھے۔ وہ اپنی نئی زندگی سے خوش اور مطمئن تھے لیکن اس اطمینان اور خوشی میں ایک نامعلوم خطرے کا احساس ہمیشہ موجود رہتا تھا۔

ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا اور کراچی میں تو سردی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یہ تو تھا کہ ان کی آمد کے بعد سے موسم میں کچھ معمولی سی تبدیلیاں ہوئی تھیں لیکن گرمی تقریباً ایسی ہی تھی۔

وہ دونوں جب اپنے گاؤں سے روانہ ہوئے تھے تو اس وقت وہاں موسم سرما شروع ہو چکا تھا اور رات کے وقت تو سخت سردی پڑنے لگی تھی اور اب ایک ماہ کی مدت گزر جانے کے بعد تو سارا علاقہ دور دور تک برف سے ڈھک چکا ہو گا سارے راستے بند ہو چکے ہوں گے دن میں بھی برف میں بھیگی ہوئی رگوں میں اتر جانے والی بے حد سرد ہوائیں چلتی ہوں گی اور لوگ دن کے وقت بھی زیادہ تر گھروں کے اندر ہی بند رہتے ہوں گے لیکن یہاں .... یہاں کراچی میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ دن بھر گرمی رہتی تھی اور پسینہ آتا رہتا تھا۔ کپڑے جسم سے بری طرح چپکے رہتے تھے البتہ کسی کسی دن موسم میں خنکی آ جاتی تھی لیکن سردی بہرحال نہیں تھی۔ ایک ماہ کی مدت گزرنے کے بعد ان کو اس بات کا تو اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ اب کچھ عرصے تک خطروں سے محفوظ ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اب ان کے علاقے سے باہر آنا جانا ناممکن ہو چکا تھا وہ جانتے تھے کہ شدید برف باری اور سردی کے باعث سارے راستے بند ہو چکے ہوں گے اور آئندہ کئی ماہ تک بند رہیں گے۔ گاؤں سے نکل کر کوئی شخص قریبی شہر تک نہیں جا سکتا تھا۔

صرف وہ دونوں ہی نہیں دراز گل اور اس کی بیوی بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ وقت گزر چکا تھا جب گاؤں سے کسی شخص کا آنا ممکن تھا۔ اب فی الحال تو کوئی بھی نہیں آ سکتا تھا۔

"سردیوں کا موسم ختم ہونے تک ان دونوں کی علیحدہ رہائش کا بندوبست بھی شاید

ہو جائے گا۔" اس رات دراز گل نے اپنی بیوی سے کہا۔ "حاکم جان خیر زماں کے کام سے بہت مطمئن ہے۔ خیر زماں نے اپنے آپ کو بہت اچھا کارکن ثابت کیا ہے۔ حاکم جان کئی بار مجھ سے یہ بات کہہ چکا ہے کہ اس کو ایسے ہی کسی آدمی کی تلاش تھی اور وہ عنقریب خیر زماں کی تنخواہ بڑھا دے گا۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" تاجور نے کہا۔ "اس کو اتنے پیسے ملنے لگیں کہ وہ علیحدہ گھر کے اخراجات برداشت کر سکے۔ ویسے تو ہم بھی اس کی کچھ نہ کچھ مدد کر سکتے ہیں۔"

"نہیں.........." دراز گل نے کہا۔ "میں جانتا ہوں وہ اس قسم کی مدد قبول نہیں کرے گا اور میں اس کی عزتِ نفس کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔ بہتر ہو گا کہ اسے خود اس قابل ہونے دو کہ وہ اپنی ساری ذمہ داریاں سنبھال سکے ہاں خدا نخواستہ اگر کوئی مجبوری پیش آ گئی تو دوسری بات ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" تاجور نے کہا۔ "ہم دوسرے کئی طریقوں سے ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ اگر ہم سے الگ ہو کر رہیں گے تو یہ صرف ہمارے لئے ہی نہیں ان کے لئے بھی اچھا ہو گا۔ آدمی جب دوسرے کے گھر میں رہتا ہے تو اس کو ہزار چیزوں کا خیال کرنا پڑتا ہے لیکن جب وہ اپنے گھر میں رہتا ہے تو اس کو ہر معاملے میں مکمل آزادی ہوتی ہے اور اسے کسی دوسرے کی خواہشات کا تابع نہیں ہونا پڑتا۔"

خیر زماں کا خاصہ وقت اب حاکم جان کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہ روز رات کے آخری پہر میں حاکم جان کے پاس پہنچتا تھا اور پھر ان کی کاروباری مصروفیات شروع ہو جاتی تھیں۔ جن کا سلسلہ دن کے دس گیارہ بجے تک جاری رہتا تھا اس کے بعد خیر زماں گھر آ کر سو جاتا تھا اور دوپہر کے ایک بجے کے قریب کھانا کھا کر وہ دوبارہ منڈی چلا جاتا تھا یا حاکم جان کے گھر چلا جاتا تھا جیسی بھی اس کو ہدایت ملتی تھی اس کے مطابق وہ عمل کرتا تھا پھر چار پانچ بجے تک گھر واپس آ جاتا تھا اور رات کے کھانے کے بعد ایک بار پھر حاکم جان کے گھر چلا جاتا تھا اور بہر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ وہاں گزارنے کے بعد واپس اپنے گھر آ جاتا تھا چونکہ رات کے آخری پہر میں بیدار ہونا ہوتا تھا اس لئے وہ جلدی سو جاتا تھا۔ دراز گل تو اس سے بھی جلدی سو جاتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ دراز گل نو بجے رات کو شروع ہونے والا ٹی وی کا خبرنامہ پورا دیکھتا ہو۔ خبرنامہ چل ہی رہا ہوتا تھا کہ وہ سونے کے لئے لیٹ جاتا تھا اور سو

بھی جاتا تھا اور عام طور سے رات کے آخری پہر میں منڈی جانے کے لئے وہ دونوں ایک ساتھ ہی گھر سے روانہ ہوتے تھے۔ اس وقت گھر کے آس پاس بڑا گہرا اور ڈراؤنا سناٹا ہوتا تھا۔

خیر زماں نے ایک ماہ کے اندر اندر اچھی خاصی اردو سیکھ لی تھی اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اردو بھی بولے وہ اب ان لوگوں کے ساتھ جنہیں پشتو نہیں آتی تھی کام چلانے کی حد تک اردو میں بات کر لیا کرتا تھا اور جتنی اردو وہ خود سیکھ رہا تھا وہی سب کچھ زرینہ کو بھی سکھانے کی کوشش کرتا تھا اور زرینہ خود بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ سب کچھ سیکھ رہی تھی۔ اب تو وہ گھر میں بھی لوگوں کے ساتھ اردو بولنے کی کوشش کرتی تھی۔

اس روز رات کے پچھلے پہر منڈی میں خیر زماں ایک ٹرک کے پاس کھڑا ہوا تھا حاکم جان اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا کسی آدمی سے بات کرنے میں مصروف تھا ٹرک میں پھلوں کی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں جنہیں اس میں سے اتارا جا رہا تھا دو آدمی ٹرک کے اوپر چڑھے ہوئے تھے اور وہ بھاری بھاری پیٹیاں اوپر سے اتار اتار کر ان مزدوروں کو دے رہے تھے جو نیچے کھڑے ہوئے تھے۔ نیچے کھڑے ہوئے مزدور ان پیٹیوں کو جلدی جلدی سنبھال کر ایک طرف نیچے ڈھیر کرتے جا رہے تھے۔

خیر زماں نیچے کھڑا ہوا اتاری جانے والی پیٹیوں کی گنتی کر رہا تھا۔ یہ بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ نیچے اتارے جانے کے بعد اگرچہ گنتی کرنا مشکل ہوتا تھا لیکن خیر زماں خاصی محنت کر کے اور وقت لگا کر نیچے بھی دوبارہ گنتی کر لیتا تھا۔

اچانک اوپر کھڑے ہوئے مزدوروں میں سے ایک مزدور کے ہاتھوں سے ایک پیٹی پھسل گئی نیچے کھڑا ہوا مزدور اس پیٹی کو سنبھال نہ سکا اور پیٹی سیدھی خیر زماں کے سر پر آن گری بھاری بھرکم پیٹی خیر زماں کے سر پر بھرپور ضرب لگاتی ہوئی نیچے زمین پر گری اور اس کے ساتھ ہی خیر زماں بھی نیچے گر گیا اس کے سر سے بڑی تیزی کے ساتھ خون بہنے لگا۔

لوگوں نے جلدی سے خیر زماں کو سنبھالا لیکن خیر زماں بے ہوش ہو چکا تھا اس کے سر میں سے خون نکلنے لگا تھا اور وہ بے سدھ ہوا جا رہا تھا۔

حاکم جان قریب ہی موجود تھا وہ فوراً بھاگ کر وہاں آ گیا۔ کئی لوگوں نے مل کر خیر

زماں کو اٹھایا اور کچھ دور لے جا کر ایک جگہ ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ خیر زماں بے ہوش تھا اور اس کے سر سے خون نکلے جا رہا تھا۔

وہاں موجود لوگ اپنی اپنی تدبیروں سے خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگے لیکن خون بند نہیں ہو رہا تھا۔

اس دوران کسی نے بھاگ کر دراز گل کو بھی خبر کر دی جو اس وقت منڈی کے اس حصے میں قریب ہی کہیں موجود تھا۔ دراز گل بدحواس ہو کر بھاگتا ہوا آیا اور خیر زماں کی حالت دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"اس کو .... اس کو جلدی سے ہسپتال لے چلو۔" اس نے حاکم جان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

ان لوگوں نے جلدی جلدی خیر زماں کے سر کو خوب اچھی طرح کس کے پٹیوں سے باندھ دیا اور پٹیاں فوراً ہی لال ہونی شروع ہو گئیں۔ خون بہنا بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"ہاں' اس کو جلدی سے ہسپتال لے چلو۔" حاکم جان نے کہا۔ "اگر زیادہ خون بہہ گیا تو مشکل ہو جائے گی۔"

ان لوگوں نے فوراً ہی ایک سوزوکی لی اور اس کے پچھلے حصے میں فرش پر چادر بچھا کر خیر زماں کو لٹا دیا۔ دراز گل اور ایک اور آدمی اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور انہوں نے دونوں طرف سے اس کو پکڑ لیا تاکہ گاڑی کے ہلنے کے دوران اس کا جسم ہلنے جلنے سے محفوظ رہے کیوں کہ وہ بے ہوش تھا۔ حاکم جان سوزوکی کے ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھا تھا۔ وہ سب لوگ اس کو لے کر فوراً ہی ہسپتال روانہ ہو گئے۔

دراز گل ایک عرصہ دراز سے کراچی میں تھا اور اس کو معلوم تھا کہ ایسے مواقع پر کیا کرنا چاہئے۔ ویسے تو لیاقت نیشنل ہسپتال اور آغا خان ہسپتال سبزی منڈی سے بالکل تھوڑے سے فاصلے پر تھے لیکن دراز گل کو شک تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں کے ڈاکٹر اس مریض کو یہی کہہ کر واپس کر دیں کہ یہ پولیس کیس ہے اور پولیس میں رپورٹ درج کرائے بغیر وہ مریض کو ہاتھ نہیں لگائیں گے اس صورت میں وقت ضائع ہوتا اور مریض کے جسم سے زیادہ خون بہہ جاتا اس کی حالت زیادہ خراب ہو سکتی تھی۔

دراز گل نے منٹوں کے اندر حساب لگا لیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا۔ سرکاری ہسپتالوں میں سب سے قریب عباسی شہید ہسپتال تھا وہ لوگ زخمی خیر زماں کو لے کر سیدھے عباسی

شہید ہسپتال روانہ ہو گئے۔

رات کا آخری پہر تھا۔ سڑکیں بالکل سنسان پڑی تھیں کوئی اکا دکا گاڑی کسی وقت گزر جاتی تھی۔ ڈرائیور نے سوزوکی کو تیز رفتاری کے ساتھ بھگایا' سڑکوں پر نہ کوئی رکاوٹ تھی نہ کہیں ٹریفک جام تھا۔ گاڑی تیزی سے سنسناتی اور لہراتی ہوئی ذرا سی دیر میں عباسی شہید ہسپتال پہنچ گئی وہ لوگ گاڑی کو اندر شعبہ حادثات کی طرف لے گئے۔

ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں نے فوراً ہی مریض پر توجہ دی اور اس کو اندر لے جا کر لٹا دیا۔ ڈاکٹر مریض کے ساتھ آنے والوں سے اس کے بارے میں دریافت کرنے لگے۔

"اس کے سر پر پھلوں کی پیٹی گر پڑی جو ٹرک سے اتاری جا رہی تھی۔" دراز گل نے ڈاکٹر کو حادثے کے بارے میں مختصراً بتاتے ہوئے کہا۔ "میں فروٹ منڈی کا بیوپاری ہوں یہ لڑکا میرا بھانجا ہے۔"

"کوئی لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا کسی سے؟" ڈاکٹر نے دراز گل کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں صاحب' نہیں۔" دراز گل نے کہا۔ "یہ لڑائی جھگڑے کا کیس نہیں ہے۔ یہ لڑکا میرا سگا بھانجا ہے اور میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اس کے سر پر پھلوں کی پیٹی گر پڑی۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ابھی اس کا معائنہ ہو جائے گا تم لوگ ادھر بیٹھ جاؤ۔ صرف ایک آدمی مریض کے ساتھ رہ سکتا ہے۔"

میں رہوں گا۔" دراز گل نے جلدی سے کہا اور اس کو مریض کے ساتھ اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

ڈاکٹروں نے فوراً ہی اس کے زخم کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ خون بہنا ابھی پورے طور سے بند نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے سب سے پہلے تو خون کا بہنا بند کیا اور اس کے بعد انجکشن وغیرہ دینے لگے۔ خیر زماں مسلسل بے ہوش تھا۔

"یہ ابھی بے ہوش ہے۔" ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کا ہوش میں آنا ضروری ہے' اس کو ہوش میں آنا چاہئے۔ ویسے صبح کو اس کے سر کا ایکسرے ہو گا اور اس کے بعد ہی اس کا فیصلہ کیا جائے گا کہ آیا آپریشن کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

"آپریشن؟" دراز گل نے سخت پریشانی کے ساتھ کہا۔ "کیا آپریشن کرنا پڑے گا؟"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "دو باتیں ہیں۔ سب سے زیادہ ضروری

بات تو یہ ہے کہ مریض کو ہوش آ جائے۔ مریض کو ہوش آ جائے تو ہمیں صحیح طور سے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی چوٹ کتنی گہری ہے۔ بات یہ ہے کہ سر کی چوٹ بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کی یادداشت بھی غائب ہو سکتی ہے۔ کوئی اور معذوری بھی پیدا ہو سکتی ہے اور بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ مریض ہوش میں ہو تو پھر پتہ چلتا ہے کہ اصل حالت کیسی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کے سر کا ایکسرے نکالا جائے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مریض کو کوئی اندرونی چوٹ آئی ہے یا نہیں۔"

دراز گل بہت پریشان تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے بار بار زرینہ کی صورت ابھر رہی تھی۔ اگر خیر زماں کو کچھ ہو گیا تو پھر زرینہ کا کیا ہو گا؟ اس کے دل پر کیا بیتے گی اور اس کا کہاں ٹھکانہ ہو گا؟ وہ تو جیتے جی مر جائے گی۔ جس شخص کی خاطر اس نے اپنے سارے خاندان کو' اپنے سارے قبیلے کو اپنا دشمن بنا لیا وہ یوں بھری جوانی میں حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے اٹھ جائے .... اس سے زیادہ دردناک اور الم انگیز بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

"میں .... میں زرینہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" وہ لرز کر دل میں سوچ رہا تھا۔ "میں کس زبان سے اس کو یہ خبر سناؤں گا؟ کہاں سے لاؤں گا وہ الفاظ جن کے ذریعے میں اس خوفناک سانحے کی اس کو اطلاع دے سکوں گا؟" دراز گل کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ اس کا دل جیسے کٹا جا رہا تھا۔

"کاش وہ ٹھیک ہو جائے۔" وہ دل ہی دل میں خیر زماں کی صحت کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ "خدا کرے کہ اسے کچھ نہ ہو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو یہ ایک زندگی کا نہیں دو زندگیوں کا سوال ہو گا۔ دو زندگیاں ختم ہو جائیں گی۔ وہ خود تو مر کر چلا جائے گا اور زرینہ بالکل اکیلی رہ جائے گی۔ وہ کیا کرے گی؟"

دراز گل کا دم گھٹنے لگا۔ اسے اپنے دل پر بہت زیادہ بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہ گھبرا کر مریض کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ حاکم جان اور دوسرے لوگ باہر موجود تھے۔

"میں اور نور محمد یہاں رک جاتے ہیں۔" دراز گل نے حاکم جان کو ڈاکٹر کی بات بتاتے ہوئے کہا۔ "تم اور سرفراز خان چلے جاؤ۔ تمہارے کام کا نقصان ہو رہا ہو گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں دراز گل!" حاکم جان نے کہا۔ "وہاں دوسرے لوگ موجود ہیں۔ خدا کرے وہ ٹھیک ہو جائے۔ میری دلی دعا ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ خیر زماں جیسا

آدمی بھلا اور کہاں مل سکے گا؟ میرے لئے تو وہ ہیرا ہے ہیرا۔"

چنانچہ وہ سب لوگ ہی وہاں رکے رہے۔ حاکم جان اس وقت تک رکنے پر مصر تھا جب تک کہ خیر زماں کو ہوش نہ آ جائے۔ وہ اس کو یہاں سے ہوش کی حالت میں دیکھ کر جانا چاہتا تھا۔ دراز گل دوبارہ مریض کے پاس اندر چلا گیا۔ خیر زماں ابھی تک بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔

اس اثنا میں ایک پولیس افسر بھی دراز گل سے پوچھ گچھ کر چکا تھا۔ وہ زخمی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کو چوٹ کس طرح لگی۔ دراز گل نے اس کو حقیقت بتا دی۔

"کوئی جھگڑے فساد کا معاملہ تو نہیں ہے؟" اس نے بھی ڈاکٹر کی طرح سوال کیا۔

"نہیں جناب!" دراز گل نے جواب دیا۔ "اس معاملے کا کسی بھی قسم کے لڑائی جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محض ایک حادثہ تھا' اس میں کسی کا قصور نہیں تھا۔ بھاری پیٹی مزدور کے ہاتھ سے پھسل پڑی' مزدور نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔"

"اچھی طرح سوچ لو' سمجھ لو۔" پولیس افسر نے اس کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر بعد میں یہ بات علم میں آئی کہ یہ کوئی لڑائی جھگڑے کا معاملہ تھا تو پھر بری طرح پھنسو گے اور کوئی شخص بچا بھی نہیں سکے گا۔" پولیس افسر کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی اور دراز گل اس کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔

"نہیں صاحب! آپ یقین کیجئے۔" اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ صرف ایک حادثہ تھا۔ مزدور کا بھی اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ زخمی میرا سگا بھانجا ہے اور میرے ہی ساتھ رہتا ہے۔ اگر اس کا کسی سے لڑائی جھگڑا ہوا ہوتا تو ظاہر ہے کہ میں ان لوگوں کے بارے میں آپ کو بتاتا مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔"

پولیس افسر نے اس کی جان چھوڑ دی اور کسی ایسے دوسرے کیس کی تلاش میں لگ گیا جس سے معقول آمدنی کی توقع ہو۔ اس کیس میں تو کچھ نہیں رکھا تھا اور اس کی دلچسپی اس کیس کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔

دراز گل بے ہوش خیر زماں کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ خیر زماں ابھی تک بے ہوش پڑا تھا اور اس کے ہوش میں آنے کے کوئی آثار بھی نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی شکل دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ گہری نیند سو گیا ہو۔

"کہیں اس کی یہ گہری نیند ابدی نیند میں تبدیل نہ ہو جائے۔" دراز گل نے لرز کر

سوچا۔ وہ بہت ہی خراب اور تکلیف دہ صورت حال کا شکار تھا۔ وہ اپنے شانوں پر اچانک نئی ذمہ داریوں کے بوجھ کو محسوس کرنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہاں ایک اور ڈاکٹر آیا۔ وہ کوئی بڑی عمر کا ڈاکٹر تھا۔ اس نے وہاں موجود دوسرے مریضوں کے علاوہ خیر زماں کا بھی معائنہ کیا اور دراز گل سے جو کہ مریض کے ساتھ تیماردار کے طور پر موجود تھا' مریض کے بارے میں پوچھا۔ دراز گل نے اس کو بھی سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

اس ڈاکٹر نے دراز گل سے مریض کے بارے میں بھی سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ وہ مریض کے خاندانی پس منظر کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھ رہا تھا۔

"کیا مریض کے خاندان میں کسی کو شوگر کی بیماری ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا اور دراز گل اس سوال پر چکرا گیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سوال کا مریض کی موجودہ حالت سے کیا تعلق تھا۔ کسی کو شوگر کی بیماری ہو یا نہ ہو' مریض کی موجودہ حالت پر بھلا اس کا کیا اثر پڑ سکتا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ اس کو اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم تھا اس کی بہن یا بہنوئی میں سے کسی کو شوگر کی بیماری ہے یا نہیں' وہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔

اس نے ڈاکٹر کو کہا کہ اس کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے اور پھر اس نے ہمت کر کے ڈاکٹر سے پوچھ لیا کہ اس سوال کا مریض کی موجودہ حالت سے کیا تعلق ہے اور اس کے خاندان میں اس بیماری کے موجود ہونے سے اس حادثے پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

"شوگر کی بیماری عام طور سے موروثی ہوتی ہے۔" نیک دل اور نرم مزاج ڈاکٹر نے اس کو سمجھایا۔ "ہم مریض کا خون ٹیسٹ کروا کے معلوم کریں گے کہ آیا اس کو شوگر کی بیماری ہے یا نہیں۔ اگر وہ شوگر کا مریض ہے تو پھر اس کے زخم آسانی سے ٹھیک نہیں ہوں گے اور ہمیں اس کے لئے دوسری تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔"

"اور .... اور .... اگر اس کو شوگر کی بیماری نہیں ہے ڈاکٹر صاحب تو پھر؟"

"تو پھر زخموں کے ٹھیک ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ بلکہ جس طرح ایک عام آدمی کے زخم ٹھیک ہو جاتے ہیں اسی طرح اس کے زخم بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب! یہ .... یہ .... ٹھیک تو ہو جائے گا نا؟" دراز گل نے ڈاکٹر کو

مہربان پا کر اس سے سوال کیا۔

"اس کو ہوش آنا چاہئے۔" ڈاکٹر نے محتاط انداز میں کہا۔ "ایک بار اس کو ہوش آ جائے تو پھر ہی کوئی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ سر کی چوٹ خطرناک ہوتی ہے مریض ہوش میں ہو تو آسانی سے پتہ چل جاتا ہے کہ کیسی چوٹ ہے۔ پھر ایکسرے کر لیتے ہیں ایکسرے تو بے ہوشی کی حالت میں بھی کر لیں گے۔"

تقریباً وہی ساری باتیں تھیں جو اس سے پہلے والے ڈاکٹر کر چکے تھے۔ پھر بھی دراز گل نے اس ڈاکٹر سے کئی سوالات پوچھے اور ڈاکٹر نے بڑی نرمی اور تسلی کے ساتھ اس کو سارے جوابات دیئے اور پھر وہ چلا گیا۔ دراز گل ابھی خیر زماں کے پاس موجود تھا۔

اس ڈاکٹر کے جانے کے کچھ دیر کے بعد اچانک خیر زماں نے آنکھیں کھول دیں اور وہ حیران اور متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دراز گل جو اس کے پاس ہی موجود تھا' جلدی سے اس کے اوپر جھک گیا۔

"کیسے ہو؟ کیسے ہو بیٹا!" دراز گل کی آواز فرط جذبات اور جوشِ مسرت سے کانپ رہی تھی۔ "کیسے ہو تم؟"

"ماما .... میں کہاں ہوں؟" خیر زماں نے اِدھر اُدھر نظریں گھماتے ہوئے کہا اور دراز گل کے دل میں خوشی کی ایک تیز و تند لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے کہ "سر کی چوٹ کے نتیجے میں آدمی اپنی یادداشت بھی کھو سکتا ہے۔" تب سے ان الفاظ میں مضمر خوف نے اس کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور ساتھ ہی ڈاکٹروں نے بارہا یہ بھی کہا تھا کہ مریض کو ہوش آنا چاہئے۔

اور اب خیر زماں کو ہوش آ گیا تھا اس نے آنکھیں کھول لی تھیں اور فوراً ہی یہ بات بھی ظاہر ہو گئی تھی کہ اس کی یادداشت اپنی جگہ بحال ہے اور اس کے ہوش و حواس بھی پوری طرح قائم ہیں۔ اس نے اپنے ماما کو پہچان لیا تھا اور اس نے یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ اجنبی جگہ پر ہے۔

"تم .... تم ہسپتال میں ہو بیٹا۔" دراز گل نے جلدی سے کہا۔ "تم کو یاد ہے نا' تمہارے چوٹ لگ گئی تھی۔"

"ہاں ماما!" خیر زماں نے کہا۔ "مجھے یاد ہے' میں ٹرک کے پاس کھڑا ہوا پیٹیاں گن رہا تھا۔ ایک پیٹی مزدور کے ہاتھ سے پھسل کر میرے اوپر گر پڑی تھی۔ مجھے یاد ہے ماما! مگر

پھر.......... پھر.......... اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"اس کے بعد تم بے ہوش ہو گئے تھے اور ہم لوگ تمہیں ہسپتال لے آئے تھے۔" دراز گل نے کہا۔ "تم اس وقت ہسپتال میں ہو اور اب تم کو ہوش آ گیا ہے۔ تم خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"میں .... ویسے تو ٹھیک ہوں ماما!" خیر زماں نے کہا۔ "بس سر میں تھوڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

"ہاں بیٹا وہ تو ہو گی ہی۔" دراز گل نے کہا۔ "تازہ تازہ چوٹ ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ تم کو ہوش آ گیا ہے اور تم پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں ہو۔ خدا نے چاہا تو تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"ہاں ماما! میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔" خیر زماں نے کمزور آواز میں ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں ماما! میں ٹھیک ہو جاؤں گا اور .... اور گھر پر .... گھر پر تو.........."

"گھر پر ابھی کسی کو بھی اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" دراز گل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جیسے ہی تم زخمی ہوئے تھے ہم لوگ فوراً ہی تم کو لے کر ہسپتال آ گئے تھے۔"

"تو .... اور کون ہے ماما!" خیر زماں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"حاکم جان ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "اور دو آدمی اور ہیں۔" اس نے ان دونوں کے نام بتاتے ہوئے کہا۔ "وہ سب لوگ باہر بیٹھے ہوئے ہیں یہاں اندر ایک سے زیادہ آدمی کے آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

اس وقت ایک نرس اس طرف آئی اور دراز گل نے جلدی سے اس کو بتایا کہ مریض کو ہوش آ گیا ہے۔

"ہاں۔" نرس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک تھی۔ "یہ بہت اچھا ہوا میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو بتاتی ہوں۔" اور وہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

ڈاکٹر فوراً ہی وہاں آن موجود ہوا۔ "اچھا' تو تم کو ہوش آ گیا ہے۔" اس نے خیر زماں کی طرف دیکھتے ہوئے اردو میں کہا۔ "کیسی طبیعت ہے تمہاری اب؟"

خیر زماں اس کی بات پوری طرح سمجھ نہیں سکا اور دراز گل نے فوراً معاملے کو سمجھ کر اس کی مدد کی۔ "ڈاکٹر صاحب اس کو ابھی اردو ٹھیک سے نہیں آتی۔ نیا نیا گاؤں سے آیا ہے۔" اور اس نے ڈاکٹر اور خیر زماں کے درمیان ترجمانی کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے۔

"بہت اچھا.......... بہت خوشی کی بات ہے۔" ڈاکٹر نے دراز گل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کو ہوش آ گیا ہے اور یہ سب کچھ پہچان رہا ہے اور اس کو سب کچھ یاد ہے تو پھر اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر کچھ دیر رک کر اور مریض کا ایک بار پھر اچھی طرح سے معائنہ کر کے وہاں سے چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد دراز گل کمرے سے باہر آیا اور اس نے حاکم جان کو خوشخبری سنا دی کہ خیر زماں کو ہوش آ گیا ہے اور خود کو بہتر محسوس کر رہا ہے۔

"شکر ہے خدا کا۔" حاکم جان نے دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "خدا نے اس کی جان بچا لی۔"

"ہاں ڈاکٹر بھی کہتا تھا کہ وہ اب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس ہوش میں آنا ضروری تھا۔"

دراز گل نے کچھ دیر کے بعد حاکم جان اور ان دوسرے آدمیوں کو واپس بھیج دیا۔ اب ان کے وہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خیر زماں کی جان کو اب خطرہ لاحق نہیں تھا۔

"میں یہاں موجود ہوں۔" اس نے ان لوگوں سے کہا۔ "اور خیر زماں کو ہوش بھی آ گیا ہے تم لوگوں کے رکنے کی ضرورت نہیں ہے' تم لوگ چلے جاؤ کام کا زیادہ ہرج نہ کرو' پہلے ہی بہت ہرج ہو چکا ہے۔"

"میں تمہارے گھر اطلاع دے دوں گا۔" حاکم جان نے کہا۔ "اور دوپہر کو کھانے سے پہلے پھر چکر لگاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "لیکن میرے گھر پر یہی بتانا کہ وہ اب ٹھیک ہے اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کی بیوی سنے گی تو سخت پریشان ہو جائے گی۔ تم ذرا ان لوگوں کو اچھی طرح سے سمجھا دینا۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" حاکم جان نے اس کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔ "میں ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔" اور اس کے بعد حاکم جان باقی لوگوں کے ساتھ وہاں

سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی اور سڑکوں پر ٹریفک چلنے لگا تھا۔

حاکم جان پہلے تو سیدھا دراز گل کے گھر پہنچا اور اس نے دروازے پر دستک دی دراز گل کا بیٹا شہزاد نکل کر آیا۔ حاکم جان کو اس وقت اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر ایک دم حیران ہو گیا۔

"خیریت تو ہے ماما!" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"بیٹا میں ہسپتال سے آ رہا ہوں۔" اس نے شہزاد سے کہا۔ "خیر زماں کے تھوڑی چوٹ لگ گئی ہے' پھلوں کی ایک پیٹی اس کے اوپر گر گئی تھی' ہم لوگ اسے ہسپتال لے گئے اور اب وہ ٹھیک ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں' ان اشاء اللہ وہ بالکل ٹھیک ہو کر گھر آ جائے گا۔ دراز گل ہسپتال میں اس کے ساتھ ہے۔"

"ارے!" شہزاد نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ "خیر زماں ہسپتال میں ہے؟ کون سے ہسپتال میں ہے؟ اور کہاں چوٹ لگی ہے اس کے؟"

"وہ عباسی شہید ہسپتال میں ہے۔" حاکم جان نے کہا۔ "میں بھی وہیں تھا اور اس وقت وہاں سے آیا ہوں جب خیر زماں کو ہوش آیا اور وہ بات چیت کرنے کے قابل ہو گیا۔ تم گھر کے لوگوں کو بتا دینا اور اپنی بھابی کو تسلی دینا وہ پریشان نہ ہو۔ خیر زماں ٹھیک ہے وہ شاید دو ایک دن ہسپتال میں رہے گا اور پھر گھر واپس آ جائے گا۔"

"آپ اندر آئیں نا ماما!" شہزاد نے کہا اور حاکم جان کو اندر بلانے کے لئے دروازہ کھول دیا۔

"نہیں بیٹا!" حاکم جان نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "میں منڈی جا رہا ہوں۔ اپنا کام بھی دیکھنا ہے اور تمہارے باپ کا کام بھی دیکھنا ہے۔ وہ بے چارا تو وہاں ہسپتال میں پھنسا بیٹھا ہے۔"

شہزاد کے اصرار کے باوجود حاکم جان گھر کے اندر نہیں آیا۔ اس کے رخصت ہونے سے پہلے شہزاد نے اس سے اس جگہ کے بارے میں پوچھا جہاں خیر زماں کو رکھا گیا تھا اور پھر جیسے ہی وہ دروازہ بند کر کے پلٹا ویسے ہی تاجور نے جو کچھ فاصلے پر موجود تھی' اس سے پوچھا۔ "کون آیا تھا صبح صبح' کیا کہتا تھا؟"

"اماں! ماما حاکم جان آئے تھے۔" شہزاد نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "وہ بتا رہے تھے کہ خیر زماں زخمی ہو گیا ہے اور ہسپتال میں ہے۔"

"کیا؟" تاجور نے ایک دم گھبراتے ہوئے کہا۔ "خیر زماں ہسپتال میں ہے' کیسے زخمی ہو گیا وہ؟"

زرینہ اس وقت باورچی خانے میں تھی۔ اس نے تاجور کے آخری الفاظ سنے اور ایک دم سے سارا کام چھوڑ کر بھاگتی ہوئی باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔

"کیا ہوا .... کیا ہوا؟" اس نے جلدی سے' سخت بے تابی کے ساتھ پوچھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

شہزاد نے کوشش کر کے مناسب ترین الفاظ میں وہ سب کچھ بیان کر دیا جو حاکم جان نے اس کو بتایا تھا اور یہ سب کچھ سنتے ہی زرینہ بلبلا کر رونے لگی۔

"نہیں نہیں۔" تاجور نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "پریشان نہ ہو خدا پر بھروسہ رکھو۔ تمہارے ماما وہاں موجود ہیں اور انہوں نے کہلوایا ہے کہ خیر زماں کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ان شاء اللہ وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ ہسپتال میں تو تمام بیماریوں کا علاج ہو جاتا ہے۔"

"ماما حاکم جان کہہ رہے تھے کہ وہ لوگ خیر زماں کو خود ہی ہسپتال لے گئے تھے۔" شہزاد نے کہا۔ "وہ اس وقت تو بے ہوش تھا لیکن اب اس کو ہوش آ گیا ہے اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مجھے .... مجھے اس کے پاس لے چلو۔" زرینہ نے زار و قطار روتے ہوئے' کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے اس کے پاس لے چلو شہزاد .... بھائی .... خدا جانے وہ کس حال میں ہے۔ میں اس کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ بس ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا اچھا' تم اتنا زیادہ پریشان نہ ہو۔" تاجور نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ چلتے ہیں۔ ہم ہسپتال چل کر اس کو دیکھ آئیں گے تاکہ تمہاری تسلی ہو جائے۔"

حقیقت یہ تھی کہ خیر زماں کے زخمی ہو جانے کی خبر سن کر تاجور خود بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔ یہ پریشانی صرف خیر زماں کے زخمی ہونے کی نہیں تھی اس میں اور بھی کئی عوامل مضمر تھے جن کی طرف اس کا دھیان فوری طور پر گیا تھا۔

"اگر خیر زماں کو کچھ ہو گیا تو پھر زرینہ کا کیا ہو گا؟" اس کے دماغ میں خدشات ابھر رہے تھے۔ "اگر عام حالات ہوتے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ زرینہ اپنے والدین کے گھر واپس

جا سکتی تھی یا اپنے سسرال جا سکتی تھی۔ کہیں بھی اس کا ٹھکانہ ہو سکتا تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں تو اس کا کہیں بھی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ اپنے تمام رشتے داروں کے لئے قطعی طور پر ناقابل قبول تھی۔ وہ تو واجب القتل تھی۔ اس کی وجہ سے تاجور اپنے خاندان کو خطرے میں محسوس کرتی تھی اور اس کو جلد از جلد اپنے سے الگ کر دینا چاہتی تھی لیکن اگر.......... اگر خیر زماں کو کچھ ہو گیا تو پھر زرینہ مستقل طور پر یہیں رہے گی اور اس کے نتیجے میں کیسی کیسی پریشانیاں لاحق ہوں گی۔"

چنانچہ تاجور کے دل میں یہ خواہش بہت شدت سے تھی کہ خیر زماں ٹھیک ہو جائے اور وہ خیر زماں کو دیکھنے کے لئے' اس کی خیر خبر لینے کے لئے خود ہسپتال جانا چاہتی تھی اور جب وہ خود ہسپتال جانے کے لئے تیار تھی تو زرینہ کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتی تھی۔

تاجور نے اپنے بیٹے شہزاد سے کہا کہ وہ فوراً ٹیکسی لے آئے اور وہ لوگ عباسی شہید ہسپتال چلیں گے۔

شہزاد جلدی جلدی تیار ہو کر ٹیکسی لینے چلا گیا اور اس اثنا میں تاجور اور زرینہ بھی تیار ہو گئیں۔ تاجور نے کچھ برتن وغیرہ اپنے ساتھ رکھ لئے ذرا دیر میں شہزاد ٹیکسی لے کر آ گیا اور وہ تینوں عباسی شہید ہسپتال روانہ ہو گئے۔

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد بھی زرینہ برابر روئے جا رہی تھی۔ جو خدشات دراز گل کے دل میں ابھرے تھے' تاجور کے دل میں بھی وہی ابھر رہے تھے۔ وہی خدشات ذرا دوسرے انداز سے زرینہ کے دل میں بھی ابھر رہے تھے۔ "اگر خدانخواستہ' خیر زماں کو کچھ ہو گیا تو پھر میرا کیا ہو گا؟" یہ وہ سوال تھا جو کہ اس کے سر پر ضربات لگا رہا تھا۔ وہ تو اپنا سب کچھ قربان کر کے خیر زماں کے ساتھ گھر سے چلی آئی تھی۔ اس نے تو اپنے لئے واپسی کے سارے راستے بند کر دیئے تھے۔ اس کے پاس تو خیر زماں کے ساتھ زندگی گزارنے کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا جو بھی زندگی تھی' جتنی تھی' تھوڑی تھی یا زیادہ تھی اسے خیر زماں کے ساتھ ہی گزارنی تھی اور اب خیر زماں زخمی اور بے ہوش ہو کر ہسپتال میں جا پڑا تھا۔ یا خدا رحم!

"صبر اور ہمت سے کام لو۔" تاجور نے اس کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "تم تو بہت بہادر اور ہمت والی لڑکی ہو۔ اگر یوں ہمت ہار جاؤ گی تو کیسے کام چلے گا؟ خدا پر بھروسہ رکھو ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

زرینہ نے تاجور کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کی سسکیوں کی آواز میں کچھ کمی واقع ہو گئی۔

ٹیکسی شہر کے ایک ایسے علاقے سے گزر رہی تھی جو زرینہ نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ لالو کھیت اور ناظم آباد کی طرف اب تک نہیں آئی تھی لیکن اس وقت اس کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس کو نہیں معلوم تھا کہ ٹیکسی کن راستوں سے گزرتی ہوئی کس طرف جا رہی ہے۔ اس کو تو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ لوگ ہسپتال جا رہے ہیں اور شہزاد نے اس ہسپتال کا نام عباسی شہید ہسپتال بتایا تھا۔

زرینہ نے آج تک کوئی ہسپتال نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اپنے گاؤں میں اور اس کے آس پاس ہسپتال تو دور کی بات رہی کوئی ڈسپنسری تک نہیں تھی اور کراچی آنے کے بعد گزشتہ ایک ماہ کے اندر اس کو کسی ہسپتال میں جانے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ چنانچہ جب ٹیکسی عباسی شہید ہسپتال کے گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو وہاں موجود لوگوں کے زبردست ہجوم کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ "اس شہر میں کوئی ایسی جگہ موجود نہیں جہاں لوگوں کے ہجوم موجود نہ ہوتے ہوں؟" اس نے دل میں سوچا۔

ہسپتال کی اپنی ایک دنیا تھی۔ زرینہ نے پہلی بار بالکل سفید لباس میں ملبوس نرسوں کو اِدھر اُدھر چلتے پھرتے اور کام کرتے دیکھا۔ اس نے پہلی بار ڈاکٹرنیاں دیکھیں جو مردوں کی طرح سارے کام کر رہی تھیں۔ یہاں ہسپتال میں اسے جا بجا عورتیں کام کرتی نظر آ رہی تھیں۔

شہزاد ان دونوں کو ساتھ لے کر وہاں گیا جہاں خیر زماں کو ہونا چاہئے تھا۔ پھر اتفاق سے برآمدے میں انہیں دراز گل مل گیا۔ وہ ایک دوا خریدنے کے لئے باہر جا رہا تھا جو ڈاکٹر نے لکھ کر دی تھی۔

"ارے .... تم لوگ؟" اس نے شہزاد اور اس کے ساتھ دونوں خواتین کو دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "تم لوگ یہاں آ گئے؟"

"ہاں۔" تاجور بولی۔ "زرینہ بہت پریشان ہو رہی تھی اور رو رہی تھی تو میں اس کو اپنے ساتھ یہاں لے آئی ہوں۔ خیر زماں کہاں ہے؟"

"خیر زماں بہت بہتر ہے پہلے سے۔" دراز گل کہنے لگا اور زرینہ اس کے بالکل قریب آ گئی تاکہ اس کی بات کو زیادہ صاف طور پر اور ٹھیک سے سن سکے۔ دراز گل ان

لوگوں کو رات سے لے کر اب تک کی تفصیل بتا رہا تھا۔

"اور وہ پوری طرح ہوش و حواس میں ہے اور اس کی یادداشت بھی بالکل ٹھیک ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے اس کا ایکسرے ہوا ہے۔ دوپہر تک ڈاکٹر ایکسرے دیکھنے کے بعد بتائیں گے کہ آپریشن کی ضرورت ہے یا نہیں اور کیا کرنا ہے۔"

دراز گل جو کچھ کہہ رہا تھا' اس میں سے کئی باتیں تھیں جو زرینہ کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھیں۔ ایکسرے .... آپریشن .... انجکشن .... سمیت سارے الفاظ ہی اس کے لئے بالکل نئے تھے لیکن وہ بڑی توجہ سے اور غور کے ساتھ سب کچھ سن رہی تھی۔

دراز گل نے دوا کا پرچہ اور پیسے شہزاد کو دے دیئے اور اس سے کہا کہ سامنے والے میڈیکل اسٹور سے جا کر یہ دوا لے آئے۔

"میں تم لوگوں کو اس سے ملوا دیتا ہوں۔" دراز گل نے کہا۔ "لیکن ایک وقت میں ایک ہی آدمی کو اندر جانے دیتے ہیں' پہلے تم آ جاؤ زرینہ!"

زرینہ آگے بڑھی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گر پڑے گی۔ اسے اپنے سارے جسم میں کپکپی سی محسوس ہو رہی تھی تاہم وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

زرینہ اندر داخل ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو جیسے ایک دوسری ہی دنیا میں پایا۔ یہاں ایک عجیب قسم کی بو بسی ہوئی تھی۔ طرح طرح کی دواؤں کی ملی جلی بو جس سے زرینہ بالکل ناواقف تھی اور یہاں لوہے کے ایک عجیب و غریب قسم کے پلنگ پر خیر زماں پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اس کا چہرہ پھیکا پھیکا ہو رہا تھا۔

دراز گل کے ساتھ زرینہ کو آتا دیکھ کر خیر زماں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک بیدار ہو گئی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

زرینہ اس کے قریب جا کر پلنگ کی پٹی پکڑ کر ایک دم رونے لگی۔ اس نے بہت کوشش کی اپنے آپ کو رونے سے روکے لیکن طوفان تھا کہ امڈا پڑتا تھا' اور آنکھیں بھیگی پڑتی تھیں۔ وہ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو نہیں روک سکی۔

"میں اب ٹھیک ہوں' زرینہ!" خیر زماں نے کہا۔ اس کی آواز میں اب کسی کمزوری کا عنصر نہیں محسوس ہوتا تھا۔ وہ ٹھیک ٹھاک طریقے سے بول رہا تھا۔

"کیا ہو گیا تم کو؟" زرینہ بڑی مشکل سے بول سکی اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔

"جو کچھ ہو گیا تھا وہ تو ختم ہو گیا۔" خیر زماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب میں ٹھیک ہوں۔ تم فکر مت کرو' بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

زرینہ نے خیر زماں کو بولتے ہوئے' باتیں کرتے ہوئے اور تقریباً ٹھیک ٹھاک حالت میں پایا تو اس کے دل کو قدرے سکون حاصل ہوا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ لیا اور اپنے کانوں سے اس کی باتیں سن لیں۔ اب وہ یہ یقین کر سکتی تھی کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔

دراز گل اس کو وہاں چھوڑ کر باہر چلا گیا اور باہر جا کر اس نے تاجور کو اندر بھیج دیا۔

"ذرا دیر رک کر باہر آ جانا۔" اس نے تاجور کو سمجھایا۔ "شہزاد دوا لے کر آتا ہو گا۔ پھر خیر زماں کو دوا دینی ہے۔"

وہ دونوں اندر ہی تھیں کہ شہزاد دوا لے کر آ گیا اور کچھ دیر کے بعد وہ دونوں باہر آ گئیں۔ زرینہ اب کافی حد تک مطمئن نظر آ رہی تھی۔

اس روز دوپہر کو ڈاکٹر نے دراز گل کو بتایا کہ خیر زماں کی ایکسرے کی رپورٹ آ گئی ہے اور سب کچھ ٹھیک ہے۔

"تم لوگ بہت خوش قسمت ہو۔" ڈاکٹر نے دراز گل سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بھانجے کا دماغ بال بال بچا ہے' چوٹ اگر ذرا سا آگے کی طرف لگتی تو اس کے دماغ تک پہنچ سکتی تھی اور اس صورت میں بہت کچھ ہو سکتا تھا۔"

"کیا' کیا ہو سکتا تھا ڈاکٹر صاحب!" دراز گل نے سہم کر پوچھا۔

"سب سے پہلا خطرہ تو یہ تھا کہ مریض کی موت واقع ہو سکتی تھی۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "دوسرے یہ کہ اس کی یادداشت ختم ہو سکتی تھی۔ تیسرے یہ کہ اس میں کسی نہ کسی قسم کی معذوری پیدا ہو سکتی تھی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ مریض اب ٹھیک ہے' کل اس کو چھٹی دے دیں گے۔ گھر لے جانا یہاں رہنے کی ضرورت نہیں چند روز تک گھر پر آرام کرے گا تو پھر بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

دوسرے روز خیر زماں کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی اور وہ گھر آ گیا۔ وہ خود کو بہت بہتر

محسوس کر رہا تھا۔ سر میں تھوڑی سی تکلیف کے علاوہ اسے اب اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔

اس اچانک رونما ہو جانے والے حادثے نے خیر زماں اور زرینہ دونوں کو سختی کے ساتھ جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور انہیں اپنے بارے میں اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اگر خدا نخواستہ میں اس حادثے میں ہلاک ہو جاتا تو پھر کیا ہوتا؟" خیر زماں بڑے دکھ کے ساتھ سوچتا۔ "پھر زرینہ کا کیا ہوتا؟ وہ ہمیشہ ماما دراز گل کے گھر میں رہ سکتی تھی؟ اور اگر وہ یہاں نہ رہتی تو پھر کہاں رہتی؟ کس کے پاس جا سکتی تھی؟ اسے تو کوئی بھی قبول نہ کرتا۔"

"میں اس صورت میں اپنے آپ کو ختم کر لیتی۔" زرینہ نے، آنکھوں میں آنسو بھر کر خیر زماں سے کہا۔ "اگر خدا نخواستہ تم کو کچھ ہو جاتا تو میں بھلا کس کے سہارے زندہ رہ سکتی تھی؟ میرا واحد سہارا تو تم ہی ہو اور اگر تم میرے ساتھ نہیں ہو گے تو پھر میں کس کے لئے زندہ رہوں گی؟"

بڑی درد انگیز صورت حال تھی جو نمودار ہوتے ہوئے رہ گئی تھی اور اس حادثے کے بعد سے ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر و منزلت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔

خیر زماں ایک صحت مند نوجوان تھا اور اس کے جسم میں قوت مدافعت موجود تھی۔ اس نے جلد ہی اپنی کمزوری پر قابو پا لیا۔ اس کے سر کا زخم بھی ٹھیک ہو گیا اور اس نے دوبارہ کام پر جانا شروع کر دیا۔ حاکم جان نے اس کے ان دنوں کی بھی پوری تنخواہ دی تھی جن دنوں وہ کام کے قابل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اس کے علاج کے لئے الگ سے بھی کچھ رقم دی تھی۔ خیر زماں اس سے یہ رقم لینے پر تیار نہیں تھا لیکن حاکم جان نے زبردستی اس کو یہ رقم دے دی۔

خیر زماں نے اپنا کام دوبارہ سنبھال لیا تھا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کر رہا تھا۔ کام پر اس کی گرفت روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور وہ حاکم جان کی ضرورت بنتا جا رہا تھا۔ حاکم جان اس پر زیادہ اعتماد کرنے لگا تھا۔ خیر زماں نے اپنے آپ کو اعتماد کے قابل ثابت کیا تھا۔

اگلے چند ماہ کے دوران خیر زماں سارے کام سے بخوبی واقف ہو گیا تھا اس کے اندر

اتنی زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اب حاکم جان کے بغیر بھی کام کر سکتا تھا اس کی ہدایت اور رہنمائی کی اسے ضرورت نہیں رہی تھی۔

ان چند ماہ کے دوران خیر زماں نے اردو بھی اچھی خاصی سیکھ لی تھی اور اب وہ بغیر کسی خاص دشواری کے اردو میں اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ ابھی اس کو الفاظ کے پیچھے بھاگنا پڑتا تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح بھاگ دوڑ کر کے ان کو پکڑ ہی لیتا تھا اور ان کے ذریعے اپنا کام نکال لیتا تھا۔ اس معاملے میں اس کو ایک اور یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ وہ گھر میں بھی اردو بول سکتا تھا۔

دراز گل کے گھر کے اندر اگرچہ سب لوگ پشتو بولتے تھے، لیکن سب لوگوں کو اردو پوری طرح آتی تھی۔ بچے تو سب اسکول میں پڑھتے تھے اور اردو بولنا ہی نہیں لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے اور اکثر اپنے گھر میں بھی اردو بولتے تھے۔ اپنے والدین سے بھی وہ اکثر اردو میں بات کرتے تھے اور خیر زماں اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اردو بولنے کی کوشش کرتا تھا اور اس نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی غلطی کرے وہ لوگ اس کو ٹوکیں اور اس کی اصلاح کریں۔

زرینہ بھی گھر کے اندر رہتے ہوئے اچھی خاصی اردو سیکھ گئی تھی وہ برابر ٹی وی کے ڈرامے دیکھتی تھی، خبریں سنتی تھی اور دوسرے پروگرام دیکھتی تھی اور ان سب کے ذریعے کچھ نہ کچھ اردو سیکھتی جا رہی تھی۔

حاکم جان، خیر زماں کے کام سے پوری طرح مطمئن تھا اور اس نے اس کی تنخواہ میں کافی اضافہ کر دیا تھا۔ خیر زماں کی وجہ سے حاکم جان کے کاروبار کو زبردست فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ حاکم جان کو ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جس پر وہ روپے پیسے کے معاملات میں پورا بھروسہ کر سکے اور کاروبار کو آگے بڑھا سکے اور خیر زماں کی شکل میں اس کو ایسا ایک آدمی مل گیا تھا۔ خیر زماں اب اس کی ضرورت بن چکا تھا۔ وہ خیر زماں کو اپنے سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔

خیر زماں کی تنخواہ میں اب اچھا خاصا اضافہ ہو چکا تھا اور وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ کہیں چھوٹا موٹا مکان کرائے پر لے کر الگ رہنا شروع کر دے۔ وہ تو کب سے یہ چاہتا تھا کہ وہ اس قابل ہو جائے۔ اس نے دراز گل اور تاجور سے بھی یہ بات کہہ دی کہ وہ اب

علیحدہ گھر لے کر رہنا چاہتا ہے۔ انہوں نے اس کو ایسا کرنے سے منع نہیں کیا۔ وہ لوگ تو خود بھی ایسا ہی چاہتے تھے۔ خیر زماں اور زرینہ کو ایک نہ ایک دن تو ان سے الگ مکان لے کر رہنا ہی تھا۔ تاہم درازگل اور اس کی بیوی نے ان دونوں پر زور نہیں دیا کہ وہ الگ ہو جائیں۔ وہ دونوں تو خود ہی الگ ہو جانا چاہتے تھے۔ کافی دن ہو گئے تھے ان کو یہاں رہتے ہوئے۔

خیر زماں کو پی آئی بی کالونی میں ہی ایک مکان کرائے پر مل گیا اور وہ بہت اچھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو منڈی کے آس پاس ہی کہیں رہنے کو جگہ مل جائے تاکہ اسے اپنے کام پر آنے جانے میں آسانی ہو اور ماما کا گھر بھی قریب رہے۔

یہ ایک کوارٹر کا آدھا حصہ تھا اور اگرچہ کافی چھوٹا تھا تاہم دو افراد پر مشتمل چھوٹے سے خاندان کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ آدھے کوارٹر میں مالک مکان خود اپنی بیوی اور ایک بیوہ بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ بیوہ بیٹی بھی ایک ڈھلتی ہوئی عمر کی عورت تھی اور اس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ یہ نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے اردو بولنے والے لوگ تھے اور صغیر احمد سے جو کہ اس مکان کا مالک تھا درازگل کی بڑی پرانی جان پہچان تھی' صغیر احمد کسی پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرتا تھا اور اس کا کل اثاثہ اس مکان کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا جس کا آدھا حصہ اس نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ صغیر احمد کی بیوی کا نام صفیہ اور بیوہ بیٹی کا نام شازیہ تھا۔ شازیہ صبح کے وقت ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔

صغیر احمد نے درازگل کی ضمانت پر اپنے کوارٹر کا یہ آدھا حصہ جو کہ ابھی کچھ دن پہلے سابقہ کرائے داروں نے خالی کیا تھا' خیر زماں کو کرائے پر دے دیا اور خیر زماں اور زرینہ بہت زیادہ خوشی اور سکون کے احساس کے ساتھ اس مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہاں ایک بہت بڑی آسانی یہ بھی تھی کہ زرینہ بالکل اکیلی نہیں تھی کوارٹر کے صحن میں دیوار کھڑی کر کے اس کو اس طرح سے آدھا آدھا کیا گیا تھا کہ دیوار میں ایک دروازہ لگا دیا گیا تھا۔ جس کے کھلے ہونے کی صورت میں ایک طرف سے دوسری طرف آنا جانا ممکن تھا اور اس غرض کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں تھی۔

تاجور نے صفیہ اور شازیہ دونوں کو بتا دیا کہ زرینہ ابھی صرف ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتی ہے کیونکہ اسے گاؤں سے آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔

"آپ فکر نہ کریں خالہ!" شازیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں اس کو بہت جلد اردو

بولنا سکھا دوں گی۔"

نئے مکان میں منتقل ہو جانے کے بعد وہ دونوں بہت خوش تھے۔ انہوں نے کراچی آنے سے پہلے اپنے گاؤں میں جو خواب دیکھے تھے وہ سب پورے ہو گئے تھے اور وہ دونوں اپنے علاقے سے نکل کر کراچی میں ماما درازگل کے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے پھر خیر زماں کو کراچی میں کام بھی مل گیا تھا۔ اچھی خاصی تنخواہ بھی تھی اور اب اس نے الگ گھر بھی کرائے پر لے لیا تھا۔ سب کچھ ایسا ہی ہو گیا تھا جیسا کہ اس نے اور زرینہ نے چاہا تھا۔

کراچی میں سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا لیکن یہ ایسی سردی تھی جسے زرینہ اور خیر زماں بمشکل سردی کہہ سکتے تھے۔ دن میں یہ حالت ہوتی تھی کہ دھوپ میں زیادہ کھڑا ہی نہیں ہوا جاتا تھا اور پسینہ بہنے لگتا تھا۔ سارا دن تیز دھوپ میں جسم جلتے رہتے تھے۔ سورج ڈوبنے کے بعد البتہ موسم میں کچھ خنکی آ جاتی تھی اور رات کو ذرا سردی ہو جاتی تھی لیکن زرینہ اور خیر زماں کو کوئی بھی گرم کپڑا پہننے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ ان کے جسم تو اس سے بھی کہیں زیادہ سردی کو برداشت کرنے کے عادی تھے۔ یہ سردی تو کچھ بھی نہیں تھی ان کے لئے اور لوگوں نے انہیں بتایا تھا کہ کراچی میں بس ایسی ہی سردی ہوتی ہے۔

"یہاں کبھی بھی رات کو آگ جلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" تاجور نے اس کو بتایا تھا۔ "سخت سے سخت سردیوں میں بھی دن یا رات کے کسی بھی حصے میں آگ جلانا ضروری نہیں ہوتا۔ یہاں گھروں میں کمروں میں انگیٹھیاں نہیں ہوتیں۔"

"اور ہمارے گاؤں میں اس وقت کیا عالم ہو گا۔" زرینہ نے خیر زماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو وہاں موجود تھا۔ "ہر طرف برف ہی برف ہو گی۔ سارے پہاڑ برف پوش بن چکے ہوں گے۔ سارے راستے برف کی وجہ سے بند ہو چکے ہوں گے۔ کوئی بھی گاؤں سے نکل کر کسی دوسری جگہ نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی کسی دوسری جگہ کا آدمی باہر سے گاؤں کے اندر آ سکتا ہو گا اور راتوں کو گھروں کو گرم رکھنے کے لئے کتنی آگ جلانی پڑتی ہو گی.........."

"ہمارے بچے تو اب اتنی سخت سردی کے عادی بھی نہیں رہے ہیں۔" تاجور نے کہا۔ "وہ تو کراچی کے ہی رہنے والے ہیں اور اتنی ہی سردی کے عادی ہیں جتنی کہ کراچی

میں ہوتی ہے۔ وہ سردیوں کے موسم میں کبھی گاؤں گئے ہی نہیں۔"

زرینہ اپنے نئے گھر میں خوش تھی۔ دراز گل اور اس کے گھر کے دوسرے لوگ برابر اس کے اور خیر زماں کے پاس آتے رہتے تھے اور وہ دونوں بھی دراز گل کے گھر جاتے رہتے تھے۔

مالک مکان کی بیوی صفیہ اور بیٹی شازیہ سے شروع دن سے ہی زرینہ کے تعلقات بہت اچھے رہے۔ یہ پہلے غیر پختون لوگ تھے جن کے ساتھ زرینہ کا رابطہ قائم ہوا تھا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے زرینہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ صرف اردو میں بولے جیسی بھی بولے، ٹوٹی پھوٹی، خراب مگر صرف اردو ہی بولے اور زرینہ بڑے شوق کے ساتھ ان لوگوں کے ساتھ اردو بولتی تھی۔ شازیہ تو باقاعدہ اس کی استانی بن گئی تھی اور وہ اس کو اردو سکھا رہی تھی۔

"تم پہلے اردو بولنا اچھی طرح سیکھ لو۔" شازیہ نے ایک روز زرینہ سے کہا۔ "اس کے بعد میں تم کو اردو لکھنا اور پڑھنا بھی سکھا دوں گی۔"

"واقعی؟" زرینہ نے ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور جو کچھ اس نے کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ آیا وہ واقعی لکھنا پڑھنا سیکھ سکے گی؟ کیا ایسا ممکن تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا سیکھ لے، جبکہ اس نے تو کبھی کتاب یا قلم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

"کیوں نہیں؟" شازیہ نے اس کو سمجھایا۔ کوئی بھی انسان کسی بھی عمر میں لکھنا پڑھنا سیکھ سکتا ہے۔

"انسان جو کچھ بھی سیکھنا چاہے وہ سیکھ سکتا ہے۔" شازیہ نے اس سے کہا۔ "ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس کے اندر سیکھنے کا شوق ہونا چاہئے، جذبہ ہونا چاہئے، آدمی چاہے تو کیا نہیں کر سکتا ہے؟"

شازیہ کی باتیں کچھ زرینہ کی سمجھ میں آ رہی تھیں، کچھ نہیں آ رہی تھیں لیکن وہ اس کی باتوں کو سمجھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

خیر زماں روزانہ رات کے آخری پہر میں اٹھ کر منڈی چلا جاتا تھا اور زرینہ گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لیتی تھی۔ خیر زماں کو اطمینان تھا کہ وہ گھر میں اکیلی نہیں ہے اور دیوار کے پیچھے ایسے لوگ موجود ہیں جو قابل اعتماد اور مہربان ہیں اور کسی بھی مشکل وقت میں پوری مدد کریں گے، وہ مطمئن ہو کر منڈی چلا جاتا اور جب دس گیارہ بجے کے قریب

وہ وہاں سے واپس آتا تو زرینہ کو چمکتی ہوئی آنکھوں اور متبسم چہرے کے ساتھ اپنا منتظر پاتا، اس کا دل خوشی سے معمور ہو جاتا۔ یہاں وہ دونوں اکیلے ہوتے تھے۔ کوئی تیسرا شخص گھر کے اندر موجود نہیں تھا۔ یہاں مکمل خلوت تھی۔ زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے سینے سے لگانے اور اسے پیار کرنے سے پہلے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کمرے کے دروازے بند کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں انہیں مکمل آزادی تھی۔

ان کی زندگی کا اب ایک طے شدہ قرینہ بن گیا تھا اور وہ اس کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ خیر زماں کی عدم موجودگی میں زرینہ کا خاصہ وقت شازیہ کے ساتھ گزرتا تھا یا تو شازیہ اس کے پاس آ جاتی یا وہ خود شازیہ کے پاس چلی جاتی۔ شازیہ نے اس کو اردو لکھنا اور پڑھنا سکھانا شروع کر دی تھی اور زرینہ بہت ہی خوشی اور شوق کے ساتھ سیکھ رہی تھی۔ خیر زماں کو بھی یہ سب کچھ بہت اچھا لگا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کے ماموں اور مامی کے بچے کس طرح کتابیں اور کاپیاں لے کر بیٹھتے ہیں، کس طرح وہ لکھتے اور پڑھتے ہیں اور ان کاموں میں کتنے انہماک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اتنا کہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور وہ لکھتے پڑھتے کتنے اچھے لگتے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بس ان کو دیکھتا ہی رہے اور اب زرینہ بھی ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چل رہی تھی۔ وہ بھی ہاتھ میں سلیٹ اور پتی لے کر بیٹھتی اور بڑے انہماک اور محویت کے عالم میں سلیٹ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی جن کا مطلب خیر زماں کی سمجھ میں بالکل نہ آتا۔ یکایک اس احساس کے ساتھ اس کا دل فخر سے بھر جاتا کہ اس کی بیوی کچھ ایسی چیزیں بھی جانتی ہے جو وہ نہیں جانتا۔ وہ لکھنا پڑھنا سیکھ رہی ہے، وہ کتابیں پڑھے گی، وہ لکھے گی اور یہ سب کچھ کس قدر حیرت انگیز اور ناقابل یقین ہو گا۔ وہ اپنے ان پڑوسیوں کا بے حد ممنون تھا جو زرینہ پر اتنی توجہ دے رہے تھے۔ زرینہ اور خیر زماں شازیہ کو باجی اور اس کی ماں صفیہ کو چاچی کہتے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ ان کے بہترین تعلقات تھے۔ چاچا صغیر احمد بھی ان لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔

"دنیا میں کتنے اچھے اچھے لوگ موجود ہیں۔" خیر زماں اکثر سوچا کرتا تھا۔ "ماما دراز گل ہیں، مامی ہیں، ان کے بچے ہیں۔ وہ سب لوگ کتنے اچھے ہیں۔ انہوں نے میرا اور زرینہ کا کتنا خیال کیا۔ ماما نے تو ہماری ایسی مدد کی کہ کوئی دوسرا کر ہی نہیں سکتا تھا اور پھر

.... یہ لوگ .... صغیر چاچا .... صفیہ چاچی .... شازیہ باجی .... یہ سب لوگ کتنے اچھے ہیں۔ واقعی دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے۔"

اور یہ سب کچھ سوچتے سوچتے اس کا ذہن یکبارگی' کراچی کی مہربان اور غیر مخالفانہ فضاؤں میں سفر کرتا ہوا بہت دور پہاڑوں کی بلندیوں کے اس پار چلا جاتا جہاں اس کا گاؤں تھا' جہاں زرینہ کا گاؤں تھا۔ جہاں زرینہ کے گھر والے تھے' جو اس کے اور زرینہ کے خون کے پیاسے تھے اور اس کی ساری خوشی کافور ہو جاتی۔ یہ تو ایک ایسا خوف تھا جس سے اس کو کبھی نجات نہیں مل سکتی تھی۔ نہ اس کو اور نہ اس کی بیوی زرینہ کو۔ اس خوف سے نجات صرف اس وقت ممکن تھی جب یا تو یہ معاملہ کسی انجام تک جا پہنچے' خواہ یہ کوئی بہت ہی دردناک انجام کیوں نہ ہو۔

☆------☆------☆

اس رات زرینہ کے گھر سے نکل جانے کے بعد فیروزہ تکئے میں منہ چھپا کر بہت دیر تک خاموشی سے سسکیاں بھرتی رہی۔ اس کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ زور سے رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی لے دے کے ایک ہی بہن تھی اور نہ کوئی اور بہن نہ بھائی اور وہ بھی اب اس سے اس طرح جدا ہو گئی تھی کہ زندگی بھر دوبارہ ملنے کا بمشکل ہی کوئی امکان تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بہن اور بہن کے چاہنے والے نے اپنے لئے جس راستہ کا انتخاب کیا تھا وہ سیدھا موت اور مکمل تباہی کا راستہ تھا۔ ان دونوں نے اپنے آپ کو موت کا سزاوار قرار دلوا دیا تھا۔ ان کے اپنے ان کے سگے ان کے دشمن ہو گئے تھے اور ان کی موت ان کے اپنوں ہی کے ہاتھوں ہونی تھی۔ فیروزہ نے اپنی بڑی بہن کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن اس نے فیروزہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے بھی اور خیر زماں نے بھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے مر مٹنے کو تیار تھے' ایک دوسرے پر نثار ہونا چاہتے تھے ان دونوں کا کہنا یہی تھا کہ اگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے تو ایک دوسرے کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ اس لئے اگر مرنا ہی ٹھہرا تو پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر کیوں نہ مرا جائے۔

اور اب اس سرد اور ویران اور خاموش رات میں وہ دونوں یہاں سے جا چکے تھے۔ فیروزہ کو ان کے ایک ایک لمحے کا حساب معلوم تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ خیر زماں زرینہ کو کس جگہ ملے گا' پھر وہ دونوں وہاں سے کس راستے سے ہوتے ہوئے قریبی قصبے تک

پہنچیں گے۔ انہیں وہاں تک پہنچنے میں اندازاً کتنا وقت لگے گا اور پھر وہ علی الصبح وہاں سے بس پکڑ کر پشاور روانہ ہوں گے اور چند گھنٹوں کے اندر اندر پشاور پہنچنے کے بعد کراچی کی ٹرین میں سوار ہو کر کراچی جا پہنچیں گے اور پھر ماما دراز گل کے گھر پہنچیں گے۔

اسے سب کچھ معلوم تھا اور وہ اس سارے راز کو اپنے سینے میں دبائے ہوئے اپنے بستر پر خاموشی سے پڑی ہوئی رو رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ سو جائے لیکن شاید اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ آج کی رات سونے کے لئے نہیں تھی۔ یہ تو ماتم کی رات تھی ایک ایسے ماتم کی رات جس میں وہ اپنے ساتھ کسی بھی دوسرے کو شریک نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ماتم تو اس کو تنہا کرنا تھا۔ صبح کو جو ایک دوسرا ماتم شروع ہونے والا تھا اس میں تو اور بھی کئی لوگ حصہ لینے والے تھے لیکن اس کے لئے تو تنہا ماتم کا یہ عذاب ابھی سے شروع ہو گیا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے اپنی زبان پر مہر لگا کر رکھنی تھی۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی اور صبح قریب آ رہی تھی اور صبح کے قریب آنے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا اور خوفناک طوفان بھی قریب آ رہا تھا۔ اس طوفان کی آمد کے بارے میں پہلے سے صرف فیروزہ جانتی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

رات کی سیاہی بہت گہری ہو گئی تھی اور پھر صبح کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے' سردی میں لپٹی ہوئی کسی پرندے کی آواز نے یخ بستہ فضا میں پھیل کر آمد سحر کی نوید سنائی۔ سخت سردی تھی اور لوگوں کے لئے اپنے اپنے گرم بستر میں سے نکلنا کسی کڑی آزمائش سے کم نہیں تھا لیکن اس آزمائش سے تو روز ہی گزرنا پڑتا تھا اور یہ تو یہاں کے لوگوں کی زندگی کے معمولات میں داخل تھا۔

روز کی طرح آج بھی گھر میں سب سے پہلے آمنہ کی آنکھ کھلی لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آج تو گھر میں ایک اور شخص بھی آمنہ سے پہلے جاگ رہا تھا۔ فیروزہ تو سوئی ہی نہیں تھی۔ جس وقت سے زرینہ گھر سے نکل کر باہر گئی تھی اس کے بعد سے ایک لمحے کے لئے بھی فیروزہ کی پلک نہیں جھپکی تھی۔ وہ برابر جاگتی رہی تھی لیکن خاموشی سے اپنے بستر پر پڑی رہی تھی۔

اس نے آمنہ کو اپنے بستر سے اٹھتے ہوئے اور نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ سب سے پہلے باورچی خانے میں جا کر چولہا روشن کرے گی' پانی گرم کرے گی

اور پھر ہاتھ منہ دھوئے گی۔ اس کے بعد وہ آ کر زرینہ کو اور اس کو جگائے گی اور پھر وضو کر کے نماز پڑھے گی اور اس کے بعد باورچی خانے میں جا کر ناشتہ تیار کرنا شروع کر دے گی۔ اس کے کچھ دیر کے بعد ان کا باپ شمروز خان بھی گھر کے اندر آ جائے گا اور وہ سب لوگ ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کریں گے۔ شمروز خان عام طور پر صبح کے ناشتے میں اپنے گھر کی خواتین کے ساتھ ضرور شریک ہوتا تھا۔ دوپہر اور رات کا کھانا اکثر باہر ہی کھا لیتا تھا۔

فیروزہ نیم باز آنکھوں سے اپنی ماں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتی رہی۔ آمنہ اپنے سارے کام معمول کے مطابق سر انجام دے رہی تھی۔ اس نے باورچی خانے میں جا کر چولہا جلایا اور پھر پانی گرم ہونے کے لئے رکھ دیا۔ وہ خود بھی چولہے کے پاس بیٹھ گئی اور ہاتھ سینکنے لگی۔ بہت سردی ہو رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد وہ ہاتھ منہ دھو کر فارغ ہو گئی اور پھر وہ لڑکیوں کو جگانے کے لئے ان کے بستر کی طرف آئی۔ اسے زرینہ کا بستر خالی نظر آیا اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ زرینہ اس کو کہیں نظر نہیں آئی۔ فیروزہ نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں اور بالکل سوتی بن گئی تھی۔

آمنہ نے اس کو "جگایا" اور وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ "چلو اٹھو۔" آمنہ نے اس سے کہا۔ "اور زرینہ کو دیکھو .... کدھر ہے۔ میں باورچی خانے میں ہوں۔"

"اچھا اماں!" فیروزہ نے آمنہ سے کہا اور بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ گویا وہ سچ مچ زرینہ کو تلاش کر رہی تھی اور اسے یقین ہو کہ زرینہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔

اس نے اندر اور پھر باہر اور پھر گھر کا ایک چکر لگایا اور زرینہ کو "تلاش کیا" اس کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس آ بیٹھی اس کا دل اس قدر زور سے دھڑک رہا تھا جیسے آج کے بعد سے ہو پھر کبھی نہیں دھڑکے گا۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا جس پر قابو پانے کی وہ پوری کوشش کر رہی تھی۔

"اماں! زرینہ .... زرینہ تو نہیں ہے۔" اس نے بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر کہا۔

"کہاں نہیں ہے؟" آمنہ نے چولہے کی آگ تیز کرتے ہوئے بالکل بے دھیانی کے عالم میں کہا۔ اسے شاید خود بھی ٹھیک سے علم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے کیونکہ اس کا

دھیان تو چولہے کی طرف تھا اور اس نے شاید فیروزہ کی بات کو پورے طور سے سمجھا بھی نہیں تھا۔ "وہ جلدی اٹھ کر کہیں اِدھر اُدھر چلی گئی ہو گی' آ جائے گی۔"

لیکن زرینہ نہیں آئی۔ فیروزہ خاموشی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی اور اس نے اپنی اماں سے مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔

فیروزہ ہاتھ منہ دھونے کے بعد باورچی خانے میں آ گئی' جہاں آمنہ پہلے سے موجود تھی اور تب آمنہ کو دوبارہ خیال آیا کہ زرینہ نظر نہیں آ رہی ہے۔

"ارے کہاں ہے زرینہ؟" اس نے فیروزہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر زور زور سے زرینہ کو آوازیں دینے لگی لیکن اس کے جواب میں زرینہ کی آواز کہیں سے نہیں سنائی دی۔ فیروزہ چولہے کے پاس سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے اعصاب پر جیسے لرزہ طاری تھا۔

"ارے کہاں مر گئی کم بخت۔" آمنہ بڑے زور سے چلائی جب سے یہ خیر زماں کا قصہ چلا تھا تب سے وہ زرینہ سے سخت ناخوش رہنے لگی تھی اور اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ زرینہ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دے گی لیکن اس کی شادی خیر زماں کے ساتھ نہیں کرے گی۔

اس کی ڈانٹ کے جواب میں بھی "کم بخت" کی کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ آمنہ متعجب ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی اور پھر اس نے فیروزہ سے کہا۔ "ارے ذرا دیکھ .... کہاں ہے وہ؟ نظر کیوں نہیں آ رہی ہے۔"

"میں نے ابھی دیکھا تھا۔" فیروزہ نے جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی پھر دیکھتی ہوں۔"

فیروزہ اس کو اِدھر اُدھر تلاش کرتی ہوئی گھر کے باہر نکل آئی اور اس راستے کی طرف دیکھنے لگی جدھر سے رات کے آخری پہر میں زرینہ گزر کر گئی تھی۔ صبح کی روشنی میں وہ جگہ خالی پڑی تھی۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سنسان اور ویران راستہ اپنے سینے کے اندر گزشتہ شب کے سارے رازوں کو دبائے ہوئے بالکل انجان بنا ہوا تھا اپنے جسموں پر خاموشی کی مہر لگائے ہوئے۔

فیروزہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس راستے کی طرف دیکھا اور اس کی چشم تصور میں رات کا منظر ابھر آیا۔ رات کے آخری حصے میں زرینہ نے اس راستے پر چل کر زندگی سے

اپنا ناطہ توڑ لیا تھا' توڑ لیا تھا۔ یا شاید جوڑ لیا تھا۔ معلوم نہیں۔ کوئی اس کا انتظار کر رہا تھا اس کے ساتھ مرنے کے لئے تیار' اس کا ساتھ دینے' ہر عذاب جھیلنے کے لئے تیار' کتنی خوش قسمت تھی زرینہ کہ اس کو ایسا چاہنے والا ملا تھا جو اس کی محبت میں واقعی اپنے آپ کو قربان کئے ڈال رہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک نظریں دوڑا دوڑا کر اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ بڑی شدید سردی ہو رہی تھی اور ساری فضا جیسے ٹھٹھری ہوئی تھی' سرد' اداس' سوگوار' ماتم کناں۔

وہ گھر کے اندر واپس آ گئی اور اس نے باورچی خانے میں جا کر ماں کو بتایا کہ زرینہ کہیں نہیں ہے۔ آمنہ اس وقت ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی اور اس نے باورچی خانے میں فیروزہ کی آمد پر کوئی توجہ بھی نہیں دی تھی۔ یہ ایک قطعی غیر اہم اور معمولی سی بات تھی لیکن جب فیروزہ نے اس کو یہ بتایا کہ زرینہ کہیں موجود نہیں ہے تو وہ ایک دم سے جیسے چونک پڑی اس کو پہلی بار معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"نہیں ہے.........!" اس نے چونک کر کہا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟" اس کی پیشانی پر بہت سارے بل پڑ گئے۔ "نہیں ہے تو کہاں ہے' کہیں اور ہو گی؟"

"گھر میں یا گھر کے باہر کہیں نہیں ہے۔" فیروزہ نے آمنہ سے کہا۔ "میں نے سب طرف دیکھ لیا ہے۔"

آمنہ نے بڑبڑاتے ہوئے کچھ کہا اور خود اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ باورچی خانے سے باہر نکلی تو فیروزہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ان دونوں نے پہلے تو سارے گھر کا اندر سے چکر لگایا اور سارے کمروں وغیرہ میں زرینہ کو دیکھا لیکن زرینہ تو کہیں بھی نہیں تھی۔ پھر آمنہ اور فیروزہ دونوں مکان سے باہر نکل گئیں۔

جس جگہ تک زرینہ کی موجودگی کا امکان پایا جاتا تھا انہوں نے وہاں تک اس کو دیکھ لیا لیکن وہ وہاں کہیں نہیں تھی۔ آمنہ سخت حیرت اور بے یقینی کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی اس کے چہرے کے عضلات کھنچ گئے تھے۔ آنکھوں میں ایک وحشت سی بھر آئی تھی اور پیشانی پر بہت ساری لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔

"آخر وہ گئی کہاں؟" اس نے متوحش آواز میں کہا۔ "تم نے .... تم نے اس کو کب دیکھا تھا؟" اس نے فیروزہ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "صبح سے.........؟"

"میں نے اس کو صبح سے نہیں دیکھا۔" فیروزہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو بس رات کو سونے سے پہلے ہی اسے دیکھا تھا۔ اس کے بعد نہیں۔"

"میں نے بھی اس کو رات ہی کو دیکھا تھا۔" آمنہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ "سونے سے پہلے اور پھر میں سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔ سب ہی لوگ سونے کے لئے لیٹ گئے تھے۔ وہ کہاں چلی گئی؟ کیا رات وہ کسی وقت.........؟" اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ الفاظ جیسے اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے تھے اور اس کی آنکھوں کی وحشت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔

صبح کا اجالا دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور سردی میں ٹھٹھری فضا میں ایک عجیب سا نکھار تھا۔ "وہ لوگ اب کہاں پہنچ چکے ہوں گے؟" فیروزہ نے اپنے آپ سے کہا۔ "وہ اب سے بہت پہلے شہر تک پہنچ چکے ہوں گے اور اب تک تو شاید وہ بس میں بیٹھ کر بسوں کے اڈے سے روانہ ہو چکے ہوں گے۔ سیدھے پشاور کے لئے .... اب تک تو ان کو بس مل جانی چاہئے۔ یا شاید تھوڑی دیر میں مل جائے .... اس کے ساتھ ہی پشاور کی جانب ان کا سفر شروع ہو جائے گا یا ہو چکا ہو گا........."

"ارے کہاں مر گئی یہ زرینہ؟" آمنہ کی آواز میں غصے' جھلاہٹ اور ناراضگی کے ساتھ ساتھ خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔ "آخر کہاں چلی گئی؟"

"پتہ نہیں اماں!" فیروزہ نے سہمتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے .... نہ جانے .... کہاں چلی گئی........."

وہ دونوں گھر کے اندر آ چکی تھیں اور آمنہ گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت دوسرے دروازے سے شمروز خان گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوا اور ان دونوں کو یوں حیران و پریشان صحن میں کھڑا دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے حیرت اور تشویش کے ساتھ پوچھا۔ "تم لوگ یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"زرینہ گھر میں نہیں ہے۔" آمنہ نے کہا۔ "ہم نے اس کو ہر جگہ تلاش کر لیا ہے' وہ گھر میں موجود نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" شمروز خان نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ "گھر میں موجود نہیں ہے تو پھر......... پھر کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" آمنہ نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "میں اور فیروزہ

اس کو ساری جگہوں پر دیکھ چکی ہیں وہ کہیں نہیں ہے۔"

"شاید .... شاید .... کہیں آس پاس گئی ہوئی ہو گی۔" شمروز خان نے اعتماد سے خالی آواز میں کہا اس کے دل و دماغ میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ یکبارگی طرح طرح کے وسوسوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

"اتنی صبح صبح آس پاس کہاں چلی گئی ہو گی؟" آمنہ نے اس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔ "وہ .... آس پاس کہاں جا سکتی ہے؟ اور اگر کہیں گئی بھی ہوتی تو اس کو اب تک واپس آ جانا چاہئے تھا۔ وہ کیا کر رہی ہے؟"

"میں ذرا باہر دیکھ کر آتا ہوں۔" شمروز خان نے وحشت کے عالم میں کہا۔ "ایسا .... ایسا کس طرح ہو سکتا ہے' وہ کہاں جا سکتی ہے؟"

اور اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکل گیا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر اس کو اپنا بھتیجا امیر خان نظر آیا۔

امیر خان اس کے بھائی احمد خان کا بڑا بیٹا تھا اور وہ لوگ بھی اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ امیر خان' خیر زماں کا تقریباً ہم عمر تھا۔ امیر خان کا ایک چھوٹا بھائی تھا جس کی عمر دس سال کی تھی' اس کا نام حبیب خان تھا ان لوگوں کے پاس بھی تھوڑی بہت زمین تھی اور کچھ مویشی اور علاقے کے بیشتر لوگوں کی طرح یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔

"آپ صبح صبح کہاں جا رہے ہیں چاچا!" امیر خان نے شمروز خان سے سلام دعا کے بعد پوچھا۔

"تم نے .... زرینہ کو کہیں اِدھر اُدھر تو نہیں دیکھا؟" شمروز خان نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔

"زرینہ کو؟" امیر خان نے حیرت سے کہا۔ "نہیں تو وہ ہمارے گھر تو نہیں آئی ہے۔ میں ابھی ابھی گھر سے ہی نکل کر آ رہا ہوں۔ میں نے تو اس کو کہیں نہیں دیکھا۔ کیوں' کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہے؟"

"وہ .... وہ .... صبح سے گھر میں نہیں ہے۔" شمروز خان نے رکتے رکتے کہا۔ "معلوم نہیں کدھر نکل گئی........."

"کدھر نکل گئی؟" امیر خان نے تعجب سے کہا۔ "مگر .... وہ کہاں جا سکتی ہے؟ صبح صبح وہ کہاں جا سکتی ہے؟ آپ نے اس کو کہاں کہاں تلاش کیا؟"

"ابھی تو کہیں بھی نہیں۔" شمروز خان نے جواب دیا۔ "میں اس کو ڈھونڈ رہا ہوں وہ گھر کے اندر موجود نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے؟"

اگرچہ شمروز خان اور اس کی بیوی نے خیر زماں والے معاملے کی اپنی طرف سے زیادہ تشہیر نہیں کی تھی تاہم' افضل خان اور جہاں زیب کی آمد کے بعد یہ بات بابر خیل کے کافی لوگوں کو معلوم ہو گئی تھی اور احمد خان تو شمروز کا سگا بھائی تھا۔ اس کو اور اس کے گھر والوں کو یہ بات اچھی طرح سے معلوم تھی۔ امیر خان کو شمروز خان نے خود ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔

امیر خان نے اپنے چاچا کی بات سنی اور اس کے ذہن میں فوری طور پر کئی طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ تاہم جو کچھ وہ سوچ رہا تھا' وہ اس کے نزدیک اتنا آسان تو نہیں ہو سکتا تھا۔ ان دونوں کو یہ بات معلوم ہونی چاہئے تھی کہ اس قسم کی حرکت کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔

"تو پھر آیئے اس کو ڈھونڈتے ہیں۔"

تقریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر سارے گاؤں بابر خیل کو معلوم ہو گیا کہ شمروز خان کی بڑی بیٹی زرینہ پُراسرار حالت میں گھر سے غائب ہو چکی ہے۔

شمروز خان اور اس کے رشتے داروں کے علاوہ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی زرینہ کو تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاید وہ علی الصبح کسی وجہ سے گھر سے باہر نکلی ہو اور پھر اچانک کسی حادثے کا شکار ہو گئی' اس لئے وہ اس کو زندہ کے علاوہ مردہ بھی تلاش کر رہے تھے لیکن وہ ان کو زندہ یا مردہ کسی حالت میں بھی نہیں ملی۔

بات اب تک صرف سرگوشیوں میں' محتاط انداز میں ہو رہی تھی اور اب تک کسی کی زبان پر کھل کر اس کا ذکر نہیں آیا تھا لیکن شمروز خان اور اس کی بیوی آمنہ کے درمیان اس بارے میں رازدارانہ گفتگو ہوئی تھی اس گفتگو کی ابتدا آمنہ کی جانب سے ہوئی تھی۔

"کسی طرح سے معلوم کرواؤ۔" آمنہ نے غم و غصے سے بوجھل آواز میں اپنے شوہر سے کہا۔ "کسی کو ڈیرہ امین گل بھیجو اور معلوم کراؤ کہ وہ نامراد اور بدنصیب خیر زماں گھر پر موجود ہے یا نہیں۔ اگر خیر زماں کے بارے میں بھی یہ معلوم ہو کہ وہ گاؤں میں موجود

نہیں تو پھر سمجھ لو کہ وہ دونوں راتوں رات ایک دوسرے کے ساتھ یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے .... اگر ایسا ہے تو میں اپنے ہاتھوں سے ان دونوں کی لاشیں گراؤں گا۔" شمروز خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس کی آواز بھاری اور بوجھل ہو گئی۔ "اگر وہ دونوں یہاں سے ایک دوسرے کے ساتھ بھاگے ہیں تو پھر ان کو دردناک موت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ میں ان کو چھوڑوں گا نہیں۔ قبر میں اتار کر دم لوں گا۔"

"وہ اسی انجام کے مستحق ہیں۔" آمنہ نے سرخ سرخ آنکھوں سے اپنے شوہر کو گھورتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ نفرتوں کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ "ان کے ساتھ یہی سلوک کیا جانا چاہئے۔ اس حرامزادی نے ہماری ناک کٹوا دی۔ ہم کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ میں تو.........."

"ابھی اس کی تصدیق ہونی باقی ہے۔" شمروز نے کہا۔ "اگر خیر زماں اپنے گاؤں میں موجود ہے تو پھر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خیر زماں کا زرینہ کی پُراسرار گمشدگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اور وجہ ہو۔ شاید .... واقعی وہ کسی حادثہ کا شکار ہو گئی ہو۔ پہلے اصل بات معلوم ہونی چاہئے۔"

تھوڑی دیر کے بعد شمروز خان اپنے بھائی احمد خان سے باتیں کر رہا تھا۔ احمد خان کا بیٹا امیر خان بھی ان دونوں کے ساتھ موجود تھا۔

"معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ خیر زماں اس کو ساتھ لے کر گیا ہے۔" شمروز خان دھیمے لیکن سلگتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اور اس بات کی تصدیق یا تردید کے لئے کسی کو ڈیرہ امین گل جانا ہو گا اور وہاں جا کر معلوم کرنا ہو گا کہ آیا خیر زماں گاؤں میں موجود ہے یا نہیں۔"

"ٹھیک ہے چاچا!" امیر خان نے کہا۔ "میں جاؤں گا۔ میں وہاں جا کر خیر زماں کے بارے میں معلوم کر آؤں اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

"یہ ہمارے پورے خاندان کی اور پورے قبیلے کی عزت کا سوال ہے۔" احمد خان نے کہا۔ "اگر خیر زماں نے ایسی کوئی حرکت کی ہے تو ہم .... ہم اس کے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔"

"ظاہر ہے کہ اس صورت میں خیر زماں کو زندہ نہیں چھوڑ سکتے۔" امیر خان نے

کہا۔ "لیکن صرف خیر زماں کو ہی نہیں.........."

"ہاں.........." شمروز خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو صرف خیر زماں کو ہی نہیں اس کے ساتھ زرینہ کو بھی۔ دونوں کو گولی مار دینی ہو گی .... دونوں مجرم ہیں اور موت کے سزاوار.........."

"سارا گاؤں اس بات کو جان چکا ہے کہ زرینہ گزشتہ رات اپنے گھر میں موجود تھی، لیکن صبح سے غائب ہے۔" احمد خان نے کہا۔ "اس لئے کوئی بھی اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ زرینہ کو اس کی مرضی کے خلاف کہیں لے جایا گیا ہے۔ لوگوں کو یہ یقین نہیں دلایا جا سکتا کہ اس کو اغوا کیا گیا ہے صرف ایک ہی بات تسلیم کی جائے گی اور وہ یہ کہ وہ جہاں کہیں بھی گئی ہے، جس کے پاس گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے .... ہم اس بات کو چھپا نہیں سکتے۔"

"اس کو چھپانے کی ضرورت بھی نہیں؟" شمروز خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "چھپاتے تو تب جب ہم اس کو سزا دینے کے لئے تیار نہ ہوتے لیکن ہم تو خود اپنے ہاتھوں سے اس کو سزا دینے کے لئے تیار ہیں۔ ہم اس کو اور خیر زماں کو موت کے گھاٹ اتار کر ہی دم لیں گے۔ وہ لڑکی اب ہمارے کس کام کی؟ وہ رات کی تاریکی میں اپنے گھر کی دہلیز پار کر گئی ہے۔ خفیہ طور پر .... اور ایک نامحرم کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اب اگر وہ مل بھی جائے تو ہم اس کو لے کر کیا کریں گے؟ وہ تو ہمارے لئے مر چکی ہے۔"

"میں .... میں ڈیرہ امین تک جاتا ہوں۔" امیر خان نے کہا۔ "وہاں جا کر میں خیر زماں کے بارے میں معلوم کر آؤں اس کے بعد ہی ہم لوگ کوئی فیصلہ کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" شمروز خان نے کہا۔ "تم جاؤ اور جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا تاکہ ہم لوگوں کو اصل صورتِ حال کا جلد سے جلد علم ہو جائے۔"

☆======☆======☆

بخت خان سخت پریشان ہو رہا تھا۔ خیر زماں آج صبح سے ہی غائب تھا۔ رات کو نہ جانے کب صبح ہونے سے پہلے وہ اپنے بستر پر سے غائب ہو گیا تھا اور بخت خان کو اس کا علم اس وقت ہوا تھا جب اس کے چھوٹے بیٹے نواز خان نے اس کو بتایا کہ خیر زماں اس کو صبح سے نظر نہیں آیا ہے۔ اسے کچھ کاموں کے سلسلے میں خیر زماں سے ضروری مشورے کرنے تھے لیکن خیر زماں کا پتہ ہی نہیں تھا۔

"میں اس کو کئی جگہوں پر ڈھونڈ کر آ گیا ہوں۔" نواز خان نے اپنے باپ سے کہا۔ "لیکن وہ کہیں نہیں ہے۔"

"اچھا!" بخت خان نے کہا۔ "تو پھر انتظار کرو وہ خود ہی آ جائے گا' شاید کسی کام سے کہیں اِدھر اُدھر چلا گیا ہو گا۔"

صبح کا ناشتہ سب لوگ ساتھ ہی کرتے تھے اور تینوں باپ بیٹے اس ناشتے میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کا تو کوئی ٹھیک پتہ نہیں ہوتا تھا۔ سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں اور سب لوگ اپنی اپنی مصروفیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کھانے کا وقت نکال لیتے تھے۔

صبح کے ناشتے کا وقت ہو گیا۔ ناشتہ تیار تھا۔ سب لوگ بیٹھے تھے لیکن خیر زماں کا کوئی پتہ نہیں تھا۔

بخت خان کو اس بات کا یقین تھا کہ خیر زماں جہاں کہیں بھی گیا ہو گا وہ ناشتے کے وقت تک ضرور واپس آ جائے گا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سب لوگ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے اور نواز خان کو اس سے بہت سی ضروری باتیں بھی کرنی تھیں۔

لیکن وہ نہیں آیا۔ گل بی بی اور نور جہاں کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کیونکہ ان دونوں سے بھی اس کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

"وہ کہاں رہ گیا؟" بخت خان نے نواز خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اچانک ایک بڑے ہی لرزہ خیز اور روح فرسا خیال نے اس کو دہلا دیا۔

راحت خان کے قتل کو کافی عرصہ گزر گیا تھا اور اب بخت خان کے خاندان کے کسی فرد کی باری تھی۔ اب قتل کئے جانے والے فرد کا تعلق بخت خان کے خاندان سے ہونا چاہئے تھا اور خیر زماں .... خیر زماں تو ان لوگوں کے لئے بہترین شکار ہو سکتا تھا۔ خیر زماں کے قتل سے ان کو دہرا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ ایک تو راحت خان کے قتل کا بدلہ پورا ہو جاتا اور اس کے ساتھ ہی اس شخص سے بھی نجات مل جاتی جس نے شمروز خان کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے کی جرأت کی تھی۔

"اف میرے خدا.........." اس نے گھبرا کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ "اب خیر زماں تو نہیں ملے گا' البتہ اس کی لاش ضرور مل جائے گی۔"

"کیا ہوا بابا!" نواز خان نے اپنے باپ سے پوچھا۔ "آپ اچانک کس فکر میں پڑ

گئے؟"

"کچھ نہیں۔" بخت خان نے کہا اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے دل میں جو کچھ تھا اس کا اظہار عورتوں کے سامنے کر کے وہ ان کو صدمے سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ہمیں .... ہمیں خیر زماں کو تلاش کرنا ہو گا۔" بخت خان نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اسے تلاش کرنا ہو گا۔"

"مگر.......... مگر کہاں بابا؟" نواز خان اب بھی اس کی بات نہیں سمجھ رہا تھا۔ "وہ ہمیں بتا کر تو نہیں گیا ہے۔ ہم اس کو کہاں تلاش کریں گے؟"

"کہیں بھی' کسی جگہ بھی۔" حیران و پریشان بخت خان نے کہا۔ اس کے انداز میں وحشت اور سراسیمگی تھی۔ "ہمیں اس کو ڈھونڈنے کے لئے جانا ہو گا۔"

فی الحقیقت اس کے کہنے کا مقصد تھا کہ "ہمیں اس کی لاش کو ڈھونڈنے کے لئے جانا ہو گا۔" کیونکہ اسے بڑی حد تک اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ شمروز خان نے اس کے بیٹے کو قتل کروا دیا ہے۔

نواز خان بھی اپنے باپ کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا اور وہ دونوں ایک ساتھ باہر کی طرف بڑھے۔

اس وقت بخت خان کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کی جیب تقریباً خالی ہے اور اس میں پیسے نہیں ہیں۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کی لاش ڈھونڈنے کے لئے باہر جا رہا ہے تو اس کی جیب میں کچھ نہ کچھ رقم بھی تو ہونی چاہئے تھی۔

"ٹھہرو!" اس نے نواز خان سے کہا۔ "میں کچھ پیسے اپنے پاس رکھ لوں۔ شاید ہمیں ضرورت پڑ جائے۔"

گل بی بی اور نور جہاں سخت حیرت' اضطراب اور خوف کے عالم میں بخت خان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بخت خان کے چہرے پر جیسے خاک سی اڑنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں بجھی بجھی تھیں اور اس کی آواز میں بھی ایک نامانوس سا بھاری پن پیدا ہو گیا تھا۔

"تم.......... تم لوگ اس کو کہاں تلاش کرنے جا رہے ہو؟" گل بی بی نے سہم کر پوچھا۔ "کیا ہو گیا ہے اس کو یا وہ کہاں چلا گیا ہے؟"

لیکن بخت خان اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اندر کمرے میں داخل ہو چکا تھا اور اس الماری کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں وہ پیسے رکھتا تھا' گھر کا خرچ عام طور سے وہ خود ہی کرتا تھا اور اس لئے اس کو یاد رہتا تھا کہ کتنے پیسے خرچ ہوئے اور کتنے بچے ہوئے رکھے ہیں۔

اس نے جب رکھے ہوئے پیسوں کو ہاتھ لگایا تو پہلی ہی نظر میں اس کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ پیسے کم ہیں' تب اس نے جلدی جلدی ان کو گننا شروع کر دیا۔ اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا' پیسے کم تھے۔

کسی کو بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بخت خان سے ہی کہتا تھا اور عام طور سے بخت خان خود اپنے ہاتھ سے ہی پیسے دیا کرتا تھا اور اس کو سارا حساب کتاب یاد رہتا تھا اور اب اس کے حساب کتاب کے لحاظ سے پیسوں میں خاصی کمی ہو گئی تھی۔

اس نے وہاں موجود رقم کو دوبارہ گنا۔ شاید اس سے کوئی بھول چوک ہو گئی لیکن دوسری بار گننے میں بھی وہی نتیجہ سامنے آیا۔ پیسے کم تھے۔

اس کے ذہن میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ یہ ایک بالکل نئی اور انہونی سی بات تھی۔ آج تک کسی نے اس سے پوچھے بغیر پیسے نہیں نکالے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ پیسوں پر سانپ بنا بیٹھا رہتا تھا اور پہرہ دیا کرتا تھا بلکہ ایک روایت چلی آ رہی تھی' ایک بے ضرر سی' مستحکم' پرانی روایت جس کے تحت پیسے ہمیشہ بخت خان کے قبضے میں رہتے تھے۔

اس نے پیسوں کو اسی جگہ چھوڑ دیا اور کمرے سے باہر آ گیا جہاں تین حیران و پریشان افراد اس کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔

"کیا تم میں سے کسی نے کچھ پیسے نکالے ہیں؟" اس نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا۔

"پیسے..........!" نواز خان نے تعجب سے کہا۔ "نہیں' میں نے تو نہیں نکالے۔"

"اور میں نے بھی نہیں۔" گل بی بی نے کہا۔ "مجھے ضرورت ہوتی تو میں تم سے مانگ لیتی۔"

"تم نے نور جہاں؟" بخت خان نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔

"نہیں بابا!" نور جہاں نے جواب دیا۔ "میں نے تو پیسوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"تو .... تو پھر اس میں سے پیسے کم کیونکر ہو گئے؟" بخت خان نے ماتھے پر بل

ڈالتے ہوئے کہا۔ "کہاں گئے پیسے؟"

"خیر زماں نے تو نہیں لئے؟" گل بی بی نے کہا۔ "صرف وہی رہ جاتا ہے اب۔"

"خیر زماں نے..........!" بخت خان نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "لیکن اس کو کیا ضرورت پیش آ گئی پیسوں کی؟ اور وہ بھی رات میں؟ کل شام کو میں نے یہاں سے کچھ پیسے نکالے تھے۔ اس وقت تو پیسے پورے تھے لیکن اب کم ہیں اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ رات کے وقت کسی نے پیسے نکالے ہیں۔"

"جب ہم میں سے کسی نے نہیں نکالے تو پھر خیر زماں ہی نکال سکتا ہے۔" گل بی بی نے کہا۔

"تو کیا اس کا یہ مطلب ہوا کہ خیر زماں گھر سے پیسے لے کر کہیں گیا ہے؟" بخت خان نے کہا۔ "لیکن کہاں اور کیوں؟ اس کو کیا ضرورت پیش آ گئی تھی پیسے لے کر جانے کی؟"

ان سب لوگوں کے ذہن بُری طرح سے الجھ رہے تھے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔

سب سے پہلے یہ خیال نواز خان کے دماغ میں آیا تھا اور اس خیال کی وجہ یہ تھی کہ نواز خان نے کچھ کپڑے بھی کم پائے۔ دونوں بھائیوں کے پاس جتنے کپڑے تھے نواز خان کو ان کا اچھی طرح سے علم تھا۔ وہ دونوں اکثر ایک دوسرے کے کپڑے پہن بھی لیتے تھے۔

باقی لوگ پیسوں کی کمی کے معاملے پر غور کر رہے تھے تو نواز خان چند منٹ کے لئے وہاں سے چلا گیا تھا اس نے سوچا تھا کہ باہر جانے سے پہلے کپڑے تبدیل کر لے اور جب اس نے کپڑوں کا جائزہ لیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ خیر زماں کے کچھ کپڑے بھی کم ہیں۔

وہ جلدی سے واپس آیا اور اس نے ان لوگوں کو مطلع کیا کہ خیر زماں کے کچھ کپڑے بھی کم ہیں۔

"کپڑے بھی کم ہیں؟" بخت خان نے حیرت سے کہا۔ "کپڑے بھی کم ہیں اور پیسے بھی کم ہیں .... اس کا مطلب تو صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ کپڑے اور پیسے لے کر کہیں چلا گیا ہے لیکن کہاں اور کیوں؟"

"اور .... کیا وہ اکیلا گیا ہے؟" نواز خان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا مطلب؟" بخت خان نے ایک دم چونک کر کہا۔ وہ فوری طور پر نواز خان کی

بات کا مطلب سمجھ نہیں سکا تھا اور جب چند لمحوں کے بعد اس نے اس کا مطلب سمجھا تو اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ گل بی بی بھی اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

"نہیں نہیں۔" بخت خان نے جلدی سے کہا۔ "وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ ایسا کیونکر کر سکتا ہے؟ کیا اس کو معلوم نہیں کہ اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ وہ .... شاید اکیلا ہی کہیں چلا گیا ہے۔"

"جانے میرے بچے کے دماغ میں کیا سمائی۔" گل بی بی یکایک رونے لگی اور نور جہاں بھی اس کے ساتھ رونے میں شامل ہو گئی۔ دونوں ماں بیٹی اس قطعی طور پر غیر متوقع اور اچانک پیدا ہو جانے والی صورت حال سے سخت پریشان اور ہراساں نظر آ رہی تھیں۔

"تم لوگ یہ رونا دھونا بند کرو۔" بخت خان نے قدرے نرمی سے کہا۔ "میں اور نواز خان جاتے ہیں۔ اس کے دوستوں وغیرہ سے معلوم کرتے ہیں۔ شاید کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو .... شاید اس نے کسی کو کچھ بتایا ہو۔"

بخت خان کے دماغ سے کم از کم ایک خدشہ تو کم ہو ہی گیا تھا پہلے تو وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید خیر زماں کو شمروز خان نے قتل کر دیا ہے لیکن اب نئے انکشافات نے اس کے اس خیال کی تردید کر دی تھی۔ وہ تو پیسے اور کپڑے اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ خود ہی کہیں چلا گیا تھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اکیلا ہی کہیں چلا گیا ہو۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "وہ بہت دل برداشتہ تھا شمروز خان کے انکار نے اس کو بہت دکھ پہنچایا تھا اور شمروز خان کو راضی کرنے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ اس نے تو افضل خان اور جہانزیب جیسے بزرگوں کی بات بھی رد کر دی۔ پھر شمروز خان کو راضی کرنے کا کون سا طریقہ ہو سکتا تھا؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں .... تو عین ممکن ہے وہ دلبرداشتہ ہو کر کہیں چلا گیا ہو .... مگر کہاں؟ وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

بخت خان اور نواز خان گھر سے باہر نکلے۔ ان دونوں نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ گھر میں اور کسی نے بھی ناشتہ نہیں کیا تھا۔ چائے تیار رکھی تھی لیکن گل بی بی اور نور جہاں نے بھی اس کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

صبح ہو چکی تھی اور گاؤں میں معمول کی سرگرمیاں جاری و ساری تھیں۔ سردی میں ٹھٹھرے ہوئے لوگ اپنے اپنے روزمرہ کے معمولات کا آغاز کر چکے تھے۔

بخت خان اور نواز خان گاؤں کے کئی لوگوں کے پاس گئے' یہ سب وہ لوگ تھے جو خیر زماں کے ذاتی دوستوں میں شامل تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی خیر زماں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اور جب ان کو یہ علم ہوا کہ خیر زماں گھر سے بغیر کچھ کہے غائب ہو گیا ہے تو ان سب کو بہت تعجب ہوا اور ساتھ ہی تشویش بھی۔

کچھ ہی دیر میں سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ بخت خان کا بڑا بیٹا خیر زماں گزشتہ رات سے گھر سے غائب ہے۔ گاؤں کے سارے ہی لوگ بابر خیل کے شمروز خان کے خاندان کے ساتھ بخت خان کے خاندان کی دیرینہ دشمنی سے بخوبی واقف تھے اور یہ بات بھی سب کو معلوم تھی کہ دونوں خاندانوں کی دیرینہ دشمنی میں آخری قتل ہونے والا شخص شمروز خان کا چچا راحت خان تھا اور اب گویا بخت خان کے خاندان کے کسی شخص کی باری تھی چنانچہ عام طور سے اس خدشے کا اظہار کیا گیا کہ خیر زماں کو شمروز خان نے قتل کروا دیا ہے اور اس کی لاش شاید آس پاس ہی کہیں پڑی ہو گی۔

لیکن ایسا نہیں تھا لاش کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ تاہم' بخت خان اور نواز خان خیر زماں کی لاش کو تلاش نہیں کر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ خیر زماں کو قتل نہیں کیا گیا ہے' خیر زماں از خود کہیں چلا گیا ہے اور اپنے ساتھ کچھ پیسے اور اپنے کپڑے بھی لے گیا ہے۔ وہ خیر زماں کے دوستوں سے معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آیا خیر زماں نے ان میں سے کسی سے' کہیں جانے کا ذکر کیا تھا لیکن اس کے کسی بھی دوست کو اس قسم کی کوئی بات نہیں معلوم تھی۔

گاؤں کے لوگوں سے یہ بات بھی چھپی نہ تھی کہ خیر زماں گھر سے پیسے اور کچھ کپڑے ساتھ لے گیا ہے اور اس بات نے تو پورے معاملے کی نوعیت کو ہی بدل کر رکھ دیا اس کا تو صاف مطلب یہی تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں چلا گیا ہے۔

خیر زماں اور زرینہ کے بارے میں لوگوں کو ٹھیک سے تو کچھ نہیں معلوم تھا لیکن کچھ اڑتی سی غیر مصدقہ خبریں گشت کرتی رہی تھیں کہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہے ہیں لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کو بنیاد بنا کر اس معاملے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا سکتا۔ کسی نے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کہی تھی بخت خان اور نواز خان نے بھی خیر زماں کی تلاش کے دوران گاؤں کے لوگوں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

بخت خان اور نواز خان نے سارا گاؤں چھان مارا۔ ان کے ساتھ اور بھی بہت سے

دوسرے لوگ شامل ہو گئے تھے لیکن نہ تو خیر زماں کا پتہ چلا اور نہ کسی سے یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اس لئے کسی نے بھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

گل بی بی اور نور جہاں کی آنکھوں سے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ یہ بات ان کو بخوبی معلوم ہو چکی تھی کہ خیر زماں کہیں چلا گیا ہے اور اب خدا جانے' وہ کہاں ہو گا' کب گھر واپس آئے گا............

بابر خیل کے احمد خان کے بیٹے امیر خان کی ڈیرہ امین گل میں آمد کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دونوں گاؤں کے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ برابر آتے جاتے رہتے تھے اور باہمی دوستی کے تعلقات کے علاوہ بعض خاندانوں میں رشتہ داریاں بھی تھیں۔

شمروز خان کا بھتیجا اور احمد خان کا بیٹا امیر خان ڈیرہ امین گل میں اپنے ایک عزیز اشرف کے گھر آیا اور اس نے وہاں آنے کے بعد اشرف علی سے کہا کہ وہ ذرا معلوم کر کے یہ بتائے کہ بخت خان کا بیٹا خیر زماں گاؤں میں موجود ہے یا نہیں۔

"خیر زماں نہیں ہے۔" اشرف علی نے جلدی سے کہا۔ "مگر تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تمہیں اس کے متعلق کچھ معلوم ہے؟"

"مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔" امیر خان نے کہا۔ "میں اس کے متعلق معلوم کرنے ہی یہاں آیا ہوں۔" مجھے بتاؤ کیا وہ گاؤں میں موجود ہے؟"

"نہیں۔" اشرف علی نے اس کو بتایا۔ "وہ گاؤں میں موجود نہیں۔ اس کے گھر والوں کا بیان ہے کہ وہ گزشتہ رات سے غائب ہے اور گھر سے کچھ پیسے اور کپڑے بھی ساتھ لے گیا ہے............ مگر............ تم............"

"اوہ............ تو یہ بات ہے۔" امیر خان ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سخت بے چینی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ یکبارگی سیاہ پڑ گیا تھا اور اس کے نقوش مسخ سے ہو گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" اشرف علی نے چونک کر گھبرا کر پوچھا۔ "تم یہ بات سن کر اتنے پریشان کیوں ہو گئے' کیا تم کو خیر زماں کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

امیر خان نے فوری طور پر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا' وہ خاموشی سے گھر میں ٹہلتا رہا۔ اس کے چہرے پر یکبارگی خشونت برسنے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بہت سخت

غصے میں ہو۔ اشرف علی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم بتاتے کیوں نہیں ہو امیر خان!" اشرف علی نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "آخر کیا بات ہے؟ تم یکبارگی پریشان کیوں ہو گئے ہو؟"

"بات یہ ہے اشرف علی کہ بخت خان کے بیٹے خیر زماں نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ وہ اپنے گھر سے اپنی قبر کھود کر نکلا ہے۔ اب ایک دردناک موت سے اس کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

"ارے............ ارے............ کیا ہو گیا ہے تم کو؟" اشرف علی نے گھبرا کر کہا۔ "کیا تم خیر زماں کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو' مگر کیوں؟ کیا وہی پرانی دشمنی............"

"نہیں اشرف علی!" امیر خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس پرانی دشمنی میں اب نئی دشمنی بھی شامل ہو گئی ہے۔ خیر زماں نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔"

"تمہاری عزت پر!" اشرف علی ایک دم بوکھلا کر بولا۔ "تمہاری عزت کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟"

"تمہارے گاؤں سے گزشتہ رات سے خیر زماں غائب ہے اور ہمارے گاؤں سے میرے چچا شمروز خان کی بیٹی زرینہ غائب ہے۔" امیر خان نے کہا۔ "وہ بھی گذشتہ رات سے ہی غائب ہے۔"

"اوہ............ تو یہ بات ہے!" اشرف علی نے سخت حیرت کے عالم میں کہا۔ "میں نے ان دونوں کے بارے میں کچھ اڑتی اڑتی سی باتیں سنی تو تھیں مگر............"

"خیر زماں کا ماموں دراز گل جو کراچی میں رہتا ہے اور پچھلے دنوں یہاں آیا ہوا تھا زرینہ کے لئے خیر زماں کا پیغام لے کر چچا کے گھر آیا تھا۔" امیر خان نے بتایا۔ "وہ لوگ دشمنی کو ختم کر کے راحت خان کے قتل کا خون بہا دینے کے لئے بھی تیار تھے لیکن میرے چچا نے اس پیغام کو مسترد کر دیا اس کے بعد دراز گل' تمہارے گاؤں کے دو بزرگوں افضل خان اور جہانزیب کو ساتھ لے کر دوبارہ گیا تھا لیکن میرے چچا نے اس بار بھی ان لوگوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ دراز گل نے میرے چچا سے اشارتاً یہ بات بھی کہی تھی کہ زرینہ اور خیر زماں کی بھی مرضی ہے لیکن شمروز خان نے صاف انکار کر دیا تھا۔"

"اچھا تو یہ معاملہ تھا۔" اشرف علی نے جلدی سے کہا۔ "ہم لوگوں کو اس بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں معلوم لیکن اِدھر اُدھر سے کچھ سنا ضرور تھا۔"

"خیر زماں نے ہماری غیرت کو للکارا ہے۔" امیر خان نے کہا۔ "وہ ہمارے خاندان کی لڑکی کو اغوا کر کے لے گیا ہے اب اس کو اس کا نتیجہ بھی بھگتنا پڑے گا۔ کیا ہم اب بھلا اس کو زندہ چھوڑیں گے؟"

"لیکن اس بات کی تصدیق تو نہیں ہوئی ہے کہ زرینہ خیر زماں کے ساتھ ہی گئی ہے۔" اشرف علی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے .... خیر زماں زرینہ کو اغوا کر کے لے گیا ہے؟"

"تصدیق میں اور کیا رکھا ہے؟" امیر خان نے کہا۔ "پورے بابر خیل اور ڈیرہ امین گل میں صرف یہی دونوں افراد ایسے ہیں جو گذشتہ رات سے اپنے اپنے گھروں سے غائب ہیں اور تو کوئی غائب نہیں ہے؟ تو پھر اس میں شک کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟"

"اگر ایسا ہے تو یہ واقعی بڑی معیوب بات ہے۔" اشرف علی نے کہا۔ "اگر خیر زماں نے ایسا کیا ہے تو بہت غلط کیا ہے اس نے اور اس کو اس کی سزا بھی ملنی چاہئے لیکن پہلے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گئے ہیں۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔" امیر خان نے کسی زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ "وہ دونوں جہاں کہیں بھی ہوں گے' ایک ساتھ ہی ہوں گے۔ پتہ چل ہی جائے گا۔"

امیر خان زیادہ دیر نہیں رکا جلد ہی وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے فوراً بعد اشرف علی سیدھا بخت خان کے پاس پہنچا جو اس وقت اپنے گھر پر موجود تھا۔ نواز خان بھی گھر پر تھا۔ اشرف علی نے بخت خان کو امیر خان کی آمد کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ بخت خان سناٹے میں آ گیا۔ جو شبہ اس کے ذہن میں پیدا ہوا تھا وہ بالکل ٹھیک نکلا۔ ایسا ہی ہوا تھا جس کا اس کو خوف تھا اور اب .... اب تو خیر زماں نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کو نہیں بچا سکتی تھی۔ وہ ایک لڑکی کو بھگا کر لے گیا تھا اور اس جرم کی سزا بخت خان اچھی طرح جانتا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے خیر زماں کی خون سے لتھڑی ہوئی لاش پڑی ہوئی تھی' جس میں جا بجا گولیوں کے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ بخت خان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

"تو .... یہ بات ہے..........." بخت خان نے آہستہ سے کہا۔ "ہمیں تو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم اس نے ہم سے تو اپنے اس ارادے کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اگر اس نے اشارتاً بھی ایسی کوئی بات کہی ہوتی تو ہم اس کو ایسا کرنے سے روک لیتے۔"

"لیکن اب تو وہ یہ قدم اٹھا چکا ہے۔" اشرف علی نے کہا۔ "سارے حالات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ وہ زرینہ کو بھگا کر لے گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" بخت خان نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا ہوا ہے تو پھر اس کی ذمہ داری مکمل طور پر ان دونوں پر عائد ہوتی ہے اور پھر وہی ہو گا جو کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔" آخری الفاظ کہتے وقت بخت خان کی آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی تھی۔

اشرف علی ذرا دیر بعد وہاں سے چلا گیا اور ذرا دیر میں ہی سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ خیر زماں بابر خیل کے شمروز خان کی بڑی بیٹی زرینہ کو بھگا لے گیا ہے۔

امیر خان واپس اپنے گاؤں پہنچا تو شمروز خان اور احمد خان سخت بے چینی کے عالم میں اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے اور جیسے ہی امیر خان وہاں پہنچا وہ لوگ اس کی صورت دیکھ کر ہی معاملے کی تہہ کو پہنچ گئے۔ شمروز خان کو تو خاص طور سے اس بات کا پورا یقین تھا کہ خیر زماں ہی اس کی بیٹی کو بھگا کر لے گیا ہے' اس کے علاوہ اور کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی تھی اور اب امیر خان کی جو صورت تھی اس سے سارے سوالوں کے جوابات صاف ظاہر تھے۔

"خیر زماں اپنے گھر پر اپنے گاؤں میں نہیں ہے۔" امیر خان نے اپنے باپ اور چچا کو بتایا۔ "وہ کچھ پیسے اور کچھ کپڑے لے کر گھر سے چلا گیا ہے۔"

"مگر کہاں' کب؟" شمروز خان نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

اس کے ان متعدد سوالوں کے جواب میں امیر خان نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس کو اشرف علی کی زبانی معلوم ہوا تھا۔

"اب تو بات صاف ہو گئی ہے چاچا۔" امیر خان نے شمروز خان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "خیر زماں زرینہ کو اغوا کر کے لئے گیا ہے اس نے ہم سب کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔"

"طمانچہ صرف خیر زماں نے ہی نہیں مارا ہے۔" شمروز خان نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "طمانچہ تو زرینہ نے بھی مارا ہے' دونوں نے مارا ہے اور دونوں کا انجام بھی ایک جیسا ہونا چاہئے۔"

آمنہ نے یہ بات سنی تو اس نے غم و غصے کے عالم میں اپنے سر کے بال نوچ ڈالے اور سینہ پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔

"ارے اس کے ٹکڑے کر ڈالو۔" اس نے زور زور سے روتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔ "اس کے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دو۔ وہ کسی رحم کی مستحق نہیں ہے۔ اس نے ہمارے منہ پر کالک مل دی ہے۔ اس کو بھی مار دو اور خیر زماں کو بھی مار دو۔" وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی اور اپنا سر پیٹ رہی تھی۔

"ایسا ہی ہو گا۔" شمروز خان نے دانت پیس کر کہا۔ "ایسا ہی ہو گا آمنہ .... ایسا ہی ہو گا' اگر وہ دونوں ساتھ گئے ہیں تو زندہ نہیں بچ سکیں گے۔ وہ کبھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔ ہم ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ ان کو زندہ دفن کر دیں گے۔"

تھوڑی دیر میں ہی سارے بابر خیل میں یہ خبر پھیل گئی کہ ڈیرہ امین گل کے بخت خان کا بڑا بیٹا خیر زماں' زرینہ کو بھگا لے گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی سارے گاؤں میں چہ میگوئیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ جن لوگوں کو خیر زماں اور زرینہ کی ملاقاتوں کے بارے میں کچھ تھوڑا بہت علم تھا انہوں نے بڑھا چڑھا کر داستان طرازی شروع کر دی۔ شمروز خان اور اس کے خاندان کے لوگوں کی عزت مٹی میں مل رہی تھی۔ شمروز خان کی بیٹی اپنے عاشق کے ساتھ جس کا تعلق دشمن خاندان سے تھا بھاگ گئی تھی۔

کچھ ہی دیر کے بعد شمروز خان' اس کا بھائی احمد خان اور احمد خان کا بیٹا امیر خان' بابر خیل سے ڈیرہ امین گل روانہ ہو گئے اور سیدھے افضل خان کے گھر پہنچے لیکن وہاں جا کر انہیں معلوم ہوا کہ افضل خان اپنے بیٹے کے ساتھ گاؤں سے باہر گیا ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں سے چند لوگ جہانزیب کے گھر پہنچے۔ جہانزیب نے مہمانوں کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور انہیں عزت کے ساتھ بٹھایا۔ وہ ان کی اچانک آمد پر حیرت زدہ نہیں تھا۔ اس کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ بابر خیل سے شمروز کی بڑی بیٹی زرینہ اور ڈیرہ امین گل کے بخت خان کا بڑا بیٹا خیر زماں گزشتہ رات سے اپنے اپنے گھروں سے غائب ہیں اور جہانزیب تو یہ خبر

سنتے ہی سارے معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کو تو سب کچھ معلوم تھا وہ تو ان لوگوں میں سے تھا جو زرینہ کے لئے خیر زماں کا پیغام لے کر گئے تھے اس کو بہرحال اس خبر سے بہت افسوس ہوا تھا ان دونوں نے اچھا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے صرف اپنے آپ کو ہی نہیں اپنے خاندان والوں کو بھی سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا اور اب احمد خان' شمروز خان اور امیر خان کی اس کے پاس آمد اس بات کی علامت تھی کہ وہ لوگ اس معاملے میں کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"جہانزیب! تم بزرگ ہو۔" احمد خان نے بغیر کسی لمبی چوڑی تمہید کے بات شروع کر دی۔ "اور تم میرے بھائی شمروز خان کے پاس اس کی بیٹی زرینہ کے لئے بخت خان کے بیٹے خیر زماں کا پیغام لے کر آئے تھے۔ تم اس سارے معاملے سے واقف ہو اور تم اب یقیناً اس بات سے بھی واقف ہو گے کہ خیر زماں' زرینہ کو بھگا کر لے گیا ہے۔ یہ خبر تم تک ضرور پہنچ چکی ہو گی۔"

"مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ زرینہ اور خیر زماں دونوں گزشتہ رات سے اپنے اپنے گھروں سے غائب ہیں۔" جہانزیب نے تھم تھم کر سکون کے ساتھ جواب دیا۔

"ہاں یہ صحیح ہے۔" احمد خان نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ زرینہ اکیلی نہیں جا سکتی اور وہ بھی رات کی تاریکی میں۔ ان دونوں کے اکٹھا غائب ہونے کا تو بس ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ خیر زماں زرینہ کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔"

"ہاں۔" جہانزیب نے کہا۔ "لیکن میں اس بات کو ذرا دوسرے انداز میں کہوں گا۔ یعنی یوں کہ زرینہ اور خیر زماں ایک دوسرے کے ساتھ چلے گئے ہیں۔ بہرحال' بات ایک ہی ہے اور اس کام کی سزا بھی ایک ہی ہے اس سے کسی کو بھلا کیا اختلاف ہو سکتا ہے؟؟"

"ہم تمہارے پاس اس لئے آئے ہیں جہانزیب!" احمد خان نے کہا۔ "تم اس گاؤں کے بزرگ ہو ہم تمہاری وساطت سے بخت خان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا بیٹا کہاں گیا ہو گا۔ ویسے تو ہم خود بھی اس کو کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ نکالیں گے لیکن بخت خان کو بھی اس معاملے میں ہماری مدد کرنی چاہئے۔ ہماری اور اس کی خاندانی دشمنی اپنی جگہ لیکن ہم نے کبھی بھی ایک دوسرے کے گھر کی عورتوں کی بے عزتی نہیں کی۔ بخت خان خود بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

"اور میں بھی جانتا ہوں۔" جہانزیب نے کہا۔ "لڑائی اور دشمنی میں عورتوں کو بے

عزت نہیں کیا جاتا۔ اگر خیر زماں زرینہ کو اپنے ساتھ لے گیا ہے تو اس کا یہ جرم ناقابل معافی ہے۔ ان دونوں کو تلاش کیا جانا چاہئے اور پھر انہیں ان کے جرم کی سزا دی جانی چاہئے۔"

"ہم چاہتے ہیں کہ تم بخت خان کو یہاں بلواؤ۔" احمد خان نے کہا۔ "ہم تمہاری موجودگی میں اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ اپنے بیٹے کے اس فعل کا دفاع تو نہیں کر رہا ہے اور یہ کہ آیا اسے ان دونوں کے بارے میں کچھ علم ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" جہانزیب نے کہا۔ "میں بخت خان کو یہاں بلواتا ہوں۔ ہم اس سے بات کریں گے۔" اور اس نے ایک آدمی کو بخت خان کو بلوانے کے لئے بھیج دیا۔

"تم لوگوں نے ان دونوں کی تلاش میں کہیں اِدھر اُدھر آدمی دوڑائے؟" جہانزیب نے ان سے پوچھا۔

"میرے دو آدمی شہر گئے ہوئے ہیں۔" احمد خان نے کہا۔ "میں نے ان کو احتیاطاً صبح کو ہی شہر کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ وہ وہاں ان کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے لیکن میرے خیال میں وہ دونوں اب تک شہر میں نہیں بیٹھے ہوں گے' وہ کہیں اور نکل گئے ہوں گے۔"

"کیا دونوں گاؤں میں کوئی شخص ایسا موجود ہے جس نے ان دونوں کو ایک ساتھ جاتے ہوئے دیکھا ہو؟" جہانزیب نے ان لوگوں سے پوچھا۔ "کوئی ایسا آدمی؟"

"ہمارے علم میں نہیں ہے۔" احمد خان نے کہا۔ "ہم نے اپنے گاؤں میں تو اچھی طرح معلوم کر لیا ہے اور وہاں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے اور امیر خان نے یہاں آ کر بھی اشرف علی سے ملاقات کی تھی اس نے بھی ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔"

"وہ دونوں رات کے اندھیرے میں نکل کر گئے ہوں گے۔" جہانزیب نے کہا۔ "مشکل تھا اس وقت بھلا کون ان کو دیکھ سکتا تھا؟"

تھوڑی دیر کے بعد بخت خان وہاں آ گیا اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا نواز خان بھی تھا۔ ان دونوں نے بابر خیل سے آئے ہوئے اپنے خاندانی دشمنوں کو دیکھا اور ان لوگوں کے درمیان رسمی دعا سلام ہوئی وہ دونوں بھی وہیں بیٹھ گئے۔

"کہو بخت خان! کچھ پتہ چلا خیر زماں کا؟" جہانزیب نے بات چیت کا آغاز کرتے

ہوئے بخت خان سے پوچھا۔

"نہیں۔" بخت خان نے گہری سنجیدگی کے ساتھ بھاری آواز میں جواب دیا۔ "کوئی پتہ نہیں چلا۔ ہم لوگ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ہم نے اس کے دوستوں سے اور گاؤں کے دوسرے بہت سارے لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا لیکن کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ ہم تو اس کی گمشدگی کے معاملے سے بالکل بے خبر ہیں۔"

بخت خان نے زیادہ سوالات سے بچنے کی غرض سے پہلے ہی وہ ساری باتیں کہہ دی تھیں جو کہ پوچھی جا سکتی تھیں۔ وہ اپنے دشمنوں کی موجودگی میں خاصی بے چینی محسوس کر رہا تھا اور جلد از جلد یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگوں کو جو کچھ بھی کہنا ہے وہ جلد از جلد کہہ دیں۔

"بخت خان! بات یہ ہے کہ شمروز خان کی بڑی بیٹی زرینہ بھی گزشتہ رات سے اسی طرح غائب ہے جس طرح خیر زماں غائب ہے۔" جہانزیب نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ "اور کیونکہ حالات ایسے ہیں کہ ان کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چلے گئے ہیں۔ تمہارا بیٹا خیر زماں' زرینہ کو اپنے ساتھ لے گیا اور زرینہ اس کے ساتھ چلی گئی ہے۔ تم کہتے ہو کہ تم کو اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے' ٹھیک ہے نہیں ہو گا مگر اس بات سے تو تم اتفاق کرو گے کہ ایسا ہی ہوا ہے؟"

"اس کی تصدیق تو صرف اس وقت ہو سکے گی جب ان دونوں کا سراغ مل جائے گا۔" بخت خان نے کہا۔ "لیکن معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ یہی ہوا ہے۔"

"تو پھر بخت خان!" اچانک احمد خان نے اس سے براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تم کو اس سے تو اتفاق کرنا چاہئے کہ دونوں سزائے موت کے مستحق ہیں اس معاملے میں ان سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی۔"

"ہاں۔" بخت خان نے آہستہ سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس سے اتفاق ہے اگر وہ دونوں کسی ایک جگہ اکٹھے مل جائیں اور یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ساتھ رہ رہے ہیں تو بے شک ان کو سزا دے دی جائے۔"

"ہم تمہاری زبان سے یہی سننا چاہتے تھے بخت خان!" احمد خان نے کہا۔ "خیر زماں ہمارا مجرم ہے۔ اس نے ہمارے گھر کی عزت پر ڈاکہ ڈالا ہے اور ہم اس کو قتل کریں گے اس کو بھی اور زرینہ کو بھی۔ دونوں کو قتل کر دیں گے۔ ہم انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے'

یہ بات تم کو اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہئے بخت خان۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" بخت خان نے آہستہ سے کہا۔ "اگر خیر زماں نے ایسا کیا ہے تو میں اس کا دفاع نہیں کروں گا۔"

"اور یہ بات بھی واضح رہے کہ خیر زماں کے قتل سے ہماری پرانی دشمنی کا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔" شمروز خان نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "پرانے معاملات تو اپنی جگہ پر جوں کے توں ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔"

جواب میں بخت خان نے زبان سے کچھ نہیں کہا صرف آہستہ سے اپنی گردن ہلا دی۔

"تمہارے خیال میں خیر زماں' زرینہ کو لے کر کہاں گیا ہو گا؟" احمد خان نے بخت خان سے پوچھا۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" بخت خان نے کہا۔ "مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔"

"وہ اپنے ماموں کے پاس کراچی گیا ہو گا۔" شمروز خان نے اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے اچھا ٹھکانہ اس کے لئے اور کوئی نہیں ہو گا۔"

بخت خان کے ذہن میں تو یہ بات پہلے سے موجود تھی لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ "میں کیوں بتاؤں۔" اس نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ "میں کیوں دراز گل کا یا کسی اور کا نام لوں؟ یہ تو ان لوگوں کا کام ہے کہ انہیں تلاش کریں۔ اس تلاش میں ان کی مدد کیوں کروں؟ مجھے کون سا انعام ملے گا میں تو اپنے بیٹے سے بھی ہاتھ دھوؤں گا اور کیا ملے گا مجھ کو؟"

"ہو سکتا ہے.........." بخت خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" احمد خان نے کہا۔ "اب یہ ہمارا کام ہے کہ اس کو تلاش کریں اور ہم اس کو تلاش کر لیں گے وہ اس دنیا میں کہیں بھی ہو گا' ہم اس کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ ہم سے بچ کر کہاں جا سکے گا۔"

"اگر وہ دونوں اکٹھا ہوں گے تو.........."

"وہ اکٹھا ہوں گے۔" احمد خان نے بخت خان کی بات تیزی سے کاٹ دی۔ "اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ وہ دونوں اکٹھا ہی ہوں گے اور ان کی موت بھی اکٹھا ہی واقع ہو

گی۔ ہم تو ان دونوں کو ہی ختم کریں گے۔"

"اب یہ ہمارا حق ہے۔" امیر خان بولا۔ "اور ایسا کرنے سے ہم کو کوئی نہیں روک سکتا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے تیز اور شعلہ بار نگاہوں سے بخت خان کی طرف دیکھا لیکن بخت خان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اس کو کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

"میں اب چلتا ہوں۔" بخت خان نے کہا۔ "میرے خیال میں اب تو میری کوئی ضرورت نہیں ہے یہاں؟ کوئی اور بات تو نہیں کرنی ہے؟"

"نہیں۔" احمد خان نے قدرے نرمی سے کہا۔ "ہمیں جو بات کرنی تھی وہ ہم نے کر لی ہے اور تم کو بتا دیا ہے کہ ہم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" بخت خان نے کہا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ نواز خان بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ جہانزیب ان دونوں کو چھوڑنے کے لئے اپنے گھر کے دروازے تک آیا۔

"جو کچھ ہوا ہے وہ افسوسناک ہے بخت خان!" جہانزیب نے کہا۔ "مگر.......... اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔ ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"ہاں جہانزیب!" بخت خان نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "یہ داغ دیکھنا بھی میری قسمت میں لکھا تھا۔ مجھے اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھونے ہوں گے اور میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔"

بخت خان اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔ راستے میں نواز خان نے اس سے اس معاملے کے بارے میں کچھ بات کرنے کی کوشش کی لیکن بخت خان زیادہ تر خاموش رہا۔ وہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالات کی دردانگیز لہریں اس کے وجود میں ابھر کر اس کو شکست و ریخت سے دوچار کر رہی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے صدمے سے دوچار ہو رہا تھا۔ اصل صدمہ تو ابھی دور تھا لیکن اس کا ظاہر ہونا بہرحال طے ہو چکا تھا۔

خیر زماں اس کا بڑا بیٹا تھا وہ اس کے لئے بہت بڑی دولت کی حیثیت رکھتا تھا۔ باپ کے بعد خیر زماں کو ہی تو اس گھر کا سربراہ بننا تھا۔ اسی کو اس خاندان کی ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں۔ ساری امیدیں اس سے وابستہ تھیں۔

کیا کیا جتن کر کے اس کی پرورش کی تھی اور اس کو پال پوس کے جوان کیا تھا۔ بخت خان نے اور اس کی بیوی گل بی بی نے اس کے آرام کی خاطر راتیں جاگ کر گزاری تھیں اور اپنے بیٹے پر کس کس طرح سے اپنی جان نچھاور کی تھی۔ جب خیر زماں پیدا ہوا تھا تو وہ دونوں میاں بیوی کتنے خوش ہوئے تھے اور انہوں نے یکایک اپنے آپ کو کتنا زیادہ دولت مند محسوس کیا تھا انہیں ایسا لگا تھا جیسے ساری دنیا کی دولت کھنچ کر ان کے قدموں میں آ کر ڈھیر ہو گئی اور پھر آنے والے دنوں کے دوران انہوں نے کس کس طرح سے اپنے خون جگر سے اس بچے کی پرورش کی تھی۔ اپنی ضرورتیں روک کر اس کی ضرورتیں پوری کی تھیں۔ تب سے اب تک کتنے سال گزر چکے تھے اور خیر زماں کے بعد ان کے ہاں دو اولادیں ہوئی تھیں' نواز خان اور نور جہاں' لیکن ایسا نہیں تھا کہ مزید اولادوں کی پیدائش کے بعد خیر زماں کی اہمیت گھٹ گئی ہو یا اس کے لئے ان کے پیار میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہو وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھا اور ہمیشہ ہی رہا۔ اولاد چاہے ایک ہو یا ایک سے زائد اس کی محبت تو والدین کے دل میں کم ہی نہیں ہوتی۔

بخت خان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ شاید اب وہ خیر زماں کو کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ اس کو زندہ نہیں دیکھ سکے گا۔ یہ لوگ اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ کاش .... کاش خیر زماں نے ایک دشمن خاندان کی لڑکی سے محبت نہ کی ہوتی۔

اس کے پاس خیر زماں کو بچانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس بات کا تو اس کو بخوبی اندازہ تھا کہ خیر زماں زرینہ کو لے کر کراچی ہی گیا ہو گا اپنے ماموں دراز گل کے پاس۔ اس کے علاوہ اور تو کوئی جگہ اس کے پاس تھی نہیں جہاں وہ جا سکتا۔

بخت خان گھر پہنچا اور اس نے اپنی بیوی گل بی بی کو بھی اس ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا وہ اس کو تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ جو کچھ ہونے جا رہا تھا اس کے لئے گل بی بی کو بھی تیار رہنا چاہئے تھا۔

گل بی بی اور نور جہاں دونوں زار و قطار رونے لگیں۔

"اس نے تو خود ہی اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالا ہے۔" بخت خان نے کہا۔ "کسی دوسرے کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو گا وہ اس کے اپنے ہی کرتوتوں کا تو پھل ہے۔"

"شمروز خان کی بیٹی نے اس کو ورغلایا۔" گل بی بی نے روتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ

اس کو نہ بھڑکاتی تو وہ بھلا اس کو لے کر کیسے جا سکتا تھا؟ اس نے .... اس نے ہی تو یہ سب کچھ کرنے پر اکسایا ہو گا۔"

"کوئی کسی کو نہیں ورغلا سکتا اور کوئی کسی کو نہیں اکساتا۔" بخت خان نے کہا۔ "خیر زماں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سوچ سمجھ کر اور اپنی مرضی سے کیا ہے۔ اس کے لئے ہم کسی دوسرے کو الزام تو نہیں دے سکتے۔"

"وہ دونوں کراچی ہی گئے ہوں گے۔" گل بی بی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے بھائی دراز گل کے پاس۔ تم .... تم بھائی دراز گل کو خط بھیج دو اور لکھ دو کہ وہ ان دونوں سے کہیں کہ وہ وہاں سے کہیں اور چلے جائیں .... کہیں چھپ جائیں جا کر۔"

"یہ سراسر بے وقوفی کی بات ہے۔" بخت خان نے اس کی تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا۔ "بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ اس سے کیا فائدہ ہو گا؟ کب تک بھاگیں گے؟ یہ کوئی دو چار دن' دو چار ہفتے کا معاملہ تو ہے نہیں یہ تو ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ اس وقت تک کا معاملہ ہے جب تک وہ دونوں زندہ ہیں۔ ان کی زندگیوں کے آخری لمحات تک کا معاملہ ہے وہ اس سے خود کو کیسے بچا سکیں گے؟ شمروز خان کو جب بھی موقع ملے گا وہ ان دونوں کو قتل کروا دے گا۔ چاہے یہ موقع اسے کل مل جائے یا آج سے دس یا بیس سال بعد ملے۔ جب بھی موقع ملے گا وہ ان دونوں کو ختم کروا دے گا اس کی تو عزت بالکل برباد ہو گئی ہے۔ وہ لوگوں میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا ہے۔ وہ بھلا انہیں کیسے معاف کر دے گا؟"

"اس قسم کے معاملات میں معاف نہیں کیا جاتا۔" نواز خان نے اپنی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے اماں! ایسی باتوں میں معافی کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہوتا اور اب تو اگر زرینہ اپنے گھر واپس آنا بھی چاہے تو وہ نہیں آ سکتی۔ کون آنے دے گا اس کو؟ کیا اس کے گھر والے اس کو قبول کر لیں گے؟"

"میں اسی دن کو روتی تھی۔" گل بی بی نے رقت آمیز آواز میں کہا۔ "میں نے سمجھانے کی کتنی کوشش کی تھی کہ زرینہ کا خیال چھوڑ دے۔ کیونکہ وہ دشمن کی بیٹی ہے اور شمروز خان اسے کبھی بھی ہماری بہو بنانے کے لئے تیار نہیں ہو گا۔ مگر اس پر تو جیسے بھوت سوار تھا۔"

"بھوت صرف اس پر ہی نہیں زرینہ پر بھی سوار تھا۔" بخت خان نے آہستہ سے کہا۔ "ان دونوں نے ہی اپنی موت کا سامان کر لیا ہے اور ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔" یہی بخت خان کا فیصلہ تھا۔

اس نے اس سارے معاملے پر اپنی طرف سے کوئی مداخلت نہ کرنے کا اور اسے حالات کے ہاتھوں میں چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ خیر زماں اور زرینہ کراچی میں دراز گل کے گھر میں ہوں یا کہیں اور وہ مسلسل خطرے میں تھے اور ڈھونڈ لئے جانے کی تلوار زندگی کے آخری لمحہ تک ان کے سروں پر لٹک رہی تھی۔ اس تلوار کو کوئی نہیں ہٹا سکتا تھا سوائے موت کے۔ انہیں جب تک جینا تھا اس خوف کے ساتھ ہی جینا تھا اور صرف موت ہی ان کو نجات دلا سکتی تھی۔ شمروز خان کے آدمی ان کو جب بھی' جہاں بھی تلاش کر پائے ان کو ختم کر دیں گے اور تب ہی یہ قصہ ختم ہو سکتا تھا اس سے پہلے نہیں۔

بخت خان جانتا تھا کہ خیر زماں کراچی میں اپنے ماموں کے پاس ہی گیا ہو گا لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنے ماموں کے پاس ہی رہتا ہو۔ وہ کسی دوسری جگہ بھی رہ سکتا تھا اور پھر اس کا تلاش کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ بخت خان نے خود کراچی کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ انسانوں کا ایک موجیں مارتا ہوا سمندر ہے اور اس سمندر میں سے ایک یا دو قطروں کو ڈھونڈ نکالنا ناممکن تھا۔ تاہم کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی ذریعے سے دراز گل یا اس کے جاننے والوں کے ذریعے بھی ان کا پتہ چل سکتا تھا اور شاید کبھی خیر زماں خفیہ طور پر اپنے گھر آنے کی کوشش کرتا۔ اپنے گھر والوں سے ملنے کے لئے کبھی نہ کبھی تو آتا ہی۔ جب تک خیر زماں زندہ تھا زرینہ زندہ تھی' تب تک ان کی تلاش بھی زندہ تھی۔ تب تک ان کی موت بھی زندہ تھی یہی قانون تھا' یہی روایت تھی' یہی تاریخ تھی اور بخت خان ان میں سے کسی بھی چیز کو تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس سارے معاملے میں زیادہ سے زیادہ ایک خاموش تماشائی کا کردار ادا کر سکتا تھا۔

سردی تیز ہو رہی تھی۔ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ موسم زیادہ سرد زیادہ بے رحم اور نامہربان ہوتا جا رہا تھا۔ اول شب کا وقت تھا اور بابر خیل کی گلیوں میں سردی میں لپٹے ہوئے سناٹے کا راج تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو چکے تھے اور بند دروازوں کے پیچھے بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ آج بابر خیل میں سب سے زیادہ دل پسند موضوع شمروز خان کی بیٹی زرینہ کا فرار تھا۔ لوگ اپنے اپنے انداز میں اس پر تبصرہ کر

رہے تھے۔ گاؤں میں زرینہ کی جو سہیلیاں تھیں ان کو اس کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی۔ ان سب کو اس بات کا یقین تھا کہ زرینہ اور اس کے عاشق کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا اور اس علاقے میں تو کبھی دوبارہ واپس آ ہی نہیں سکیں گے۔

بعض نوجوان لڑکیوں کو زرینہ پر رشک آ رہا تھا۔ وہ بڑی ہمت والی لڑکی تھی اور خوش قسمت بھی' کیونکہ اس کو ایسا عاشق ملا تھا جو جان پر کھیل کر اس کو لے اڑا تھا اور اب وہ دونوں زندہ رہیں یا نہ رہیں انہوں نے ایک دوسرے کو پا لیا تھا' اپنی محبت کو کامیاب کر لیا تھا چاہے مختصر سے عرصے کے لئے ہی سہی۔

شمروز خان کے گھر میں اس وقت ایک کمرے میں احمد خان' اس کا بیٹا امیر خان' شمروز خان اور اس کی بیوی آمنہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ فیروزہ ان لوگوں کے پاس نہیں تھی لیکن ان سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں تھی ان لوگوں کے درمیان جو بھی گفتگو ہو رہی تھی فیروزہ اس کو سن سکتی تھی۔

زرینہ اور خیر زماں کی تلاش میں جو لوگ شہر گئے تھے' وہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے واپس آ گئے تھے۔ انہوں نے مقدور بھر ان دونوں کو شہر میں تلاش کرنے کی اور ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

بسوں کے اڈے پر منہ اندھیرے سے ہی مسافروں کی آمد شروع ہو جاتی تھی اور پھر بسیں آنے جانے لگتی تھیں۔ ایسے میں بھلا کس کو یاد رہ سکتا تھا کہ کون سا مسافر مرد یا عورت تنہا یا کسی کے ساتھ ادھر آیا تھا۔ شمروز خان کے بھیجے ہوئے لوگوں نے کافی کوشش کی لیکن انہیں کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ البتہ ایک بات انہیں تقریباً یقینی طور پر معلوم ہو گئی تھی اور یہ کہ وہ دونوں اس شہر میں کہیں موجود نہیں تھے۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔" احمد خان نے کہا۔ "اب ہمیں سوچنا یہ ہے کہ وہ کہاں گئے ہوں گے۔"

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ دونوں صرف کراچی ہی جا سکتے ہیں۔ دراز گل کے پاس۔ وہی ان کو پناہ دے سکتا ہے۔ اگر خیر زماں اکیلا ہوتا تو وہ کہیں بھی جا سکتا تھا لیکن وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ زرینہ بھی ہے اور جب کوئی عورت بھی ساتھ ہو تو آدمی کے لئے معاملات آسان نہیں رہتے پھر اسے پناہ کے لئے کسی ایسی جگہ کی ضرورت ہوتی

ہے جہاں کے لوگوں پر وہ پورا بھروسہ کر سکے اور موجودہ صورت حال میں صرف دراز گل ہی ایک ایسا آدمی ہے جس پر خیر زماں پوری طرح سے بھروسہ کر سکے۔" شمروز خان نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" احمد خان نے اس کے خیال کی تائید کی۔ "ان دونوں کے لئے کراچی پہنچنا کوئی مشکل بھی نہیں ہو گا۔ وہ شہر سے پشاور چلے گئے ہوں گے اور وہاں سے بس کے ذریعے یا ٹرین کے ذریعے کراچی کے لئے روانہ ہو گئے ہوں گے۔"

"یہ بات تو مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ بخت خان کا اور کوئی بھی دور یا قریب کا عزیز اس علاقے سے باہر نہیں ہے سوائے دراز گل کے۔ وہ دونوں جب اس علاقے سے باہر جائیں گے تو سوائے دراز گل کے گھر کے اور کہیں نہیں جا سکتے۔ وہی جگہ ان کا واحد ٹھکانہ ہے۔" شمروز خان نے کہا۔ "اور دراز گل نے ان کو ضرور پناہ دی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔" احمد خان نے کہا۔ "ہم کراچی جا کر دراز گل سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ان دونوں مجرموں کو ہمارے حوالے کر دے۔"

"نہیں احمد خان!" شمروز نے آہستہ سے کہا۔ "ہم کراچی میں ایسا کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ دوسرا ملک ہے وہاں کے قاعدے قوانین بھی دوسرے ہیں۔ ہم کراچی میں اپنے کسی دشمن کو یوں کھلے عام قتل نہیں کر سکتے۔ وہاں تو پولیس پکڑ لیتی ہے اگر دراز گل نے ان دونوں کو ہمارے حوالے کر بھی دیا تو پھر کیا ہو گا؟ کیا ہم ان کو رسیوں سے باندھ کر یہاں لا سکیں گے؟ یا وہاں ان کو کھلے عام گولی مار سکیں گے؟ نہیں احمد خان اگر وہ لوگ ہمارے علاقے میں ہوتے تو سب کچھ ممکن تھا۔ ہم ان سے اپنے قانون کے مطابق نمٹتے اور کسی کو اس پر اعتراض نہ ہوتا لیکن ہم کراچی میں ایسا نہیں کر سکتے۔ وہاں ایسا کرنے کی صورت میں ہم خود پھنس جائیں گے۔"

"چاچا! ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" امیر خان نے کہا۔ "غفور احمد کا بیٹا ظہور احمد پچھلے دس سال سے کراچی میں رہ رہا ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ہی وہ تقریباً ایک مہینہ یہاں رہ کر گیا ہے۔ اس سے مجھے کراچی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا ہے اور ویسے بھی معلوم ہوتا رہتا ہے' سنا ہے وہاں کئی لاکھ پختون رہتے ہیں۔ بڑی بڑی آبادیاں اور بستیاں ہیں پختونوں کی لیکن ان کو وہاں کے قاعدے قانون کے مطابق زندگی گزارنی پڑتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو امیر خان!" شمروز خان نے کہا۔ "وہاں ہمارے لئے یہ سب کچھ

بہت آسان نہیں ہو گا۔ یہاں اپنے علاقے میں تو ہم کھلم کھلا ان کو گولی مار کر ہلاک کر سکتے تھے لیکن کراچی میں یا کسی دوسری جگہ ایسا نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ہمیں کچھ اور سوچنا ہو گا۔"

"اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ اس علاقے میں واپس آئیں گے تو یہ آپ کی بھول ہے۔" امیر خان نے کہا۔ "وہ دونوں اب یہاں نہیں آئیں گے اور انہیں یہاں آنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کراچی میں روٹی' روزگار بہت ہے۔ وہ دونوں بڑے ٹھاٹھ سے وہاں رہ سکتے ہیں۔ اس لئے یہ خیال دل سے نکال دیجئے کہ وہ خود چل کر یہاں آئیں گے اور اپنے آپ کو ہماری بندوقوں کے سامنے لا کھڑا کریں گے۔ ایسا نہیں ہو گا ہمیں خود کراچی جا کر ان کو تلاش کرنا ہو گا اور خاموشی سے ٹھکانے لگانا ہو گا اور یہ کام بڑی ہوشیاری کے ساتھ کرنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔" شمروز خان نے کہا۔ "میں کراچی جاؤں گا اور اپنے ہاتھ سے ان دونوں کو قتل کروں گا۔"

"نہیں چاچا!" امیر خان نے کہا۔ "آپ نہیں جائیں گے' آپ تو وہاں کسی کو جانتے تک نہیں ہیں۔ آپ کے لئے مشکل ہو گا۔ یہ کام تو میں کروں گا۔ ظہور احمد میرا خاص دوست ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ کتنے عرصے سے کراچی میں رہ رہا ہے۔ ہم ظہور احمد پر پورا بھروسہ کر سکتے ہیں۔ وہ ہماری مدد کرے گا۔ ابھی کچھ دنوں پہلے جب وہ یہاں گاؤں میں تھا تو مجھ سے بہت اصرار کر رہا تھا کہ میں کچھ دنوں کے لئے کراچی چلوں اور اس کے ساتھ رہوں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر زندگی رہی تو اگلے سال آؤں گا۔ تو چاچا میں جاؤں گا۔ وہ تو کراچی کے چپے چپے سے واقف ہے۔ کراچی میں رہنے والے بہت سارے پختونوں سے بھی واقف ہے اور وہ دراز گل کا گھر بھی جانتا ہو گا۔"

"دراز گل کے گھر کا پتہ ملنا کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔" شمروز خان نے کہا۔ "ڈیرہ امین گل کے کسی شخص کے ذریعے اس کے کراچی کے گھر کا پتہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"بس تو پھر یہ بات طے ہو گئی چاچا!" امیر خان نے کہا۔ "میں جاؤں گا اور ان دونوں کو ختم کر دوں گا۔"

"بہتر تو یہ ہوتا کہ میں خود ہی جاتا۔" شمروز خان نے کہا۔ "وہ میری بیٹی ہے اور اس

کو سزا دینے کی ذمہ داری بھی میرے ہی اوپر عائد ہوتی ہے۔"

"ہماری اور آپ کی عزت تو مشترکہ ہے چاچا!" امیر خان نے کہا۔ "وہ آپ کی بیٹی ہے تو میری بہن ہے' اس نے اگر آپ کے منہ پر کالک ملی ہے تو میرے منہ پر بھی کالک ملی ہے۔"

"اگر ہمارا کوئی بیٹا ہوتا تو یہ کام وہ کرتا۔" آمنہ نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ "لیکن افسوس کہ خدا نے ہمیں صرف دو بیٹیاں ہی دیں۔ ہماری قسمت.........." اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"میں بھی تو آپ ہی کا بیٹا ہوں چاچی!" امیر خان نے کہا۔ "میری بھی تو کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ چاچا کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں کو سزا میں دوں گا۔ اپنے ہاتھوں سے۔"

"پولیس سے بچ کر کام کرنا ہو گا۔" امیر خان نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "مجھے بس کراچی میں ان دونوں کا ٹھکانہ معلوم ہو جائے اس کے بعد باقی کام تو پوری ہوشیاری کے ساتھ میں کر لوں گا اور واپس گاؤں آ جاؤں گا۔ بس ان دونوں کا پتہ مل جائے مجھ کو۔"

احمد خان خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کی اس تجویز کی نہ حمایت کی تھی اور نہ مخالفت لیکن فی الحقیقت وہ اس کا مخالف تھا۔

احمد خان کے دو بیٹے تھے بڑا بیٹا امیر خان تھا جو اپنے باپ کا "ولی عہد" تھا چھوٹا بیٹا' حبیب خان ابھی صرف دس سال کا تھا۔ چنانچہ امیر خان پر بڑا بیٹا ہونے کے ناطے بہت ساری گھریلو اور خاندانی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں اور احمد خان اس کی جان کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ احمد خان اس کو زندہ' صحت مند اور خوش و خرم دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے جگر کا ایک بیش قیمت ٹکڑا تھا اور وہ کسی بھی صورت اس سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔

اسے امیر خان پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ کیوں اس سراسر خطرناک کام کے لئے اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کر رہا تھا۔ شمروز خان کا معاملہ تھا اور وہ لوگ حتی المقدور اس کی مدد کر رہے تھے اور اگر وہ دونوں مجرم اس علاقے میں موجود ہوتے تو معاملہ بہت آسان تھا احمد خان' امیر خان سے خود ہی کہتا کہ ان کو گولی مار دے لیکن وہ تو یہاں سے سینکڑوں میل دور کراچی میں تھے جیسا کہ خیال کیا جا رہا تھا اور کراچی جا کر ان کو ختم کرنا ایک بڑا خطرناک

کام تھا جس میں جان کا خطرہ بھی موجود تھا اور امیر خان نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈال لیا تھا اور اب چونکہ وہ اپنے چچا اور چچی کے سامنے سب لوگوں کی موجودگی میں از خود یہ ذمہ داری قبول کر چکا تھا تو احمد خان اس کو سب کے سامنے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اس نے دبی زبان سے کچھ دوسرے دلائل کی مدد سے اس تجویز کی مخالفت بھی کی لیکن امیر خان تو جیسے اس کام کو کرنے کے لئے ادھار کھائے بیٹھا تھا۔

امیر خان بے تاب تھا کہ ان دونوں کا کام اپنے ہاتھ سے تمام کرے اور اس کی اصل وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ اس کے خاندان کی عزت کا معاملہ تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ خیر زماں سے شدید نفرت کرتا تھا۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اپنی چچا زاد بہن زرینہ اسے یکبارگی بہت اچھی لگنے لگی تھی۔

ظاہر ہے کہ زرینہ کو بچپن سے جانتا تھا دونوں ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ زرینہ اس سے دو سال چھوٹی تھی اور وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح تھی لیکن پھر یکایک اس کو زرینہ میں ایک خاص کشش محسوس ہونے لگی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ زرینہ ایک دم سے بڑی ہو گئی تھی اور اس کا رنگ روپ یکبارگی نکھر آیا تھا۔ وہ بچی سے ایک دم نوجوان لڑکی بن گئی تھی اس کا قد جیسے کھنچ کر لمبا ہو گیا تھا اور جسم بھر گیا تھا اس کی آنکھوں میں چاند ستاروں کی روشنی اتر آئی تھی اور چہرے پر گلاب کھلنے لگے تھے۔ زرینہ' امیر خان کو اچھی لگنے لگی تھی اور اس کے دل میں اس کے لئے اچانک پسندیدگی پیدا ہو گئی اور چاہت کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زرینہ اور خیر زماں ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے اور ان کے درمیان فروغ پانے والی اس یگانگت اور مفاہمت کا چرچا عام نہیں تھا۔ کسی کو اس بارے میں علم نہیں تھا۔

امیر خان نے زرینہ کی جانب پیش قدمی کرنے کی کوشش کی لیکن زرینہ کی جانب سے اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ زرینہ اس کو اپنا بڑا بھائی سمجھتی تھی اور اس نے ایک سے زائد موقع پر اس پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ اس کو ہمیشہ اپنے بڑے بھائی کے طور پر عزیز رکھے گی۔

پھر ایک دن امیر خان نے ذرا کھل کر اس سے بات کی اور پھر زرینہ نے بھی اس سے کھل کر بات کی۔ اس نے امیر خان سے صاف کہہ دیا کہ وہ زندگی کے سفر میں اس کی

ساتھی نہیں بن سکتی اور یوں امیر خان کو حتمی طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ زرینہ کے دل میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے اور اسے اس بات پر بہت ملال ہوا لیکن ملال سے زیادہ اس کو غصہ تھا اپنے ٹھکرائے جانے کا' اپنی ذلت کا احساس تھا۔ اس کی مردانہ انا بڑی شدت کے ساتھ مجروح ہوئی تھی۔ اس کو تو یقین تھا کہ جب وہ زرینہ کی جانب ملتفت ہو گا اس سے اظہار محبت کرے گا تو زرینہ اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہوئے تیزی سے' دیوانہ وار اس کی جانب کھنچتی چلی آئے گی اور پھر ان دونوں کی شادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔ وہ دونوں سگے بھائیوں کی اولاد تھے' ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی وہ تو بڑی آسانی کے ساتھ ایک ہو سکتے تھے۔ چاچا اور چاچی کو بس اشارہ ملنا چاہئے تھا۔ وہ دونوں تو فوراً ہی اس شادی کے لئے تیار ہو جاتے۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہو سکا تھا امیر خان نے زرینہ کا رویہ دیکھ کر اس بات کو نہ بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ اپنے والدین سے ذکر کرتا تو وہ بڑی خوشی سے اس کے لئے زرینہ کا رشتہ مانگ لیتے لیکن وہ ایسا صرف اس صورت میں کرنا چاہتا تھا جب زرینہ خود بھی اس کے لئے راضی ہوتی۔ زرینہ کی رضامندی کے بغیر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔

تاہم' اس کو یہ کھوج تھی کہ اگر زرینہ نے اس کو مسترد کر دیا ہے تو پھر وہ اور کس کو پسند کرتی ہے۔

اور پھر اس کو معلوم ہو گیا کہ زرینہ کس کو پسند کرتی ہے۔ اس نے زرینہ اور خیر زماں کے بارے میں کچھ اڑتی اڑتی سی باتیں تو ضرور سنی تھیں لیکن اس کو اس کا مکمل طور پر علم اس وقت ہی ہو سکا جب دراز گل' زرینہ کے لئے خیر زماں کا پیغام لے کر شمروز خان کے پاس پہنچا اور اس دن سے امیر خان کے دل میں خیر زماں کے لئے زبردست نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا' خیر زماں اور اس کے خاندان سے نفرت تو اس کو ویسے ہی ورثے میں ملی تھی لیکن اس واقعے کے بعد سے تو اس نفرت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ خیر زماں کا وجود اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا تھا۔

اس انکشاف کے ساتھ ہی کہ خیر زماں اور زرینہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ امیر خان کے دل میں ایک ایسے احساس شکست نے جنم لیا جس کی تہہ میں نہ صرف خیر زماں کے لئے ہی نہیں بلکہ زرینہ کے لئے بھی نفرت کارفرما تھی۔ زرینہ کے لئے اس کے دل

میں جو چاہت موجود تھی اس میں کبھی بھی وارفتگی اور شگفتگی کا عنصر شامل نہیں رہا تھا اور یہ کوئی مر مٹنے والی' خود کو مٹا دینے والی محبت نہیں تھی۔ یہ تو محض پسندیدگی کا ایک سادہ سا جذبہ تھا جو مسترد کر دیئے جانے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ ختم ہو گیا تھا بلکہ اس نے ایک منفی شکل اختیار کر لی تھی۔

زرینہ نے چونکہ اس کو مسترد کر دیا تھا اس لئے امیر خان کے دل میں پھر یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ وہ زرینہ کو اپنی بیوی بنائے اور جب اس کو زرینہ اور خیر زماں کے بارے میں پورے معاملے کا علم ہوا تو اس کے دل میں ان دونوں کے لئے نفرت پیدا ہو گئی اور وہ گہری ہوتی چلی گئی۔ اس نے اپنے والدین سے یا کسی اور سے' ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ وہ زرینہ سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس کی نوبت ہی نہیں آنے پائی۔ زرینہ نے خود ہی سارے معاملے کو ختم کر دیا تھا۔

اور پھر خیر زماں اور زرینہ بھاگ گئے۔ امیر خان کے دل میں ان کے لئے نفرت کا جذبہ اور بھی زیادہ شدید ہو گیا۔ انہوں نے اپنے اپنے خاندانوں کو سرِ بازار رسوا کر دیا تھا اور اپنے گھر والوں کو ذلت اور رسوائی سے دوچار کیا تھا۔

امیر خان کے لئے اس سے زیادہ دل خوش کن اور پُرمسرت بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے۔ اس کے دل میں نفرت اور انتقام کی ایک عجیب و غریب آگ دہک اٹھی تھی اور وہ اس کو ٹھنڈا کر کے اپنے آپ کو تسکین دینا چاہتا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ کراچی جا کر یہ سب کچھ کرنا اس کے لئے بہت خطرناک ہو گا اور اس میں اس کے پکڑے جانے اور سزا پانے کا خدشہ پوری طرح موجود تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ ہوشیاری کے ساتھ کام کرے گا اور اسے ضرور کامیابی حاصل ہو گی۔

"میں کراچی جاؤں گا۔" امیر خان نے اپنے باپ اور چچا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور میں ان دونوں مجرموں کو ٹھکانے لگا کر واپس آ جاؤں گا مجھے پورا یقین ہے کہ میں یہ کام کر لوں گا۔"

"خدا تمہاری مدد کرے' گا بیٹا!" آمنہ نے اس کو سراہتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دونوں بدکار اور گناہگار ہیں اور ایسے گناہگاروں اور بدکاروں کو مار دینے سے خدا بھی تم سے خوش ہو گا۔ تم کو اس کام کا ثواب ملے گا۔"

"ہاں چاچی!" امیر خان نے اس کی شہ پا کر فوراً کہا۔ "میں یہ نیک کام خود کروں گا۔"

"سردیوں کا موسم شروع ہو چکا ہے۔" احمد خان نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "کوئی دن جاتے ہیں کہ سارے راستے وغیرہ بند ہو جائیں گے اور پھر کئی مہینے کے لئے ہمارا علاقہ باقی دنیا سے کٹ کر رہ جائے گا ہمیں نہ تو باہر کی کوئی خبر مل سکے گی اور نہ ہم باہر کوئی خبر بھیج سکیں گے۔ اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ سردی کا موسم نکل جانے دو اور پھر جیسے ہی گرمی کا موسم آئے اور برف پگھلنا شروع ہو ویسے ہی تم اس کام کے لئے کراچی روانہ ہو جانا۔"

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔" کسی اور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شمروز خان بول پڑا۔ اس کو اپنے بھائی کی رائے سے پوری طرح اتفاق تھا۔

لیکن احمد خان نے یہ بات یوں ہی نہیں کہہ دی تھی۔ اس نے ایک خاص مقصد کے تحت ایسا کیا تھا۔ ابھی برف باری شروع نہیں ہوئی تھی اور راستے بند ہونے نہیں شروع ہوئے تھے۔ اگر امیر خان اگلے چند دنوں میں اپنے علاقے سے کراچی کے لئے نکل جاتا تو وہ باآسانی کراچی پہنچ جاتا اور پھر سردی کا پورا موسم وہاں گزار کر اپنا کام پورا کر کے واپس بابر خیل آ سکتا تھا۔ کراچی میں اس کا دوست ظہور احمد تو موجود تھا ہی جو ایک لمبے عرصے کے لئے خوشی سے اس کی میزبانی کر سکتا تھا۔

لیکن احمد خان نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا امیر خان ابھی روانہ ہو جائے۔ اس کی تو دلی خواہش تھی کہ امیر خان کراچی نہ جائے اور اس کام کی ذمہ داری نہ لے۔ وہ اپنے بیٹے کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا اور اس لئے اس نے کچھ وقت لینے کی کوشش کی تھی تاکہ اس دوران شاید کوئی ایسی صورت نکل سکے جس کے باعث امیر خان اپنا ارادہ بدلنے پر تیار ہو جائے۔

"ٹھیک ہے۔" امیر خان نے بھی ان لوگوں کی بات سے اتفاق کیا۔ "اگر آپ لوگ ایسا چاہتے ہیں تو ایسا ہی سہی۔ میں سردیاں ختم ہونے کے بعد چلا جاؤں گا۔"

چنانچہ ان لوگوں کے درمیان یہ بات طے پا گئی کہ موسم سرما کے اختتام پر امیر خان کراچی جائے گا اور وہاں ان دونوں کو تلاش کرنے کے بعد انہیں موت کے گھاٹ اتار دے گا اور خاموشی سے واپس آ جائے گا۔ یہ بھی طے پا گیا کہ اس منصوبے کے بارے میں

کسی کو کچھ نہیں بتایا جائے گا۔

"ہم بھلا ان کو پہلے سے ہوشیار رہنے کا موقع کیوں دیں؟" شمروز خان نے کہا۔ "کسی کو بھی اس بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب وقت آئے گا تو سب لوگوں کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ اگر ان لوگوں کو ہمارے اصل منصوبے کا پہلے سے علم ہو گیا تو وہ غائب بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اس میں ایک فائدہ اور بھی ہے۔" آمنہ نے کہا۔ "جب کچھ دن گزر جائیں گے اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو گی تو وہ یہ سمجھنے لگیں گے کہ وہ پوری طرح سے محفوظ ہیں اور اس طرح وہ اپنی حفاظت کی طرف سے غافل بھی ہو جائیں گے۔ غفلت کے عالم میں ان پر زیادہ آسانی کے ساتھ چھاپہ مارا جا سکتا ہے۔"

فیروزہ اس ساری گفتگو کو اپنے کانوں سے سن رہی تھی لیکن اس نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ صرف خاموشی سے سنتی رہی تھی اور اس کا دل چپکے چپکے خون کے آنسو روتا رہا تھا۔

وہ روتی رہی تھی ان محبت کرنے والوں کے لئے جنہوں نے ایک دوسرے کو بے دریغ، اپنی زندگیوں کا نذرانہ پیش کر دیا تھا۔ جو ایک دوسرے کے لئے مر مٹے تھے اور ہنستے ہنستے موت کے منہ میں جانے کے لئے تیار تھے۔

کاش .... کاش .... اس کے پاس کوئی ایسا طریقہ موجود ہوتا کہ وہ ان کو خبردار کروا سکتی، ان کو اطلاع دے سکتی کہ وہ خطرے میں ہیں۔ ان کے دشمنوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کہاں ہیں اور ان سے کہہ سکتی کہ وہ وہاں سے بھاگ جائیں، دور چلے جائیں۔ کہیں بہت دور چلے جائیں۔ اتنی دور جہاں ان کے دشمنوں کے ہاتھ ان تک نہ پہنچ سکیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنی محبت بھری دنیا کو آباد رکھ سکیں۔

لیکن فیروزہ تو بالکل بے بس تھی۔ اس کے لئے تو کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ تو مکمل طور پر ان پڑھ تھی اور خط بھی نہیں لکھ سکتی تھی۔ ورنہ شاید چپکے سے وہ دراز گل کے پتے پر جو اس کو زبانی یاد تھا انہیں کسی نہ کسی طرح ایک خط بھیج کر اطلاع دے دیتی، وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی سوائے ان کے حق میں دعائے خیر کرنے کے اور اس میں وہ کوتاہی نہیں کرتی تھی۔ اس کی نظریں وہ بالکل بے قصور تھے انہوں نے ایک دوسرے کو چاہا تھا اور ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے یہاں سے چلے گئے تھے۔ جہاں انہیں

ایک ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔

فیروزہ نے اس بات چیت میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا وہ وہاں سے کچھ فاصلے پر موجود رہی تھی اور ان لوگوں کی خونی گفتگو سنتی رہی تھی۔ یہ سب کے سب ان دونوں کے خون کے پیاسے تھے۔ فیروزہ کو ان کی شکلوں سے خوف آتا تھا۔ اپنی ماں اسے اپنی ماں نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ اپنا باپ اسے اپنا باپ نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ یہ بالکل ہی دوسرے انسان بن گئے تھے۔ یہ وہ مہربان اور شفیق والدین نہیں رہے تھے جن پر اولادوں کو ناز کرنا پڑتا ہے۔ یہ تو کوئی بے نام وحشی تھے کہ اپنی اولادوں کو خود ہی چیر پھاڑ کھانا چاہتے تھے۔

اس کے ایک ہفتے کے بعد موسم سرما کی پہلی برف باری ہوئی اور ساری فضا سفید ہو گئی۔ سفید چمکیلی روئی کے گالے ہر طرف اگے ہوئے نظر آ رہے تھے اور دھند میں لپٹے آسمان سے جیسے چاندی برسنے لگی تھی۔

موسم یکبارگی بہت خشک ہو گیا سردی سے رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ دور دور تک چمکیلے رنگ کی حکمرانی قائم ہو چکی تھی۔

”اب کم از کم چند ماہ تک تو وہ دونوں ضرور زندہ رہیں گے۔“ فیروزہ نے دل ہی دل میں کہا۔ ”خدا کرے اس سال سردی کا موسم کچھ زیادہ ہی لمبا ہو جائے اور دیر تک برف جمی رہے۔“

☆======☆======☆

خیر زماں کے ایکسیڈنٹ کو چار ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور اب وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس حد تک ٹھیک تھا کہ وہ اپنے سر میں لگنے والی اس چوٹ کو بالکل بھول گیا تھا۔

خیر زماں خوش اور مطمئن تھا اس کی بیوی زرینہ بھی خوش اور مطمئن تھی۔ دونوں اس بات سے مطمئن تھے کہ ابھی تک ان کے خلاف کسی نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی وہ محفوظ تھے اور اب تو سردیوں کا موسم تھا ان کے علاقے کے تمام راستے بند ہو چکے ہوں گے اور کچھ مہینوں تک بند ہی رہیں گے فی الحال تو وہ محفوظ تھے۔ اس روز خیر زماں حاکم جان کے مکان میں ایک بیوپاری سے رقم وصول کر رہا تھا۔ رقوم کی وصولی کا کام منڈی میں حاکم جان کی دکان میں ہی ہوتا تھا اور حاکم جان کے دفتر میں بھی جو کہ پی آئی بی کالونی کے ایک کوارٹر میں ہی واقع تھا جس میں حاکم جان رہتا تھا۔

رقم خیر زماں کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس کو گن رہا تھا اچانک اس کو یوں لگا جیسے اس کے سر میں کسی نے اندر کی طرف سے زور کا ایک پتھر رسید کر دیا ہو اور سر میں شدید تکلیف شروع ہو گئی تھی کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور اس کے ہاتھ پیر بے قابو ہونے لگے۔ اس پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب رقم چھوٹ کر اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔ بیوپاری نے جلدی سے رقم سنبھالی ایک اور آدمی وہاں موجود تھا۔ اس نے خیر زماں کو سنبھالا' خیر زماں پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی اس کا سر پھٹ کر جیسے ٹکڑوں میں تقسیم ہوا جا رہا تھا۔

حاکم جان اس وقت گھر کے دوسرے کمرے میں تھا اس کو فوراً بلایا گیا اس نے آ کر خیر زماں کی حالت دیکھی تو سخت پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا خیر زماں؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے' کیا ہوا تم کو؟“

”میرا سر .... میرا سر .... پھٹا جا رہا ہے۔“ خیر زماں بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہہ سکا اس پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی اور وہ ٹھیک سے بول بھی نہیں پا رہا تھا۔

ان لوگوں نے جلدی سے اس کو ایک چارپائی پر لٹا دیا اور اسے پانی پلانے کی کوشش کی ایک آدمی جلدی جلدی اس کے سر کی مالش کرنے لگا لیکن خیر زماں کی حالت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اس کی زبان سے الفاظ بھی ٹھیک سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

”اس کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔“ حاکم جان نے وہاں موجود اپنے دوسرے آدمیوں سے کہا۔ یہ تو شام کا وقت تھا اور پی آئی بی کالونی میں اس وقت کئی ڈاکٹر مل سکتے تھے۔ حاکم جان کالونی کے ایک بڑے اور ہوشیار ڈاکٹر سے بخوبی واقف تھا اس کا نام عبدالرشید تھا وہ جلدی سے خیر زماں کو ایک ٹیکسی میں ڈال کر ڈاکٹر عبدالرشید کے پاس لے گیا۔

ڈاکٹر عبدالرشید نے خیر زماں کا تفصیل کے ساتھ معائنہ کیا۔ خیر زماں سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے صرف اتنا بتا سکا کہ اس کے سر میں شدید درد ہے اور اس کی وجہ سے اس کا سارا جسم بے جان ہوا جا رہا ہے۔

”میں دوا دے رہا ہوں۔“ ڈاکٹر عبدالرشید نے حاکم جان سے کہا۔ جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ ”ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے خیر زماں کے ایک انجکشن بھی لگایا اور اس کو دوا لکھ کر دے دی۔ انجکشن لگنے کے بعد خیر زماں کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تھی۔

حاکم جان نے خیر زماں کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ زرینہ کو جب اس کی بیماری کا علم ہوا تو وہ

سخت پریشان ہو گئی لیکن خیر زماں نے اس کو تسلی دی کہ اب وہ ٹھیک ہے۔ بس اچانک کسی وجہ سے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ خیر زماں نے زرینہ کو بتایا۔ "بڑا شدید درد تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سر کے ٹکڑے اڑے جا رہے ہیں اور کوئی اندر ہی اندر سر کو کچل رہا ہے۔ اف خدایا! میری تو جان نکلی جا رہی تھی۔"

"ڈاکٹر.......... ڈاکٹر کیا کہتا تھا؟" زرینہ نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

"ڈاکٹر کہتا تھا کہ ٹھیک ہو جائے گا۔" خیر زماں نے کہا۔ "اس نے انجکشن لگایا تھا اور دوا بھی دی تھی اور تم اتنی زیادہ پریشان مت ہو میں اب ٹھیک ہوں آخر انسان کبھی نہ کبھی بیمار تو ہو ہی جاتا ہے۔"

زرینہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگی۔ خیر زماں کے سر کا درد تو کم ہو گیا تھا لیکن اس کے سر میں دھمک اب بھی ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس میں کافی کمی آ گئی تھی تاہم اس کا سر مکمل طور سے ٹھیک حالت میں نہیں آیا تھا۔

"تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔" زرینہ نے اس سے کہا۔ "تم چائے پی کر آرام کرو۔"

"نہیں۔" خیر زماں نے اس کو روکتے ہوئے کہا۔ "تم میرے لئے چائے مت بناؤ میرا چائے پینے کو بالکل بھی جی نہیں چاہ رہا ہے۔ میں سونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شاید مجھے نیند آ جائے۔" اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

زرینہ کچھ دیر خاموشی سے اس کا سر دباتی رہی اور پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ سو گیا ہے تو آہستہ سے اٹھ کر وہاں سے چلی آئی اور گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

کچھ دیر کے بعد دراز گل اور تاجور آ گئے۔ انہیں خیر زماں کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع مل گئی تھی اور وہ اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے آئے تھے۔

"ابھی کچھ دیر پہلے حاکم جان میرے پاس آیا تھا۔" دراز گل نے کہا۔ "اس نے بتایا کہ خیر زماں کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اور وہ اس کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اب کیسا ہے وہ؟"

"وہ سو رہے ہیں۔" زرینہ نے بتایا۔ "کہہ رہے تھے کہ سر میں بڑے زور کا درد تھا۔" اور وہ ان لوگوں کو خیر زماں کی بیماری کی تفصیل بتانے لگی۔

"دوا نے فائدہ کیا ہے۔" اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "انہیں نیند آ گئی ہے اور وہ سو گئے ہیں۔"

"یہ اچھا ہے۔" تاجور نے کہا۔ "نیند آنے سے سر کا درد کم ہو جائے گا۔"

وہ لوگ کچھ دیر تک وہاں رہے اور اس کے بعد واپس چلے گئے۔ زرینہ نے ان کے منع کرنے کے باوجود ان کے لئے چائے بنائی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔

اگلی صبح تک خیر زماں بالکل ٹھیک تھا اس کے سر میں درد کا نام و نشان تک نہیں تھا اور وہ خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ زرینہ بہت خوش تھی اور وہ خود بھی بہت خوش تھا۔ حاکم جان نے اس کو پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ وہ رات کے وقت منڈی نہ آئے اور آرام کرے اور اگر طبیعت ٹھیک رہے تو صبح کو ذرا دیر کے لئے آ جائے۔

صبح کو اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی اور ناشتہ کرنے کے بعد وہ منڈی چلا گیا۔ منڈی میں گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ خرید و فروخت کا بازار گرم تھا۔ خیر زماں بھی ان کاروباری سرگرمیوں کا ایک حصہ بن کر ان میں ضم ہو گیا۔ شام تک وہ اپنے درد کے بارے میں سب کچھ بھول گیا تھا سر کا وہ شدید درد ایک بھولی بسری بات بن کر رہ گئی تھی اس نے معمول کے مطابق سارے کام انجام دیئے۔

اور اس کے بعد آنے والے دنوں کے دوران بھی اسے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ وہ معمول کے مطابق اپنی سرگرمیاں انجام دیتا رہا اس کا سر بالکل ٹھیک ٹھاک رہا۔

اس واقعے کو بیس دن گزر چکے تھے تقریباً سب ہی لوگ خیر زماں کے سر کے درد کو بھول چکے تھے کہ اچانک اس کو ایک بار پھر سر کے درد کا دورہ پڑا۔

وہ اس وقت منڈی میں تھا اور کچھ مزدوروں کی اجرت کا حساب کتاب کر رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے سر میں پھر وہی تکلیف محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے اندر سے کوئی پتھر سے سر کو کچل رہا ہو۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا اور ہاتھ پیر بے جان ہونے لگے۔ جسم کی طاقت جیسے زائل ہونے لگی اور اس پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔

وہاں موجود لوگوں نے اس کو سنبھالا اور اسے سہارا دیتے ہوئے کچھ دور لے جا کر ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ ایک آدمی اس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا' دوسرے نے آہستہ آہستہ اس کے سر کو سہلانا شروع کر دیا۔

حاکم جان اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ جاننے والوں نے دراز گل کو تلاش کیا لیکن وہ بھی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کو وہیں لٹائے رکھا اور دو تین آدمی اس کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔

خیر زماں کی آنکھیں بند تھیں اور تکلیف کی شدت سے اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو چکی تھی۔ اسے اپنے اردگرد کا بس ہلکا ہلکا احساس تھا۔

کافی دیر تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا اور پھر آہستہ آہستہ خود ہی درد کم ہونا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر میں وہ ختم ہو گیا لیکن اس کے سر کی حالت خراب ہو رہی تھی' درد تو نہیں تھا لیکن اس کو بہت چکر آ رہے تھے اور ساتھ ہی سر میں دھمک بھی ہو رہی تھی۔

اس دوران حاکم جان آ گیا اور اسے خیر زماں کی بیماری کی اطلاع ملی۔ وہ خود ہی اس جگہ پہنچا جہاں خیر زماں لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت تک خیر زماں کے سر کا درد تو ختم ہو گیا تھا لیکن سر ٹھیک نہیں تھا اور وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

حاکم جان نے اس کو گھر بھیج دیا وہ خود اس کے ساتھ نہیں جا رہا تھا کیونکہ اس کو بہت سارے ضروری کام کرنے تھے اس نے خیر زماں کو سامان ڈھونے والے ایک سائیکل رکشہ میں بٹھا کر اس کے گھر پہنچا دیا۔

خیر زماں نے زرینہ سے اپنی حالت چھپانے کی کوشش کی لیکن وہ پوری طرح سے چھپا نہیں سکا۔ نقاہت اس کے چہرے سے ظاہر تھی جسے وہ چھپا نہیں سکا تھا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے زرینہ سے کہا۔ "بس' ذرا سر میں درد ہو گیا تھا اور اب ٹھیک ہوں درد ختم ہو گیا ہے۔"

"ویسا ہی درد تھا جیسا کہ پہلے اٹھا تھا؟" زرینہ نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں' تھا تو ویسا ہی۔" خیر زماں نے کہا۔ "لیکن یہ درد بغیر کسی دوا کے ختم بھی ہو گیا۔ اب تو بس سر میں دھمک باقی ہے اور ذرا چکر آ رہے ہیں۔ ذرا دیر میں یہ سب کچھ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر............ ایسا کیوں ہوتا ہے؟" زرینہ نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ غور سے اپنے شوہر کی شکل دیکھ رہی تھی اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

"میں شام کو ڈاکٹر عبدالرشید کے پاس جاؤں گا۔" خیر زماں نے کہا۔ "اس کی دوا سے مجھ کو فائدہ ہوا تھا۔ میں اس کو درد کے بارے میں بتاؤں گا۔"

حاکم جان اس دن بہت مصروف تھا اور رات سے پہلے وہ خیر زماں کے پاس نہیں آ سکا۔ البتہ دراز گل سہ پہر کو آ گیا تھا اسے خیر زماں کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں کسی سے معلوم

ہوا تھا اور پھر وہ خیر زماں کو لے کر ڈاکٹر عبدالرشید کے پاس گیا۔

ڈاکٹر عبدالرشید نے پچھلی بار جو نسخہ لکھا تھا اسے خیر زماں نے بہت سنبھال کر رکھا تھا اس نے وہ نسخہ ڈاکٹر کو دکھا دیا۔ ڈاکٹر عبدالرشید نے اس کو پہچان لیا۔

"مجھے دوبارہ ویسا ہی درد ہوا ڈاکٹر صاحب!" خیر زماں نے سنبھل سنبھل کر اردو میں اس سے بات کرنی شروع کر دی۔

"اچھا؟" ڈاکٹر نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "چلو دیکھتے ہیں۔" اور وہ اس کے تفصیلی معائنے میں مصروف ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس سے اس کی تکلیف کے بارے میں تفصیلات بھی پوچھتا جاتا تھا اور خیر زماں اس کو سب کچھ بتا رہا تھا۔

"اچھا بھئی دراز گل!" ڈاکٹر عبدالرشید نے جو دراز گل کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ دراز گل سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اب ایسا کرو کہ خیر زماں کے سر کا ایک ایکسرے نکلوا لو۔ میں لکھ کر دیتا ہوں۔ ایکسرے نکل آئے تو پھر مجھے علاج میں آسانی ہو جائے گی۔ ویسے بھی دوا تو دے رہا ہوں۔ ان شاء اللہ اس سے بھی فائدہ ہو گا۔"

"ایکسرے؟" دراز گل چونک پڑا سر کے درد کا بھلا ایکسرے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ وہ ڈاکٹر عبدالرشید پر بھروسہ کرتا تھا اور پھر ڈاکٹر تو ڈاکٹر ہی ہوتا ہے وہ زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے کہ کیا کرنا چاہئے۔

خیر زماں کے لئے بھی ایکسرے وغیرہ اب نامانوس چیز نہیں رہی تھی۔ وہ جب تک اپنے گاؤں میں تھا ان ساری چیزوں سے یکسر ناواقف تھا۔ اس نے تو ان کے نام بھی نہیں سنے تھے لیکن یہاں آ کر عباسی شہید ہسپتال میں چند روز داخل رہنے کے دوران اس نے برسوں کا فاصلہ دنوں میں طے کر لیا تھا اور وہ ان بہت ساری چیزوں کے بارے میں جان گیا تھا۔

"ہاں دراز گل ایکسرے۔" ڈاکٹر عبدالرشید نے پرچہ لکھ کر اس کو دیتے ہوئے کہا۔ "کل ہی کروا لو اور پھر ایکسرے اور رپورٹ لے کر میرے پاس دوبارہ آ جاؤ میں اس وقت مریض کا دوبارہ معائنہ کروں گا۔ فی الحال یہ دوا جاری رکھو۔" اس نے دوا کا پرچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اگلے دن دراز گل نے خیر زماں کو اپنے بیٹے شہزاد کے ساتھ ایکسرے کے لئے بھیج دیا۔ خیر زماں کے سر کا ایکسرے ہو گیا۔

"کل میں رپورٹ لے آؤں گا۔" واپسی پر شہزاد نے خیر زماں سے کہا۔ "پھر تم ڈاکٹر عبدالرشید کو دکھا لینا۔ بابا نے کہا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ جائیں گے۔"

"معلوم نہیں .... یہ درد کیوں ہوتا ہے۔" خیر زماں نے فکرمندی کے ساتھ کہا۔

"پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا' پہلے تو میرے سر میں کبھی معمولی سا بھی درد نہیں ہوا اور اب .... اب تو ایسا درد ہوتا ہے کہ میری جان نکل جاتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے سر کے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہو جاؤ گے۔" شہزاد نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر عبدالرشید بہت ہوشیار آدمی ہے۔ برسوں سے ہمارے گھر کے سارے لوگوں کا علاج وہی کرتا ہے۔ ہم سب لوگ اس سے علاج کرواتے ہیں اور وہ ہم سب لوگوں کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہے۔ بہت اچھا اور ہوشیار ڈاکٹر ہے۔"

زرینہ اس ساری صورت حال سے خاصی پریشان تھی۔ ایکسرے اسے کوئی بڑی خوفناک اور قیامت خیز قسم کی شے معلوم ہو رہی تھی۔ خدا جانے خیر زماں کے سر میں کیا ہو گیا تھا جو بار بار اس طرح درد اٹھتا تھا۔ اگر وہ گاؤں میں ہوتی تو اس کو ساتھ لے کر شاہ نورالدین کے مزار پر جاتی جو اس علاقہ کا سب سے زیادہ مشہور و معروف مزار تھا اور ایک بہت بلند پہاڑی پر واقع تھا جہاں دور دور سے لوگ آتے تھے اور اپنے دل کی مرادیں پاتے تھے۔ زرینہ خود بھی وہاں کئی بار جا چکی تھی۔ پچھلی بار جب اپنی ماں کے ساتھ وہاں گئی تھی تو اس نے مزار کی جالی پکڑ کر خاموشی اور رازداری کے ساتھ یہ دعا کی تھی کہ وہ اور خیر زماں ایک ہو جائیں اور اس کی یہ دعا قبول ہو گئی تھی۔ وہ اور خیر زماں ایک ہو گئے تھے' وہ بہت خوش تھی۔

لیکن اب شاہ نورالدین کا مزار محض ایک خواب و خیال بن کر رہ گیا تھا کہ نہ وہ وہاں جا سکتی تھی۔ نہ ہی مزار پر دعا مانگ سکتی تھی۔ وہ کراچی میں تھی اور کراچی والوں کے لئے کراچی میں ہی کئی مزار موجود تھے۔

اس نے کراچی میں عبداللہ شاہ غازی کا مزار دیکھا تھا اس کے اور خیر زماں کے کراچی آنے کے بعد چند ہی دن کے بعد سب لوگ کلفٹن گئے تھے جہاں انہوں نے سمندر کی سیر کی تھی اور عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر بھی گئے تھے۔ وہاں بہت بھیڑ تھی۔ سینکڑوں' ہزاروں کا مجمع تھا اور مامی نے بتایا تھا کہ اس مزار پر ہمیشہ ایسا ہی رش ہوتا ہے۔

"میں خیر زماں کے ساتھ عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر جاؤں گی۔" اس نے دل میں سوچا۔ "شاہ نورالدین کا مزار نہ سہی' عبداللہ شاہ غازی کا مزار سہی۔ وہ سب اللہ والے لوگ ہی تو ہوں گے۔"

خیر زماں کو دراز گل اپنے ساتھ ڈاکٹر عبدالرشید کے پاس دوبارہ لے گیا۔ اس بار ایکسرے بھی ان کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر عبدالرشید نے پہلے تو رپورٹ دیکھی اور پھر وہ ایکسرے کو دیکھنے لگا۔ اس نے ایکسرے کو ٹیوب لائٹ پر لگا دیا تھا جس سے وہ پوری طرح روشن ہو گیا تھا اور وہ ایسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی کی لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "میں نے ایکسرے تو دیکھ لیا ہے اور تم اب ایسا کرو دراز گل کہ خیر زماں کو دماغ کے ماہر ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ یہ ایکسرے ساتھ میں لے جانا میں ڈاکٹر کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔"

"دماغ کے ڈاکٹر کے پاس؟" دراز گل نے چونک کر کہا۔ "لیکن ڈاکٹر صاحب اس کا دماغ تو بالکل ٹھیک ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے؟" ڈاکٹر عبدالرشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر ہے اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہے لیکن یہ بار بار جو سر میں درد اٹھتا ہے اس کی وجہ معلوم کرنا ضروری ہے۔ صحیح علاج تب ہی ہو سکے گا جب اصل وجہ معلوم ہو جائے گی اور وہ وجہ دماغ کا ڈاکٹر ہی معلوم کرے گا۔"

"اور وہی علاج بھی کرے گا؟" دراز گل نے پریشانی کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں۔" ڈاکٹر عبدالرشید نے جواب دیا۔ "وہی علاج بھی کرے گا لیکن اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب! میں تو چاہتا تھا کہ آپ ہی اس کا علاج کرتے۔" دراز گل نے کہا۔ "آپ کو تو ہمارا سارا خاندان جانتا ہے اور آپ ہم سب لوگوں کو جانتے ہیں۔ دوسرا ڈاکٹر.........."

"میں خط لکھ کر دوں گا۔" ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ڈاکٹر بھی بہت اچھی طرح علاج کرے گا اور ان شاء اللہ ساری تکلیف دور ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! جیسی آپ کی مرضی۔" دراز گل نے کہا۔ "میں اس کو اسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔"

ڈاکٹر عبدالرشید نے ایک معروف نیوروجسٹ کے نام جس سے اس کے ذاتی مراسم بھی تھے ایک خط لکھ دیا جس میں مرض کے متعلق اپنی رائے کا بھی اشارتاً اظہار کر دیا۔

"یہ خط لے کر ڈاکٹر عرفان علی کے پاس چلے جاؤ۔" اس نے ڈاکٹر کا نام اور اس کا پتہ بتاتے ہوئے دراز گل سے کہا۔ "پھر جیسا بھی وہ کہیں ویسا ہی کرو ہو سکتا ہے وہ مزید ایکسرے

نکلوانے کے لئے یا ٹیسٹ کروانے کے لئے کہیں تو تم ان کی ہدایات پر پوری طرح سے عمل کرنا اور مجھ کو بتاتے رہنا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب!" دراز گل نے کہا اور وہ خیر زماں کو اپنے ساتھ لے کر اس کے گھر واپس آ گیا جہاں زرینہ ان دونوں کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

"کیا ہوا ماما!" اس نے براہ راست دراز گل سے سوال کیا۔ "ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟"

"ڈاکٹر مجھے ایک دوسرے ڈاکٹر کے پاس بھیج رہا ہے۔" خیر زماں نے معاملے کو مزاح کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہوئے ایک پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

لیکن زرینہ اس کی اس ہنسی میں شریک نہیں ہوئی' وہ اس مزاح سے لطف اندوز ہونے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھی۔ اس کا چہرہ ایک دم اتر گیا اور آنکھیں جیسے بجھنے لگیں۔

"کیا مطلب؟" اس نے کہا۔ "دوسرے ڈاکٹر کے پاس' مگر کیوں؟ کیا وہ خود علاج نہیں کرنا چاہتا؟"

"ایسی بات نہیں ہے بیٹا!" دراز گل نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "وہ خود بھی علاج کر سکتا ہے لیکن وہ خیر زماں کو ایک ایسے خاص ڈاکٹر کے پاس بھیج رہا ہے جو سر سے متعلق ساری تکالیف کے علاج کا ماہر ہے' وہ زیادہ بہتر طور پر خیر زماں کا علاج کر سکتا ہے؟"

بات ٹھیک سے کچھ زرینہ کی سمجھ میں نہیں آئی وہ تو بس اتنا ہی سمجھ سکی کہ ڈاکٹر عبدالرشید خیر زماں کو اپنے بجائے کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس اس لئے بھیج رہا ہے کہ وہ خود اس کا علاج نہیں کر سکتا اور یہ بات خاصی تشویشناک تھی آخر وہ اس کا علاج کیوں نہیں کر سکتا تھا؟

"میں کل خیر زماں کو اپنے ساتھ ڈاکٹر عرفان علی کے پاس لے جاؤں گا۔" دراز گل نے کہا۔ "ان شاء اللہ اس کے علاج سے اس کو فائدہ ہو گا۔"

"میرے سر کا درد ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے ماما!" خیر زماں نے تشویش کے ساتھ کہا۔ "اگر یہ درد اسی طرح ہوتا رہا تو میں کوئی کام نہیں کر سکوں گا۔"

دو روز پہلے اٹھنے والے درد کے بعد سے خیر زماں فی الحقیقت کافی پریشان ہو گیا تھا۔ پہلی بار جب اس کے سر میں درد اٹھا تھا تو اس وقت اس کے ہاتھ میں بھاری رقم تھی جو وہ حاکم جان کی طرف سے ایک بیوپاری سے وصول کر رہا تھا اس وقت بھی اس پر درد کی شدت کے باعث نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ رقم اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی تھی

اور وہ کوشش کے باوجود اسے سنبھال نہیں سکا تھا۔ وہ تو اس بیوپاری نے اور وہاں موجود لوگوں نے رقم سنبھال لی تھی اگر کوئی سنبھالنے والا نہیں ہوتا اور وہ رقم کوئی شخص وہاں سے اڑا لے جاتا تو؟ اس کے دماغ میں یہ خیال بار بار ابھر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل کانپ کر رہ جاتا۔ واقعی اگر کوئی اور شخص اس رقم کو لے جاتا تو کیا حشر ہوتا؟ وہ رقم تو کسی کی امانت تھی وہ اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کا بندوبست کہاں سے کر پاتا؟

ادھر کچھ دنوں کے بعد یہ درد پھر اس کے سر میں اٹھا تھا' اس وقت اگرچہ اس کے ہاتھ میں پیسے وغیرہ تو نہیں تھے لیکن وہ کاروباری مصروفیات میں ہی الجھا ہوا تھا۔ پیسے بھی ہو سکتے تھے کیونکہ پیسوں کا لین دین بھی وہ خود ہی کرتا تھا تو پھر کیا ہوتا؟ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ آدمی اگر ایسے بیمار ہو جائے اسے بخار ہو جائے' پیٹ میں درد ہو جائے یا کوئی اور تکلیف ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ ان ساری تکالیف کا آدمی کو پہلے سے احساس اور علم ہونے لگتا ہے اور وہ ان سے نمٹنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے لیکن یہ اچانک' بالکل ہی اچانک بیٹھے بٹھائے درد کی شدت سے سر کا پھٹنے لگنا یہ تو بڑی ہی خطرناک بات تھی۔

"تمہارے سر کا درد ٹھیک ہو جائے گا؟" دراز گل کی آواز سن کر وہ اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ "پریشان مت ہو' ڈاکٹر عبدالرشید بہت ہوشیار آدمی ہے اور وہ جو کچھ بھی کرے گا سوچ سمجھ کر کرے گا اور اس سے فائدہ ہی پہنچے گا۔"

"ماما! ہمیں کسی مزار پر بھی جانا چاہئے۔" زرینہ نے کہا۔ "وہاں گاؤں میں تو شاہ نورالدین کا مزار ہے' ہم لوگ مرادوں کے پورا ہونے کی دعائیں مانگنے کے لئے اسی مزار پر جایا کرتے تھے یہاں کراچی میں بھی ضرور مزار ہوں گے۔ وہ .... عبداللہ شاہ غازی کا مزار ہے نا؟"

"ہاں ہے۔" دراز گل نے سرسری انداز میں کہا۔ "چلیں گے' کسی وقت چلیں گے۔ ابھی تو اس کو ڈاکٹر عرفان علی کے پاس لے جانے کی ضرورت ہے جس کے نام ڈاکٹر عبدالرشید نے خط دیا ہے۔"

زرینہ خاموش ہو گئی۔ ماما دراز گل نے اس معاملے میں کسی خاص گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا جس سے زرینہ کو خاصی مایوسی بھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس بارے میں مامی سے بات کرے گی اور ان سے کہے گی کہ اسے اور خیر زماں کو لے کر مزار پر چلیں۔

دراز گل کچھ دیر تک وہاں رکا رہا پھر چلا گیا اس کے جانے کے کچھ دیر بعد شازیہ وہاں آ گئی۔ وہ زرینہ کو پڑھانے کے لئے آئی تھی۔

"کیسی ہو زرینہ!" اس نے زرینہ کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔ خیر زماں اس وقت دوسرے کمرے میں تھا اس آدھے کوارٹر میں دو بالکل چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے' تھوڑا سا صحن تھا' چھوٹا سا برآمدہ اور کچن باتھ روم وغیرہ۔

زرینہ نے اپنی شکستہ اردو میں اس کو یہ بتایا کہ خیر زماں کی طبیعت خراب ہے اور اب ڈاکٹر عبدالرشید اسے کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس بھیج رہا ہے۔

"دماغ کے ڈاکٹر کے پاس باجی' دماغ کے ڈاکٹر کے پاس۔" زرینہ نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ "وہ خود علاج کیوں نہیں کرتا' معلوم نہیں؟"

شازیہ نے اس کو سمجھانا شروع کیا کہ آج کل کے دور میں کس طرح جسم کے الگ الگ حصوں کی الگ الگ بیماریوں کے لئے الگ الگ ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ جو اپنے اپنے میدان کے ماہر ہوتے ہیں اور ان بیماریوں کا علاج دوسرے ڈاکٹروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ زرینہ بڑی توجہ کے ساتھ شازیہ کی باتیں سن کر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جسم میں اگر ہڈی ٹوٹ جاتی ہے تو پھر ہڈیوں کا ڈاکٹر اس کا علاج کرتا ہے۔" شازیہ نے اس کو سمجھایا۔ "کوئی دوسرا ڈاکٹر زیادہ بہتر طور پر یہ کام نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر آدمی کو دل کی بیماری ہے تو پھر دل کا ماہر ڈاکٹر اس کا علاج کرے گا اور یہی صورت دوسری بیماریوں کے ساتھ ہے۔ تم پریشان مت ہو۔"

کراچی آنے کے بعد زرینہ پر ایسی ایسی چیزوں کا انکشاف ہو رہا تھا جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھیں جن کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے اپنے گاؤں میں تو کوئی ڈسپنسری تک نہیں تھی۔ کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ بیماریوں کا علاج گھریلو ٹوٹکوں سے ہوتا تھا یا گنڈے تعویذوں اور مزاروں پر حاضری سے۔ کبھی کبھار کوئی شخص علاج کے لئے قریبی شہر چلا جاتا تھا جہاں ڈاکٹر موجود تھا۔

اور یہاں .... یہاں کراچی میں .... شازیہ اس کو بتا رہی تھی کہ جسم کے ہر حصے کی بیماری کا ڈاکٹر الگ الگ ہوتا ہے۔ بڑی عجیب سی بات تھی جو بمشکل اس کی سمجھ میں آ سکی تھی۔

دو دن کے بعد دراز گل خیر زماں کو اپنے ساتھ لے کر ڈاکٹر عرفان علی کے پاس گیا۔ ڈاکٹر عرفان علی ایک بڑے ہسپتال میں بیٹھتا تھا۔ دراز گل اس کو وہیں لے گیا۔

ڈاکٹر عرفان علی نے ڈاکٹر عبدالرشید کا دیا ہوا خط پڑھا اور پھر اسے اپنے پاس دراز میں رکھ

لیا۔ "ایکسرے کہاں ہے؟" اس نے ایکسرے طلب کیا اور دراز گل نے جلدی سے ایکسرے اور ڈاکٹر عبدالرشید کے نسخے وغیرہ اس کے حوالے کر دیئے۔

ایکسرے دیکھنے سے پہلے ڈاکٹر عرفان علی نے خیر زماں سے اس کی تکلیف کے بارے میں تفصیل سے پوچھا اور خیر زماں اس بتانے لگا۔ اردو میں روانی نہ ہونے کے باعث دراز گل بار بار مداخلت کر کے وضاحت کر دیتا تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر عرفان علی نے ایکسرے دیکھا اس نے ایکسرے کو لائٹ پر رکھا اور اسے غور سے دیکھ رہا تھا' وہ کافی دیر تک اس کو غور سے دیکھتا رہا۔

"تم نے بتایا تھا کہ یہ درد تمہارے سر میں دوسری بار ہوا ہے۔" ڈاکٹر عرفان علی نے اس سے پوچھا۔ "ایک ماہ سے کچھ کم عرصے میں دوسری بار۔"

"جی ہاں۔" خیر زماں نے جواب دیا۔

"اس سے پہلے' یاد کرو اس سے پہلے کبھی تمہیں اس قسم کا درد ہوا تھا؟ بچپن میں' لڑکپن میں۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب کبھی نہیں۔" خیر زماں نے جواب دیا۔

"اچھا .... اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے سر میں کبھی کوئی چوٹ لگی تھی؟ کبھی تم گر پڑے ہو یا کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہو یا ایسی ہی کوئی اور بات؟"

خیر زماں کے دماغ کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ ڈاکٹر عرفان علی کے اس سوال کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں چند ماہ پیشتر پیش آنے والے واقعے کی ساری یادیں تازہ ہو گئیں۔ جب منڈی میں اس کے سر کے اوپر پھلوں سے بھری ہوئی ایک بھاری پیٹی گر پڑی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا' اس کے بعد اس کو کئی دن تک ہسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

"جی ہاں .... جی ہاں ڈاکٹر صاحب!" اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "میرے سر میں چوٹ لگی تھی۔"

"کب لگی تھی اور کیسے لگی تھی؟" ڈاکٹر عرفان نے پوچھا اور خیر زماں اس کو تفصیلات بتانے لگا۔ جیسے ہی وہ الفاظ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتا تو فوراً دراز گل اس کی مدد کرتا۔

ڈاکٹر عرفان علی بڑے غور سے اس کی بات سن رہا تھا اور اس کے ماتھے پر گہری لکیریں نمودار ہو رہی تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب وہ چوٹ تو ٹھیک ہو گئی تھی۔" خیر زماں کی بات ختم ہوتے ہی دراز

گل نے ڈاکٹر عرفان علی سے کہا۔ ”اس کے بعد تو خیر زماں واپس آ گیا تھا اور ہسپتال کے ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔“

”جو یہ درد بار بار ہو رہا ہے یہ اسی چوٹ کا نتیجہ ہے۔“ ڈاکٹر عرفان علی نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ”اس تکلیف کا توجہ سے علاج کروانا ہو گا ورنہ اس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ میں ایک ٹیسٹ لکھ کر دے رہا ہوں‘ یہ کافی مہنگا ٹیسٹ ہے لیکن یہ کروانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر صحیح علاج شروع کرنا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس ٹیسٹ کا جو نتیجہ آئے گا اس کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔“

”اچھا۔“ دراز گل ایک دم سٹپٹا گیا۔ ”کیا کوئی .... بڑی اندرونی خرابی ہے ڈاکٹر صاحب!؟“

”خرابی تو ہے۔“ ڈاکٹر عرفان علی نے کہا۔ ”اور وہ ایکسرے سے ظاہر ہے لیکن اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ ٹیسٹ کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا اور اس کے بعد ہی صحیح علاج تجویز کیا جا سکے گا۔“

”اس ٹیسٹ پر کتنا پیسہ خرچ ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب!؟“

”تقریباً پانچ ہزار روپے۔“ ڈاکٹر عرفان نے باری باری ان دونوں کے چہروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”پانچ ہزار روپے..........!“ خیر زماں کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ”اتنی بڑی رقم؟“

”ہاں۔“ ڈاکٹر عرفان علی نے کہا۔ ”یہ بہت مہنگا ٹیسٹ ہے مگر یہ تمہارے علاج کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بغیر علاج نہیں ہو سکے گا۔ میں تم کو لکھ کر دے رہا ہوں‘ اس ہسپتال میں یہ ٹیسٹ ہو جائے گا۔“

ڈاکٹر عرفان علی نے ٹیسٹ لکھ کر دے دیا۔ ”جتنی جلد ممکن ہو سکے یہ ٹیسٹ کروا لو اور پھر اس کی رپورٹ لے کر میرے پاس آنا۔“ اس نے ان دونوں سے کہا۔ ”اس کے بعد ہی علاج شروع ہو گا۔ فی الحال میں ایک دوا لکھ دیتا ہوں اسے صرف اس وقت استعمال کرنا جب درد ہو۔ اگر درد نہ ہو تو اس کو استعمال نہ کرنا۔“ اور اس نے ایک اور نسخہ لکھ کر دے دیا۔

وہ دونوں جب ڈاکٹر کے کمرے سے نکلے تو خیر زماں کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ علاج پر اتنا زیادہ پیسہ بھی خرچ

ہو جاتا ہے۔ اس کے گاؤں میں تو ڈاکٹری علاج ہوتا ہی نہیں تھا اور وہاں کے لوگ اس کے بارے میں بہت کم جانتے تھے اور یہاں کراچی میں وہ چند روز کے لئے عباسی شہید ہسپتال میں رہا تھا جو کہ ایک سرکاری ہسپتال تھا اور جہاں صرف بازار سے خریدی جانے والی دواؤں وغیرہ کا خرچہ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ایکسرے‘ ٹیسٹ اور ہسپتال میں رہنے وغیرہ کے اخراجات ادا نہیں کرنے پڑے تھے لیکن اس ڈاکٹر نے تو ایک ٹیسٹ کی اتنی بڑی رقم بتائی تھی تقریباً پانچ ہزار روپے‘ خیر زماں کا تو دل دہل گیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں پچھلے چند ماہ کے دوران خیر زماں نے اچھے خاصے پیسے کمائے تھے۔ حاکم جان اس کو اچھی تنخواہ دے رہا تھا‘ کیونکہ وہ خیر زماں پر پورا بھروسہ کرتا تھا اور خیر زماں نے مکان کا کرایہ اور دیگر ضروری اخراجات کے بعد کچھ رقم پس انداز بھی کر لی تھی اور اس کے پاس اتنے پیسے تھے کہ وہ اس ٹیسٹ پر پانچ ہزار روپے خرچ کر سکتا تھا لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوتا؟

ابھی تو علاج شروع ہوا تھا‘ خدا جانے علاج پر کتنا خرچہ آئے گا اور وہ خود کام کرنے کے قابل ہو یا نہیں۔ خدا جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں اضطراب‘ مایوسی اور تشویش کی لہریں دوڑ رہی تھیں‘ اس نے تو اتنے بڑے خرچے کا سوچا بھی نہیں تھا۔

”ڈاکٹر عبدالرشید کو بھی نسخہ دکھا لیں گے۔“ دراز گل نے خیر زماں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو ایک طرح سے ہمارا اپنا آدمی ہے‘ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔“

”اور اگر اس نے بھی یہی کہا تو؟“ خیر زماں کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

”تو .... پھر یہ ٹیسٹ کروانا پڑے گا۔“ دراز گل نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ”اور جب کوئی ڈاکٹر ایک بات کہتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کی بات کو مانا جائے۔“

خیر زماں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اپنے خیالات میں گم تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر اس ٹیسٹ کے لئے اس نے پانچ ہزار روپے خرچ کر دیئے تو پھر اس کی اب تک کی بچت میں سے کتنے پیسے باقی بچیں گے اور آئندہ کی ضرورتوں کی تکمیل کی کیا صورت ہو گی۔

وہ دونوں ہسپتال سے سیدھے ڈاکٹر عبدالرشید کے پاس پہنچ گئے‘ وہ اس وقت اپنے

مطب میں آ چکا تھا۔ دراز گل نے اس کو پوری بات بتائی اور ڈاکٹر عرفان علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ دکھایا۔

ڈاکٹر عبدالرشید نے نسخے پر ایک سرسری نظر ڈالی اور اسے دراز گل کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ وہ یہی لکھیں گے۔ انہیں یہی ٹیسٹ کروانا چاہئے تھا۔ انہوں نے ٹھیک لکھا ہے۔ تم یہ ٹیسٹ کروا لو اور رپورٹ لے کر ان کے پاس جاؤ۔ پھر دیکھو کہ وہ کیا بتاتے ہیں۔"

مہنگے ٹیسٹ پر تعجب صرف خیر زماں کو تھا' دراز گل کو نہیں تھا۔ دراز گل تو عرصہ دراز سے کراچی میں رہ رہا تھا اور علاج معالجے سے بخوبی واقف تھا۔ ابھی دو سال پہلے ہی اس کی بیوی تاجور کا ایک چھوٹا آپریشن ہوا تھا اور اس آپریشن پر تقریباً آٹھ ہزار روپے کا خرچہ آیا تھا جبکہ وہ صرف دو دن ہسپتال میں رہی تھی۔ دراز گل کے لئے آٹھ ہزار روپے کی رقم کوئی بڑی رقم نہیں تھی کیونکہ وہ کاروبار سے بہت اچھے پیسے کما رہا تھا لیکن خیر زماں کے لئے پانچ ہزار روپے کی رقم بہت بڑی تھی اور دراز گل اس بات سے بخوبی واقف تھا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب!" دراز گل نے کہا۔ "پھر یہ ٹیسٹ کروائے لیتے ہیں۔ یا اگر آپ کوئی دوسرا علاج تجویز کرتے ہیں تو.........."

"نہیں دراز گل!" ڈاکٹر عبدالرشید نے سختی کے ساتھ کہا۔ "میں کوئی دوسرا علاج تجویز نہیں کروں گا اور ساتھ ہی میں تم کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے علاج کے لئے اِدھر اُدھر مت بھاگنا۔ کوئی دوسرا علاج موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر عرفان نے جو کچھ کہا ہے وہی ٹھیک ہے۔ اگر اِدھر اُدھر دوسرے علاج کے چکر میں بھاگتے پھرو گے تو وقت ضائع کرو گے اور نقصان اٹھاؤ گے۔ الٹے سیدھے مشورے دینے والے لوگ بہت مل جاتے ہیں۔"

"ہم لوگ تو ہمیشہ سے آپ ہی کی بات مانتے چلے آئے ہیں' ڈاکٹر صاحب!" دراز گل نے کہا۔ "جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہم کریں گے۔"

"پھر یہ ٹیسٹ کروا لو۔" ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا۔

"اچھی بات ہے ڈاکٹر صاحب!" دراز گل نے کہا اور وہ دونوں وہاں سے چلے آئے۔

"تم پیسے کی فکر مت کرنا خیر زماں!" دراز گل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "بالکل فکر نہ کرنا۔ ابھی میں موجود ہوں اور جب تک میں

موجود ہوں تب تک تم کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میرے پاس پیسے ہیں ماما!" خیر زماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی اتنے تو ہیں کہ میں.........."

"انہیں سنبھال کر رکھو۔" دراز گل نے کہا۔ "ابھی تو دوا علاج کے لئے اور بھی پیسوں کی ضرورت پڑے گی' انہیں بعد میں خرچ کرنا۔"

"نہیں ماما!" خیر زماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کے پہلے ہی مجھ پر کیا کم احسانات ہیں' میں تو آپ کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں۔ میرے اس بوجھ میں اور زیادہ اضافہ نہ کیجئے۔"

"پاگل کہیں گا۔" دراز گل نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "کون سا احسان ہے میرا تمہارے اوپر؟ ارے اپنے ہی تو اپنوں کے کام آتے ہیں۔"

دراز گل اس کے ساتھ اس کے گھر آ گیا جہاں زرینہ بے تابی کے ساتھ اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

دراز گل کے چہرے پر تو ایک مصنوعی اور پھیکی مسکراہٹ نظر آ رہی تھی لیکن خیر زماں کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔

"ڈاکٹر عرفان نے ایک ٹیسٹ کروانے کے لئے کہا ہے۔" دراز گل زرینہ کو تفصیلات بتانے لگا۔

"اوہ .... تو اس چوٹ کو تو کافی دن گزر گئے ہیں۔" زرینہ نے ساری بات سننے کے بعد پریشانی کے ساتھ کہا۔ ابھی اس کو خرچ کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔ "تو کیا اس کا اثر اب تک باقی ہے؟"

"ہاں بیٹی!" دراز گل نے کہا۔ "ڈاکٹر عرفان علی کا کہنا تو یہی ہے اس نے تو خاص طور سے یہ بات پوچھی تھی کہ سر میں کبھی چوٹ تو نہیں لگی تھی اور وہ کہتا ہے کہ یہ درد اسی چوٹ کا نتیجہ ہے۔"

"لیکن .... چوٹ تو ٹھیک ہو گئی تھی ماما!" زرینہ نے الجھتے ہوئے کہا۔ "پھر .... یہ سب کیوں؟"

"ڈاکٹروں کی باتیں ڈاکٹر ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں بیٹی۔" دراز گل نے کہا۔ "شاید .... اندر کوئی نہ کوئی کسر رہ گئی ہو گی۔"

لیکن زرینہ کو ڈاکٹروں پر اتنا بھروسہ نہیں تھا جتنا کہ دراز گل کو کراچی میں رہتے ہوئے تقریباً ربع صدی کے قیام کے دوران ہو گیا تھا۔ زرینہ نے تو کراچی آنے کے بعد پہلی بار کسی ڈاکٹر کو دیکھا تھا۔

"کاش .... کاش میں گاؤں جا سکتی۔" اس نے بڑی حسرت اور گہری آرزومندی کے ساتھ سوچا۔ "اگر میں گاؤں جا سکتی تو خود شاہ نورالدین کے مزار پر جا کر دعا مانگتی، منت مانگتی اور میرا خیر زماں ضرور اچھا ہو جاتا۔ مزار کے مجاور سے پڑھا ہوا پانی لیتی، وہ خیر زماں کو پلاتی تعویذ لیتی وہ اس کے گلے میں ڈالتی مگر........... یہ سب ممکن نہیں ہے۔ گاؤں تو مجھ سے بہت دور ہے اور میں اب وہاں جا بھی نہیں سکتی .... لیکن کوئی دوسرا مزار..........."

اس نے دراز گل سے مزار پر جانے کی بات نہیں کی۔ وہ پہلے اس سے یہ بات کہہ چکی تھی لیکن دراز گل نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی اس نے سوچا کہ وہ ماں سے اب ضرور اس بارے میں بات کرے گی۔

"اس ٹیسٹ کا خرچہ پانچ ہزار روپے ہو گا۔" خیر زماں نے آہستہ سے کہا اور زرینہ یوں اچھل پڑی جیسے اسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"پانچ ہزار روپے؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ "اتنا خرچہ؟ مگر .... کیوں؟"

"مہنگا ٹیسٹ ہے بیٹا۔" دراز گل نے نرمی سے کہا۔ "لیکن تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے خیر زماں سے کہہ دیا ہے یہ رقم میں دوں گا۔"

"یہ .... یہ تو .... کافی بڑی رقم ہے ماما۔" زرینہ نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ "آپ..........."

"اس بات کو یہیں ختم کرو۔" دراز گل نے اس موضوع کو منقطع کرتے ہوئے کہا۔ "بس خدا سے دعا کرو کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک نکلے۔"

"اگر ہم لوگ خیر زماں کو کسی مزار پر لے جائیں تو وہ ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔" زرینہ نے دل میں سوچا۔ "اتنی بڑی رقم خرچ کرنے کی ضرورت بھی نہیں پیش آئے گی۔" لیکن اس نے یہ بات دراز گل سے نہیں کہی اس کے بجائے دراز گل کی بیوی تاجور سے کہی جو رات کو خیر زماں کی طبیعت پوچھنے کے لئے اس کے گھر آئی تھی تاجور کے

ساتھ شہزاد اور دراز گل بھی آئے تھے۔

"مزار پر بھی لے جائیں گے۔" تاجور نے قدرے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن علاج کروانا بہت ضروری ہے۔ دعا کے ساتھ ساتھ دوا کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔"

زرینہ کو اس کے جواب سے بھی مایوسی ہوئی۔ تاہم، اس نے پوچھا۔ "تو پھر مزار پر لے کر چلیں گی نا مامی؟ وہاں پیر صاحب سے کوئی تعویذ وغیرہ..........."

"ہاں چلیں گے کسی دن۔" تاجور نے کہا۔ "پہلے یہ ٹیسٹ وغیرہ ہو جائے پھر چلیں گے۔" اس نے کوئی خاص دن نہیں بتایا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔

خیر زماں کے سر میں اب درد نہیں تھا اور وہ اپنا کام کر رہا تھا۔ حاکم جان نے اس سے ساری تفصیلات پوچھ لی تھیں اور خیر زماں نے اس کو بتایا تھا کہ ڈاکٹر عرفان علی نے اس کو ایک ٹیسٹ لکھ کر دیا ہے جس پر تقریباً پانچ ہزار روپے خرچ آئے گا۔

حاکم جان نے اس پر کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا اور نہ ہی اس کی مالی مدد کا وعدہ کیا۔

"ہاں .... علاج تو بہت مہنگا ہے بھائی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "آدمی کو اپنی صحت کے لئے بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔"

حاکم جان ایک کاروباری آدمی تھا اور خیر زماں کی اہمیت اس کے لئے محض اس وجہ سے تھی کہ وہ اس کے کاروبار میں مدد و معاون ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ایک قابل اعتبار شخص تھا اور حاکم جان روپے پیسے کے معاملے میں اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتا تھا۔ دوسرے تمام معاملات میں بھی وہ مکمل طور پر قابل اعتماد تھا اور اس لئے حاکم جان اس کو تقریباً دوگنی تنخواہ دے رہا تھا۔ اسے تو اس سے آدھی تنخواہ میں آدمی مل سکتا تھا لیکن مکمل اعتماد اور بھروسہ تو نہیں مل سکتا تھا لیکن خیر زماں کی اچانک بیماری نے تو سارا کام خراب کر کے رکھ دیا تھا۔

ایسا ملازم خواہ وہ ہیرا ہی کیوں نہ ہو اس وقت مالک کے لئے پتھر بن جاتا ہے جب اس کو کام کے دوران ایسے دورے پڑنے لگیں جن کے نتیجے میں سارے کام کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو اور خیر زماں کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہونے لگا تھا۔

پہلے دورے تک تو بات کسی حد تک ٹھیک تھی۔ کسی وجہ سے اتفاق سے پڑ گیا ہو گا اور دوا علاج سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا لیکن جب ایک ماہ سے بھی کم مدت کے

دوران خیر زماں پر سر کے درد کا دوسرا دورہ پڑا تو حاکم جان کو تشویش لاحق ہونے لگی۔ اس تشویش کا تعلق جتنا خیر زماں کی بیماری سے تھا اس سے زیادہ اپنے کاروباری مفادات سے تھا۔ اگر اس کو اسی طرح سر درد کے دورے پڑتے رہے تو بڑی مشکل ہو گی اس کا کام تو بہت ذمہ داری کا تھا۔ بیوپاریوں کے ساتھ لین دین کرنا' ان سے رقم لینا' رقم دینا' مزدوری وغیرہ کا حساب کرنا اور دوسرے بہت سارے کام کرنا۔ ان سارے کاموں کے لئے ذہن کا حاضر رہنا دماغ کا ہر قسم کی تکلیف سے پاک رہنا ضروری تھا اگر ایک ذمہ دار آدمی پر کام کے دوران اس قسم کے دورے پڑتے رہیں تو پھر اس کو ذمہ داری والے کام تو نہیں سونپے جا سکتے۔

چنانچہ دوسرے دورے کے بعد ہی حاکم جان محتاط ہو گیا تھا اس نے اب "انتظار کرنے اور دیکھنے" کی حکمت عملی کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دیکھنا تھا کہ ڈاکٹر لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور علاج کا کیا نتیجہ نکلتا ہے وہ اس معاملے میں اپنی طرف سے اب کسی غیر معمولی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں کسی اور متبادل کی تلاش میں بھی اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ اسے تو کاروبار کرنا تھا اور پیسہ کمانا تھا اگر خیر زماں اس کے کام کا نہیں رہا تھا تو وہ کیوں اس کو اپنے سر پر بٹھائے رکھتا؟

خیر زماں اور زرینہ کے منع کرنے کے باوجود ٹیسٹ کے پیسے دراز گل نے ہی دیئے۔

"چلو قرض سمجھ کر رکھ لو۔" دراز گل نے آخر میں ان لوگوں سے کہا۔ "ابھی تو کام چلنے دو بعد میں جب تمہارے پاس اپنی ضرورت سے فاضل ہوں تو تب مجھے واپس کر دینا۔"

ٹیسٹ بہت دیر کا بڑی ہی عجیب و غریب نوعیت تھا۔ بڑی حیران کن قسم کی مشین تھی اور بڑا ہی عجیب و غریب قسم کا تجربہ تھا۔ عجیب و غریب بھی اور طویل بھی۔ خیر زماں تو پریشان ہو گیا تھا۔ بالآخر خدا خدا کر کے اس طویل اور صبر آزما عمل سے نجات ملی۔ ٹیسٹ ختم ہوا اور خیر زماں نے سکون کا سانس لیا۔

"دو دن بعد آ کر رپورٹ لے جانا۔" اس کو بتایا گیا اور وہ اور شہزاد کمرے سے باہر آ گئے۔ اس ٹیسٹ کے لئے شہزاد اس کے ساتھ ہسپتال آیا تھا۔ ٹیسٹ اسی ہسپتال میں ہوا تھا جس میں ڈاکٹر عرفان علی بیٹھتا تھا۔

"یہ بہت ہی جدید قسم کا اور مہنگا ٹیسٹ ہے۔" شہزاد اس کو بتا رہا تھا۔ "اور کراچی

میں بھی یہ ہر ہسپتال میں نہیں ہوتا صرف چند ہی بڑے ہسپتالوں میں ہوتا ہے اور یہ ہسپتال ان میں سے ایک ہے۔"

"اچھا؟" خیر زماں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس ٹیسٹ کے ذریعے کیا معلوم کریں گے؟"

"شاید سر کی اندرونی حالت .... دماغ کی حالت۔" میٹرک کے طالب علم شہزاد نے جواب دیا۔

"لیکن ڈاکٹر عبدالرشید نے تو ایکسرے نکلوایا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اس سے سر کی اندرونی حالت کا پتہ چل جائے گا۔"

"یہ ایکسرے سے مختلف کوئی چیز ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "شاید ایکسرے سے زیادہ اہم.........."

شہزاد اس کو اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکا۔

خیر زماں گھر واپس آ گیا شہزاد بھی کچھ دیر کے لئے اس کے گھر رکا پھر وہ اپنے گھر چلا گیا۔

خیر زماں نے زرینہ کو ٹیسٹ کی ساری تفصیلات بتائیں اور زرینہ اس طرح حیرت اور بے یقینی کے عالم میں اس کی باتوں کو سنتی رہی جیسے وہ کوئی پریوں کی کہانی سن رہی ہو۔ خیر زماں جس عجیب و غریب اور انوکھے تجربے سے گزرا تھا اس میں وہ زرینہ کو بھی شریک کر رہا تھا اور زرینہ بڑی خوشی سے خود کو اس منفرد تجربے میں شریک کر رہی تھی۔

"رپورٹ تو اب دو دن کے بعد ملے گی اور پھر رپورٹ لے کر ڈاکٹر عرفان علی کے پاس جانا ہو گا۔" خیر زماں نے زرینہ سے کہا۔ "پھر ڈاکٹر علاج شروع کرے گا۔ دیکھو دواؤں پر کتنا خرچہ آتا ہے۔"

"میں نے مامی سے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر ان سے کہوں گی۔" زرینہ نے کہا۔

"ہمیں کسی پیر فقیر کے پاس کسی مزار پر بھی تو جانا چاہئے' خالی دواؤں سے کیا ہو گا؟ کوئی تعویذ کوئی عمل' کوئی پڑھا ہوا پانی.........."

"میں نے بھی ماما سے ایک دن کہا تھا۔" خیر زماں نے کہا۔ "لیکن انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔"

"میں شازیہ باجی سے کہوں گی۔" زرینہ نے سرگوشی میں کہا۔ "وہ تو بہت ہی اچھی

ہیں اور ہمارا بہت خیال رکھتی ہیں۔ مجھے تو وہ مفت میں پڑھا رہی ہیں اور اب تک میں نے اچھا خاصا پڑھ لیا ہے۔"

"شازیہ باجی کو میری بیماری کے بارے میں تو علم ہو گا؟" خیر زماں نے پوچھا۔ "تم نے ان کو بتایا تو ہو گا؟"

"ہاں' کیوں نہیں۔" زرینہ نے کہا۔ "شازیہ باجی اور صفیہ خالہ دونوں کو معلوم ہے اور وہ دونوں تم کو پوچھتی رہتی ہیں۔ میں نے ان کو بتایا تھا کہ تمہارا ہسپتال میں کوئی بہت مہنگا ٹیسٹ ہونے والا ہے۔ اب جب رپورٹ آ جائے گی اور ڈاکٹر علاج بتائے گا تو پھر میں ان کے ساتھ کسی مزار پر ضرور جاؤں گی۔ حیرت کی بات ہے یہاں کے لوگ بیماریوں کا علاج کرنے کے لئے مزاروں پر پیروں فقیروں کے پاس جاتے ہی نہیں ہیں جسے دیکھو بس ڈاکٹر کے پاس بھاگا چلا جاتا ہے۔"

"ہر جگہ کے اپنے اپنے طریقے ہوتے ہیں زرینہ۔" خیر زماں نے آہستہ سے کہا اور اس کے کچھ دیر بعد وہ حاکم جان کے پاس چلا گیا۔

حاکم جان نے اس سے ٹیسٹ کے بارے میں سرسری طور پر پوچھا اور پھر اس کو وہ کئی کام بتا دیئے جو صبح سے رکھے ہوئے تھے۔ کیونکہ خیر زماں تو کام پر آنے کے بجائے ہسپتال چلا گیا تھا جہاں اس کو کئی گھنٹے لگ گئے تھے۔

"رپورٹ دو دن کے بعد ملے گی۔" خیر زماں نے خود ہی حاکم جان کو بتایا۔ "وہ رپورٹ لے کر ڈاکٹر عرفان علی کے پاس جانا ہے اور پھر وہ بتائے گا کہ کون سی دوا لینی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" حاکم جان نے کہا۔ "ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشان مت ہو اور ہاں ذرا منشی سے اللہ بخش زمیندار کا حساب تو معلوم کرو۔" اور اس کے ساتھ ہی کبھی نہ ختم ہونے والے کام کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دو دن کے بعد خیر زماں شہزاد کے ساتھ ہسپتال گیا اور وہ لوگ وہاں سے رپورٹ لے آئے اس نے تو کہا تھا کہ وہ اکیلا ہی جا کر رپورٹ لے آئے گا لیکن دراز گل نے شہزاد کو خاص طور سے اس کے ساتھ بھیجا تھا کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ خیر زماں تو لفافے پر لکھے ہوئے نام کو پڑھ بھی نہیں سکتا تھا۔

رپورٹ انہیں مل گئی اور خیر زماں گھر آ گیا اس وقت شازیہ' زرینہ کے پاس موجود

تھی اور زرینہ اس کو اپنے شوہر کی بیماری اور علاج کے بارے میں تفصیلات بتانے کے بعد اس سے یہ درخواست کر رہی تھی کہ وہ اس کو اپنے ساتھ کسی مزار پر لے چلے۔

"اصل میں بات یہ ہے زرینہ میں خود کبھی کسی مزار وغیرہ پر نہیں گئی ہوں اس لئے مجھے ان چیزوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے' بہرحال تم کہتی ہو تو دیکھوں گی کسی سے معلوم کروں گی۔" شازیہ نے قدرے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "ویسے خیر زماں کو اپنے علاج کی طرف سے غفلت بالکل نہیں برتنی چاہئے۔ یہ سر کے درد کے دوروں والی کیفیت اچھی چیز نہیں ہے۔"

زرینہ نے اس کو بتایا کہ خیر زماں اپنے علاج میں کوئی کوتاہی نہیں برت رہا ہے اور اس وقت وہ اپنی رپورٹ لینے کے لئے ہسپتال گیا ہوا ہے۔

اس وقت خیر زماں گھر آ گیا۔

"رپورٹ لے آئے خیر زماں!" شازیہ نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اس سے پوچھا۔

"جی باجی۔" خیر زماں نے فوراً کہا۔ "لے آیا ہوں۔"

"لاؤ دکھاؤ۔" شازیہ نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لیا اور اس کو دیکھنے لگی۔

"اچھا تو تمہارے سر کا ایم آر آئی ہوا تھا۔" اس نے جیسے خود سے باتیں کرتے ہوئے کہا اور رپورٹ دیکھنے لگی کچھ دیر تک وہ ان کو غور سے دیکھتی اور رپورٹ پڑھتی رہی اور پھر اس نے ساری چیزوں کو واپس لفافے میں رکھ دیا۔

"تفصیل سے تو ڈاکٹر ہی بتا سکے گا۔" اس نے فلموں اور رپورٹ کو واپس لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہارے سر کے اندر کوئی خرابی ضرور موجود ہے جس کے لئے علاج کی ضرورت ہے۔"

"کیا خرابی ہے باجی؟" خیر زماں نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ نہیں سمجھ سکتی کیونکہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔" شازیہ نے کہا۔ "لیکن بس تھوڑا بہت اندازہ لگا سکتی ہوں کہ کوئی معمولی سی خرابی ہے۔"

"بہت پیسہ خرچ ہو گیا باجی۔" خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔ "اس ٹیسٹ کا پانچ ہزار روپے لیا ان لوگوں نے۔"

"ہاں خیر زماں یہ مہنگا ٹیسٹ ہے۔" شازیہ نے کہا۔ "لیکن اس کے ذریعے اصل

تکلیف کا آسانی سے پتہ چل جاتا ہے۔ اب ڈاکٹر تمہارا علاج آسانی سے کر سکیں گے۔"

"باجی' آپ کی دعا چاہئے مجھ کو۔" خیر زماں نے کہا۔ "میرے لئے دعا کیجئے۔"

"ضرور کروں گی۔" شازیہ نے کہا۔ "اور تم پریشان مت ہو ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے اور تمہیں اس درد سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔"

اس شام خیر زماں دراز گل کے ساتھ ڈاکٹر عبدالرشید کے پاس گیا اور انہوں نے وہ رپورٹ ڈاکٹر عبدالرشید کو دکھائی وہ بڑی دیر تک غور اور توجہ کے ساتھ ساری چیزوں کو دیکھتا رہا اس نے رپورٹ کو بھی اچھی طرح سے پڑھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر پیدا کئے بغیر کہا۔ "اب ڈاکٹر عرفان علی کو دکھالینا۔ پھر جیسا وہ بتائیں............"

"اس میں کیا لکھا ہے ڈاکٹر صاحب؟" دراز گل نے اس سے پوچھا۔ "سر کے اندر کیا ہے؟"

"سر کے اندر کچھ خرابی ہے۔" ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا۔ "اب اس کو دور کرنے کا طریقہ کیا ہو گا' یہ بات تم کو ڈاکٹر عرفان ہی بتا سکیں گے۔ تم جلدی سے جا کر ان کو رپورٹ دکھا دو۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔" دراز گل نے کہا۔ "آپ کی بہت بہت مہربانی ڈاکٹر صاحب۔ بہت شکریہ آپ کا' آپ ہم لوگوں کا کتنا خیال کرتے ہیں۔"

"ارے بھئی' اگر ڈاکٹر اپنے مریضوں کا خیال نہیں کرے گا تو پھر کون ان کا خیال کرے گا؟" ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا۔ "ویسے تم اس بات کا خیال رکھنا ڈاکٹر عرفان علی نے جو دوا لکھی ہے اس کا ناغہ مت ہونے دینا اور برابر کھلاتے رہنا۔"

"وہ تو یہ برابر کھا رہا ہے ڈاکٹر صاحب۔" دراز گل نے خیر زماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ اس نے نہیں چھوڑی ہے۔"

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔" خیر زماں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میں دوا کھا رہا ہوں۔"

دراز گل اور خیر زماں وہاں سے چلے آئے دراز گل تو اپنے گھر چلا گیا اور خیر زماں رپورٹ کا لفافہ گھر پر احتیاط کے ساتھ رکھنے کے بعد حاکم جان کے پاس چلا گیا۔ جہاں وہ کافی رات گئے تک کام کرتا رہا اس نے خود ہی حاکم جان کو بتایا کہ وہ ہسپتال سے اپنی

رپورٹ لے آیا ہے اور پرسوں اسے لے کر ڈاکٹر عرفان علی کے پاس جانا ہے۔

"اچھا .... چلو ٹھیک ہے۔" حاکم جان نے سرسری انداز میں کہا۔ "اب دیکھو ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔"

"میں نے ماما کے ساتھ جا کر ڈاکٹر عبدالرشید کو رپورٹ دکھائی تھی۔" خیر زماں نے کہا۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ سر کے اندر کوئی معمولی خرابی ہے جس کو دور کرنے کا طریقہ ڈاکٹر عرفان علی ہی بتا سکے گا۔"

"بس درد بند ہونا چاہئے۔" حاکم جان نے کہا۔ "درد ہونے سے سارا کام خراب ہو جاتا ہے۔ آدمی کے سر میں اچانک درد اٹھ کھڑا ہو اور کوئی کام کرنے کے قابل نہ رہے تو یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔"

"ہاں ...." خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔ اس کو تو حاکم جان سے زیادہ اس بات کا احساس تھا اور وہ دن رات خدا سے دعا مانگتا رہتا تھا کہ اس کو سر کا درد نہ اٹھے اور اگر اٹھے تو ایسے وقت میں جب وہ گھر پر ہو اور آرام کر رہا ہو۔ کام کے دوران بالکل ٹھیک ٹھاک رہے۔ یہ ضروری تھا۔

اس کے سر میں اگر ہلکی سی بھی کسی وجہ سے ذرا سی سرسراہٹ ہی ہوتی تو وہ ایک دم چونک جاتا اور ذرا چوکس اور مستعد ہو جاتا جو کام اس کے ہاتھ میں ہوتا اس کو چھوڑ دیتا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا لیکن یہ لمحاتی کیفیت جلد ہی ختم ہو جاتی اور وہ خود کو بالکل ٹھیک ٹھاک محسوس کرنے لگتا۔

دو دن کے بعد اس کو ڈاکٹر عرفان علی کے پاس جانا تھا۔ زرینہ بہت چاہتی تھی کہ ڈاکٹر عرفان علی کے پاس جانے سے پہلے وہ اسے کسی مزار پر لے جا سکے لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ تاجور نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اور خیر زماں کو عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر لے جائے گی لیکن وہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اپنا یہ وعدہ پورا نہیں کر سکی تھی۔ شازیہ نے بھی اس سے کہا تھا کہ کسی دن لے جائے گی لیکن ابھی تک اسے بھی وقت نہیں مل سکا تھا۔ زرینہ نے اس کو یاد بھی دلایا تھا جس پر اس نے کہا تھا کہ ڈاکٹر عرفان علی کو رپورٹیں دکھا لینے دو اس کے بعد چلیں گے۔

دراز گل اور خیر زماں ڈاکٹر عرفان علی کے پاس پہنچے اور اسے رپورٹ دکھائی۔ ڈاکٹر عرفان علی کافی دیر تک بڑی توجہ کے ساتھ رپورٹ دیکھتا رہا اور دراز گل اور خیر زماں اس

کی شکل دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر عرفان علی کے چہرے پر کوئی خوشگوار تاثر نہیں تھا۔

"بھئی .... بات یہ ہے کہ تمہارے سر کا آپریشن کرنا پڑے گا۔" کچھ دیر کے بعد اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔ "تمہارے سر میں پھلوں کی پیٹی گرنے سے جو چوٹ لگی تھی اس کے نتیجے میں سر کے اندر ذرا خرابی پیدا ہو گئی ہے۔" وہ ان دونوں کو سادہ ترین زبان میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زیادہ تفصیلات تو وہ شاید سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ "اس خرابی کو دور کرنے کا طریقہ آپریشن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔"

"آپریشن؟" دراز گل نے گھبرا کر کہا۔ "سر کا آپریشن؟"

"ہاں۔" ڈاکٹر عرفان علی نے کہا۔ "سر کا آپریشن .... دواؤں سے یہ تکلیف ٹھیک نہیں ہو گی اس کا علاج صرف آپریشن ہے۔"

"اور .... اگر آپریشن نہ کرواؤں تو؟" خیر زماں نے سخت گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

"تو سر کے درد کے دورے بار بار پڑیں گے۔" ڈاکٹر عرفان علی نے کہا۔ "اور جلدی جلدی پڑیں گے اور ان کے نتیجے میں تمہیں کسی بھی قسم کی معذوری پیدا ہو سکتی ہے اور خدانخواستہ موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔"

"موت!" خیر زماں ایک دم لرز گیا۔

"ہاں۔" ڈاکٹر عرفان علی نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہ کوئی ایسی معمولی بیماری نہیں ہے جس کو یوں آسانی سے نظرانداز کر دیا جائے۔ تمہارے سر میں جب چوٹ لگی تھی تو اس کے باعث تمہارا دماغ متاثر ہو گیا تھا اس وقت اس چیز کا پتہ نہیں چل سکا تھا لیکن اب وہ خرابی ابھر کر سامنے آ رہی ہے اور تمہیں اس کا علاج کروانا ہو گا۔"

"اس آپریشن کا کیا خرچہ ہو گا ڈاکٹر صاحب۔" خیر زماں نے ڈوبتے ہوئے دل اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان کے ساتھ ڈاکٹر سے سوال کیا۔

"یہ ایک بڑا اور پیچیدہ آپریشن ہو گا۔" ڈاکٹر عرفان علی نے کہا۔ "کسی طرح سے بھی چالیس ہزار روپے سے کم کا خرچہ نہیں ہو گا۔"

"چالیس ہزار۔" خیر زماں آنکھیں پھاڑ کر ڈاکٹر کی شکل دیکھنے لگا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ "........... یہ تو .... یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔"

"غریب آدمی ہے ڈاکٹر صاحب۔" دراز گل نے ملتجیانہ انداز میں ڈاکٹر عرفان علی

سے کہا۔ "اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا..........."

"دیکھو تم کو معلوم ہے یہ پرائیویٹ ہسپتال ہے۔" ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری زیادہ سے زیادہ یہ مدد کر سکتا ہوں کہ اپنی فیس کم کر دوں۔ یہ آپریشن میں خود ہی کروں گا اور میں اپنی فیس میں کچھ کمی کر سکتا ہوں لیکن ہسپتال کے اخراجات' آپریشن تھیٹر کے اخراجات' دواؤں وغیرہ کے اخراجات یہ سب تو کرنے ہی ہوں گے۔ ان میں کوئی کمی نہیں ہو سکے گی۔ تم لوگ سوچ لو۔ آپس میں مشورہ کر لو اچھی طرح سے۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا اس کام میں زیادہ دیر مت لگانا اور جب تک آپریشن نہ ہو جائے اس وقت تک وہ دوا ضرور استعمال کرتے رہنا جو میں نے لکھ کر دی ہے۔ اس کو مت چھوڑنا۔"

"آپریشن کے علاوہ علاج کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب؟" خیر زماں نے نیم مردہ آواز میں پوچھا۔

"اگر ہوتا تو میں آپریشن کے لئے ہرگز نہ کہتا۔" ڈاکٹر عرفان علی نے کہا۔ "صرف آپریشن ہی اس کا علاج ہے اور کوئی علاج نہیں ہے۔"

وہ دونوں وہاں سے چلے آئے۔ خیر زماں کا سارا وجود زبردست ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کو اپنے علاج پر اتنی بھاری رقم خرچ کرنی ہو گی جو کبھی اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ اس نے چالیس ہزار روپے کی رقم صرف کراچی آنے کے بعد ہی دیکھی تھی اور وہ بھی صرف منڈی کے بیوپاریوں کے پاس' اپنے پاس تو اس نے اتنی بڑی رقم کا تصور بھی نہیں کیا تھا وہ تو صرف پانچ ہزار روپے کے لئے ہی رو رہا تھا جو کہ ٹیسٹ پر خرچ ہوئے تھے اور یہاں تو چالیس ہزار روپے کا خرچہ نکل آیا تھا کہاں سے آئیں گے اتنے پیسے؟

خود دراز گل بھی بہت پریشان ہو گیا تھا چالیس ہزار روپے کی بات سن کر اس کا بھی دماغ گھوم گیا تھا ظاہر تھا کہ خیر زماں کے پاس تو چالیس ہزار روپے نہیں تھے اور نہ ہی ہو سکتے تھے۔ اور اگر آپریشن کروانا تھا تو چالیس ہزار روپے کا کہیں نا کہیں سے بندوبست کرنا ہی تھا۔

حاکم جان کی طرف سے کسی مدد کی امید نہیں تھی۔ حاکم جان نے اشارتاً دراز گل سے یہ بات کہہ دی تھی کہ اس کا بھانجا بیمار رہتا ہے اور اس میں کام کرنے کی قوت کم

ہوتی جارہی ہے۔ دراز گل اس کا مطلب سمجھ گیا تھا اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ حاکم جان کسی دوسرے آدمی کی تلاش میں ہے۔ دراز گل خود بھی کاروباری آدمی تھا اور وہ حاکم جان سے کوئی شکوہ نہیں کر سکتا تھا انہیں تو ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مکمل طور پر تندرست ہوں اور بالکل ٹھیک ٹھاک کام کر کے ان کے کاروباری مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ خیر زماں بے چارہ اپنی اس صلاحیت سے محروم ہوتا جارہا تھا۔

"دیکھو اب کچھ اور لوگوں سے مشورہ کریں گے۔" راستے میں دراز گل نے خیر زماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ اس سے یہ وعدہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ آپریشن کے سارے اخراجات خود برداشت کرے گا۔ پانچ ہزار روپے کی بات ہوتی تو وہ کچھ نہ کچھ کرلیتا لیکن یہ تو بہت بڑی رقم تھی۔ دراز گل خود بھی بال بچے والا آدمی تھا اس کے گھریلو اخراجات کافی تھے۔ بچے پڑھ رہے تھے ان کی پڑھائی کا خرچہ بھی بہت زیادہ تھا۔ "اگر ڈاکٹر عبدالرشید کہیں گے تو کسی اور ڈاکٹر کو دکھالیں گے۔ تم گھبراؤ مت خدا نے چاہا تو کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی۔"

"میرے پاس تو ابھی اتنی رقم نہیں ہے ماما۔" خیر زماں نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا۔ "اور میرے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جسے بیچ کر میں یہ رقم حاصل کر سکوں۔"

"خدا پر بھروسہ رکھو بیٹے۔" دراز گل نے اس کو تسلی دی۔ "کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا۔"

خیر زماں اپنے گھر پہنچا تو اس وقت وہاں شازیہ بھی موجود تھی شازیہ اور زرینہ نے بتایا تھا کہ خیر زماں اپنے ماما دراز گل کے ساتھ ڈاکٹر عرفان کے پاس گیا ہوا ہے۔

"کیا حال ہے خیر زماں!" شازیہ نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ملاقات ہوئی ڈاکٹر عرفان علی سے؟"

"جی باجی۔" خیر زماں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ شازیہ نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ حسرت اور بے بسی کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ زرینہ بھی غور سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"اچھا تو پھر کیا کہا انہوں نے؟" شازیہ نے پوچھا۔ "دوائیں لکھ کر دی ہیں؟"

"نہیں باجی۔" خیر زماں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ "دوائیں نہیں لکھی ہیں۔ آپریشن .... آپریشن کا کہا ہے۔"

"آپریشن؟" زرینہ ایک دم گھبرا کر بولی اور وہ خیر زماں سے جلدی جلدی پشتو میں باتیں کرنے لگی۔

"ہاں آپریشن۔" خیر زماں نے اس کو پشتو میں بتایا۔ "سر کا آپریشن کرنے کا کہتا ہے ڈاکٹر .... اور اس پر بہت بھاری خرچہ آئے گا۔ کہتا ہے کہ چالیس ہزار روپے سے کم نہیں لگیں گے۔"

"او خدایا........." زرینہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "چالیس ہزار روپے .... ہم کہاں سے لائیں گے اتنی رقم؟" اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور رونے لگی۔

"ارے کیا ہوا؟" شازیہ نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔ وہ ان دونوں کے درمیان پشتو میں ہونے والی گفتگو کو تو نہیں سمجھ سکی تھی لیکن اتنا اندازہ اس کو ضرور ہو گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی سنگین نوعیت کی بات ہے۔

خیر زماں' زرینہ کو مختصراً ساری بات بتا چکا تھا۔ زرینہ نے شازیہ کو اردو میں بتایا کہ ڈاکٹر عرفان علی نے کیا کہا تھا۔

"ہمارے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے باجی۔" اس نے روتے ہوئے شازیہ سے کہا۔ "ہمیں مزار پر لے چلو باجی۔ ہمیں مزار پر لے چلو۔"

"اچھا لے چلیں گے۔" شازیہ نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "جلدی لے چلیں گے۔"

زرینہ رو رو کر اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ مزار پر جا کر دعا مانگے گی' منت مانے گی اور وہاں سے تعویذ لے کر آئے گی جس کے نتیجے میں اس کا شوہر بالکل اچھا ہو جائے گا اور کسی آپریشن واپریشن کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں رو رو کر اپنا حالِ دل بیان کر رہی تھی۔

"میں لے چلوں گی۔" شازیہ نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں تم کو مزار پر ضرور لے چلوں گی۔ تم وہاں چل کر دعا مانگنا مگر دیکھو علاج کی طرف سے غافل مت ہونا علاج کروانا بہت ضروری ہے۔"

لیکن زرینہ رو رو کر یہی کہہ رہی تھی کہ اس کے پاس پیسہ نہیں ہے اور وہ لوگ آپریشن کے اتنے بھاری اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ ڈاکٹری علاج کے بجائے

دوسرے ہی طریقہ علاج پر زیادہ زور دے رہی تھی۔

شازیہ کچھ دیر تک ان دونوں کے ساتھ رہی وہ دونوں ہی بہت پریشان تھے اور زرینہ تو بہت روئی تھی اب وہ رو دھو کر خاموش ہو گئی تھی اور اس نے شازیہ سے کہا تھا کہ اس نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔

شازیہ کے دل میں ان دونوں کے لئے گہری ہمدردی تھی۔ یہ دونوں سیدھے سادے سے دیہاتی لوگ' جو پہلی بار اپنے گاؤں سے نکل کر کراچی آئے تھے۔ خلوص اور محبت کے پیکر تھے شازیہ کو وہ دونوں بہت پسند تھے اور وہ بڑی خوشی کے ساتھ زرینہ کو پڑھا رہی تھی زرینہ خود بھی پڑھنے میں دلچسپی لیتی تھی۔

لیکن ان دونوں کی موجودہ پریشانی ایسی تھی جس کا شازیہ کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔

اس رات اپنے گھر میں کھانے کے دوران اس نے اپنے والدین سے خیر زماں اور زرینہ کی پریشانی کا ذکر کیا۔

"بہت رو رہی تھی بے چاری۔" اس نے اپنے والدین کو خیر زماں کی بیماری اور ڈاکٹر عرفان علی کی رائے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "غریب لوگ ہیں خیر زماں منڈی میں کام کرتا ہے کہاں سے لائیں گے اتنا پیسہ؟ علاج کے اخراجات تو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔"

"اگر وہ پرائیویٹ آپریشن کروائے گا تو اس پر اتنا ہی خرچہ آئے گا جتنا ڈاکٹر عرفان علی نے اس کو بتایا ہے۔" صغیر احمد نے کہا۔ "لیکن اگر یہی آپریشن وہ کسی سرکاری ہسپتال میں کروا لے تو بہت تھوڑے سے پیسوں میں اس کا کام ہو جائے گا۔"

"لیکن مشکل تو یہی ہے کہ سرکاری ہسپتالوں میں پوچھتا کون ہے؟" شازیہ نے کہا۔ "اس کا نیورو سرجری کا کیس ہے میں نے اس کی رپورٹ دیکھی تھی۔ صرف کوئی نیورو سرجن ہی اس کا آپریشن کر سکتا ہے۔"

"جناح ہسپتال میں ہو سکتا ہے۔" صغیر احمد نے کہا۔ "وہاں نیورو سرجری کا بندوبست ہے اور شاید عباسی شہید میں بھی لیکن وہاں کے بارے میں مجھے ٹھیک سے علم نہیں۔"

"میرے خیال میں اس سے کہوں کہ وہ جناح ہسپتال میں چلا جائے۔" شازیہ نے

کہا۔ "شاید وہ لوگ اس کو داخل کر لیں اور اس کا آپریشن کریں۔"

"اس طرح کون کرے گا بیٹی؟" صغیر احمد نے کہا۔ "کوئی چھوٹا موٹا آپریشن تو ہے نہیں جو آسانی سے ہو جائے تم بتا رہی ہو کہ نیورو سرجری کا کیس ہے' گنے چنے نیورو سرجن ہیں کراچی میں' جناح ہسپتال میں نیورو سرجری کے ڈپارٹمنٹ میں ایک ڈاکٹر علی رضا ہیں ان کا چھوٹا بھائی ایک کیمیکل کمپنی کا نمائندہ ہے اور برابر میرے پاس میرے دفتر میں آتا رہتا ہے کیونکہ میرا تعلق پرچیز سے ہے۔"

"ارے تو ابو پلیز آپ اس سے بات کیجئے۔" شازیہ نے جلدی سے کہا۔ "وہ غریب لوگ ہیں بے چارے اگر ان کی کچھ مدد ہو جائے تو یہ بہت ہی ثواب کا کام ہو گا۔ آپ اس آدمی سے بات کیجئے۔"

"اس کا نام حسین احمد ہے۔" صغیر احمد نے کہا۔ "دیکھو میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

"وہ بے چاری زرینہ .... اسے تو بس ایک ہی رٹ لگی ہوئی ہے .... مزار پر چلو .... مزار پر چلو.........."

"وہ جن علاقوں سے آئی ہے وہاں آج بھی مزارات ہی سب سے بڑی علاج گاہیں ہیں۔" صغیر احمد نے کہا۔

"ہم روپے پیسے سے تو ان لوگوں کی مدد نہیں کر سکتے۔" شازیہ نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ ہم آپریشن کے لئے چالیس ہزار روپے تو فراہم نہیں کر سکتے لیکن ہم کسی نہ کسی دوسرے طریقے سے ان بے چاروں کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ حسین احمد صاحب سے کل ہی بات کیجئے ابو۔"

"ہاں۔" صغیر احمد نے بھی اپنی بیٹی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "بے چارے کی عمر ہی کیا ہے۔ لڑکا سا تو ہے۔ اس کو تو ابھی بہت دنوں تک زندہ رہنے کی ضرورت ہے۔"

"میں کل ہی حسین احمد کو فون کر کے اس سے بات کروں گا۔" صغیر احمد نے کہا۔ "اور اگر بالفرض جناح ہسپتال میں اس کے ذریعے بات نہیں بن سکی تو پھر کوئی اور طریقہ سوچیں گے۔ مشکل تو یہ ہے کہ یہ بہت ہی نازک قسم کا آپریشن ہے اور ہر چھوٹے موٹے ہسپتال میں نہیں کیا جا سکتا ورنہ کراچی میں کئی ایسے رفاہی ہسپتال ہیں جہاں بہت کم پیسوں میں آپریشن اور علاج وغیرہ ہو جاتا ہے لیکن برین سرجری تو ہر ہسپتال میں نہیں ہو سکتی

اور نہ ہی ہر سرجن کر سکتا ہے۔"

"سب سے اچھا تو یہی ہے کہ جناح ہسپتال میں ہو جائے۔" شازیہ نے کہا۔

"میں بات کرتا ہوں۔" صغیر احمد نے کہا۔ "لیکن ابھی ان لوگوں سے ذکر مت کرنا۔ خواہ مخواہ غلط امید دلانے سے کیا فائدہ؟ کچھ بات بن جائے تب بتانا۔"

دراز گل خیر زماں کو اس کے گھر چھوڑنے کے بعد جب اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں اس کو حاکم جان مل گیا۔ دونوں رک گئے اور ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ دراز گل نے حاکم جان کو بتایا کہ وہ ابھی خیر زماں کو اس کے گھر چھوڑ کر آ رہا ہے۔

"بہت لمبا نسخہ بتایا ہے ڈاکٹر نے۔" اس نے حاکم جان سے آہستہ سے کہا۔ حاکم جان نے خود ہی اس سے پوچھا تھا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔

"لمبا نسخہ؟" حاکم جان نے کہا۔ "کیسا لمبا نسخہ؟"

"آپریشن کے لئے کہہ رہا ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "اور اس کا خرچہ چالیس ہزار روپے بتا رہا ہے۔"

"چالیس ہزار روپے؟" حاکم جان نے چونک کر کہا۔ "یہ تو بہت زیادہ ہے' بہت زیادہ ہے۔ اتنا پیسہ بھلا وہ کہاں سے لائے گا؟ میرے خیال میں تو یہ ڈاکٹروں واکٹروں کے چکر چھوڑو دراز گل .... یہ تو بس لمبے چوڑے نسخے ہی بتاتے رہتے ہیں۔"

"تو پھر کیا کریں؟" دراز گل نے پوچھا۔

"ہومیو پیتھک کا علاج کرواؤ۔" حاکم جان نے کہا۔ "وہ سستا بھی ہوتا ہے اور اس میں یہ چیر پھاڑ وغیرہ نہیں ہوتی۔ تھوڑا ٹائم تو زیادہ لگتا ہے لیکن آدمی ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"مگر .... میں تو ہومیو پیتھک کے کسی ڈاکٹر کو نہیں جانتا۔" دراز گل نے کہا۔ "اور میں نے کبھی ہومیو پیتھک کا علاج کروایا ہی نہیں' میرے سارے ہی گھر والے ڈاکٹر سے ہی علاج کرواتے رہے ہیں۔"

"میں ہومیو پیتھک کے ایک بہت اچھے اور ہوشیار ڈاکٹر کو جانتا ہوں۔" حاکم جان نے کہا۔ "وہ عزیز آباد میں بیٹھتا ہے۔ میں تمہیں اس کا پتہ دے دوں گا اگر تم چاہو تو خیر زماں کو اس کو دکھا لو اس کی دوا سے ضرور فائدہ ہو گا۔"

"اچھا .... بتا دو۔" دراز گل نے آہستہ سے کہا۔ "مگر ڈاکٹر عرفان علی کہہ رہا تھا کہ آپریشن میں دیر نہ کی جائے اور جلدی کرا لیا جائے۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ آپریشن نہ

کروانے کے نتیجے میں کوئی معذوری پیدا ہو سکتی ہے اور موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔"

"ارے خاک ڈالو اس پر۔" حاکم جان نے کہا۔ "یہ ڈاکٹر لوگ تو ایسے ہی ڈرایا کرتے ہیں۔ ان کو تو بس پیسہ چاہئے اپنے لئے۔ تم خیر زماں کو ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔"

حاکم جان اپنا مشورہ دے کر رخصت ہو گیا اور دراز گل کے دل پر بڑی گہری چوٹ لگی۔ حاکم جان نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ آپریشن کے سلسلے میں اپنی طرف سے کچھ مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔ جبکہ خیر زماں نے گزشتہ چند ماہ کے دوران اس کے کاروبار کے فروغ میں اس کی کتنی مدد کی تھی۔ اس نے تو اتنی بھی دلچسپی نہیں لی کہ وہ یہی کہتا کہ خیر زماں کو اپنے جاننے والے ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے پاس وہ خود لے جائے گا اور اس سے بات کرے گا۔ اس نے تو بس راہ چلتے سیدھے سادے مشورے کی ایک پڑیا اس کے ہاتھ میں پکڑا دی اور چلا گیا۔

تاہم' یہ ایک راستہ تو تھا جو کہ حاکم جان نے اس کو دکھلایا تھا۔ دراز گل نے خود اپنا یا اپنے گھر والوں میں سے کسی کا ہومیو پیتھک علاج نہیں کروایا تھا اور اسے اس سلسلے میں کوئی تجربہ نہیں تھا اس کو تو پی آئی بی کالونی کے ڈاکٹر عبدالرشید پر پورا بھروسہ تھا اور وہ خود اور اس کے سارے گھر والے اس سے علاج کرواتے تھے۔ اس کے مشورے اور سفارش سے وہ کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھاتے تھے یا ہسپتال وغیرہ جاتے تھے اور ڈاکٹر عبدالرشید نے آج تک کسی ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔

"میرے خیال میں ڈاکٹر عبدالرشید سے بھی اس بارے میں پوچھا جائے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "ہو سکتا ہے وہ اس کو مناسب سمجھے۔"

اس نے اپنے گھر جانے کے بعد جب تاجور کو ساری بات بتائی تو تاجور بھی سناٹے میں آ گئی۔ چالیس ہزار روپے کی رقم کے بارے میں سن کر ہی اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے بھی مشورہ کر کے دیکھ لو۔" اس نے کہا۔ "شاید حاکم جان ٹھیک ہی کہتا ہو۔ شاید اس کے علاج سے کوئی فائدہ کی امید ہو۔"

"ہاں' میں بھی یہی سوچتا ہوں۔" دراز گل نے کہا۔ "لیکن یہ معاملہ بڑا نازک ہے ڈاکٹر عرفان علی نے کہا ہے کہ آپریشن میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔"

"تو دیر مت کرو۔" تاجور نے کہا۔ "کل ہی اسے لے کر ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے پاس

چلے جاؤ۔ اس سے بات تو کر کے دیکھو کہ وہ کیا کہتا ہے ہو سکتا ہے وہ اس بیماری کو ٹھیک سے سمجھ لے اور اس کے پاس اس کا کوئی ایسا علاج بھی موجود ہو جس میں آپریشن کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے۔"

"ہاں میں جاؤں گا۔" دراز گل نے کہا۔ "اور میں ڈاکٹر عبدالرشید سے بھی مشورہ کروں گا۔"

"ہاں کر لو۔" تاجور نے کہا۔ "اور اس کو بتا دینا کہ اتنا مہنگا آپریشن کروانا خیر زماں کے لئے ممکن نہیں ہے وہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا اس لئے کوئی سستا سا طریقۂ علاج تجویز کیا جائے۔"

رات کو وہ دونوں میاں بیوی زرینہ اور خیر زماں کے گھر آئے خیر زماں بھی اس وقت گھر میں ہی موجود تھا۔

"کل میں تم کو ایک اور ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔" دراز گل نے اس سے کہا۔

"وہ ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہے اور آپریشن وغیرہ کے بغیر ہی علاج کرتا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں حاکم جان نے بتایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بہت اچھا ڈاکٹر ہے اور اس کے علاج سے لوگوں کو ضرور فائدہ ہوتا ہے۔"

"کیسا ڈاکٹر ہے؟" خیر زماں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ "کون سا ڈاکٹر ہے؟"

"ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہے۔" دراز گل نے اپنی بات دہرائی۔

"ہومیوپیتھک؟" خیر زماں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ .... وہ کیا ہوتا ہے ماما؟"

"وہ کیا ہوتا ہے' وہ ایک دوسرا طریقہ علاج ہوتا ہے۔" دراز گل نے اس کو سمجھانا چاہا۔ دراصل خود اس کے لئے بھی سمجھنا بہت مشکل تھا کہ ہومیوپیتھک طریقہ علاج ہوتا کیا ہے۔ اس نے نہ کبھی اس کے بارے میں سوچا تھا اور نہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی اسے تو بس اتنا معلوم تھا کہ اس طریقہ مین چھوٹی چھوٹی سفید میٹھی گولیوں سے علاج کرتے ہیں جو چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں بند ملتی ہیں اور یہ کہ اس کے ڈاکٹر بھی الگ ہوتے ہیں اس سے زیادہ وہ اس طریقہ علاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

تاہم جس حد تک ممکن ہو سکتا تھا اس نے خیر زماں اور زرینہ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی بات تھی جو ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ ان کے

لئے بس اتنا ہی جان لینا کافی تھا کہ یہ ایک دوسرا طریقہ علاج تھا جس میں آپریشن وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں ماما؟" خیر زماں نے اس کی پوری بات سننے کے بعد آہستہ سے کہا۔ "جیسا آپ چاہیں کریں۔"

"ہم لوگ تو بس یہ چاہتے ہیں بیٹا کہ تم تندرست اور ٹھیک ٹھاک رہو۔" تاجور نے کہا۔ "اور اس کے لئے ہم سے جو کچھ بھی بن پڑے گا وہ ضرور کریں گے۔ خدا کرے کہ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ۔"

خیر زماں ان لوگوں کی مجبوری کو بھی سمجھتا تھا چالیس ہزار روپے کی رقم کوئی ایسی رقم نہیں تھی جو کوئی اس کو یوں ہی اٹھا کر دے دیتا۔ جبکہ جلد واپسی کی بھی کوئی توقع نہ ہو۔ آخر ان لوگوں کے بھی اپنے اخراجات تھے۔ اپنے مسائل تھے' ان کے بچے تھے جن کی تعلیم کا خرچہ تھا۔

"کل میں تمہیں اس ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔" دراز گل نے کہا۔ "دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔ ان شاء اللہ اس کے ہاتھ سے تم کو شفا ہو گی۔"

"مامی..........." زرینہ نے موقع غنیمت دیکھ کر کہا۔ "ایک بار .... ایک بار مزار پر تو چلیں کسی پیر فقیر کے پاس۔ کسی اللہ والے کے پاس.........."

"ہاں .... اچھا..........." تاجور نے جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا چلیں گے۔ تم کہتی ہو تو ضرور چلیں گے۔"

زرینہ کے دل پر ایک بڑی چوٹ لگی مامی نے کہا تھا کہ تم کہتی ہو تو ضرور چلیں گے کہ گویا وہ از خود وہاں جانے کی زیادہ خواہشمند نہیں تھی۔ ہائے کیا ہو گیا تھا ان لوگوں کو کراچی میں رہتے ہوئے بس طرح طرح کے ڈاکٹروں کے پیچھے لگے رہتے تھے علاج کے لئے اور پیروں فقیروں کو تو جیسے بالکل ہی بھول گئے تھے۔

"کب چلیں گے مامی؟" زرینہ اصرار کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"تم کل زرینہ کو لے کر چلی جاؤ۔" دراز گل نے کہا۔ "کل شہزاد کی چھٹی ہے اس کے ساتھ چلی جانا۔ دوا کے ساتھ دعا رہے تو اچھا ہے۔"

زرینہ کے وجود میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ تو کب سے چاہتی تھی کہ وہ کسی بزرگ کے مزار پر جائے اور وہاں جا کر اپنے شوہر کی صحت یابی اور سلامتی کے لئے دعا کرے۔

چاہے ڈاکٹر کے پاس جائے نہ جائے لیکن یہ لوگ اس کی بات پر توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔

دراز گل اور تاجور کافی دیر تک ان دونوں کے ساتھ رہے اور انہیں دلاسہ، تسلی دیتے رہے وہاں سے رخصت ہونے کے بعد تاجور تو گھر چلی گئی اور دراز گل ڈاکٹر عبدالرشید کے پاس پہنچا جس کا مطب رات کو بہت دیر تک کھلا رہتا تھا اس وقت ڈاکٹر عبدالرشید آخری مریض کو دیکھ کر فارغ ہونے والا تھا اور خالی بیٹھا ہوا تھا لیکن دراز گل کے وہاں پہنچتے ہی دو مریض اور آ گئے تاہم ڈاکٹر عبدالرشید نے دراز گل کو پہلے بلوایا۔

"ہاں بھئی دراز گل کیا خبر ہے؟" ڈاکٹر عبدالرشید نے اس سے پوچھا۔ "آج گئے تھے تم ڈاکٹر عرفان علی کے پاس؟"

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب گیا تھا۔" دراز گل نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔ "وہ آپریشن کے لئے کہتے ہیں۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر عبدالرشید نے کسی تعجب کا اظہار کئے بغیر کہا۔ "مجھے معلوم تھا میں نے رپورٹ دیکھنے کے بعد خود بھی اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ یہ سرجری کا کیس ہے اور آپریشن کے بغیر چارہ نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب، کوئی ایسی صورت نہیں کہ آپریشن کے بغیر یہ بیماری ٹھیک ہو جائے؟" دراز گل نے بڑی اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں دراز گل۔" ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا۔ "ایسا کوئی طریقہ نہیں۔ اس کا علاج صرف آپریشن ہے اور آپریشن سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر عرفان علی بہت ہوشیار سرجن ہے اس نے اس سے پہلے بھی دماغ کے بہت سارے کامیاب آپریشن کئے ہیں ان شاء اللہ یہ آپریشن بھی کامیاب ہو گا۔"

دراز گل ڈاکٹر عبدالرشید سے فوری طور پر نہیں کہنا چاہتا تھا کہ اصل مسئلہ خوف کا نہیں بلکہ رقم کا تھا وہ عرصہ دراز سے ایک اچھے کھاتے پیتے اور خوش حال آدمی کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالرشید سے ملتا رہا تھا اور اپنے اور اپنے گھر والوں کے علاج کے سلسلے میں اس نے کبھی بھی کسی مالی پریشانی کا اظہار نہیں کیا تھا چنانچہ اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ فوری طور پر مالی دشواری کا ذکر لے بیٹھے۔ بعد میں .... شاید بعد میں یہ بات کہی جا سکتی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب، حاکم جان نے مجھے ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر کے بارے میں بتایا ہے کہ

وہ بہت ہوشیار ہے۔" دراز گل نے ذرا محتاط انداز میں کہنا شروع کیا۔ "حاکم جان کہتا ہے کہ وہ ڈاکٹر بغیر آپریشن کے بھی خیر زماں کا علاج کر سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بار خیر زماں کو اس کو بھی دکھا دوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہومیوپیتھک ڈاکٹر؟" ڈاکٹر عبدالرشید کی پیشانی پر کچھ لکیریں نمودار ہو گئیں۔ "بات یہ ہے دراز گل کہ میں کسی ہومیوپیتھک ڈاکٹر کو نہیں جانتا اور اس لئے میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"لیکن دکھانے میں کوئی ہرج تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"ہرج تو نہیں ہے۔" ڈاکٹر عبدالرشید نے محتاط انداز میں کہا۔ "دکھانا چاہتے ہو تو دکھا لو لیکن میں تم کو ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں۔ میری نظر میں خیر زماں کی بیماری کا علاج آپریشن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور یہ آپریشن جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب........." دراز گل نے جلدی سے کہا۔ "میں تو صرف مشورہ کرنے کی بات کر رہا ہوں۔ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔"

"ہاں، مشورہ کر کے دیکھ لو اگر تم چاہتے ہو تو۔" ڈاکٹر عبدالرشید نے ایسے لہجے میں کہا جس میں ناپسندیدگی کی جھلک کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"ہومیوپیتھک والے ڈاکٹر آپریشن نہیں کرتے۔" دراز گل نے کہا۔ "سنا ہے کہ وہ ساری بیماریوں کا علاج آپریشن کے بغیر ہی کر لیتے ہیں۔"

"میں ہومیوپیتھک کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا دراز گل۔" ڈاکٹر عبدالرشید نے کہا۔ "لیکن ایک بات میں ضرور جانتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بہت سی بیماریاں اور تکالیف ایسی ہیں کہ ان کا علاج دواؤں کے ذریعے ناممکن ہے۔ قطعی طور پر ناممکن، اور ان کے لئے آپریشن لازمی ہوتا ہے، اور میرے خیال میں خیر زماں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ بہرحال تم ان ڈاکٹر صاحب سے مل کر اپنی تسلی کر لو لیکن آپریشن میں دیر مت کرو۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔" دراز گل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی بڑی مہربانی۔"

ڈاکٹر عبدالرشید نے آہستہ سے گردن ہلا دی اور دراز گل اس کے مطب سے نکل کر باہر چلا گیا۔

اگلے دن صبح تاجور، شہزاد کو ساتھ لے کر آئی اور زرینہ کو اپنے ساتھ لے کر مزار پر جانے کے لئے روانہ ہو گئی۔ زرینہ کی خوشی کا تو ٹھکانہ نہ تھا۔ "اب ہو گا اصلی علاج۔"

اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”اور خیر زماں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ کسی آپریشن کی ضرورت نہیں ہو گی۔“ وہ تاجور اور شہزاد کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ خیر زماں اس وقت اپنے کام پر گیا ہوا تھا۔ زرینہ نے مکان کے دروازے میں تالہ لگا کر چابی صفیہ کو دے دی اور اس سے کہا کہ اگر خیر زماں اس کی واپسی سے پہلے آ جائے تو اس کو چابی دے دیں اور بتا دیں کہ وہ ماں اور شہزاد کے ساتھ مزار پر جا رہی ہے۔

”اچھا .... تو تم مزار پر جا رہی ہو دعا مانگنے کے لئے؟“ صفیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جاؤ .... خدا کرے کہ تمہاری دعا قبول ہو جائے۔“

”ذرا گھر کا خیال رکھئے گا خالہ۔“ زرینہ نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

”تم بے فکر ہو کر جاؤ۔“ صفیہ نے اس سے کہا اور زرینہ ان لوگوں کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

☆======☆======☆

درازگل دن کے کوئی گیارہ بجے کے قریب خیر زماں کو اپنے ساتھ لے کر ہومیوپیتھک ڈاکٹر شوکت حسین عزیز کے مطب پر پہنچا۔ حاکم جان نے اس کو بتایا تھا کہ ڈاکٹر شوکت حسین عزیز صبح دس بجے سے لے کر دوپہر دو بجے تک اپنے مطب میں بیٹھتا ہے۔ خیر زماں جب اپنے گھر سے روانہ ہوا تو زرینہ اس وقت تک واپس نہیں آئی تھی۔ صفیہ خالہ نے اس کو زرینہ کا پیغام دے دیا تھا۔

درازگل نے خیر زماں کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنی ساری رپورٹیں وغیرہ ساتھ میں لے لے اور خیر زماں نے ساری چیزیں ایک بڑے لفافے میں بہت احتیاط کے ساتھ رکھ لی تھیں اور پھر کاغذ کے اس لفافے کو پلاسٹک کی ایک بڑی سی تھیلی میں رکھ لیا تھا۔

خیر زماں درازگل کے ساتھ رکشہ میں بیٹھ کر عزیز آباد پہنچا اسے کراچی میں رہتے ہوئے کئی مہینے گزر گئے تھے لیکن اس نے آج تک عزیز آباد نہیں دیکھا تھا اور اب جو وہ پہلی بار ادھر آیا تو اس کو معلوم ہوا کہ یہ تو اپنی جگہ پر خود ایک پورا شہر تھا۔ دکانیں‘ مکان‘ بازار کیا کچھ نہیں تھا یہاں۔ دنیا کی ہر شے نظر آ رہی تھی۔

”یااللہ .... اس ایک شہر میں کتنے بہت سارے شہر موجود ہیں!“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”پی آئی بی کالونی تو خود اپنی جگہ پورا شہر ہے۔ منڈی کا علاقہ بھی اپنی جگہ پر ایک پورا شہر ہے اور ہر طرف شہر ہی شہر ہیں اور اب یہ عزیز آباد۔“

اسے حاکم جان کی بات یاد آئی۔ حاکم جان نے ایک روز اس سے کراچی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ کراچی میں رہنے والا کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے پورا کراچی دیکھا ہے۔

”کتنا ہی گھوم پھر لو‘ کتنے ہی چکر لگا لو لیکن پھر بھی یہی محسوس ہو گا کہ ابھی تو بہت کچھ دیکھنا باقی ہے۔“ حاکم جان نے کہا تھا۔ ”یہ ایک شہر نہیں ہے یہ تو ایک ملک ہے‘ ملک۔ اس کی سیر کرنا ایسا ہے جیسے کسی ملک کی سیر کرنا کیا تم ایک ملک کے چپے چپے کو دیکھ

سکتے ہو؟"

حاکم جان نے واقعی سچ کہا تھا۔ پچھلے چند ماہ کے دوران خیر زماں کو کراچی کے بہت سے علاقے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ہر علاقہ اپنی جگہ پر ایسا تھا کہ وہاں ضرورت کی ساری چیزیں مل جاتی تھیں۔ شہر در شہر .... کتنے شہر تھے۔ شہروں کا ایک طویل اور لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا چاروں طرف۔

اور اب یہ ایک اور نیا شہر تھا۔ عزیز آباد گھنی اور گنجان آباد .... تپلی تپلی گلیاں اور گلیوں کے اندر ٹھونسے ہوئے مکانات اور مکانوں کے اندر جیسے ابلتے ہوئے انسان .... انسان ہی انسان .... آبادی ہی آبادی۔ مرد و خواتین' بچے .... ہر طرف زندگی موجیں مارتی نظر آتی تھی۔

ڈاکٹر شوکت حسین عزیز کا پتہ دراز گل کے پاس موجود تھا اور وہ رکشہ میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا وہاں تک پہنچ گیا۔

ڈاکٹر شوکت حسین عزیز کے مطب میں تالا لگا ہوا تھا۔

"شاید .... وہ ابھی آیا نہیں ہے۔" دراز گل نے خیر زماں سے کہا۔ "اب کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ آؤ بیٹھتے ہیں۔"

ڈاکٹر شوکت حسین عزیز کے مطب کی چار سیڑھیاں تھیں وہ دونوں ان سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور مطب کے کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔

"یہ جو ہومیوپیتھک والے ڈاکٹر ہوتے ہیں تو کیا یہ آپریشن کے بغیر ہر بیماری کا علاج کر سکتے ہیں؟" خیر زماں نے سادگی کے ساتھ دراز گل سے پوچھا۔

"حاکم جان تو یہی کہہ رہا تھا۔" دراز گل نے کہا۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ یہ ڈاکٹر لوگ آپریشن وغیرہ نہیں کرتے۔ صرف دوا کی میٹھی گولیاں دیتے ہیں اور انہی سے علاج کرتے ہیں۔"

"تو .... شاید یہ ڈاکٹر میرا بھی گولیوں سے علاج کر دے؟" خیر زماں نے گہری آرزومندی کے ساتھ کہا۔

"بات کر کے دیکھتے ہیں بیٹا۔" دراز گل نے کہا۔ "اگر ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہے۔ آپریشن کرنا ہی نہ پڑے اور اس کے بغیر ہی تکلیف دور ہو جائے۔"

وہ دونوں وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور انہیں کافی دیر ہو گئی لیکن ڈاکٹر شوکت

حسین عزیز کے مطب کا تالہ نہیں کھلا ایسا لگتا تھا کہ جیسے مطب آج کھلے گا ہی نہیں۔

"کیا بات ہے؟ اتنی دیر ہو گئی؟" دراز گل نے ہاتھ میں بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر صاحب ابھی تک نہیں آئے۔ آئیں گے بھی یا نہیں۔ کسی سے معلوم کرنا چاہئے۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مطب کے برابر ایک جنرل اسٹور تھا وہ دونوں اس میں داخل ہو گئے۔ کاؤنٹر پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا تھا۔

"یہ .... یہ ڈاکٹر شوکت حسین عزیز کا مطب آج ابھی تک نہیں کھلا؟" دراز گل نے اس شخص سے پوچھا۔ "آپ کو اس کے بارے میں کچھ علم ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب کا مطب تو پچھلے تین دن سے بند ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"وہ بیمار ہیں اور ہسپتال میں داخل ہیں۔"

"اچھا؟" دراز گل نے حیرت سے کہا۔ "بیمار ہیں' کیا ہو گیا ہے ان کو؟"

"ان کا آپریشن ہوا ہے پیٹ کا۔" اس آدمی نے کہا۔ "کافی دنوں سے ان کے پیٹ میں تکلیف رہتی تھی کسی بھی دوا سے ٹھیک نہیں ہوتی تھی بالآخر ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا اور انہوں نے ہسپتال میں داخل ہو کر آپریشن کروا لیا ویسے اب وہ کافی ٹھیک ہیں۔ کل ان کا بیٹا آیا تھا ذرا دیر کے لئے۔ اندر سے کچھ سامان لینا تھا اس کو کہہ رہا تھا کہ آپریشن کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں اور جلد ہی دوبارہ اپنے کام پر واپس آ جائیں گے۔"

"آپریشن کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں؟" خیر زماں نے اس شخص کی بات کو دہراتے ہوئے انداز میں اس سے پوچھا۔

"ہاں۔" دکاندار نے کہا۔ "آپریشن کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں لیکن میرے خیال میں ابھی ہفتہ دس دن تک تو آرام کریں گے۔ تم لوگوں کو اگر ان سے ملنا ہے تو پھر میرا خیال ہے کہ ایک ہفتے کے بعد چکر لگا لینا۔"

"اچھی بات ہے بھائی۔" دراز گل نے ایک لمبی اور گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔" اور اس کے ساتھ ہی دونوں دکان میں سے باہر نکل آئے۔

دکاندار کی باتیں سننے کے بعد خیر زماں کے دل و دماغ میں ایک زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔

اگر ڈاکٹر شوکت حسین عزیز آپریشن کے بغیر ہر مرض کا علاج کر سکتا تھا تو اس کو خود

اپنا آپریشن کروانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے کیوں ہسپتال میں داخل ہو کر اپنا آپریشن کروایا؟ خیر زماں کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔

خود دراز گل بھی مایوسی کا شکار ہوا تھا۔ حاکم جان نے اس سے جو کچھ بھی کہا تھا وہ سب بے بنیاد اور فضول معلوم ہو رہا تھا جو ڈاکٹر خود اپنے علاج کے لئے آپریشن کروانے پر مجبور ہو وہ بھلا کسی دوسرے مریض کا بغیر آپریشن کے کیا علاج کر سکے گا؟

خیر زماں خود کو اپنے خیالات کے اظہار سے نہ روک سکا اور اس نے اپنے ماموں سے کہا۔ "اس ڈاکٹر نے تو خود اپنا آپریشن کروایا ہے۔"

"ہاں.........." دراز گل نے آہستہ سے کہا۔ "وہ دکاندار تو یہی کہہ رہا تھا اور مجھے تعجب ہے کہ حاکم جان تو اس کے بارے میں بڑی بڑی باتیں کہہ رہا تھا۔"

خیر زماں نے اور کچھ نہیں کہا اس کا دماغ بہت زیادہ پریشان ہو رہا تھا اور اس کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اس کو کیا کرنا چاہئے۔ آپریشن کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں تھے اور بغیر آپریشن کے علاج ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

"ابھی تو تم ڈاکٹر عرفان علی کی دی ہوئی دوا جاری رکھو۔" دراز گل نے اس سے کہا۔ "اس دوا کا ناغہ مت کرنا پھر دیکھو اور کسی ڈاکٹر کو بھی دیکھتے ہیں۔"

اصل میں دراز گل نے یہ الفاظ محض یوں ہی کہہ دیئے تھے وہ اور کسی ڈاکٹر کو اتنی اچھی طرح سے نہیں جانتا تھا جتنا ڈاکٹر عبدالرشید کو جانتا تھا اور فی الحال اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیا کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر عبدالرشید کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے کہ کئی تکالیف ایسی ہوتی ہیں جن کا علاج دواؤں کے ذریعے ممکن نہیں ہوتا اور ان میں آپریشن کروا لینا چاہئے لیکن چالیس ہزار' وہ کہاں سے آئیں گے؟

وہ دونوں رکشے میں بیٹھ کر واپس پی آئی بی کالونی لئے روانہ ہو گئے راستے میں ان کے درمیان بہت کم بات چیت ہوئی دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے اور دونوں کے دل میں ایک خیال تو بہرحال واضح صورت اختیار کر چکا تھا اور وہ یہ کہ ڈاکٹر شوکت حسین عزیز جیسے لوگ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔

جب وہ دونوں گھر واپس آئے تو زرینہ مزار سے واپس آ چکی تھی وہ وہاں سے پڑھا ہوا پانی ساتھ لائی تھی اور بہت خوش نظر آ رہی تھی اس نے ان دونوں کو دیکھتے ہی بے تحاشہ بولنا شروع کر دیا۔ وہ خوش ہو کر اپنی اس مہم کا احوال سنا رہی تھی اس نے خیر زماں

کو پڑھا ہوا پانی پلانے میں بھی دیر نہیں کی جو وہ ایک بوتل میں لے کر آئی تھی۔

"اس ڈاکٹر نے کیا کہا؟" اس نے اپنی مہم کے بارے میں بتانے کے بعد ان دونوں سے پوچھا۔ "کیا آپریشن کے بغیر علاج ہو جائے گا؟"

"وہ ڈاکٹر نہیں ملا زرینہ۔" خیر زماں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ ہسپتال میں داخل ہے' بیمار ہے اور اس نے خود اپنا آپریشن کروایا ہے۔"

"خود اپنا آپریشن کروایا ہے؟" زرینہ نے حیرت سے کہا۔ "کس سے' کسی دوسرے ڈاکٹر سے؟"

"ظاہر ہے کہ جب وہ ہسپتال میں داخل ہے تو اس نے کسی دوسرے ڈاکٹر سے ہی اپنا آپریشن کروایا ہو گا۔" خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔

"تو .... وہ تو خود ڈاکٹر ہے.........." زرینہ نے الجھتے ہوئے کہا۔ "وہ خود اپنا علاج نہیں کر سکا۔"

"ضروری نہیں ہوتا کہ ہر ڈاکٹر اپنا علاج خود ہی کر لیا کرے۔" دراز گل نے قدرے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر لوگ بھی اپنا علاج دوسرے ڈاکٹروں سے کرواتے ہیں۔"

زرینہ کو یہ سب کچھ سن کر خاصی مایوسی ہوئی اسے تو پورا یقین تھا کہ اس کی ریاضت سو فیصدی کامیاب ہو گی اور اس کی بدولت ڈاکٹر شوکت حسین عزیز آپریشن کے بغیر ہی اس کے شوہر کو صحت یاب کر دے گا لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ دونوں خالی ہاتھ واپس آ گئے تھے۔ ڈاکٹر سے تو ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔

"پھر.......... اب کیا کریں گے ماما؟" اس نے دراز گل سے پوچھا۔

"سوچتے ہیں۔" دراز گل نے آہستہ سے کہا۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ "کسی اور ڈاکٹر سے بھی مشورہ کرتے ہیں۔"

دراز گل کچھ دیر کے بعد چلا گیا اور خیر زماں بھی اپنے کام پر چلا گیا۔ زرینہ اکیلی رہ گئی اپنی اداسیوں اور پریشانیوں کے ساتھ تنہا .... وہ تو مزار سے واپسی پر بہت خوش تھی اور اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر شوکت حسین عزیز بغیر آپریشن کے اس کے شوہر کا علاج کر دے گا لیکن اب اس کی یہ خوشی ادھوری رہ گئی تھی۔ وہ تو خود اپنا آپریشن کروا رہا تھا تاہم اس کے دل میں امید کی کرن ضرور روشن تھی۔ وہ مزار سے پڑھا ہوا پانی لے کر آئی تھی

اور اس نے وہاں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے شوہر کی زندگی اور صحت کے لئے دعا کی تھی۔

صغیر احمد اس روز اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا کام میں مصروف تھا اس کو اچھی طرح سے یاد تھا کہ اسے حسین احمد کو فون کرنا ہے وہ اپنے کرایہ دار خیر زماں کے مسئلے کو بھولا نہیں تھا وہ اس غریب نوجوان کی واقعی مدد کرنا چاہتا تھا جو اتنی دور سے اپنے گھر اور گھر والوں کو چھوڑ کر دو روٹی کمانے کے لئے کراچی آیا تھا۔ صغیر احمد کو بخوبی اندازہ تھا کہ خیر زماں فی الحال چالیس ہزار روپے کے خرچے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور یہ آپریشن اس کے لئے ضروری بھی تھا۔ برین سرجری کا معاملہ تھا۔ کوئی مذاق نہیں تھا۔ عمر بھر کی معذوری بھی ہو سکتی تھی اور موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔

وہ کام میں مصروف تھا اور سوچ ہی رہا تھا کہ ذرا سی فرصت ملے ہاتھ خالی ہو تو وہ حسین احمد کو فون کرے کہ اتنے میں حسین احمد خود ہی اس کے پاس آن پہنچا۔

"ارے .... آیئے حسین احمد صاحب۔" اس نے بڑی خوش دلی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو آپ کو یاد ہی کر رہا تھا۔ ایک ضروری کام آن پڑا ہے آپ سے؟"

"مجھ سے؟" حسین احمد نے قدرے حیرت اور خوشی کے ساتھ کہا۔ اصل میں اب تک تو اس کا ہی کام صغیر احمد سے پڑتا رہتا تھا کیونکہ صغیر احمد اس آفس میں پرچیز ڈپارٹمنٹ میں تھا اور حسین احمد دوسری کمپنی کا سیلز آفیسر تھا جس سے صغیر احمد کی کمپنی مال خریدتی تھی۔

"بتایئے .... بتایئے .... کیا کام ہے۔"

"اصل میں تو کام ذاتی طور پر آپ سے نہیں ہے' بلکہ آپ کے بھائی ڈاکٹر علی رضا سے ہے۔" اس نے کہا۔ "اور میرا ذاتی کام بھی نہیں ہے یہ تو ایک خالص انسانی نوعیت کا کام ہے۔"

"ہاں ہاں .... بتایئے۔" حسین احمد نے بے چینی کے ساتھ کہا۔

صغیر احمد نے اس کو خیر زماں کے معاملے کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

"اس بے چارے کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ وہ کسی پرائیویٹ ہسپتال میں آپریشن کروا سکے۔" صغیر احمد نے کہا۔ "نیورو سرجری کا معاملہ ہے۔ ہر سرجن تو آپریشن

کر بھی نہیں سکتا۔ صرف چند گنے چنے نیورو سرجن ہیں کراچی میں۔ اگر اس غریب آدمی کے آپریشن کا جناح ہسپتال میں بندوبست ہو جائے تو .... آپ کے بھائی وہاں ڈاکٹر ہیں نیورولوجی ڈپارٹمنٹ میں اگر وہ ذرا سی توجہ دیں تو.........."

"کیوں نہیں' کیوں نہیں۔" حسین احمد نے جلدی سے کہا۔ "میں ان سے بات کرتا ہوں۔ میرے خیال میں تو ہو جانا چاہئے۔ میں آج ہی ان سے بات کروں گا اور کل آپ کو بتا دوں گا۔ پھر آپ مریض کو ہسپتال بھیج دیجئے گا۔ پہلے او پی ڈی میں چیک اپ کرا دیں گے پھر ایڈمٹ کروا دیں گے۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو میں ذاتی طور پر آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔" صغیر احمد نے کہا۔

"یہ آپ کا ذاتی کام تو ہے ہی نہیں۔" حسین احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ تو ایک ایسے آدمی کی مدد کرنا چاہتے ہیں جو واقعی مدد کا مستحق ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے بات کروں گا۔ وہ ضرور اس معاملے میں مدد کریں گے۔"

صغیر احمد بہت خوش ہوا اور اس نے شام کو اپنے گھر پہنچنے کے بعد صفیہ اور شازیہ کو بتایا کہ اس کی حسین احمد سے بات ہو گئی ہے اور اس نے اس معاملے میں پوری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

"خدا کرے کہ اس بے چارے کا کام ہو جائے۔" شازیہ نے کہا۔ "اور آخر یہ اتنے بڑے بڑے سرکاری ہسپتال ہیں کس کے لئے؟ یہ جو بڑے بڑے پروفیسر وہاں بیٹھ کر لمبی لمبی تنخواہیں لیتے ہیں تو کس لئے؟ کچھ غریبوں کا بھلا بھی تو کریں۔"

"وہ تو صرف اپنے اپنے پرائیویٹ کلینکوں کی دکانیں چمکانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔" صفیہ نے کہا۔ "اور سرکاری ہسپتالوں میں بھی وہ وقت ہی کتنا دیتے ہیں۔"

"ویسے تو ابھی زرینہ کو بتانا مت۔" صغیر احمد نے شازیہ سے کہا۔ "ذرا میں دیکھ لوں کہ حسین احمد کیا بتاتا ہے۔ اس کے بعد ہی اس کو بتانا تاکہ اسے یقین دلایا جا سکے کہ کام ہو جائے گا۔"

"ہاں ابو۔" شازیہ نے کہا۔ "میں اس کو ابھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

اس روز رات کو زرینہ نے شازیہ کو بتایا کہ وہ اپنی مامی اور ان کے بیٹے کو ساتھ لے کر مزار پر گئی تھی اور وہاں سے پڑھا ہوا پانی لائی تھی اور اس نے وہاں خیر زماں کی صحت یابی اور جان کی سلامتی کے لئے دعا بھی مانگی تھی۔

"مجھے امی نے بتایا تھا کہ تم اپنی مامی کے ساتھ گئی تھیں۔" زرینہ نے کہا۔ "چلو اچھا ہوا تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہو گئی تم وہاں جانے کے لئے بہت بے چین تھیں۔"

زرینہ نے اس کو ہومیوپیتھک ڈاکٹر شوکت حسین کے بارے میں بھی سب کچھ تفصیل سے بتایا اس نے بتایا کہ اس ڈاکٹر کا نام اور پتہ حاکم جان نے دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہ بغیر آپریشن کے ہی علاج کر دے گا لیکن وہ تو خود آپریشن کے ذریعے اپنا علاج کروا رہا تھا اور ہسپتال میں داخل تھا۔

"وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔" شازیہ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "تم لوگ اس بات کو اچھی طرح جان لو کہ خیر زماں کی بیماری کا علاج صرف آپریشن ہے اس کے علاوہ اس کا اور کوئی علاج نہیں ہے اس لئے اِدھر اُدھر کے ڈاکٹروں کے پاس بھاگتے پھرنا بے کار ہے۔"

"پھر ہم کیا کریں باجی؟" زرینہ بے چارگی کے ساتھ رونے لگی۔ "اتنا پیسہ تو ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"زرینہ .... زرینہ۔" اس نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ہم سب مل کر کوشش کریں گے کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔" وہ زرینہ کو اصل بات ابھی نہیں بتانا چاہتی تھی۔

اگلے روز حسین احمد نے صغیر احمد کے دفتر آ کر اس کو اطلاع دی کہ اس نے اپنے بھائی ڈاکٹر علی رضا سے بات کر لی ہے اور علی رضا نے مریض کو جناح ہسپتال بلایا ہے۔

"اگر ڈاکٹر عرفان علی کا یہ مشورہ ہے کہ مریض کی برین سرجری کی جانی چاہئے تو پھر اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ایسا ہی کیا جانا چاہئے۔" حسین احمد نے صغیر احمد سے کہا۔ "آپ مریض کو پرسوں جناح ہسپتال بھیج دیں۔ پرسوں نیورو میں او پی ڈی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر علی رضا خود مریض کو دیکھ لیں گے اور پھر پروفیسر نقوی کو بھی دکھا دیں گے جو کہ انچارج ہیں اس کے بعد مریض کو داخل کر لیں گے اور ان شاء اللہ آپریشن ہو جائے گا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے تفصیل سے بات کر لی ہے۔"

"یہ آپ نے بہت بڑی نیکی کی ہے حسین احمد صاحب۔" صغیر احمد نے کہا۔ "میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔"

"ارے چھوڑیئے صغیر احمد صاحب۔" حسین احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا

کارڈ لیجئے مریض کو دے دیجئے گا۔ وہ سیدھا ڈاکٹر علی رضا کے کمرے میں پہنچ جائے اور یہ کارڈ اندر بھجوا دے۔ ڈاکٹر صاحب اس کو فوراً بلوا لیں گے۔ میں نے ان کو اس کا نام وغیرہ لکھوا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" صغیر احمد نے کہا۔ "میں اس کو پرسوں بھیج دوں گا۔"

"ایک بات اور ہے صغیر احمد صاحب۔" حسین احمد نے کہا۔ "ہسپتال اور آپریشن وغیرہ کا تو کوئی خرچہ نہیں ہو گا لیکن پھر بھی دواؤں وغیرہ کی مد میں کچھ نہ کچھ رقم ضرور خرچ کرنی ہو گی ویسے تو ڈاکٹر صاحب کوشش کریں گے کہ زیادہ سے زیادہ دوائیں ہسپتال سے ہی دلوا دیں لیکن ہسپتال کا جو حال ہے وہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ دواؤں کے نام پر تو بس خاک اڑتی رہتی ہے۔"

"یہ بات بھی میں ان لوگوں کو سمجھا دوں گا۔" صغیر احمد نے کہا۔ "دواؤں وغیرہ کا خرچہ تو ان کو خود ہی اٹھانا ہو گا کچھ تھوڑی بہت مدد ہم لوگ کر دیں گے۔"

"اگر ضرورت پڑی تو کچھ دواؤں کا بندوبست میں بھی کر دوں گا۔" حسین احمد نے کہا۔ "میں خود بھی چکر لگا لوں گا ہسپتال کا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔" صغیر احمد نے متاثر ہوتے ہوئے کہا اور اس کے کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اسی روز سہ پہر کو دراز گل کی منڈی میں حاکم جان سے ملاقات ہوئی حاکم جان کو خیر زماں کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ لوگ ڈاکٹر شوکت حسین عزیز کے کلینک گئے تھے اور کلینک انہیں بند ملا تھا کیونکہ ڈاکٹر شوکت حسین عزیز کا آپریشن ہوا تھا اور وہ ہسپتال میں داخل تھا۔

"ہاں مجھے خیر زماں نے بتایا تھا۔" حاکم جان نے دراز گل سے گفتگو کے دوران کہا۔ "وہ بے چارہ ڈاکٹر تو خود بیمار ہو گیا۔"

"ہاں بیمار ہو گیا اور ہسپتال میں داخل ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "اس کا آپریشن ہوا ہے۔"

"خیر زماں کہہ رہا تھا کہ شاید ایک ہفتے کے بعد وہ آ جائے گا۔" حاکم جان نے کہا۔ "تو تم لوگ اب ایسا کرنا کہ ایک ہفتے کے بعد اس کے پاس چلے جانا۔"

"معلوم نہیں .... وہ کچھ کر سکے گا یا نہیں۔" دراز گل نے افسردگی اور ناامیدی

کے ملے جلے انداز میں کہا۔ "وہ آپریشن کے بغیر اپنے آپ کو تو ٹھیک کر نہیں سکا پھر کسی دوسرے کو کیا ٹھیک کرے گا۔"

"یہ تمہارا محض خیال ہے دراز گل۔" حاکم جان نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اس نے خود اپنا علاج کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔"

دراز گل نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا حاکم جان کا انداز ٹالنے والا تھا اور اس میں عدم دلچسپی کا عنصر نمایاں تھا۔ دراز گل خوب سمجھ رہا تھا حاکم جان کے لئے اب خیر زماں ایک بیکار شے میں تبدیل ہو گیا تھا وہ پیسہ کمانے کی مشین نہیں رہا تھا۔ اس کو تبدیل کر دینے کی ضرورت تھی۔

دراز گل کا ذہن بہت زیادہ الجھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ مین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خیر زماں کے لئے کیا کرے۔ اگر وہ لوگ گاؤں میں رہ رہے ہوتے تو سرے سے کوئی مسئلہ نہیں تھا وہاں نہ ہسپتال تھے نہ ٹیسٹ تھے نہ ڈاکٹر تھے۔ کچھ بھی نہیں تھا انہیں اپنے مقدر سے جینا تھا اور اپنے مقدر سے مر جانا تھا' اور سارے لوگ صبر شکر کر کے بیٹھ جاتے تھے۔ کسی کو اس بات کا ذرا سا احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ کچھ کیا جا سکتا تھا جو کہ نہیں کیا گیا لیکن یہاں شہر میں وہ بھی کراچی جیسے شہر میں تو حالات بالکل مختلف تھے۔ یہاں ایک سے ایک بڑے ہسپتال تھے ایک سے ایک قابل ڈاکٹر تھے' ایک سے ایک بڑھ کر سہولتیں موجود تھیں اور ان ساری چیزوں کی موجودگی کے باعث مجبوری' بے بسی' کم مائیگی' بے بضاعتی کا احساس بہت شدید تھا کچھ نہ کر سکنے کی مجبوری دل کو چیرے ڈالتی تھی کم مائیگی کا صدمہ روح کو کچلے ڈالتا تھا اور دراز گل اس شدید صدمے سے دوچار تھا۔

اگر وہ خیر زماں کے آپریشن کے لئے اپنے پاس سے چالیس ہزار روپے کا بندوبست کر بھی دے تو خیر زماں یہ رقم کہاں سے ادا کرے گا؟ کون جانے آپریشن کے بعد اس کا حال کیا رہے۔ وہ کام کرنے کے قابل بھی رہے یا نہ رہے۔ خدا نہ کرے۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ آپریشن کے بعد وہ ایک اضافی ذمہ داری بن جائے۔ وہ اور زرینہ دونوں .... موت' زندگی' صحت' معذوری اور بیماری سب خدا کے ہاتھ میں تھی۔ مگر آدمی کو اپنے طور پر بھی تو کچھ نہ کچھ سوچنا پڑتا ہے اور خیال کرنا پڑتا ہے۔

اب اس کے دل میں رہ رہ کر ایک ہی خیال آ رہا تھا خیر زماں کا علاج آپریشن کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر عبدالرشید سے بات کرے اس کو صاف

صاف بتا دے کہ خیر زماں آپریشن کے اتنے بھاری اخراجات برداشت نہیں کر سکتا اور اس کے لئے وہ دوسرا طریقہ بتائے کوئی دوسری راہ دکھائے۔ وہ اس ادھیڑ بُن میں تھا اور اپنے آپ کو اس بات کے لئے تیار کر رہا تھا کہ ڈاکٹر عبدالرشید کے پاس جا کر اس سے بات کرے یہ کام خاصہ مشکل تھا۔

اس شام جب صغیر احمد گھر واپس آیا تو اپنے ساتھ بہت اچھی خبر لے کر آیا تھا جس کا خاص طور سے شازیہ کو بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار تھا۔

اس نے جب اپنی بیوی اور بیٹی کو یہ بتایا کہ حسین احمد نے اپنے بھائی ڈاکٹر علی رضا سے بات کر لی ہے اور خیر زماں کے آپریشن کا جناح ہسپتال میں بندوبست ہو جائے گا تو وہ دونوں ہی بہت زیادہ خوش ہوئیں۔ خاص طور سے شازیہ۔

"اس شریف آدمی نے اس کام کا بندوبست کر دیا ہے۔" صغیر احمد نے کہا۔ "ورنہ اگر ویسے ہی کسی سفارش کے بغیر ہسپتال جاتا تو بے چارہ اِدھر سے اُدھر دھکے کھاتا رہتا کون پوچھتا ہے بھلا۔"

"یہ بہت بڑا کام ہو گیا ہے ابو۔" شازیہ نے کہا۔ "اب میں زرینہ کو بتا دوں گی کہ اسے خرچے کے سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"ساری بات ان دونوں کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آئے گی۔" صغیر احمد نے کہا۔ "ان سے کہنا کہ وہ دراز گل کو بلوا لیں میں اس کو ساری بات سمجھا دوں گا کہ کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔ ان دونوں کو تو ابھی اردو بھی پوری طرح سے نہیں آتی۔ دراز گل کو خیر زماں کے ساتھ جانا چاہئے۔ یا اپنے بیٹے کو اس کے ساتھ بھیجنا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی سمجھدار آدمی ساتھ میں ہو' جو ڈاکٹر کی بات کو بھی پوری طرح سے سمجھ لے۔"

"ہاں ابو۔" شازیہ نے کہا۔ "ویسے دراز گل خود بھی اس کے ساتھ ہر جگہ جاتا رہا ہے۔ وہی اس کو لے کر عزیز آباد بھی گیا تھا ہومیوپیتھک والے ڈاکٹر کے پاس۔"

"نیورو سرجری کے کیس میں بھلا ہومیوپیتھی والے کیا کریں گے۔" صغیر احمد نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد شازیہ زرینہ کے پاس پہنچی اس وقت خیر زماں بھی گھر میں موجود تھا۔ دونوں میاں بیوی شازیہ کی بہت عزت کرتے تھے اور اس کے ساتھ غیر معمولی احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔

"آیئے باجی آیئے۔" خیر زماں نے ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا۔ پریشانی اس کے چہرے سے ظاہر تھی جس کو وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ آپریشن نہ کروانے کی صورت میں اس کی زندگی کی بھی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی اور وہ اس کے بعد سے مسلسل ایک حالتِ خوف میں تھا۔ زرینہ بھی سامنے ہی موجود تھی۔

"میں تم دونوں کے لئے ایک بہت بڑی خوشخبری لائی ہوں۔" شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خیر زماں کے آپریشن کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"کیا؟" زرینہ نے ایک دم چونک کر کہا اور شازیہ کی شکل دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں سخت حیرت اور بے یقینی تھی۔ "آپریشن کا بندوبست؟"

"ہاں زرینہ۔" اس نے کہا۔ "ایک دوسرے ہسپتال میں .... بہت بڑے سرکاری ہسپتال میں آپریشن ہو جائے گا۔"

"مگر .... آپ نے یہ کیسے کیا؟" خیر زماں ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے ہوئے اس کو دیکھ رہا تھا یہ تو ایک اس قدر غیر متوقع بات تھی کہ وہ اس کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ شازیہ بھی اس معاملے میں اس کی کوئی مدد کر سکتی ہے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"میں نے ابو سے بات کی تھی۔" شازیہ نے کہا۔ "انہوں نے ہی بندوبست کروایا ہے اور ان شاء اللہ تمہارا آپریشن ہو جائے گا اور تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"اوہ .... خدایا باجی.........." زرینہ فرط مسرت سے بے قابو ہو کر چیخی اور دوڑ کر شازیہ سے لپٹ گئی۔ "باجی .... باجی.........." اور جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئی کہ شکستہ اردو کے بجائے پشتو بولنے لگی۔ پشتو ہی وہ زبان تھی جس میں وہ خوشی و مسرت کے اپنے شدید ترین جذبات کا اظہار کر سکتی تھی۔ وہ ان جذبات کا بھرپور اور مکمل اظہار کرنا چاہتی تھی اور وارفتگی کے عالم میں پشتو بولنے لگی تھی۔

اور پھر اچانک ہی اس کو خیال آ گیا کہ شازیہ اس کے اس اظہارِ مسرت سے لطف اندوز تو ضرور ہو سکتی ہے لیکن اس کی باتوں کو سمجھ نہیں سکتی اور پھر وہ فوراً ہی اردو بولنے لگی۔

وہ شازیہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر انہیں چوم رہی تھی اور بار بار اس کا شکریہ ادا کر رہی

تھی۔

"ہمارا خیر زماں اچھا ہو جائے گا باجی۔" فرط مسرت سے آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔ "ہمارا خیر زماں اچھا ہو جائے گا۔ وہ اچھا ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ ضرور اچھا ہو جائے گا۔" شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب تم لوگوں کو خیر زماں کے آپریشن کے لئے چالیس ہزار روپے کی رقم خرچ نہیں کرنی پڑے گی۔ اس کے بجائے بہت کم پیسوں میں کام ہو جائے گا۔"

"یہ سب کیسے ہو گا باجی؟" خیر زماں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ وہ تو سب کچھ سن کر سحرزدہ سا ہو گیا تھا اور ابھی تک اس نشاط انگیز سحر کی کیفیت سے خود کو آزاد نہیں کر پایا تھا۔

"تمہارے لئے اس سب کا سمجھنا ذرا مشکل ہو گا خیر زماں۔" شازیہ نے اس سے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ جا کر اپنے ماما دراز گل کو بلا لو تو میرے ابو ان کو ساری بات سمجھا دیں گے اور پھر اس کے مطابق عمل کرنا۔"

"ابھی جاتا ہوں۔" خیر زماں نے جوش کے عالم میں کہا اور اسی وقت گھر سے نکل کر چلا گیا دونوں گھروں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ صرف پانچ سات منٹ کا پیدل کا راستہ تھا۔ خیر زماں بڑی خوشی کے عالم میں گیا تھا۔

"جناح ہسپتال کراچی کا سب سے بڑا سرکاری ہسپتال ہے۔" خیر زماں کے جانے کے بعد شازیہ زرینہ کو بتا رہی تھی۔ "میرے ابو نے وہاں ایک ڈاکٹر سے جان پہچان نکالی ہے۔ سرکاری ہسپتالوں میں علاج مفت ہوتا ہے لیکن اچھا علاج اس وقت تک نہیں ہو پاتا جب تک کہ کوئی جان پہچان نہ ہو۔ وہاں ابو کے جاننے والے ڈاکٹر موجود ہیں۔ امید ہے کہ خیر زماں کا سارا کام ہو جائے گا۔"

زرینہ حیرت اور خوشی کے عالم میں شازیہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہے۔ اس کو تو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ خواب ہو۔ وہ اور خیر زماں اس معاملے کی وجہ سے کس قدر پریشان تھے ڈاکٹر عرفان علی نے صاف کہہ دیا تھا کہ آپریشن نہ کرانے کی صورت میں جان تک کا خطرہ موجود ہے اور وہ سب خود کو کس قدر لاچار اور مجبور پا رہے تھے۔

خیر زماں تھوڑی دیر بعد ہی واپس آ گیا اور اس نے بتایا دراز گل گھر پر موجود نہیں تھا

لیکن وہ یہ کہہ کر آیا ہے کہ دراز گل جیسے ہی آئے ویسے ہی اس کو یہاں بھیج دیا جائے کیونکہ صغیر احمد صاحب اس سے بات کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق میرے علاج اور آپریشن سے ہے۔

"ماما ابھی تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔" خیر زماں نے کہا۔ "وہ جیسے ہی گھر آئیں گے تو سیدھے اِدھر آ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" شازیہ نے کہا۔ "میں چلتی ہوں۔ ابو گھر پر ہی ہیں جب دراز گل آ جائیں تو آواز دے دینا میں اور ابو آ کر ان سے بات کر لیں گے۔"

"بس وہ ابھی ذرا دیر میں آ جائیں گے۔" خیر زماں نے ہیجان و اضطراب کے عالم میں کہا۔ وہ جلدی جلدی گیا تھا اور جلدی جلدی چلتا ہوا واپس آیا تھا اور اس وجہ سے اس کی سانس بھی کچھ پھول رہی تھی۔

شازیہ وہاں سے چلی آئی اور اس نے اپنے باپ کو بتا دیا کہ دراز گل تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔

"کیا تم نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ اس معاملے میں ہماری مدد کریں؟" شازیہ کے جانے کے بعد مسرور و شاداں اور حیران و پریشان خیر زماں نے زرینہ سے پوچھا۔

"نہیں تو .... بالکل نہیں۔" زرینہ نے کہا۔ "میں ان سے بھلا کیوں کہتی؟ وہ کوئی ہمارے رشتے دار تو نہیں اور وہ کر بھی کیا سکتے تھے؟ یہ سارا پیسے کا مسئلہ تھا وہ کوئی ہم کو چالیس ہزار روپے تو نہیں دے سکتے تھے۔"

"پھر......... ان لوگوں کے دل میں یہ بات کس طرح سے آ گئی؟" خیر زماں کو بہت حیرت ہو رہی تھی۔ "ہم نے تو ان سے نہیں کہا تھا۔"

"دنیا میں کتنے بہت سے اچھے لوگ موجود ہیں۔" خیر زماں نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔ "دنیا میں اگر بُرے لوگ ہیں تو اچھے لوگ بھی تو بہت ہیں۔ اگر ایک طرف وہ لوگ ہیں جو ہماری جان لے لینا چاہتے ہیں تو دوسرے وہ لوگ بھی ہیں جو ہمیں نئی زندگی دینے کی خواہش رکھتے ہیں، جو ہماری مدد کر رہے ہیں۔"

"ہاں خیر زماں۔" زرینہ نے کہا۔ "اور یہ لوگ تو ہمارے اپنے بھی نہیں ہیں، میرا مطلب ہے کہ ہمارا ان سے کوئی رشتہ بھی نہیں ہے، یہ تو ہمارے علاقے کے بھی نہیں ہیں۔"

"مگر یہ کتنے مہربان اور اچھے لوگ ہیں۔" زرینہ نے کہا۔ "خدا کرے .... خدا کرے تمہارا کام ہو جائے۔ ان لوگوں کے ذریعے۔ میں تو تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی خیر زماں۔ میری زندگی تو تمہاری ہی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر تم زندہ اور خوش ہو تو میں بھی زندہ اور خوش ہوں۔ تمہارے علاوہ میرا اب اس دنیا میں اور ہے ہی کون۔ تمہارے دم سے ہی تو میری زندگی ہے۔"

"اور میں نے بھی تو........." خیر زماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے بھی تو تمہارے ساتھ زندہ رہنے اور مرنے کی قسم کھائی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے۔"

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد دراز گل وہاں آن پہنچا۔ اسے اپنے گھر پر خیر زماں کا پیغام مل گیا تھا اور وہ بیتابانہ انداز میں یہاں آن پہنچا تھا۔

"صغیر صاحب تمہارے آپریشن اور علاج کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے حیرت کے ساتھ خیر زماں سے پوچھا۔ "ان کا .... ان کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ کیا تم نے ان سے کچھ کہا تھا؟"

"نہیں ماما۔" خیر زماں نے خود فوراً ہی جواب دیا۔ "میں نے یا زرینہ نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ شازیہ باجی کو صرف یہ بات معلوم تھی کہ ڈاکٹر عرفان علی نے میرا آپریشن کرنے کو کہا ہے، جس پر بھاری خرچہ ہو گا اور بس ہم نے ان سے اور تو کچھ نہیں کہا۔"

"شازیہ باجی کہہ رہی تھیں کہ صغیر احمد صاحب نے خود ہی کوئی بندوبست کیا ہے۔" زرینہ نے کہا۔ "کسی سرکاری ہسپتال میں۔"

"اچھا تم ان لوگوں کو بتا دو کہ میں آ گیا ہوں۔" دراز گل نے کہا۔

"اچھا میں انہیں بلاتی ہوں۔" زرینہ نے کہا اور جلدی سے وہاں سے چلی گئی اس نے شازیہ کو آواز دی اور اسے دراز گل کی آمد کے بارے میں بتایا۔

"اچھا ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔" شازیہ نے اس سے کہا اور ذرا دیر کے بعد وہ اور صغیر احمد، دونوں ان لوگوں کے پاس آ پہنچے۔

دراز گل نے کھڑے ہو کر ان لوگوں کا خیر مقدم کیا اور صغیر احمد سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ وہ متجسس نظروں سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ صغیر احمد کو وہ بہت دنوں

سے جانتا تھا۔ اچھا شریف آدمی تھا اور نہ جانے کس زمانے سے پی آئی بی کالونی میں رہ رہا تھا۔ دراز گل پی آئی بی کالونی کے جس حصہ میں رہتا تھا وہاں آس پاس کے لوگوں سے اس کے بہت اچھے دیرینہ مراسم تھے اور بہت سارے گھرانوں سے تو گھریلو تعلقات بھی تھے اور عورتوں کا گھروں میں آنا جانا تھا۔ شازیہ کو دراز گل اس وقت سے جانتا تھا جب وہ ایک نوعمر لڑکی تھی۔

"شازیہ نے مجھ کو بتایا تھا کہ خیر زماں کے سر میں تکلیف ہے اور ڈاکٹر عرفان علی آپریشن کے لئے کہہ رہا ہے جس پر کافی خرچہ آئے گا۔" صغیر احمد نے بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں گفتگو شروع کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نکلے جس کے باعث ان لوگوں کی انا کو ٹھیس لگے اور ان کی خودداری مجروح ہو۔ "اتنے بھاری خرچہ کی وجہ سے تو کسی کا بھی پریشان ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ شازیہ نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے ایک دوست سے کہہ کر جناح ہسپتال میں آپریشن کا بندوبست کروا دوں اور میں نے اپنے دوست سے بات کر لی ہے اب اگر تم لوگ چاہو تو خیر زماں کا آپریشن جناح ہسپتال میں ہو سکتا ہے اور یہ سرکاری خرچے پر ہو گا۔ اگر تم لوگ چاہو تو۔"

"ہم کیوں نہیں چاہیں گے صغیر بھائی۔" دراز گل نے ممنونیت سے بھرپور لہجے میں بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ تو ہمارے سگے عزیزوں کی طرح ہیں آپ سے کیا چھپانا؟ خیر زماں کے پاس ابھی اتنا پیسہ نہیں ہے کہ وہ چالیس پچاس ہزار روپے آپریشن پر خرچ کر سکے اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ آپریشن ضروری ہے اس کے علاوہ اور کوئی علاج ممکن نہیں۔"

"ڈاکٹر ٹھیک کہتے ہیں۔" شازیہ نے کہا۔ "خیر زماں کے سر میں پہلے چوٹ لگی تھی اور یہ اس وقت کی خرابی ہے جس کی وجہ سے سر میں درد ہوتا ہے اس کا علاج آپریشن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ آپریشن تو کرنا ہی ہو گا۔"

"حاکم جان نے ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر کا پتہ بتایا تھا مگر.........."

"کسی اور چکر میں نہ پڑو دراز گل۔" صغیر احمد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جیسا ڈاکٹر عرفان علی نے کہا ہے ویسا ہی کرو۔ یہ آپریشن جناح ہسپتال میں ہو جائے گا میں نے ایک دوست سے بات کر لی ہے۔ تم پرسوں خیر زماں کو ساتھ لے کر جناح ہسپتال چلے جاؤ۔"

"جی میں ضرور جاؤں گا صغیر احمد صاحب۔" دراز گل نے فوری آمادگی کے ساتھ کہا۔ "اگر یہ کام ہو جائے تو بہت اچھا ہو گا۔ میں تو آپ کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں گا۔"

"اس میں شکر گزاری کی کوئی بات نہیں ہے دراز گل۔" صغیر احمد نے کہا۔ "دنیا میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف اس کی مدد کی جائے جس سے کوئی کام نکلتا ہو۔ انسانی رشتے بھی تو اپنی جگہ پر کوئی چیز ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں .... جی ہاں۔" دراز گل نے جلدی سے کہا۔ "آپ نے بہت خیال کیا۔ بہت خیال کیا آپ نے۔" وہ کچھ اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اور کیا کہے۔

صغیر احمد اس کو تفصیل کے ساتھ سمجھانے لگا۔ اس کو کیا کرنا ہے' کس وقت اور کہاں جانا ہے اور کس سے ملنا ہے۔ دراز گل کے علاوہ خیر زماں اور زرینہ بھی اس کی بات بڑے غور اور توجہ کے ساتھ سن رہے تھے اور پورا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خیر زماں ایک ایک بات کو اپنے دل پر نقش کر رہا تھا ہر ایک نام کو یاد کر رہا تھا گو کہ اس کو ساتھ لے جانے اور سارے معاملے کو سنبھالنے کی بنیادی ذمہ داری دراز گل کی تھی' لیکن وہ خود بھی ساری بات کو اپنے دماغ میں بٹھاتا جا رہا تھا۔

"یہ کارڈ بہت سنبھال کر رکھنا۔" صغیر احمد نے دراز گل کو حسین احمد کا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ "وہاں نیورولوجی ڈپارٹمنٹ کی او پی ڈی میں جاؤ گے تو ڈاکٹر کے کمرے کے باہر جو آدمی موجود ہو اس کو یہ کارڈ دکھا دینا اور اس سے کہنا کہ ڈاکٹر علی رضا سے ملنا ہے۔"

"ٹھیک ہے صغیر بھائی۔" دراز گل نے کہا۔ "میں پہنچ جاؤں گا۔ خیر زماں کو ساتھ لے کر میں ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"اس کارڈ کو سنبھال کر رکھنا۔" صغیر احمد نے کہا۔ "اور اگر بالفرض خدا نخواستہ راستے میں یہ کارڈ گم ہو جائے یا کہیں گر جائے تو تم واپس مت لوٹ آنا۔ تم اس جگہ جانا ضرور اور ڈاکٹر کے کمرے کے باہر دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی سے کہنا کہ تم کو ڈاکٹر علی رضا سے ملنا ہے اور تمہیں ان کے بھائی حسین احمد نے بھیجا ہے۔ یاد رہے گا نا حسین احمد۔"

"سب کچھ یاد رہے گا صغیر صاحب۔" دراز گل نے کہا۔ "میں کچھ بھی نہیں بھولوں گا۔ سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ ڈاکٹر علی رضا کا بھائی حسین احمد .... اس سے ملے بغیر تو

وہاں سے آؤں گا بھی نہیں۔"

"ساری رپورٹیں' ایکسرے' نسخے وغیرہ بہت سنبھال کر لے جانا اور ڈاکٹر صاحب کو دکھا دینا پھر دیکھو کہ وہ کیا بتاتے ہیں۔"

"بہت اچھا صغیر بھائی۔" دراز گل نے کہا۔ وہ کبھی "صغیر بھائی" اور کبھی "صغیر صاحب" کہہ رہا تھا یہ اس کی اچانک پیدا ہو جانے والی وارفتگی کا نتیجہ تھا' ورنہ اس سے پہلے تو ہمیشہ اس کو صغیر صاحب ہی کہتا تھا۔

"ڈاکٹر علی رضا کا بھائی حسین احمد۔" خیر زماں بار بار ان الفاظ کو اپنے دل میں دہرا رہا تھا۔ "کیا معلوم ماما بھول جائیں۔ تو مجھے تو یاد رہے گا.......... ڈاکٹر علی رضا کا بھائی حسین احمد۔" صغیر احمد کی باتوں کو کسی مقدس صحیفے کی تحریر کی طرح اپنے دل کے اندر جذب کرتا اور اتارتا جا رہا تھا۔

سر کے درد کے جن عذابوں سے وہ گزرتا رہا تھا ان کو کچھ اس کا ہی دل جان سکتا تھا۔ درد کے دوبار پڑنے والے دوروں نے نہ صرف یہ کہ اس کے سارے جسم کو' سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا بلکہ اسے ذہنی اور جذباتی طور پر بھی کچل کر رکھ دیا تھا۔ نڈھال کر ڈالا تھا اسے۔ اپنی ذات پر سے اس کا اعتماد کم ہونے لگا تھا اور وہ اپنے آپ کو ایک ایسا ادھورا انسان محسوس کرنے لگا تھا جو کسی بھی کام کو مکمل کرنے کی ذمہ داری پوری طرح سے قبول نہیں کر سکتا تھا معلوم نہیں کب کس وقت اچانک اس کو درد سر کا دورہ پڑ جائے اور جو بھی کام اس وقت اس کے ہاتھ میں ہو وہ سارے کا سارا چوپٹ ہو جائے۔ اس کے اس خدشے کا سب سے بڑا ثبوت اس کی جانب حاکم جان کا بدلا ہوا رویہ تھا۔

درد سر کے دوسرے دورے کے بعد ہی سے حاکم جان نے بڑی خاموشی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس کو لین دین کے کام سے الگ کر دیا تھا ابھی فی الحال حاکم جان نے یہ کام اپنے ہاتھ میں رکھا تھا لیکن اس نے اشارتاً خیر زماں کو بتا دیا تھا کہ "ملک" سے اس کا عزیز عنقریب کراچی آنے والا ہے اور یہاں آ کر لین دین کا کام وہی سنبھالے گا باقی دوسرے اہم کاموں سے بھی وہ خیر زماں کو آہستہ آہستہ الگ کر رہا تھا اور اس کے کاموں کو ایک سے زائد آدمیوں میں بانٹ رہا تھا۔ خیر زماں ان ساری تبدیلیوں کو بڑے دکھ کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ اس عجیب و غریب بیماری کا شکار نہ ہو جاتا تو حاکم جان کبھی بھی اس کی حیثیت کو کم نہ کرتا۔

"لیکن میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بھی تو حاکم جان کے کام کے دوران ہی ہوا تھا۔" وہ اکثر سوچتا۔ "میں اس وقت بھی حاکم جان ہی کا کام تو کر رہا تھا کوئی اپنا کام نہیں کر رہا تھا ٹرک پر سے پیٹیاں اتر رہی تھیں اور میں ان کی گنتی کر رہا تھا اب اگر پیٹیاں اتارنے والے مزدور کے ہاتھ سے ایک پیٹی پھسل کر میرے سر پر آن گری اور اس کے نتیجے میں میرے سر میں سخت چوٹ لگ گئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں اپنی غلطی سے تو زخمی نہیں ہوا تھا اور اپنے کسی ذاتی کام کے دوران زخمی نہیں ہوا تھا۔ میں تو اس وقت بھی حاکم جان کا کام ہی کر رہا تھا۔"

وہ یہ ساری باتیں سوچ تو سکتا تھا لیکن حاکم جان سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی ابھی حاکم جان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ حاکم جان نے اسے نوکری سے الگ نہیں کیا تھا ابھی تک تو اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔

"جناح ہسپتال میں آپریشن وہیں کے ڈاکٹر کریں گے؟" دراز گل نے صغیر احمد سے پوچھا اور خیر زماں اس کی آواز کو سن کر ایک دم جیسے خواب سے چونک پڑا۔

"ہاں۔" صغیر احمد نے جواب دیا۔ "وہیں کے ڈاکٹر کریں گے اور ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر نقوی خود کریں جو وہاں کے سب سے بڑے ڈاکٹر ہیں لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ وہاں دوسرے ڈاکٹر بھی بہت ہوشیار اور اچھے ہیں۔ ڈاکٹر علی رضا خود بھی بہت ہوشیار ہیں اور آپریشن کرتے ہیں۔"

صغیر احمد نے ان لوگوں کو یہ بھی بتا دیا کہ اگرچہ ہسپتال کا اور آپریشن وغیرہ کا تو کوئی خرچہ نہیں ہو گا لیکن دواؤں کے سلسلے میں خرچہ کرنا ہو گا کیونکہ ساری دوائیں ہسپتال سے نہیں مل سکیں گی اور وہ باہر سے منگوانی پڑیں گی۔

"وہ تو مجھ کو معلوم ہے کہ دوائیں اپنے خرچے پر منگوانی پڑتی ہیں۔" دراز گل نے کہا۔ "خیر زماں جب عباسی شہید ہسپتال میں داخل تھا تو اس وقت بھی ساری دوائیں ہم لوگ اپنے ہی خرچ سے لاتے تھے۔"

صغیر احمد اور شازیہ نے بات چیت ختم کرنے کے بعد وہاں سے اٹھ کر جانا چاہا' لیکن زرینہ نے ان دونوں کو بصد اصرار روک لیا۔ "چائے پیئے بغیر نہیں۔" اس نے شازیہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں کو ہی زبردستی بٹھا لیا۔

دراز گل صغیر احمد اور شازیہ سے بار بار گہرا اظہارِ ممنونیت کر رہا تھا اس وقت وہ

دونوں اسے رحمت کے فرشتے نظر آ رہے تھے جنہوں نے اسے ایک ایسے خوفناک عذاب سے بچالیا تھا جو گذشتہ کئی دنوں سے اس کے وجود کو چاٹ رہا تھا اور جس کا کوئی علاج اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پچھلے کئی دن اس نے جیسے دوزخ کی آگ میں جلتے اور تپتے ہوئے گزارے تھے بعض اوقات تو سوچتے سوچتے اس کا دماغ پھٹنے لگتا اور کوئی راستہ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ چالیس ہزار روپے کی خطیر رقم خواب میں بھی آ آ کر اس کو ڈرایا کرتی تھی اور کسی کسی وقت خیر زماں کی جواں لاش کا دھندلا دھندلا منظر اس کے جسم و جاں پر لرزہ طاری کر دیتا۔ وہ اپنے بھانجے کو زندہ اور خوش و خرم دیکھنا چاہتا تھا اسے بھی اس کی بیوی کو بھی لیکن اس کے لئے بھاری قیمت ادا کرنا اسے بہت مشکل معلوم ہو رہا تھا۔

اور اب خود بخود وہ سارے ہی مسائل حل ہو گئے تھے۔ دراز گل کے دل میں بار بار خفت اور شرمندگی کا جو ایک احساس پیدا ہو جاتا تھا وہ اب ختم ہو گیا تھا وہ ذہنی طور پر آسودہ ہو گیا تھا یہ جان لیوا احساس اب اس کے دل میں چٹکیاں نہیں لے سکتا تھا کہ وہ اپنے نوجوان بھانجے کی جان بچانے کے لئے جو کچھ کر سکتا تھا اس نے نہیں کیا اس کا دل شازیہ اور صغیر کے لئے انتہائی تشکر کے جذبات سے لبریز تھا۔

ان لوگوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پی اور اس کے بعد شازیہ اور صغیر احمد وہاں سے رخصت ہو گئے۔

"ان لوگوں نے تو کمال کر دیا۔" ان دونوں کے جانے کے بعد دراز گل نے خیر زماں اور زرینہ سے مخاطب ہو کر مسرت' شادمانی سے سرشار لہجے میں کہا۔ "انہوں نے خود ہی یہ سب کچھ کر دیا۔"

"ہاں ماما۔" زرینہ نے جیسے خوشی سے چہچہاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو شازیہ باجی سے بار بار یہ کہا تھا کہ مجھے مزار پر لے چلیں جہاں چل کر میں دعا مانگ لوں گی' منت مانوں گی اور پڑھا ہوا پانی لے کر آؤں گی۔ انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ مجھے لے کر جائیں گی لیکن انہوں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا تھا کہ وہ آپریشن کروانے میں مدد دیں گی۔"

"بس اب تو کوئی پریشانی نہیں رہی۔" دراز گل نے خیر زماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناح ہسپتال تو کراچی کا بہت بڑا ہسپتال ہے سب سے بڑا ہسپتال اور وہاں بہت ڈاکٹر ہیں۔ اگر وہاں آپریشن ہو جاتا ہے تو بہت اچھا ہے۔ دواؤں وغیرہ کے خرچے کی کوئی بات نہیں ہے' اس کا بندوبست تو ہو سکتا ہے۔ اصل بات تو آپریشن کی ہے سارا خرچہ تو

اسی کا ہے۔"

"خدا ان لوگوں کو خوش رکھے۔" زرینہ نے کہا اس کی آنکھوں میں گہری خوشی کی چمک تھی۔

ایک دن کے وقفے سے دراز گل' خیر زماں کو جناح ہسپتال لے گیا۔ صغیر احمد کے دیئے ہوئے کارڈ کو اس نے کسی مقدس تعویذ کی طرح بڑی حفاظت اور احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھا تھا اور چونکہ یہ کام ایسا تھا جس میں آدمی کا تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہونا ضروری تھا اس لئے دراز گل اپنے بیٹے شہزاد کو بھی ساتھ لے گیا تھا تاکہ وہ انگریزی میں لکھے ہوئے بورڈز وغیرہ کو پڑھ سکے اور اس کے لئے دراز گل کو کسی کی محتاجی نہ ہو۔

وہ لوگ مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی ڈاکٹر علی رضا کی او پی ڈی میں پہنچ گئے تھے۔ دراز گل نے کمرے کے باہر موجود آدمی کو کارڈ دکھا دیا تھا اور احتیاطاً حسین احمد کا نام بھی بتا دیا تھا۔ آدمی نے اس انتظار کرنے کو کہا تھا کیونکہ ڈاکٹر علی رضا ابھی تک آیا نہیں تھا۔

جناح ہسپتال کی وسعت اور وہاں کی گہما گہمی خیر زماں کے لئے ایک اور تحیر خیز اور حیرت انگیز ماجرا تھی کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا یہ ہسپتال کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے۔ اندر سے پورا ایک شہر تھا اس میں باقاعدہ سڑکیں تھیں جن پر گاڑیاں چلتی تھیں جگہ جگہ ہوٹل تھے اور دکانیں تھیں وہ ان ساری چیزوں کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا "یا میرے خدا اس شہر کے ابھی اور کتنے ایسے اسرار و رموز ہیں جن سے میں واقف نہیں ہوں اور اس کی شکل و صورت کو پورے طور سے دیکھنے کے لئے مجھے ابھی اور کتنا انتظار کرنا ہوگا؟" یہاں تو ہر قدم پر ایک حیرت کدہ تھا۔ ہر گام ایک نئی دنیا تھی۔

جناح ہسپتال میں جگہ جگہ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آ رہے تھے اور گاڑیوں کی بھی اس قدر ریل پیل تھی کہ چلنا دشوار تھا یہاں بھی شہر کی سڑکوں کی طرح سنبھل سنبھل اور تھم تھم کر چلنا پڑ رہا تھا۔

"یہ ہے عجائبات کی دنیا.......... کراچی.........." خیر زماں کو بار بار اپنے آپ سے کہنا پڑتا تھا۔ "واقعی جو آدمی ایک بار یہاں آ کر رہنا شروع کر دے تو پھر وہ اس شہر کو چھوڑ کر دوسری جگہ کیوں جائے گا؟"

ہسپتال میں ہر طرف پھیلی ہوئی عمارتوں میں جگہ جگہ لوگوں کی بھیڑ نظر آ رہی تھی اس ہسپتال کی کوئی ایک عمارت نہیں تھی بلکہ یہ تو ایک پورا سلسلہ عمارات تھا کتنی بہت

ساری عمارتیں تھیں جو ایک دوسرے سے الگ الگ اور کافی فاصلے پر واقع تھیں اور ہر عمارت لوگوں کے ہجوم سے بھری ہوئی تھی۔

نیورولوجی کی او پی ڈی میں اتنی بھیڑ تھی جیسے میلہ لگا ہو۔ خیر زماں تو اتنے بڑے مجمع کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا اور یہی سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں ڈاکٹر علی رضا سے ملاقات ہو سکے گی یا نہیں۔

لیکن اس کارڈ نے تو جیسے جادو کی پڑیا کا کام دیا ڈاکٹر علی رضا کی آمد کے بعد چپراسی نے دراز گل سے وہ کارڈ لے لیا تھا اور وہ اس کو اندر لے گیا تھا چند ہی منٹ کے بعد اس نے ان لوگوں کو اندر بلا لیا تین آدمی اندر گئے تھے خیر زماں کے علاوہ دراز گل اور شہزاد۔

"مریض کون ہے؟" ڈاکٹر علی رضا نے تینوں بظاہر صحت مند اور ٹھیک ٹھاک نظر آنے والوں سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"یہ ہے۔" دراز گل نے خیر زماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر علی رضا نے خیر زماں کو اپنے قریب رکھے ہوئے اسٹول پر بٹھا لیا اس کے بعد وہ اس کی رپورٹوں وغیرہ کو دیکھنے لگا۔ کافی دیر تک وہ بڑے انہماک کے ساتھ ساری چیزوں کا جائزہ لیتا رہا اس دوران کمرے کے اندر مکمل خاموشی چھائی رہی۔

"سر میں چوٹ لگے ہوئے کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟" ڈاکٹر علی رضا نے اس سے پوچھا اور اس نے فوراً بتا دیا پھر ڈاکٹر علی رضا نے اس سے سر کے درد کے بارے میں تفصیلات پوچھیں۔ خیر زماں اس کے سوالات کے جوابات دیتا گیا اور جو کچھ اس سے پوچھا گیا وہ اس نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر علی رضا نے اپنی نشست پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ ...." اور وہ خیر زماں کو اپنے ساتھ کمرے سے باہر لے گیا دراز گل اور شہزاد وہیں بیٹھے رہے۔

"کہاں لے گئے ہیں ڈاکٹر صاحب اس کو؟" شہزاد نے کمرے میں موجود ملازم سے پوچھا۔

"شاید ڈاکٹر نقوی کے پاس لے گئے ہوں گے۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "وہ یہاں کے سب سے بڑے ڈاکٹر ہیں۔"

ڈاکٹر نقوی اپنی تیز اور ذہانت آمیز نظروں سے خیر زماں کی شکل دیکھ رہا تھا وہ اس کی

ساری رپورٹیں وغیرہ دیکھ چکا تھا اور ڈاکٹر علی رضا نے اس کے کیس کی سمری بنا کر اس کے سامنے پیش کر دی تھی جسے اس نے دیکھ لیا تھا اور کیس کی نوعیت کو پوری طرح سے سمجھ گیا تھا۔

"برین سرجری کا کیس ہے۔" اس نے ڈاکٹر علی رضا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر عرفان کی تشخیص بالکل ٹھیک ہے۔ سرجری کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"تو .... تو پھر داخل کئے لیتے ہیں سر؟" ڈاکٹر علی رضا نے اس سے پوچھا۔

"جی ڈاکٹر صاحب۔" ڈاکٹر نقوی نے کہا۔ "داخل کر لیجئے اور آپریشن لسٹ میں نام شامل کر لیجئے۔"

ڈاکٹر علی رضا خیر زماں کو ساتھ لئے ہوئے دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا جہاں دراز گل اور شہزاد دونوں ان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"آج سے ایک ہفتے کے بعد آج ہی کے دن آ جانا۔" ڈاکٹر علی رضا نے کہا اور جلدی جلدی کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ "صبح کے وقت آ جانا اور تم کو داخل کر لیا جائے گا۔ پھر چند روز کے بعد تمہارا آپریشن کر دیا جائے گا اور ابھی یہ ٹیسٹ وغیرہ یہاں سے کروا لو۔"

اس نے دو الگ الگ پرچے لکھ کر خیر زماں کی طرف بڑھا دیئے اور ساتھ ہی ان لوگوں کو ٹیسٹوں اور داخلے وغیرہ کے سلسلے میں ضروری ہدایات دینے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب!" دراز گل نے ذرا ہمت کر کے ڈاکٹر علی رضا سے سوال کیا۔ "خیر زماں بالکل ٹھیک ہو جائے گا نا؟ آپریشن میں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟"

"آپریشن میں اتنا خطرہ نہیں جتنا خطرہ آپریشن نہ کرانے میں ہے؟" ڈاکٹر علی رضا نے کہا۔ "شاید ڈاکٹر عرفان علی نے تم کو یہ بات بتائی ہو گی۔ اس تکلیف کا علاج صرف آپریشن ہی ہے اور اگر آپریشن نہ کروایا جائے تو اس قسم کے دورے بار بار پڑیں گے۔ آدمی ادھ مرا ہو جائے گا اور معذور بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں جان کا بھی خطرہ ہے دماغ کو مسلسل خطرہ لاحق رہے گا۔"

خیر زماں اندر ہی اندر ایک بار پھر لرز کر رہ گیا سارے ہی ڈاکٹر ایک جیسی بات کہہ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سب ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے .... آپریشن جلد از جلد ہو جانا چاہئے تھا۔

ہسپتال سے واپس ہوتے ہوئے انہیں سہ پہر ہو گئی تھی سارے ٹیسٹ وغیرہ

کروانے میں بھی بہت ٹائم لگ گیا تھا لیکن یہ کیا کم غنیمت بات تھی کہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ سارا کام ہو گیا تھا اور پیسے بھی کچھ نہیں خرچ ہوئے تھے۔

وہ لوگ گھر واپس پہنچے تو انہوں نے زرینہ کو بہت پریشان پایا اتنی دیر ہو گئی تھی اور وہ لوگ واپس نہیں آئے تھے۔ اس لئے زرینہ بہت پریشان ہو رہی تھی اس نے شازیہ سے بھی پوچھا تھا کہ وہاں کتنی دیر لگنی چاہئے لیکن شازیہ بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکی تھی ہسپتال کا معاملہ تھا دیر تو لگ ہی سکتی تھی ڈاکٹر کب آتا ہے' کب ملتا ہے' کتنا انتظار کرواتا ہے کون جانے۔

وہ تینوں ہسپتال سے سیدھے خیر زماں کے گھر آئے اور ان کو دیکھ کر زرینہ کی جان میں جان آئی جو بہت زیادہ اضطراب و تشویش کا شکار ہو رہی تھی۔ شازیہ ابھی ذرا دیر پہلے ہی زرینہ کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی جب سب لوگ واپس آ گئے تو شازیہ بھی وہاں دوبارہ آ گئی تاکہ ان لوگوں سے معلوم کر سکے کہ ہسپتال میں کیا ہوا۔

دراز گل نے خوشی اور مسرت کے گہرے اظہار کے ساتھ ان لوگوں کو ساری تفصیلات بتائیں۔

"بس اب جا کر داخل ہو جانا ہے۔" اس نے آخر میں کہا۔ "داخلے کی پرچی بن گئی ہے اور ایک ہفتے کے بعد داخل کر لیا جائے گا۔ سارا بندوبست ہو گیا ہے۔ اب تو بس آپ لوگوں کی دعائیں چاہئیں شازیہ بی بی' خدا کرے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے' آپریشن کامیاب رہے اور خیر زماں پوری طرح سے صحت یاب ہو جائے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔" شازیہ نے کہا۔ "ڈاکٹر علی رضا بڑے اچھے اور مشہور ڈاکٹر ہیں اور ان کے آپریشن کامیاب ہی ہوتے ہیں عام طور سے اور یہ آپریشن بھی کامیاب ہو گا۔"

رات کو صغیر احمد خود ان لوگوں کے پاس آیا اور اس نے خیر زماں اور زرینہ سے بات کی۔ دونوں بہت خوش تھے اور وہ ان دونوں سے بات کر ہی رہا تھا کہ دراز گل بھی وہاں آن پہنچا۔ اس نے بتایا کہ وہ خاص طور سے صغیر احمد سے ملاقات کرنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آیا ہے۔

"ڈاکٹر علی رضا نے اس کو بہت اچھی طرح سے دیکھا' اور پھر بڑے ڈاکٹر کو بھی دکھایا۔ ڈاکٹر نقوی کو.........." دراز گل نے خوش ہوتے ہوئے صغیر احمد کو بتایا۔ "اور اب

وہ آپریشن کریں گے۔"

"چلو بہت اچھا ہوا کہ تمہارا کام ہو گیا۔" صغیر احمد نے کہا۔ "مجھے اس بات سے دلی خوشی ہوئی خدا نے چاہا تو اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

خیر زماں نے اگلے دن حاکم جان کو بھی اس بارے میں بتا دیا اور اسے اطلاع دی کہ صغیر احمد نے اس کی بہت مدد کی ہے اور اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے جناح ہسپتال میں اس کے آپریشن کا بندوبست کر دیا ہے۔

"اچھا؟" حاکم جان نے کسی گرم جوشی کے مظاہرے کے بغیر کہا۔ "تو .... کب ہو گا تمہارا آپریشن؟"

"ایک ہفتے کے بعد داخل کریں گے۔" خیر زماں نے کہا۔ "اور اس کے چند دن کے بعد آپریشن کریں گے۔"

"اور ہسپتال میں کتنے دن تک رہنا ہو گا؟" حاکم جان نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" خیر زماں نے کہا۔ "ان لوگوں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

حاکم جان خیر زماں کی غیر حاضری کے دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا یہ عرصہ کتنے دنوں پر مشتمل ہو گا؟ ان دنوں کے دوران ان کاموں کا کیا ہو گا جو خیر زماں کرتا ہے؟ کیا خیر زماں کو غیر حاضری کے دنوں کی تنخواہ دینی چاہئے یا نہیں۔

وہ خیر زماں کے آپریشن اور اس کی صحت کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا وہ کام سے اس کی غیر حاضری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

خیر زماں اس کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ تفصیلات سنا رہا تھا اور حاکم جان کا ذہن بہت ساری دوسری باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر علی رضا نے بھی خیر زماں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر عرفان علی کی دی ہوئی دوا کا استعمال برابر جاری رکھے اور اس میں بالکل غفلت سے کام نہ لے۔ چنانچہ وہ دوا بڑی پابندی کے ساتھ کھاتا رہا اور اس کے نتیجے میں سر کے درد کے دورے سے محفوظ رہا لیکن وہ ہر وقت ایک قسم کے خوف کا شکار رہتا تھا۔ درد کی لہر کسی وقت بھی اٹھ سکتی تھی اور اگر ایک بار یہ منحوس درد شروع ہو جاتا تو پھر نہ جانے کہاں جا کر دم لیتا۔ وہ بے چینی سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب اس کو اس درد سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے اور وہ پہلے کی

طرح چاق و چوبند ہو جائے اس کے دل و دماغ سے اس درد کا خوف ہمیشہ کے لئے مٹ جائے۔

دن ایک ایک کر کے یوں گزر گئے کہ احساس ہی نہیں ہوا اور خیر زماں کے ہسپتال جانے کا وقت آ گیا۔

خود دراز گل نے بھی حاکم جان سے خیر زماں کے داخلے اور آپریشن وغیرہ کے بارے میں بات کی تھی اور اس کو یہی بتایا تھا کہ اگرچہ ہسپتال کا بھاری خرچہ تو نہیں ہو گا لیکن دواؤں پر تو خود ہی پیسے خرچ کرنے ہوں گے لیکن حاکم جان کی طرف سے کسی مالی تعاون کی پیشکش نہیں کی گئی دراز گل کو اس بات کا بہت ملال ہوا لیکن اس نے حاکم جان سے کچھ نہیں کہا۔

دراز گل اور اس کی بیوی تاجور تو یہ چاہتے تھے کہ جتنے دن خیر زماں ہسپتال میں رہے اتنے دن زرینہ ان کے ساتھ چل کر ان ہی کے گھر میں رہے لیکن زرینہ نے اپنے ہی گھر میں رہنے کو ترجیح دی۔

"میں یہاں بھی اکیلی نہیں ہوں مامی۔" اس نے تاجور سے کہا۔ "شازیہ باجی ہیں صغیر چاچا ہیں یہ سب لوگ بھی تو میرے ساتھ ہیں۔ آپ لوگوں کو میں اب اور زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے اور خیر زماں نے پہلے ہی آپ لوگوں کو بہت پریشان کیا ہے۔ ماما کو کتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑی ہے اور ابھی تو اور بھی کرنی پڑے گی۔ خیر زماں ہسپتال میں ہو گا تو آپ ہی لوگ اس کی دیکھ بھال کریں گے۔ آپ نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔" اور اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔

اگلے دن صبح کو خیر زماں کو ہسپتال جانا تھا اور اس رات بہت دنوں کے بعد خیر زماں نے بڑی ہی شدت کے ساتھ اپنے گھر والوں کو یاد کیا۔

اس سے پہلے بھی وہ بارہا اپنے گھر والوں کو یاد کرتا رہا تھا اور کبھی کبھی تو دل میں بڑی ٹیسیں سی اٹھنے لگتی تھیں۔ اس کا اپنے گھر والوں سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اس کے والدین نے تو اس کی بات مان لی تھی اور دراز گل کے سمجھانے بجھانے کے نتیجے میں وہ لوگ زرینہ کو اپنی بہو بنانے پر راضی بھی ہو گئے تھے لیکن یہ تو زرینہ کے گھر والے تھے جنھوں نے بڑی سختی اور نفرت کے ساتھ اس پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔

"اگر میں اپنا گھر چھوڑ کر نہ آتا تو مجھے ہسپتال میں داخل ہونے کی' آپریشن کروانے

کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔" اس نے گہرے دکھ کے ساتھ سوچا۔ "تب .... تب میں اپنے گاؤں میں ہی رہتا اور میری زندگی کا وہی اسلوب رہتا جو کہ وہاں تھا۔"

"کیا سوچ رہے ہو خیر زماں؟" زرینہ نے اس کو کافی دیر سے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"سوچنے کے لئے تو بہت کچھ ہے زرینہ۔" اس نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر تمہارے والدین نے ماما کی بات مان لی ہوتی تو آج ہمارے حالات کتنے مختلف ہوتے ہم لوگ گاؤں میں ہی رہ رہے ہوتے اور ہمیں یہاں آنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔"

"لیکن مجھے یہاں آ کر اچھا لگا خیر زماں۔" زرینہ نے کہا۔ "یہاں آنے کے بعد مجھے صحیح معنوں میں اس بات کا اندازہ ہوا کہ دنیا کتنی بڑی ہے۔ گاؤں میں رہ کر تو دنیا بہت چھوٹی معلوم ہوتی ہے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا اور یہاں .... یہاں کراچی آ کر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا تو بہت بڑی ہے' اتنی بڑی کہ ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ ایک شہر ہی ایسا ہے جس میں آدمی ساری زندگی اِدھر سے اُدھر گھومتا رہے اور پھر بھی اس کو پورا نہ دیکھ سکے۔"

"ہاں۔ زرینہ یہ تو ٹھیک ہے۔" خیر زماں نے کہا۔ "یہاں آنے کے بعد ہی ہم کو معلوم ہوا کہ اصل میں دنیا کیسی ہے۔ وہاں رہ کر تو ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے .... لیکن میں سوچتا ہوں کہ اگر میرے والدین کو اس وقت یہ بات معلوم ہو جائے کہ میرے سر کا آپریشن ہونے والا ہے اور میری کھوپڑی کھولی جائے گی تو ان کا کیا حال ہو گا۔ اماں تو چیخیں مار مار کر رونے لگیں اور مجھے ہرگز اس بات کی اجازت نہ دیں کہ میں ہسپتال جاؤں اور آپریشن کرواؤں۔"

"ڈر تو مجھے بھی بہت لگ رہا ہے خیر زماں۔" زرینہ نے کہا۔ "مگر .... مگر کیا کروں۔ یہاں تو لوگ ڈاکٹروں کی بات مانتے ہیں بس ڈاکٹروں کی ہی مرضی چلتی ہے اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آپریشن کریں گے اور کوئی علاج نہیں ہے تمہاری بیماری کا۔"

"میں اپنی تکلیف کے بارے میں تم کو بتا ہی نہیں سکتا۔" خیر زماں نے کہا۔ "سر میں جب درد کی لہریں اٹھتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بس اب جان نکل جائے گی اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ سب کچھ دماغ سے نکل جاتا ہے' سوائے درد کے احساس کے اور پھر بے ہوشی طاری ہونے لگتی ہے اور درد کا احساس بھی مٹ جاتا ہے

پھر............ تو جیسے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔"

"خدا نے چاہا تو اب ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" زرینہ نے کہا۔ "آپریشن کے بعد تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے جب اتنے بڑے بڑے ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا تو پھر ضرور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ماما دراز گل تو کتنے عرصے سے کراچی میں رہ رہے ہیں اور یہاں کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں وہ کوئی غلط مشورہ نہیں دیں گے ہمیں ان کی بات ماننی ہی چاہئے۔"

"میرے ہسپتال جانے کے بعد تم زیادہ پریشان مت ہونا۔" خیر زماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے دباتے ہوئے کہا۔ "یہاں ماما اور مامی وغیرہ موجود ہیں سب لوگ ہیں تم اکیلی نہیں اور اپنے آپ کو اکیلا مت سمجھنا اور میں ان شاء اللہ بہت جلد ہی ٹھیک ٹھاک ہو کر واپس آ جاؤں گا۔"

"میں تو ایک ایک دن گنوں گی۔" زرینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کرے سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔"

"سب کچھ ٹھیک ہی رہے گا۔" خیر زماں نے کہا۔ "خدا نے چاہا تو میں بالکل ٹھیک ہو کر واپس آؤں گا۔"

اس رات وہ دونوں تنہائی میں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے' اپنے اپنے گاؤں کی باتیں' اپنے اپنے گھر والوں کی باتیں اپنے بچپن کی اور گزرے ہوئے دنوں کی' گاؤں میں گزاری ہوئی زندگی کی باتیں۔ بہت دنوں کے بعد انہوں نے اپنے گھروں کے بارے میں اتنی بہت ساری باتیں کی تھیں اور زرینہ کو خاص طور سے اس بات کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہو رہا تھا کہ وہ اب کبھی بھی اپنے گھر والوں سے نہیں مل سکے گی' ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکے گی۔

"وہ لوگ تو میری شکل بھی نہیں دیکھیں گے۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "اماں اور بابا.......... دونوں کو میں خوب جانتی ہوں۔ میری اماں تو صاف صاف کہتی تھیں کہ وہ تم سے میری شادی کرنے کے بجائے میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دیں گی وہ تو کسی حالت میں بھی اس رشتے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی تھیں اور اب وہ اس بات سے یقیناً بہت خوش ہوں گی کہ مجھ کو گولی مار دی جائے وہ تو مجھ کو برداشت کرنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں ہوں گی۔"

"معلوم نہیں ہم لوگوں کے وہاں سے چلے آنے کے بعد پھر ہمارے گھرانوں پر کیا گزری۔" خیر زماں نے آہستہ سے کہا وہ دونوں اس سے پہلے بھی اکثر اس موضوع پر آپس میں بات کر چکے تھے۔

"جو بھی گزری ہو گی گزر چکی ہو گی۔" زرینہ نے آہستہ سے کہا۔ "اب تو وہ لوگ بس اس تیاری میں لگے ہوئے ہوں گے کہ کب ان کو موقع ملے اور کب وہ ہم کو ختم کر دیں لیکن یہاں کراچی آ کر مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ ہمارے گاؤں میں۔"

"کام کرنے والے تو ہر جگہ اپنے لئے راستے بنا ہی لیتے ہیں۔" خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔ "اب جو ہو سو ہو۔ اللہ مالک ہے ہم کو تو جو کچھ کرنا تھا ہم نے کر ڈالا اب آگے جو ہماری تقدیر۔"

"ہاں .... جو ہماری تقدیر.........." زرینہ نے آہستہ سے کہا اور خیر زماں کے سینے پر سر رکھ دیا۔

☆======☆======☆

اگلی صبح کو خیر زماں ہسپتال کے لئے روانہ ہوا۔ دراز گل کے علاوہ دراز گل کے ساتھ کام کرنے والا ایک اور آدمی فضل اللہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ فضل اللہ تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا اس لئے دراز گل نے اس کو اپنے ساتھ لے لیا تھا تاکہ ذرا آسانی رہے۔ شہزاد کے لئے اسکول سے چھٹی کرنا دشوار تھا۔

زرینہ نے پُرنم آنکھوں کے ساتھ خیر زماں کو رخصت کیا اور جب وہ دراز گل اور فضل اللہ کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا گیا تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس وقت تاجور اس کے ساتھ تھی وہ اس کو دلاسہ دینے لگی۔

خیر زماں جب دراز گل اور فضل اللہ کے ساتھ ہسپتال پہنچا تو اس کا داخلہ ہو گیا اس کو وہاں کوئی دقت درپیش نہیں آئی۔ ڈاکٹر علی رضا نے پہلے ہی سارا بندوبست کروا دیا تھا۔ اس کو جنرل وارڈ میں ایک بستر پر لٹا دیا گیا۔

"پہلے تمہارے کچھ ٹیسٹ وغیرہ ہوں گے اور اس کے بعد تمہارا آپریشن ہو گا۔" ایک نرس نے اس کو بتایا۔

دراز گل اور فضل اللہ کو اب وہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی' دراز گل نے وارڈ

میں موجود ڈاکٹر سے پوچھ لیا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہو گی۔ ڈاکٹر نے اس کو بتایا کہ فی الحال کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن کچھ دوائیں وغیرہ بازار سے منگوانے کی ضرورت پیش آئے گی۔

"شام کو ملاقات کے وقت میرا بیٹا آئے گا۔" اس نے ڈاکٹر کو بتایا۔ "جس چیز کی بھی ضرورت ہو گی وہ لا دے گا۔" اور وہ اور فضل اللہ خیر زماں کو ہسپتال میں چھوڑ کر چلے آئے۔

شام کو ملاقات کے وقت شہزاد خیر زماں کے پاس آیا۔ دراز گل کو اس وقت آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی پی آئی بی کالونی سے جناح ہسپتال آنا بھی کوئی آسان نہیں تھا دو دو بسیں بدلنی پڑتی تھیں۔

خیر زماں ٹھیک ٹھاک تھا آج دن میں ڈاکٹر علی رضا نے بعض دوسرے ڈاکٹروں کے ساتھ اس کا تفصیلی معائنہ کیا تھا اور کچھ ٹیسٹ لکھے تھے۔

"ٹیسٹ کل ہوں گے۔" خیر زماں نے شہزاد کو بتایا۔ "ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ آپریشن کے بارے میں دو تین دن میں کوئی فیصلہ کریں گے۔"

خیر زماں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اس نے شہزاد کو بتایا کہ ابھی ڈاکٹر نے بازار سے منگوانے کے لئے کوئی دوا نہیں لکھی ہے۔

شہزاد کچھ دیر کے بعد چلا گیا اور خیر زماں اکیلا رہ گیا وہ اپنے آپ کو بالکل صحت مند اور ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا تھا اور اس کو یہ بات بہت عجیب سی لگ رہی تھی کہ وہ ہسپتال کے وارڈ میں ایک بستر پر پڑا ہوا تھا اسے تو کوئی تکلیف نہیں تھی بظاہر وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا کوئی بیماری نہیں تھی اس کو لیکن پھر بھی وہ یہاں ایک قیدی کی طرح بستر پر پڑا رہنے پر مجبور تھا۔

شہزاد نے یہاں سے جانے کے بعد خیر زماں کے بارے میں ساری باتیں اپنے گھر والوں کو اور زرینہ کو بتا دی تھیں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ تاہم زرینہ نے وہ رات بڑے ہی کرب اور اضطراب کے عالم میں گزاری اور ان دونوں کی گاؤں چھوڑنے کے بعد یہ پہلی رات تھی جب خیر زماں گھر پر موجود نہیں تھا اور زرینہ کو اس کے بغیر رہنا پڑ رہا تھا اگرچہ شازیہ کافی دیر تک اس کے پاس رہی تھی اور اس سے باتیں کرتی رہی تھی پھر بھی زرینہ بڑی بہت اداس اور ملول تھی۔ خیر زماں کے بغیر اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

نہ کھانا' نہ پینا' نہ سونا نہ جاگنا کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا ہر چیز میں ایک خلا تھا ایک بوجھل قسم کی محرومی کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نے دراز گل سے کہا تھا کہ اسے بھی ہسپتال لے جایا جائے خیر زماں کے پاس لیکن دراز گل نے اس کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ آپریشن سے پہلے خیر زماں کو کسی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ البتہ آپریشن کے بعد اس کو ایک تیماردار کی ضرورت تھی۔

"آپریشن کے بعد تم اس کو دیکھنے تو جا سکتی ہو لیکن تیماردار کی حیثیت سے تم وارڈ میں اس کے ساتھ رہ نہیں سکتیں۔" دراز گل نے اس کو سمجھایا۔ "اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مردانہ وارڈ ہے مردانہ وارڈ میں مریض کے ساتھ رات کے وقت کسی تیماردار عورت کو رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

زرینہ خاموش ہو گئی۔ دراز گل نے اس سے کہا۔ "وہ آپریشن والے دن اس کو ہسپتال لے جائے گا۔"

جس دن خیر زماں کا آپریشن تھا' اس دن دراز گل' تاجور اور زرینہ تینوں صبح ہی ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ انہیں آپریشن سے پہلے خیر زماں سے چند منٹ کی ملاقات کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ زرینہ نے کئی دن کے بعد خیر زماں کو دیکھا اور اس کے دماغ کو فوراً ہی جھٹکا لگا وہ تو خیر زماں کے اندر ہونے والی معمولی سے معمولی تبدیلی کو بھی فوراً ہی محسوس کر سکتی تھی اس نے دیکھا کہ خیر زماں پہلے کے مقابلے میں کچھ دبلا ہو گیا ہے۔ صرف چند دن میں اس کے وزن میں تھوڑی کمی ہو گئی تھی۔ زرینہ کو یہ بات معلوم تھی کہ خیر زماں کو تینوں وقت کا کھانا ہسپتال کی طرف سے ہی مل رہا ہے اور گھر سے کوئی کھانا بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف پھل وغیرہ گھر سے آ جاتے تھے۔

گزشتہ رات ہی دراز گل نے خود صغیر احمد اور شازیہ سے خاص طور پر ملاقات کر کے انہیں اب تک کی ساری تفصیلات بتا دی تھیں اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دے دی تھی کہ اگلے دن اس کا آپریشن ہو گا ویسے صغیر احمد کو حسین احمد نے بھی اس معاملے کی پیشرفت سے باخبر رکھا تھا۔ یہ طے پا گیا تھا کہ خیر زماں کا آپریشن ڈاکٹر نقوی خود کریں گے اور یہ امر ان سارے لوگوں کے لئے بہت زیادہ اطمینان و سکون کا باعث تھا ڈاکٹر نقوی کا شمار اس وقت ملک کے مایہ ناز نیورو سرجنوں میں ہوتا تھا اور عام طور سے اس کے سارے

آپریشن کامیاب ہوتے تھے۔ خیر زماں کے رشتے داروں کو تو اس بات کا کوئی خاص اندازہ تھا بھی نہیں لیکن صغیر احمد اور شازیہ وغیرہ یہی چاہتے تھے کہ آپریشن ڈاکٹر نقوی خود اپنے ہاتھ سے کریں' لیکن یہ ان کے انتخاب کا معاملہ نہیں تھا سرکاری ہسپتال میں آپریشن ہونے والا تھا سرکاری خرچ پر تو کوئی بھی ڈاکٹر جو ڈیوٹی پر ہو یہ آپریشن کر سکتا تھا وہ ڈاکٹر نقوی بھی ہو سکتا تھا اور کوئی اور ڈاکٹر بھی۔ خیر زماں کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے حصے میں ڈاکٹر نقوی آیا۔

جب خیر زماں کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا تو زرینہ' دراز گل اور تاجور باہر موجود تھے اندر خیر زماں کا آپریشن ہو رہا تھا اور باہر لبوں پر اس کی صحت یابی کی دعائیں اور التجائیں تھیں۔

زرینہ اس وقت خود کو شدید بے بسی کا شکار پا رہی تھی۔ خیر زماں زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر رہا تھا لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی' اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اگر وہ اپنے گاؤں میں ہوتی تو آپریشن اس کے لئے ایک واقعہ قتل سے کم سنگین نوعیت کا حامل نہ ہوتا لیکن شہر آنے کے بعد تو بہت ساری چیزوں سے مفاہمت کرنی پڑی تھی۔ بہت ساری ان باتوں کو قبول کرنا پڑا تھا جن کے بارے میں پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

حسین احمد نے ڈاکٹر علی رضا کے حوالے سے صغیر احمد کو پہلے ہی یہ بات بتا دی تھی کہ یہ ایک خاص اور نازک آپریشن تھا اور اس میں کافی وقت لگ سکتا تھا تاہم اس نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ اس کی کامیابی کے قوی امکانات موجود تھے۔

اندر کیا ہو رہا تھا اس سے بالکل بے خبر زرینہ' تاجور اور دراز گل باہر بیٹھے ہوئے انتظار کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ زرینہ کے لئے یہ بہت ہی کڑا وقت تھا وہ تو جیسے امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا تھی اس کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں اور وہ اپنی چادر کے پلو سے انہیں بار بار خشک کرتی جا رہی تھی۔

آپریشن میں تقریباً تین گھنٹے لگے اور باہر بیٹھے ہوئے لوگ انتظار کرتے کرتے تھک کر نڈھال ہو گئے تھے زرینہ کے لئے تین گھنٹے جیسے تین صدیوں کے برابر تھے۔ اس کے لئے تو ایک ایک لمحہ جیسے سولی پر گزر رہا تھا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرانے لگی

تھیں۔

تقریباً تین گھنٹے کے بعد ان لوگوں کو یہ اطلاع ملی کہ خیر زماں کا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے لیکن ان کو اندر جا کر اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی ان کو بتایا گیا کہ مریض کو آپریشن تھیٹر سے نکال کر انتہائی نگہداشت کے کمرے میں رکھ دیا گیا ہے جہاں سے ایک یا دو گھنٹے کے بعد اس کو وارڈ میں بھیجا جائے گا یہ بات پہلے ہی بتا دی گئی تھی کہ آپریشن کے بعد مریض کے ساتھ کسی تیماردار کا رہنا ضروری ہے تاکہ وہ اس کی دیکھ بھال کر سکے۔

کافی دیر کے بعد ڈاکٹر علی رضا نے آ کر ان لوگوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ خیر زماں کا آپریشن مکمل طور سے کامیاب رہا ہے۔

"جو خرابی تھی اس کو دور کر دیا گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "اور اب ان شاء اللہ اس کے سر میں کبھی بھی درد نہیں ہو گا۔"

وہ تینوں بڑے غور سے ڈاکٹر کی بات سن رہے تھے۔

"شکر ہے کہ یہ آپریشن وقت پر ہو گیا۔" ڈاکٹر علی رضا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جتنی زیادہ دیر ہوتی جاتی اتنے ہی زیادہ کامیابی کے امکانات میں کمی واقع ہوتی جاتی۔ ڈاکٹر کا کام زیادہ سے زیادہ مشکل ہوتا جاتا۔"

"تو .... اب یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب؟" دراز گل نے پُرامید لہجہ میں ڈاکٹر علی رضا سے پوچھا۔

"ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈاکٹر علی رضا نے کہا۔ "تقریباً دو ہفتے کے بعد ہم اس کو چھٹی دے دیں گے۔ اس کے بعد اس کو گھر جا کر بھی تقریباً دو ہفتے تک مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد سے یہ اپنا کام وغیرہ شروع کر سکتا ہے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ شروع شروع میں بہت زیادہ محنت کے کام سے بچے ہلکی پھلکی محنت کی حد تک تو بات ٹھیک ہے لیکن بھاری جسمانی محنت سے کچھ دن تک پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔"

زرینہ نے ڈاکٹر علی رضا سے خود تو کوئی سوال نہیں پوچھا لیکن اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو انتہائی غور اور توجہ کے ساتھ سنا اس کا سارا وجود جیسے مسرت اور شادمانی کی شیرینی سے بھر گیا تھا۔

آپریشن سے پہلے خیر زماں کے سر کے سارے بال اتار دیئے گئے تھے اور اس کے

سر کی چکنی چکنی جلد چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ آپریشن کے کئی گھنٹے کے بعد جب اس کو وارڈ میں لایا گیا تو اس کی شکل اس قدر بدلی ہوئی لگ رہی تھی کہ زرینہ بھی اس کو بمشکل پہچان سکی۔ وہ اس وقت نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا لیکن نام لے کر آواز دینے پر ہلکی سی آنکھیں کھولتا تھا جس سے اس بات کا صاف طور پر اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ سن اور سمجھ سکتا ہے اور یہ کہ اس کے حواس کام کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس کے آپریشن کی کامیابی کی دلیل تھی۔

تاجور اور زرینہ مریض کے پاس ٹھہری رہیں تاجور کسی بھی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی اہل تھی وہ عرصہ دراز سے کراچی میں رہ رہی تھی اس شہر سے بخوبی واقف تھی اور زبان بھی پوری طرح جانتی تھی۔ دراز گل واپس چلا گیا رات کو جب دراز گل دوبارہ واپس آیا تو اس اہتمام کے ساتھ آیا تھا کہ اس کو رات مریض کے ساتھ ہی گزارنی تھی شہزاد بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔

"صغیر احمد صاحب اور شازیہ ہمارے گھر آئے تھے۔" دراز گل نے ان دونوں کو بتایا۔ "وہ آپریشن کے بارے میں پوچھ رہے تھے میں نے ان کو بتایا کہ خیر زماں کا آپریشن کامیاب رہا ہے اور ڈاکٹر علی رضا کا کہنا ہے کہ ان شاء اللہ وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا اس پر وہ دونوں بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بہت بہت مبارک باد دی ہے۔"

"یہ سب کچھ تو انہی کی مہربانی کی بدولت ہے۔" تاجور نے کہا۔ "ان لوگوں نے بہت خیال کیا خدا انہیں خوش رکھے۔"

خیر زماں کو نیند کے انجکشن دیئے جا رہے تھے اور اگرچہ وہ ہوش میں آ چکا تھا لیکن اس پر غنودگی طاری تھی ابھی تک اسے کچھ کھانے پینے کے لئے بھی نہیں دیا گیا تھا۔

زرینہ اور تاجور شہزاد کے ساتھ گھر واپس چلی گئیں اور دراز گل مریض کے پاس رہا۔ اسے آج کی رات مریض کے ساتھ ہی گزارنی تھی۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ کم از کم آج کی رات کسی کا مریض کے ساتھ رہنا ضروری تھا کیونکہ آج ہی تو آپریشن ہوا تھا۔

خیر زماں آواز دینے پر آہستہ سے آنکھ کھول کر دیکھ لیتا تھا اور بہت ہی ہلکی اور دھیمی آواز میں کچھ بول بھی لیتا تھا لیکن پھر اس کے فوراً بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگتی تھی اور اس کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔

دراز گل اس کے پاس موجود تھا اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک نوجوان ڈاکٹر نے اس

کے پاس آ کر اس کا معائنہ کیا تھا اور دراز گل کے استفسار پر بتایا تھا کہ اس کی حالت ٹھیک ٹھاک ہے۔

دراز گل نے وہ رات خیر زماں کے پاس ہی گزاری۔ بڑی مشکل رات تھی کہ وہ ٹھیک سے سو سکتا تھا نہ ٹھیک سے جاگ سکتا تھا۔ مریض کا خیال رکھنا بھی ضروری تھا اور سونے کا کوئی مناسب بندوبست بھی نہیں تھا۔ بہرحال اس نے جیسے تیسے کر کے وہ رات گزار لی اور صبح کو طے شدہ پروگرام کے مطابق فضل اللہ وہاں آ گیا۔ دراز گل واپس گھر چلا گیا۔

یہ صرف دو دن کی تکلیف تھی اس کے بعد تو خیر زماں تیزی کے ساتھ صحت یاب ہونے لگا۔ صرف دو راتیں ایسی تھیں جب کسی کو اس کے ساتھ رہنے کی ضرورت تھی اور ان دو راتوں میں سے ایک رات تو دراز گل اس کے ساتھ رہا اور دوسری رات شہزاد۔

زرینہ تقریباً روزانہ ہی شام کو اس کو دیکھنے کے لئے آیا کرتی تھی کبھی دراز گل کے ساتھ کبھی شہزاد کے ساتھ اور ایک دن تو وہ اور تاجور دونوں اکیلی آئی تھیں اور پھر ایک دن شازیہ اور صفیہ اس کے ساتھ آئی تھیں۔

شازیہ اور صفیہ کو دیکھ کر خیر زماں کی آنکھوں میں ممنونیت کے آنسو آ گئے یہی تو وہ لوگ تھے اس کے اپنے لوگ .... اس کے اپنے نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے تھے' اپنوں سے زیادہ اپنے لوگ' جنہوں نے اس کو ایک طرح سے نئی زندگی عطا کی تھی۔ اس کا رواں رواں ان مہربان اور نیک دل لوگوں کا احسان مند تھا۔

خیر زماں کا آپریشن پوری طرح کامیاب رہا تھا اور اس کی کوئی بھی حس اور کوئی بھی قوت ذرا سی بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ مکمل طور پر ایک نارمل آدمی تھا چوٹ لگنے کی وجہ سے جو خرابی پیدا ہو گئی تھی وہ نیورو سرجن نقوی کے ماہر ہاتھوں نے دور کر دی تھی اور اس کو بالکل ٹھیک کر دیا تھا۔

"یہ خرابی اب ہمیشہ کے لئے دور ہو گئی ہے۔" ڈاکٹر نقوی نے دراز گل سے باتیں کرتے ہوئے اس کو بتایا۔ "خیر زماں کے سر میں اب کبھی بھی اس قسم کا درد نہیں ہو گا اور اس خرابی کے دوبارہ نمودار ہونے کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔ وہ اب ٹھیک رہے گا۔" اس نے یہ ساری باتیں دراز گل کے سوالوں کے جواب میں کہی تھیں۔

"خیر زماں بہت خوش قسمت ہے کہ اس کا وقت پر آپریشن ہو گیا۔" ڈاکٹر نقوی نے

کہا۔ ”اس معاملے میں اگر زیادہ دیر ہو جاتی تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔“

خیر زماں کو تقریباً دو ہفتے تک ہسپتال میں رہنا پڑا اور اس کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو کر گھر آ گیا تاہم ڈاکٹروں نے اس کو تقریباً دو ہفتے تک مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

خیر زماں کے آپریشن سے پہلے ہی دراز گل نے حاکم جان کو اس کے بارے میں ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ اس کے علاج میں اگرچہ آپریشن اور ڈاکٹروں کا خرچہ تو شامل نہیں ہو گا لیکن دوائیں بہرحال اپنے پاس سے منگوانی ہوں گی اور دواؤں کا خرچہ بھی اچھا خاصہ ہو جائے گا تاہم حاکم جان نے اپنی طرف سے کسی قسم کی مدد کی پیشکش نہیں کی، یہی نہیں اس نے خیر زماں کو پیسے دینے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا مہینہ پورا ہونے میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا جب خیر زماں اپنا کام چھوڑ کر ہسپتال میں داخل ہوا۔

حاکم جان نے اس کو پورے مہینے کی تنخواہ دے دی اور اشارتاً یہ بات بتا دی کہ اس کی اگلی تنخواہ کا حساب اس دن سے شروع ہو گا جس دن سے وہ دوبارہ اپنا کام شروع کرے گا لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ فی الحال اس نے دوسرے آدمی کو رکھ لیا ہے کیونکہ اس کو تو شاید ابھی لمبے عرصے تک آرام کی ضرورت ہو گی خیر زماں نے اس سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔

آپریشن کے بعد بھی جبکہ خیر زماں تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا دراز گل نے اس کے بارے میں حاکم جان کو بتایا لیکن حاکم جان نے کسی خاص دلچسپی اور گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا اس کا رویہ محتاط تھا وہ اس بات کا مکمل اطمینان حاصل کئے بغیر کہ خیر زماں کام کرنے کے قابل ہے اور اس کی صحت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اس کو دوبارہ کام پر واپس لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

حاکم جان ایک بار بھی خیر زماں کو دیکھنے ہسپتال نہیں گیا تھا وہ صرف دراز گل سے ہی اس کی خیریت معلوم کر لیتا تھا اور اس کو کافی سمجھتا تھا۔

اور پھر خیر زماں بالکل ٹھیک ہو کر ہسپتال سے گھر واپس آ گیا دراز گل نے بڑی ہی خوشی کے ساتھ حاکم جان کو یہ خبر سنائی کہ ڈاکٹر نقوی نے اسے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ خیر زماں کو اب دردِ سر کی وہ تکلیف دوبارہ کبھی نہیں ہو گی اور اب وہ صحت مند رہے گا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ حاکم جان نے خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ابھی تو اس کو مہینوں آرام کرنے کی ضرورت ہو گی۔“

دراز گل اس کا مطلب سمجھ گیا تھا وہ فوری طور پر اس کو کام پر واپس لینے کے ارادے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا دراز گل کو بھی اس کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

خیر زماں جب ہسپتال میں ہی تھا اور ڈاکٹروں نے اس کے بارے میں دراز گل کو یقین دلا دیا تھا اب وہ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے تو اس وقت دراز گل نے خیر زماں کے بارے میں کچھ اور سوچ لیا تھا۔

خیر زماں گزشتہ کئی ماہ سے منڈی میں کام کر رہا تھا اور اب وہ یہاں پھلوں کے کاروبار کے سلسلے میں سارے معاملات سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکا تھا وہ ذہین اور ہوشیار نوجوان تھا اور اس میں محنت کرنے اور آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ وہ ترقی کرنا چاہتا تھا۔

دراز گل کے لئے یہ قطعی ممکن تھا کہ وہ خیر زماں کو اپنے پاس ملازم رکھ لیتا وہ اسے اس سے زیادہ پیسے دے سکتا تھا جتنے کہ حاکم جان اس کو دیتا تھا لیکن وہ خیر زماں کو اپنے پاس ملازم نہیں رکھنا چاہتا تھا ماموں اور بھانجے کی رشتہ داری کا جو تعلق تھا اس کو وہ کاروباری تعلق میں تبدیل نہیں کرنا چاہتا تھا اور خود تاجور بھی اس بات کے حق میں نہیں تھی۔

دراز گل نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ خیر زماں کو خود اپنا کاروبار کروائے گا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں اس کی مدد کرے گا۔ خیر زماں کے اندر اتنی صلاحیت موجود تھی کہ وہ اپنا الگ اور آزادانہ کاروبار کر سکتا تھا اور دراز گل کو یقین تھا کہ وہ جلد ہی اپنے قدم جما لے گا۔

اس نے تاجور سے بھی اس بارے میں بات کر لی تھی اور تاجور خود بھی یہی چاہتی تھی کہ خیر زماں اپنے سگے ماموں کے پاس ملازم کے طور پر کام نہ کرے اس نے اس خیال کو بہت پسند کیا تھا کہ خیر زماں اپنا آزادانہ کاروبار شروع کر دے۔

چنانچہ جب خیر زماں ہسپتال سے گھر واپس آیا تو دراز گل نے اس سے اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بات کی۔

”حاکم جان نے تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔“ اس نے خیر زماں سے کہا۔ ”لیکن میں اس کو الزام بھی نہیں دیتا۔ یہ تو کاروباری دنیا ہے اور کاروباری دنیا میں آدمی سب سے پہلے اپنے کاروباری فائدے کو دیکھتا ہے۔ کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے بارے میں بھی سنجیدگی اور بے لوثی کے ساتھ سوچتے ہوں۔“

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ماما۔" خیر زماں نے کہا۔ "اس لئے میں نے حاکم جان سے کوئی شکایت نہیں کی اب جب میں کام کرنے کے قابل ہو جاؤں گا اور پوری طرح سے صحت یاب ہو جاؤں گا تو پھر اس سے کہوں گا کہ میں اس کے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"نہیں خیر زماں۔" دراز گل نے کہا۔ "اب تم اس کے لئے کام نہیں کرو گے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ تم کما کما کر دوسروں کی جیبیں بھرتے رہو اب تم حاکم جان کے لئے نہیں کماؤ گے۔"

"کیا مطلب؟" خیر زماں نے چونک کر پوچھا۔ "آپ چاہتے ہیں کہ اب میں حاکم جان کے لئے کام نہ کروں؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے میرے لئے کسی دوسری جگہ کام تلاش کر لیا ہے۔"

"نہیں خیر زماں۔" دراز گل نے کہا۔ "میں نے تمہارے لئے کہیں اور کام تلاش نہیں کیا ہے تم اب کہیں بھی نوکری نہیں کرو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ٹھیک ہو جانے کے بعد تم خود اپنا کاروبار کرو........... آزادنہ کاروبار..........."

"آزادنہ کاروبار' اپنا کاروبار؟" خیر زماں نے حیرت اور خوشی کے عالم میں کہا۔ "مگر .... یہ کیسے ممکن ہے ماما؟ میں تو........... میرا مطلب ہے..........."

"اس میں مشکل کیا ہے؟" دراز گل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں منڈی میں کام کرتے ہوئے کئی مہینے ہو گئے ہیں اور تم پھلوں کے کاروبار کے بارے میں سب کچھ بہت اچھی طرح سے جان گئے ہو تم اپنا الگ کاروبار شروع کر سکتے ہو میں تمہاری پوری مدد کروں گا کہ تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمہیں ایک چھوٹی سی جگہ دلوا دوں گا۔ مال کی تم فکر مت کرو۔ جتنا چاہو گے اتنا دلوا دوں گا۔ اطمینان سے اپنا کاروبار کرو' کاروبار کے میدان میں اپنی جگہ بناؤ کسی کی ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ تو .... یہ تو .... بہت بڑی بات ہو جائے گی ماما۔" خیر زماں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ "میں .... میں اپنا کاروبار کر سکوں گا؟ کیا واقعی!"

"ارے .... تو اس میں مشکل کیا ہے اور یقین نہ آنے کی کون سی بات ہے؟" دراز گل نے کہا۔ "کیا لوگ اپنا کاروبار کرتے نہیں ہیں؟ میں بھی تو اپنا کام کر رہا ہوں۔ حاکم جان بھی تو اپنا کاروبار کر رہا ہے۔ سینکڑوں لوگ اپنا کاروبار کر رہے ہیں تم بھی اگر اپنا

کاروبار شروع کر دو گے تو کون سی نئی بات ہو گی؟"

"بات یہ ہے ماما کہ میں نے تو کبھی اس چیز کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہاں آنے سے پہلے میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ میں کوئی کاروبار بھی کر سکوں گا۔ میں نے تو صرف محنت مزدوری کے چھوٹے موٹے کاموں کے بارے میں سوچا تھا۔"

"اور اب .... جبکہ تم یہاں آ گئے تو زیادہ سے زیادہ بڑے کاموں کے بارے میں سوچو۔" دراز گل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چھوٹے موٹے کاموں کے بارے میں مت سوچو تم بڑے کام بھی تو کر سکتے ہو۔"

"بس خدا مجھے صحت دے۔" خیر زماں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ کام تو میں کر سکتا ہوں۔"

خیر زماں فی الحال گھر پر ہی تھا اور آرام کر رہا تھا ابھی کچھ دن تک اس کو آرام ہی کرنا تھا۔ وہ زیادہ تر گھر کے اندر ہی رہتا تھا اور کسی کسی وقت تھوڑی بہت چہل قدمی کے لئے باہر نکل جاتا تھا۔

شازیہ تو روز ہی اس کے گھر آتی تھی اور وہ زرینہ کو پڑھا رہی تھی زرینہ پڑھنے لکھنے میں اور اردو سیکھنے میں بڑی گہری دلچسپی لے رہی تھی اور اپنے فارغ وقت میں وہ زیادہ سے زیادہ لکھنے اور پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ خود کو اس نئی دنیا کا حصہ بنا لینا چاہتی تھی جہاں اب وہ رہتی تھی اور جہاں سے اب اس کو کہیں اور نہیں جانا تھا۔ اب تو کراچی ہی اس کا سب کچھ تھا یہی وہ شہر تھا جہاں اس کو اپنے شوہر کے ساتھ اپنی بقیہ زندگی گزارنی تھی یہیں اس کو جینا اور مرنا تھا اور وہ اس شہر کی فضاؤں میں اپنے آپ کو جذب کر دینا چاہتی تھی۔

وہ دیکھتی تھی کہ دراز گل اور اس کے بیوی بچے کس طرح سے اس شہر کی زندگی میں شامل ہو کر یہیں کا حصہ بن چکے تھے۔ اب کراچی ہی ان کا شہر تھا اور ان کی ساری امیدیں اور تمنائیں اسی شہر سے وابستہ تھیں۔ دراز گل اور تاجور کے بچے آس پاس رہنے والے دوسرے بچوں اور اپنے اسکول کے ساتھیوں سے کسی طرح مختلف نہ تھے نہ لباس کے اعتبار سے نہ زبان کے اعتبار سے نہ رہن سہن کے اعتبار سے۔ ان میں اور دوسرے بچوں میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا تھا۔

زرینہ خود بھی ایسی ہی بن جانا چاہتی تھی۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ وہ اب اپنے گاؤں تو کبھی بھی واپس نہیں جا سکے گی نہ اپنے گاؤں نہ خیر زماں کے گاؤں اس کے علاقہ میں تو صرف موت اس کی منتظر تھی۔ اس کی بھی اور خیر زماں کی بھی۔

اس لئے جب زرینہ کو یہ معلوم ہوا کہ دراز گل ایسا منصوبہ بنا رہا ہے کہ خیر زماں کراچی کی سبزی منڈی میں پھلوں کا اپنا کاروبار شروع کر دے تو اس کو بہت زیادہ خوشی ہوئی وہ تو اب اس شہر میں اپنی جڑیں جمانا چاہتی تھی۔ اور اگر خیر زماں نوکری کے بجائے اپنا کاروبار کرے تو اس سے زیادہ اچھی بات بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔

تاہم دراز گل نے خیر زماں کو منع کر دیا تھا کہ وہ ابھی اس کے بارے میں کسی اور کو کچھ نہ بتائے۔

"جب تک سارا ٹھیک ٹھاک بندوبست نہ ہو جائے اس وقت تک کسی کو اس کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے خیر زماں سے کہا۔ "کام شروع ہونے سے پہلے ہی بات پھیل جائے تو یہ اچھا نہیں ہے۔"

"ہاں ماما۔" خیر زماں نے اس سے اتفاق کیا۔

صغیر احمد اور صفیہ دو بار خیر زماں کو دیکھنے کے لئے ہسپتال گئے تھے اور خیر زماں اور زرینہ ان کے بے حد ممنون تھے اس ممنونیت کا اظہار وہ لوگ متعدد طریقوں سے کیا کرتے تھے لیکن پھر بھی ان کو یہ احساس تھا کہ وہ اپنے محسنوں کا پوری طرح سے شکریہ ادا نہیں کر پاتے ہیں۔

حاکم جان نے خیر زماں کی جگہ دوسرا آدمی رکھ تو لیا تھا لیکن وہ آدمی اسے زیادہ پسند نہیں تھا۔ خیر زماں کی تو بات ہی کچھ اور تھی وہ بہت ذہین اور ہوشیار ہونے کے ساتھ بے حد ذمہ دار اور فرض شناس بھی تھا وہ سارے کام کو اتنی اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ حاکم جان کو اس سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی تھی۔ وہ خود اپنے کام کو اچھی طرح سے کر لیتا تھا۔

یہ بات حاکم جان کے علم میں تھی کہ دوسری مرتبہ درد سر کے دورے کے بعد خیر زماں کو کوئی تیسرا دورہ نہیں پڑا تھا۔ ڈاکٹر عرفان علی کی دوا سے اس کے دورے رکے ہوئے تھے اور اب تو اس کا آپریشن بھی ہو چکا تھا۔ بہت بڑا اور خطرناک قسم کا آپریشن' جس کے بعد ڈاکٹر نقوی جیسے مشہور و معروف نیورو سرجن نے یہ بات کہہ دی تھی کہ اب

اس کو ایسی کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

حاکم جان یہ سوچ رہا تھا کہ خیر زماں کے ٹھیک ہو جانے کے بعد وہ کچھ عرصے کے لئے آزمائشی طور پر اسے اپنے ساتھ کام پر لگا لے کم پیسوں پر۔ وہ اس سے کہہ سکتا تھا کہ اب چونکہ وہ نئے سرے سے کام شروع کر رہا ہے اور اس کو ذمہ داری بھی کم دی جا رہی ہے اس لئے اس کو فی الحال پیسے بھی کم ملیں گے۔

خیر زماں کے آرام کے دن گزر چکے تھے اس دوران وہ ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرتا رہا تھا اور چیک اپ کے لئے ڈاکٹر کے پاس ہسپتال بھی جاتا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے تفصیلی معائنے کے بعد اس کو بالکل ٹھیک ٹھاک قرار دے دیا تھا اور اس سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ معمول کے مطابق اپنی سرگرمیاں شروع کر سکتا ہے۔

"کچھ عرصے تک بہت زیادہ محنت کے کاموں سے پرہیز کرو۔" ڈاکٹر نقوی نے اس کو ہدایت دی تھی اور خیر زماں کی عمر صحت اور حالت کو دیکھتے ہوئے ان کاموں کی وضاحت بھی کر دی تھی۔

اس روز حاکم جان خیر زماں سے ملنے کے لئے اس کے پاس اس کے گھر پہنچا خیر زماں کو تعجب بھی ہوا حاکم جان اس تمام عرصہ کے دوران صرف ایک بار ذرا سی دیر کے لئے اس کے گھر آیا تھا اس وقت جب کہ خیر زماں ہسپتال سے گھر آ گیا تھا اس کے بعد سے تو پھر وہ کبھی آیا ہی نہیں۔ صرف دراز گل سے اس کی خیریت معلوم کر لیتا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے خیر زماں؟" حاکم جان نے بڑے دوستانہ اور خوشگوار انداز میں س سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" خیر زماں نے جواب دیا۔ "بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں اور ڈاکٹروں نے ھ سے کہہ دیا ہے کہ اب میں کبھی بھی اس قسم کے درد کا شکار نہیں ہوں گا اور میں خود ھی اپنے آپ کو بالکل ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا ہوں۔"

"پھر تو بہت اچھا ہے۔" حاکم جان نے کہا۔ "پھر ایسا کرو کہ کچھ تھوڑا بہت کام روع کر دو کل دن میں آ جاؤ اور جو کچھ مال رکھا ہوا ہے اس کا ذرا حساب تاب........"

"نہیں ماما۔" خیر زماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں اب آپ کے پاس ام نہیں کروں گا۔"

خیر زماں کا جواب ایسا سپاٹ سرد اور حاکم جان کے لئے غیر متوقع تھا کہ حاکم جان اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ فوری طور پر تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ خیر زماں کیا کہہ رہا ہے۔ وہ کام سے انکار کر رہا ہے۔

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ "تم .... ابھی کام نہیں کرنا چاہتے؟"

"میں نے ابھی اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔" خیر زماں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "کچھ دنوں بعد ہی میں طے کروں گا کہ مجھ کو کیا کرنا ہے۔"

"لیکن .... تم کبھی نہ کبھی تو کام کرو گے؟" حاکم جان نے کہا۔ "کسی نہ کسی کے پاس.........."

"میں اس کے بارے میں سوچوں گا۔" خیر زماں نے کہا۔ "اور پھر.......... آپ کو تو میری ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے تو آدمی رکھ لیا ہے جو آپ کے پاس کام کر رہا ہے آپ کیوں مجھ کو بلا رہے ہیں؟"

"وہ .... آدمی تو ہے .... ٹھیک ہے .... لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تم بھی اپنی پرانی جگہ پر واپس آ جاتے تو زیادہ اچھا تھا۔ تم سارے کام سے بخوبی واقف ہو سب کام کر سکتے ہو اور پھر تم کو کام کی ضرورت بھی ہے۔"

"میں ابھی آپ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔" خیر زماں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "بہتر ہو گا کہ آپ میرا آسرا نہ کریں اور جس آدمی کو آپ نے کام پر لگایا ہوا ہے اس سے کام لیتے رہیں۔"

حاکم جان مایوسی اور حیرت کا شکار ہوا اسے تو پوری توقع تھی کہ جب وہ خیر زماں سے دوبارہ کام پر واپس آنے کی بات کرے گا تو خیر زماں خوشی کے مارے پاگل ہو جائے گا اور خود میرے آگے اظہار تشکر کرے گا لیکن یہاں تو معاملہ بالکل برعکس نکلا۔ خیر زماں نے تو بڑی سرد مہری کے ساتھ اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔

حاکم جان کچھ دیر کے بعد وہاں سے چلا گیا جاتے وقت وہ خیر زماں سے ایک بار پھر یہ بات کہہ گیا تھا کہ وہ اس کی اس پیشکش کو قبول کر لے اور اس کے پاس کام کرنے کے لئے آ جائے خیر زماں نے اس کو اپنے اصل منصوبے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

خیر زماں کام کے قابل ہو گیا اور اس کے آرام کے دن ختم ہوئے تو دراز گل نے حسب وعدہ اس کے لئے فروٹ منڈی میں ایک چھوٹی سی جگہ کا بندوبست کر دیا اس جگہ

کے حصول کے لئے دراز گل کو اپنے اثر و رسوخ کے استعمال کے علاوہ کچھ رقم بھی خرچ کرنی پڑی تھی اور اس نے رقم خرچ کر دی تھی۔ خیر زماں کے لئے یہ رقم بطور قرض کے تھی جسے اس کو بعد میں کاروبار چل جانے کی صورت میں اتار دینا تھا۔

جیسے ہی خیر زماں نے اپنا الگ کاروبار شروع کیا حاکم جان کو فوراً ہی اس کی اطلاع مل گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کو اس بات کا افسوس ہوا خیر زماں ایک بہت اچھا اور باصلاحیت کارکن تھا اگر وہ اس کے ساتھ رہتا تو اس کے کاروبار میں اضافے اور فروغ کا سبب بنتا لیکن اب تو وہ بات ہی ختم ہو گئی تھی۔ پہلے تو حاکم جان کا خیال تھا کہ شاید دراز گل نے خیر زماں کو اپنے ساتھ لگا لینے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور خیر زماں تو اب الگ کاروبار کرے گا۔ حاکم جان اس بات سے بالکل خوش نہیں ہوا۔

خیر زماں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا اور بڑی محنت اور تندہی کے ساتھ اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کی وہ اب زیادہ وقت اپنی کاروباری سرگرمیوں کو دیتا تھا پچھلے چند ماہ کے دوران اس نے منڈی میں کام کا جو تجربہ حاصل کیا تھا اس کو اب وہ اپنے کاروبار کے فروغ کے لئے استعمال کر رہا تھا۔

زرینہ اس نئی صورت حال سے بہت مطمئن تھی جب حاکم جان کے ساتھ خیر زماں کے معاملات خراب ہو گئے تھے تو زرینہ کو بعض اوقات بڑا ڈر لگتا تھا وہ ان دنوں دہرے خوف کا شکار تھی ایک تو اس کو خیر زماں کی بیماری کی طرف سے پریشانی تھی اور دوسرے وہ اس کے روزگار کی جانب سے بھی پریشان تھی۔ نہ جانے کام کا کیا ہو گا۔ اور اب سارے ہی مسائل حل ہو گئے تھے۔ خیر زماں صحت یاب ہو چکا تھا اور اب وہ اپنا کاروبار کر رہا تھا۔

خیر زماں نے مقابلے اور بھاگ دوڑ کی اس دنیا میں بڑی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بنانی شروع کر دی تھی اس کا کام اچھا خاصہ چل نکلا تھا اور جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ دراز گل نے اس کو کتنا اچھا مشورہ دیا تھا۔ حاکم جان کی ملازمت میں اس کو ماہانہ جتنے پیسے ملتے تھے اس سے زیادہ وہ اپنے کاروبار میں کما رہا تھا اور کمائی میں مزید اضافہ کی امید تھی۔

ایک نئی زندگی شروع ہو چکی تھی خیر زماں اور زرینہ دونوں ہی اس نئی زندگی کا حصہ بنتے جا رہے تھے اس میں شامل ہوتے جا رہے تھے اور خود بدلتے جا رہے تھے اور دنیا کو اپنے ساتھ بدلتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

تاجور موجودہ صورت حال سے بہت مطمئن تھی خیر زماں کی نہ صرف یہ کہ جان بچ گئی تھی بلکہ وہ کام کرنے کے قابل بھی تھا اور آئندہ ایک عام انسان کی حیثیت سے زندگی گزار سکتا تھا۔ یہ امر تاجور کے لئے اس لحاظ سے بہت زیادہ اطمینان بخش تھا کہ اس کو زرینہ کا بوجھ نہیں اٹھانا پڑ رہا تھا وہ تو اس خیال سے بہت پریشان تھی کہ اگر خدانخواستہ خیر زماں بیمار ہو کر کسی معذوری کا شکار ہو گیا اور کام کاج کے قابل نہیں رہا تو پھر زرینہ کا کیا ہو گا۔ اس کی کفالت کی ذمہ داری تو پھر صرف دراز گل پر ہی آن پڑے گی کیونکہ اور کوئی تو زرینہ کے سر پر ہاتھ رکھنے والا تھا ہی نہیں۔ اس کے اپنے تو اس کے خون کے پیاسے تھے اور وہ اپنے علاقے میں واپس جا بھی نہیں سکتی تھی۔

خیر زماں کا کام بہت اچھا چلنے لگا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی اپنی نئی زندگی سے بہت خوش تھے اور اس وقت تو ان دونوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے گھر میں ایک نیا مہمان آنے والا ہے۔

زرینہ کو اس کی اطلاع ایک لیڈی ڈاکٹر نے دی' جس کے پاس تاجور اس کو لے کر گئی تھی اور جب لیڈی ڈاکٹر نے تاجور کی موجودگی میں اس کو یہ بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو زرینہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اسے یوں لگا جیسے اس کے سارے جسم کا خون کھنچ کر اس کے چہرے میں جمع ہو گیا اور اس کا دل جوش مسرت کے عالم میں جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا تھا اس کی آنکھوں میں یکایک جیسے بے شمار چاند تارے اتر آئے تھے اور ان کی روشنی سے اس کا سارا وجود جگمگانے لگا تھا۔

تاجور نے لیڈی ڈاکٹر کی بات سن کر مسکرا کر زرینہ کی طرف دیکھا اور زرینہ کی نگاہیں زمین پر گڑ گئیں شرم کے مارے اس کی نگاہیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں یہ کس قدر مسرت آمیز اور نشاط انگیز شرم تھی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اس کو کچھ دوائیں وغیرہ لکھ کر دیں اور اس سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو مہینے کے مہینے اس کے پاس آ کر اپنا چیک اپ کروا سکتی ہے۔

"جی ڈاکٹر صاحب میں اس کو آپ کے پاس لاتی رہوں گی۔" تاجور نے لیڈی ڈاکٹر سے کہا۔ "آپ ہی سے چیک اپ کرواتی رہے گی۔"

کچھ دیر کے بعد وہ دونوں وہاں سے واپس آ گئیں اور خیر زماں کو یہ خوشخبری تاجور نے اپنی زبان سے سنائی اور خیر زماں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"میری شکل کیا دیکھ رہے ہو بے وقوفوں کی طرح۔" تاجور نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی؟ تم باپ بننے والے ہو احمق آدمی۔ تمہاری بیوی ماں بننے والی ہے۔"

"ہیں! یقین نہیں آتا مامی۔" خیر زماں نے مسرت آمیز بوکھلاہٹ اور سراسیمگی کے عالم میں کہا۔ "یہ تو .... یہ تو بہت بڑی خبر ہے۔"

"ہاں بہت بڑی خبر ہے۔" تاجور نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اچھا اب دیکھو میری بات دھیان سے سن لو یہ گاؤں نہیں جہاں مائیں جانوروں کی طرح بچے پیدا کرتی ہیں۔ یہ شہر ہے یہاں ماں بننے والی عورتوں کے لئے دنیا بھر کی سہولتیں موجود ہیں۔ زرینہ کا ہر ماہ لیڈی ڈاکٹر سے باقاعدہ معائنہ کروایا جائے گا اور اسے دوائیں ملتی رہیں گی۔ آج سے وہ برابر ڈاکٹرنی کے زیر علاج رہے گی۔"

"آپ جیسا کہیں مامی ویسا ہی ہو گا۔" خیر زماں نے کہا۔ "آپ جس طرح چاہیں کریں۔"

☆======☆======☆

سردیاں ختم ہو چکی تھیں ٹھٹھری ہوئی برفانی بوجھل اور رگوں میں خون منجمد کر دینے والی ہواؤں کا زور ختم ہو چکا تھا پہاڑی راستوں پر بھی برف پگھل رہی تھی راستے کھل رہے تھے۔ آمد و رفت کی سہولتیں بحال ہو رہی تھیں۔ شمال کے بے حد سرد علاقوں میں بھی زندگی کی گم گشتہ رونقیں پھر سے بحال ہونی شروع ہو گئی تھیں۔

امیر خان نے سردیوں کا موسم گرمیوں کے انتظار میں گزارا تھا۔ بلکہ اسے تو ایک خاص وجہ سے موسم گرما کی آمد کا انتظار تھا .... برف پگھلے' راستے کھلیں اور وہ کراچی جا کر زرینہ اور اس کے چاہنے والے خیر زماں کو موت کے گھاٹ اتار سکے جو گاؤں سے بھاگ کر غالباً کراچی گئے تھے۔

اس روز زرینہ اور خیر زماں کی پُراسرار گمشدگی کے بعد امیر خان نے اپنے باپ کی موجودگی میں اپنے چاچا اور چچی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کراچی جا کر زرینہ اور خیر زماں کو قتل کر دے اس کے باپ احمد خان نے اس کی اس پیشکش پر کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بلکہ فی الحقیقت اس نے اس کو ناپسند کیا تھا اور اس وقت اپنے بھائی اور بھاوج کی موجودگی میں اپنے بیٹے امیر خان کو کھل کر منع کرنے کے بجائے اس کو یہ مشورہ دیا تھا کہ

وہ اس کام کو اگلے موسم گرما تک کے لئے اٹھا رکھے کیونکہ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا اور عنقریب پہلی برف باری ہونے والی تھی جس کے بعد راستوں کے بند ہو جانے کا عمل شروع ہو جاتا اور پھر اس علاقے سے باہر جانے والا شخص پورے موسم سرما کے لئے باہر ہی پھنس کر رہ جاتا وہ واپس علاقے میں نہیں آ سکتا تھا۔ دوسرے تمام لوگوں نے اس کی تجویز کو پسند کیا تھا اور بالاتفاق رائے یہ قرار پایا تھا کہ سردیوں کے خاتمے کے بعد امیر خان کراچی جائے گا۔ جہاں اس کا بچپن کا دوست ظہور احمد رہتا تھا جو اس کے ہی گاؤں کے رہنے والے غفور احمد کا بیٹا تھا اور ایک طویل عرصہ پہلے بابر خیل کو چھوڑ کر کراچی میں آ کر آباد ہو گیا تھا اور پھر وہیں کا ہو رہا تھا البتہ دو تین سال میں ایک چکر اپنے گاؤں کا بھی لگا لیتا تھا۔ اس نے امیر خان کو کراچی اپنے پاس آنے کی دعوت بھی دے رکھی تھی۔ امیر خان کو اسی کے پاس جانا تھا۔

گو کہ اس امر کی کسی بھی ذریعے سے تصدیق نہیں ہو سکی تھی کہ خیر زماں اور زرینہ ایک دوسرے کے ساتھ ہی بھاگے ہیں اور وہ بھاگ کر کراچی گئے ہیں جہاں خیر زماں کا ماموں دراز گل اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا تاہم سارے ہی لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت حال ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہی بھاگ سکتے تھے اور کراچی میں دراز گل کے گھر کے علاوہ ان کا کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہو سکتا۔ انہیں لازماً وہیں جانا چاہئے تھا اور اس کا پتہ صرف کراچی جانے کے بعد ہی چل سکتا تھا اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں تھی اور امیر خان کراچی جانے کے لئے اور ان دونوں کا پتہ لگانے کے بعد انہیں ختم کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

اس روز گھر واپس جانے کے بعد احمد خان نے اپنے بیٹے کو اس کام سے روکنے کی کوشش کی۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اس کو کھلم کھلا منع بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ صرف شمروز خان کی عزت کا سوال نہیں تھا۔ یہ تو پورے خاندان کی عزت کا معاملہ تھا خاندان کی ایک لڑکی گھر سے بھاگ گئی تھی وہ ایک دشمن کے بیٹے کے ساتھ بھاگی تھی اور اس نے صرف اپنے والدین کو ہی نہیں سارے خاندان کو رسوا کیا تھا۔ اس لئے اس کا اور اس کے عاشق کا قتل صرف اس کے والد اور بھائی وغیرہ کا ہی فرض نہیں تھا۔ اس کے چچاؤں اور چچا زاد بھائیوں کا بھی فرض تھا اور زرینہ کا چونکہ سگا بھائی کوئی نہیں تھا اس لئے چچازاد بھائیوں وغیرہ پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ خاندان کی عزت کو بٹہ لگانے والوں

کو ان کے کئے کی سزا دیں۔ چنانچہ احمد خان کے پاس اپنے بیٹے کو روکنے کا کوئی ٹھوس اور اخلاقی جواز نہیں تھا اور اس نے اس لئے دوسرا طرز استدلال اختیار کیا۔

"کراچی میں ان لوگوں کو تلاش کرنا کوئی مذاق تھوڑی ہے۔" اس نے اپنے بیٹے امیر خان سے کہا۔ "سنا ہے وہاں تو زندگی گزر جاتی ہے اور آدمی کو تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ تم کیسے ان دونوں کو تلاش کرو گے؟"

"اس کا طریقہ ہے بابا۔" امیر خان نے جواب دیا۔ "اس کا طریقہ موجود ہے بابا۔" اس نے کہا۔ "کراچی میں میرا دوست ظہور احمد ہے۔ وہ اب جیسے اس شہر کا ہو کر رہ گیا ہے وہاں کے چپے چپے سے واقف ہے اسے دراز گل کے گھر کا بھی ضرور پتہ ہو گا اور اگر نہیں ہو گا تو وہ آسانی سے معلوم کر لے گا وہ دراز گل سے مل سکتا ہے اور کسی نہ کسی طرح ان دونوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ ہم گھر سے باہر نکلیں گے تو ہزار راستے خود بخود نظر آ جائیں گے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں جلدی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" احمد خان نے کہا۔ "آخر ایک نہ ایک دن تو وہ لوگ اس علاقے میں آئیں گے۔ کبھی نہ کبھی آئیں گے۔ چاہے دس بیس سال بعد آئیں جب بھی آئیں تب ہی ان کا کام تمام کر دیا جائے۔"

"وہ یہاں اب کیوں آئیں گے بابا؟" امیر خان نے اس کی دلیل کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ اتنے احمق ہیں کہ یہاں آ کر اپنے آپ کو موت کے منہ میں جھونکیں گے؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ یہاں آنے کے بعد پھر ان کا یہاں سے زندہ واپس جانا ناممکن ہے؟"

"لیکن بیٹا کراچی غیر جگہ ہے۔" احمد خان نے کہا۔ "وہاں کے قاعدے قانون دوسرے ہیں وہاں اگر خدا نخواستہ تم کو پکڑ لیا گیا تو.........."

"ایسا کچھ نہیں ہو گا بابا۔" امیر خان نے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیں میں جانتا ہوں کہ مجھے اپنا کام کس طرح کرنا ہو گا اور پھر.......... وہاں ظہور احمد ہے جو اس شہر سے مکمل واقفیت رکھتا ہے اگر وہ وہاں نہ ہوتا تو میں شاید کراچی جانے کے بارے میں سوچتا ہی نہیں لیکن ہم ظہور احمد پر تو پورا بھروسہ کر سکتے ہیں اور پھر بابا جان.......... اس لڑکی نے ہمارے خاندان کی عزت کو للکارا ہے۔ اس نے اور خیر زماں نے ہم سب کے منہ پر کالک مل دی

ہے۔ کیا ہم اس چیز کو برداشت کر سکیں گے؟ کیا ہماری غیرت مر گئی ہے؟؟"

احمد خان کی غیرت تو نہیں مری تھی لیکن اسے اپنے جوان بیٹے کی زندگی بہت عزیز تھی اگر معاملہ اپنے ہی علاقے کا ہوتا تو پھر اسے پرواہ نہیں تھی یہاں تو وہ لوگ سب کچھ کر سکتے تھے جو بھی معاملات تھے۔ آپس کے معاملات تھے اور صدیوں کی دیرینہ روایات کے مطابق تھے لیکن کراچی میں تو سب کچھ بالکل ہی مختلف تھا۔ یہاں پولیس' تھانے' جیلیں' مقدمے' عدالتیں اور سزائیں تھیں یہاں تو سب کچھ بہت مختلف تھا اور وہ بے یقینی تھی اس کے بیٹے کے ساتھ یہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

احمد خان نے وقفے وقفے سے اپنے بیٹے کو سمجھایا لیکن امیر خان نے اس کی کوئی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

امیر خان کے دل میں جو کچھ تھا اس سے اس کا باپ بالکل ناواقف تھا۔ زرینہ اور خیر زماں کے خلاف اس کے دل میں نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔ زرینہ نے اس کی محبت کو مسترد کر کے ایک دوسرے آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے گھر سے ہی بھاگ گئی تھی۔ اس سے زیادہ خوفناک بات کیا ہو سکتی تھی۔ وہ ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا تھا اور اس کے لئے وہ دن گنتا رہا تھا۔ آخراب خدا خدا کر کے سردی کا موسم ختم ہوا تھا اور راستے کھل گئے تھے۔ اب وہ کراچی جا سکتا تھا۔

اس دوران شمروز خان اور اس کی بیوی آمنہ کی طرف سے برابر امیر خان کی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی اور اسے اس بات پر آمادہ کیا جاتا رہا کہ وہ کراچی جا کر ان دونوں کو قتل کر دے۔ فیروزہ ان لوگوں کی باتیں سنتی تھی اور دل ہی دل میں کانپتی رہتی تھی۔

"کاش .... کاش .... سردی کا موسم کبھی ختم نہ ہو۔" کبھی کبھی وہ بڑی حسرت کے ساتھ سوچتی۔ "کاش راستوں پر جمی ہوئی برف کبھی نہ پگھلے۔ راستے کبھی نہ کھلیں اور امیر خان ان دونوں کو قتل کرنے کے لئے کبھی بھی کراچی نہ جا سکے۔ کاش .... وہ دونوں کراچی میں امیر خان کے قاتلانہ حملہ سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔ کاش .... کاش..........." اس کی آنکھیں بھیگتی رہتیں' دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور وہ یہ ساری باتیں سوچتی رہتی۔

اس پورے علاقے میں وہ واحد فرد تھی جسے ان دونوں کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ دونوں سلامتی کے ساتھ یہاں سے جانے میں کامیاب

ہو گئے ہوں گے تو اس وقت وہ کراچی میں خیر زماں کے ماما دراز گل کے گھر میں ہوں گے لیکن گھر سے نکلنے کے بعد ان دونوں پر کیا گزری تھی اور وہ کراچی پہنچ بھی سکے تھے یا نہیں۔ اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔

جہاں تک بخت خان اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگوں کا تعلق تھا تو انہیں اگرچہ امیر خان کے اصل منصوبے کا تو ٹھیک ٹھیک علم نہیں تھا لیکن اپنے طور پر وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ان لوگوں کو جب بھی موقع ملے گا یہ خیر زماں اور زرینہ دونوں کو قتل کر دیں گے۔ انہوں نے اس صورت حال کو خاموشی کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ وہ اس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتے تھے اور نہ کرنا چاہتے تھے۔

برف پگھلنے اور راستے کھلنے کے ساتھ ہی امیر خان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ قریبی قصبے جا کر اپنے دوست ظہور احمد کو کراچی ایک خط بھجوا دیا جس میں اس نے لکھا کہ وہ جلد ہی کراچی کے لئے روانہ ہونے والا ہے وہ ظہور احمد کو اپنی آمد کی پیشگی اطلاع دے دینا چاہتا تھا۔

امیر خان کے پاس ظہور احمد کا پتہ وغیرہ موجود تھا اور ظہور احمد نے اس کو اس سلسلے میں اتنی باتیں بتا دی تھیں کہ وہ کراچی آنے کے بعد ظہور احمد کے گھر تک پہنچ سکتا تھا کس جگہ سے اسے کون سی بس ملے گی یا کہاں سے اسے رکشہ یا ٹیکسی مل سکتی ہے اور اس کو کہاں اترنا چاہئے۔ یہ ساری باتیں امیر خان کو بڑی حد تک معلوم تھیں جب ظہور احمد اس کو یہ ساری باتیں بتاتا تھا اس وقت تو امیر خان نے ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی کیونکہ اس کا کراچی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن پھر جب اس نے کراچی جانے کا فیصلہ کیا تو اس نے ذہن پر زور دے کر وہ ساری باتیں اچھی طرح سے یاد کر لیں جو ظہور احمد نے اس کو بتائی تھیں اور اب اس کو یقین تھا کہ وہ بغیر کسی خاص دشواری کے کراچی پہنچ جائے گا تاہم اس نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ ظہور احمد کو اپنی آمد سے پہلے ہی مطلع کر دے چنانچہ اس نے قریبی قصبے میں جا کر ظہور احمد کو ایک خط لکھ ڈالا۔

اس کے ایک ہفتے کے بعد امیر خان کراچی کے لئے روانہ ہو گیا احمد خان اور شمروز خان دونوں اس کے ساتھ شہر تک آئے جہاں سے انہوں نے اس کو رخصت کیا امیر خان کو یہاں سے بس میں بیٹھ کر پشاور اور پھر پشاور سے کراچی جانا تھا۔ احمد خان نے رخصت ہوتے وقت جب اپنے بیٹے کو گلے سے لگایا تو اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں امیر خان

اپنے باپ اور چچا سے رخصت ہو کر بس میں بیٹھ گیا اور کچھ دیر کے بعد بس پشاور کے لئے روانہ ہو گئی۔

جب تک بس نظر آتی رہی احمد خان ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا شمروز خان بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا اور وہ بالکل خاموش تھا اسے اس بات کا احساس تھا کہ احمد خان کو اس کی خوشی نہیں ہے کہ اس کا بیٹا ایک ایسی خطرناک مہم پر جا رہا ہے جس میں خود اس کی اپنی جان بھی جا سکتی تھی لیکن اب اس کو کیا کہا جا سکتا تھا کہ یہ امیر خان کی اپنی ضد تھی۔ اسے ایسا کرنے پر کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ شمروز خان نے یا اس کی بیوی نے خود تو ایک بار بھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ کراچی جا کر زرینہ اور خیر زماں کو قتل کر دے یہ تو خود اس کا اپنا فیصلہ تھا۔

شمروز خان اور احمد خان دونوں کھڑے ہوئے اس بس کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دونوں کے جذبات' محسوسات ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف تھے احمد خان صرف اور صرف اپنے بیٹے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے لئے دنیا کی ہر شے سے زیادہ اہم بات اس کے بیٹے کی جان کی سلامتی تھی۔ اس کی ساری توجہ صرف اس کی جان کی سلامتی پر مرکوز تھی۔ وہ اس کو زندہ اور پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا تھا لیکن شمروز خان کی جذباتی ترجیحات بالکل مختلف تھیں اس کو امیر خان کی کامیابی سے دلچسپی تھی اس کی ساری خواہشات کا نچوڑ یہ تھا کہ امیر خان کراچی جائے اور لازمی طور پر زرینہ اور خیر زماں کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے اور ان دونوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر سرخرو ہو جائے۔ اس کے بعد خود اس کے ساتھ کیا پیش آتا ہے اس سے اس کو بس ایک خاص حد تک دلچسپی تھی۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا جس کے درد کی شدت سے اس کے کلیجے میں ناسور پڑ جائے۔

"خدا تم کو کامیابی دے بیٹا۔" وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ "خدا کرے تم ان دونوں گنہگاروں کو جہنم رسید کر کے گھر واپس آؤ۔"

"خدا کرے تمہاری جان محفوظ رہے۔" احمد خان دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا۔ "خدا کرے کہ تم کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور تم صحیح و سلامت گھر واپس آؤ۔"

بس رفتہ رفتہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور وہ دونوں وہاں سے واپس ہوئے۔ موسم ٹھیک ہونے اور راستے کھلنے کے بعد وہ پہلی بار شہر آئے تھے اور انہیں یہاں سے کچھ

خریداری وغیرہ بھی کرنی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کچھ وقت شہر میں گزارا لیکن دونوں ہی کا دل نہیں لگا خاص طور سے احمد خان کا۔ اس کی جان تو اس کے بیٹے میں اٹکی ہوئی تھی جو ہر لمحہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ بس نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہو گی اور اس کے ساتھ امیر خان بھی اس سے زیادہ سے زیادہ دور ہوتا جا رہا تھا۔

شمروز خان کو بھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا جس دن سے زرینہ اس کے گھر سے غائب ہوئی تھی اس دن سے وہ اپنے آپ کو ایک ادھورا آدمی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی جو مجموعی عزت اور غیرت تھی اس کا کچھ حصہ زرینہ کے گھر چھوڑنے کی صورت میں گم ہو گیا تھا اور عزت اور غیرت کا گمشدہ حصہ صرف اس وقت دوبارہ حاصل اور بحال ہو سکتا تھا جب زرینہ کو اس کے کئے کی سزا مل جائے' جب زرینہ کو قتل کر دیا جائے' کم از کم زرینہ کو تو قتل کر ہی دیا جائے کہ وہ لڑکی تھی' بیٹی تھی' گھر کی عزت تھی اور اس نے گھر سے بھاگ کر سارے خاندان کے منہ پر کالک مل دی تھی۔

دونوں اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گزشتہ دنوں جبکہ سردی کا زور ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا اور موسم میں تبدیلی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے تو ایک روز احمد خان نے اپنے بیٹے امیر خان سے کہا کہ وہ خود کراچی جا کر ان دونوں کا کام تمام کر دے گا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا؟" امیر خان نے سخت حیرت کے عالم میں کہا۔ "آپ جائیں گے کراچی یہ کام کرنے کے لئے؟"

"کیوں؟" احمد خان نے کہا۔ "اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ کیا میرے ہاتھوں کو بندوق اٹھانا اور میری آنکھوں کو نشانہ لگانا نہیں آتا؟ یا میرے جسم میں طاقت ختم ہو گئی ہے؟ میں ابھی بہت کچھ کر سکتا ہوں بیٹا۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو تم کر سکتے ہو کراچی جا کر یہ کام کر سکتا ہوں۔"

"اگر ایسا ہی ہے بابا تو پھر شمروز بابا کو خود یہ کام کرنا چاہئے تھا۔ آپ ان سے کیوں نہیں کہتے؟"

"شمروز کے ساتھ معاملہ دوسرا ہے۔" احمد خان نے کہا۔ "اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے اور اس کے ایک بیٹی بھی ہے فیروزہ .... جس کی اس کو شادی بھی کرنی ہے۔ اگر شمروز کے ساتھ کچھ ہو گیا تو معاملہ خراب ہو جائے گا مجھے تو خدا نے دو بیٹے دیئے ہیں اگر کچھ ہو گیا تو میرے بیٹے گھر کو سنبھال لیں گے اور اپنی بہن کی شادی کا بھی بندوبست کر

لیں گے۔"

"نہیں بابا۔" امیر خان نے اس کے سارے استدلال کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نہیں جائیں گے۔ یہ آپ کا کام نہیں' جس آدمی کے دو بیٹے ہوں اس کو یہ کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا چھوٹا بھائی حبیب خان ابھی دس سال کا ہے۔ چند سال کے بعد وہ جوان ہو جائے گا اور میں تو ہوں ہی۔ آپ کو یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات پکی ہے کہ اس کام کے لئے میں کراچی جاؤں گا اور میں خود اپنے ہاتھوں سے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

احمد خان نے اپنے بیٹے کو قائل کرنے کی کافی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ اس نے احمد خان کے اس خیال سے بالکل اتفاق نہیں کیا کہ احمد خان خود کراچی جا کر یہ کام کرے۔

جو آگ امیر خان کے دل میں لگی ہوئی تھی اس سے احمد خان اور دوسرے لوگ ناواقف تھے۔ اس آگ کی تپش اور حرارت صرف امیر خان کا دل ہی محسوس کر سکتا تھا۔ اس کا تو سارا وجود جل کر خاک ہوا جا رہا تھا اس کے لئے ایک ایک دن گزارنا مشکل تھا۔

اور اب خدا خدا کر کے وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ کراچی کے لئے روانہ ہو سکے۔

شمروز خان اور احمد خان اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے کافی دیر تک شہر میں گھومتے پھرتے رہے۔ دونوں کا دل کسی بھی چیز میں نہیں لگ رہا تھا اور ان کے اعصاب پر ایک اضمحلالی کیفیت طاری تھی۔ دونوں میں آپس میں بہت کم بات ہوئی انہوں نے اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں خریدیں اور پھر وہ واپس اپنے کاموں کے لئے روانہ ہو گئے۔ شمروز خان اور احمد خان واپس اپنے گاؤں بابر خیل آ گئے اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

آمنہ اپنے شوہر کی واپسی کی بڑی شدت کے ساتھ منتظر تھی وہ جاننا چاہتی تھی کہ آیا امیر خان کراچی کے لئے سلامتی کے ساتھ روانہ ہو گیا یا نہیں اور وہ اس کی مکمل کامیابی کے لئے دعاگو تھی۔ اس کے سینے میں اپنی سگی بیٹی کے لئے نفرت کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ وہ اس کو مردہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لڑکی نے والدین کی نافرمانی کی تھی۔ اس نے اپنی مرضی کو والدین کی مرضی پر ترجیح دے کر صدیوں پرانی سماجی روایات اور مقررہ نظام کے منہ پر طمانچہ مارا تھا اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس نے دشمن کے بیٹے سے محبت کی تھی اور وہ اس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ وہ دشمن جس نے راحت خان جیسے آدمی کو قتل کر ڈالا تھا

.... اس لڑکی کی سزا صرف موت ہو سکتی تھی وہ موت سے کم کی سزا کی مستحق نہیں تھی۔ اس منحوس لڑکی نے راحت خان کے قاتلوں کے ساتھ رشتہ جوڑا تھا۔

شمروز خان واپس آیا تو آمنہ کی جلتی ہوئی منتظر نگاہوں کو ٹھنڈک ملی۔

"چلا گیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" شمروز خان نے جواب دیا۔ "چلا گیا' ہمارے سامنے بس میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔"

"اب کراچی پہنچنے کے بعد وہ خط تو بھجوائے گا نا؟"

"ہاں' خط تو بھجوائے گا۔" شمروز خان نے کہا۔ "لیکن کراچی سے یہاں تک خط پہنچتے پہنچتے کتنا وقت لگ جاتا ہے مہینہ تک اس کا خط یہاں پہنچے گا تب تک تو وہ وہاں پتہ نہیں کیا کچھ کر چکا ہو گا۔"

"پھر بھی ہمیں اس کے خیریت سے وہاں پہنچ جانے کی اطلاع تو مل جائے گی۔" آمنہ نے کہا۔

"خط بھی راستے میں اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔" شمروز خان نے کہا۔ "ہمیں تو بس اب انتظار ہی کرنا ہو گا۔"

فیروزہ اپنے والدین کی باتیں سن رہی تھی اور اس کے دل میں درد اور خوف کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کی تمام تر دعاؤں کے باوجود اس کی تمام تر خواہشات کے باوجود موسم سرما ختم ہو گیا تھا' برف پگھل گئی تھی' راستے کھل گئے تھے اور امیر خان کراچی کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ زرینہ اور خیر زماں کو قتل کرنے کے لئے۔

اور اس کے ساتھ ہی فیروزہ کی دعاؤں کا رخ بدل گیا تھا۔ اس کی خواہشات نے ایک نئی شکل اختیار کر لی تھی۔

"کاش .... کاش' وہ ان لوگوں کو کبھی نہ تلاش کر سکے۔ کاش وہ دراز گل کے گھر تک پہنچ ہی نہ سکے اور اگر پہنچ بھی جائے تو .... دونوں اس کو دراز گل کے گھر پر نہ ملیں اور دراز گل بھی ان کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔ کاش .... کاش .... وہ ان دونوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

فیروزہ کسی بے زبان جانور کی طرح خاموش رہنے پر مجبور تھی اور صرف دل ہی دل میں دعائیں مانگ سکتی تھی اور اس میں وہ کوئی کمی نہیں کر رہی تھی۔

امیر خان بس میں بیٹھ کر پشاور کے لئے روانہ ہو گیا اس کے پاس اس کے دوست ظہور احمد کا پتہ موجود تھا اور اس نے اس پتے کو زبانی بھی اچھی طرح یاد کر لیا تھا تاکہ اگر کسی وجہ سے وہ کاغذ اس کے پاس سے گم ہو جائے تو وہ اس اجنبی شہر میں بالکل بے سہارا نہ رہ جائے۔

بس اپنے راستے پر چلتی رہی اور امیر خان اپنی نشست پر بیٹھا ہوا اِدھر اُدھر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

امیر خان اپنے علاقے کے ان چند خوش نصیب لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے پشاور دیکھا تھا۔ آج سے دو سال پہلے وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ پشاور آیا تھا اور انہوں نے ایک دن اور ایک رات کا عرصہ پشاور میں گزارا تھا۔ چنانچہ پشاور اس کے لئے کوئی انجانا اور مکمل طور پر اجنبی شہر نہیں تھا۔ ٹرین کا سفر البتہ اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔

وہ بس کے ذریعے بھی کراچی جا سکتا تھا اسے معلوم تھا کہ پشاور سے کراچی بسوں کے ذریعے جانا بھی ممکن ہے لیکن اس نے جان بوجھ کر ٹرین کے ذریعے جانے کا فیصلہ کیا تھا وہ ٹرین کے سفر سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ کیا معلوم زندگی میں آئندہ پھر کبھی یہ موقع ملے یا نہ ملے .... آنے والے وقت کے بارے میں بھلا کون جان سکتا تھا۔

بہت دور کراچی میں پی آئی بی کالونی کے ایک کوارٹر کے آدھے حصے میں بیٹھے ہوئے خیر زماں اور زرینہ کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ موت کا فرشتہ ان کی تلاش میں بابر خیل سے روانہ ہو چکا ہے۔ وہ دونوں اپنی دنیا میں مگن تھے اور آنے والی ان غیر معمولی پُرمست اور پُرہیجان ساعتوں کا انتظار کر رہے تھے جب زرینہ ماں بننے والی تھی۔

امیر خان کی بس کئی گھنٹے کا طویل پہاڑی سفر طے کرنے کے بعد بالآخر پشاور پہنچ گئی اور بس سے اترنے کے بعد امیر خان نے سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا جہاں سے اسے کراچی جانے والی ٹرین کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں۔

کراچی کی ٹرین کے بارے میں معلومات حاصل کر لینے کے بعد وہ اسٹیشن سے چلا آیا اور کافی دیر تک شہر میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ ٹرین کے چلنے میں ابھی بہت وقت تھا۔

گزشتہ دو سال کی مدت کے دوران شہر میں کوئی خاص تبدیلیاں نمودار نہیں ہوئی تھیں۔ امیر خان نے پہلے بھی پشاور کو گھوم پھر کر اچھی طرح دیکھا تھا اور اب ایک بار پھر اس کو اس کا موقع ملا تھا۔

دماغ کے کسی بہت دور دراز گوشے میں ایک خفیہ خیال سہا ہوا' سکڑا ہوا بیٹھا تھا اور کسی کسی وقت کچوکے لگانا شروع کر دیتا تھا۔ "کیا خبر میں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر بھی سکوں گا یا نہیں؟ کیا خبر میں وہاں پکڑا جاؤں یا مارا جاؤں۔ شاید وہ میری زندگی کی آخری ساعتیں ہوں۔"

لیکن پھر فوراً ہی اس خیال کو جھٹک کر اپنے دماغ سے الگ کر دیا۔ "نہیں .... ایسا نہیں ہو گا۔ میں ہر کام بہت احتیاط کے ساتھ سنبھل کر کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کراچی ہے غیر علاقہ ہے۔ میرا اپنا علاقہ نہیں ہے وہاں کے طور طریقے الگ ہیں لیکن میں پوری ہوشیاری کے ساتھ کام کروں گا۔ کوئی مشکل بات نہیں ہے میرا نشانہ تو ویسے بھی بہت اچھا ہے۔ بس ایک ایک گولی میں ہی دونوں کا کام تمام کر دوں گا اور اس کے بعد چپ چاپ وہاں سے راہِ فرار اختیار کر لوں گا۔" اس نے جو کچھ سوچا تھا وہ نہایت سادہ تھا اور وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا بس ایسا ہی کچھ ہو گا۔

اسے کراچی جانے والی گاڑی مل گئی اور وہ اس میں بیٹھ کر کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ ٹرین میں اس کا پہلا سفر تھا اور یہ تجربہ اس کو بہت دلچسپ اور تحیر انگیز لگا۔ اتنی بڑی چیز اتنی لمبی چوڑی جیسے بہت سارے خانوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا لوہے کی پٹڑی پر کس قدر تیز رفتاری کے ساتھ اندھا دھند بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ ٹرین کی رفتار اس کے لئے بہت زیادہ حیرت انگیز تھی۔

راستے میں مناظر بدلتے گئے' علاقے بدلتے گئے' لوگ بدلتے گئے' زبانیں بدلتی گئیں' رسم و رواج بدلتے گئے اور کراچی تک پہنچتے پہنچتے بہت کچھ بدل گیا۔ وہ ایک نئی دنیا میں آ گیا تھا۔

ظہور احمد کراچی میں شیر شاہ میں رہتا تھا اور اس نے امیر خان کو بتایا تھا کہ شیر شاہ جانے کے لئے کراچی کے سٹی ریلوے اسٹیشن پر اترنا پڑتا ہے۔

"کراچی کے کئی ریلوے اسٹیشن ہیں۔" اس نے امیر خان کو بتایا تھا۔ "لانڈھی ہے' ڈرگ روڈ ہے' کینٹ ہے اور پھر سب سے آخر میں سٹی ریلوے اسٹیشن ہے۔ میں اپنے گھر جانے کے لئے سٹی ریلوے اسٹیشن پر اترتا ہوں۔ میرا گھر شیر شاہ میں ہے اور وہاں جانے کے لئے سٹی ریلوے اسٹیشن پر اترنا پڑتا ہے۔"

امیر خان کو اس کی یہ بات بہت اچھی طرح یاد تھی اور وہ کراچی سٹی اسٹیشن پر ہی

اترا تھا۔

اس کو یہ بات تو پہلے سے معلوم تھی کہ کراچی پشاور کے مقابلے میں بہت بڑا شہر ہے لیکن یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ یہ اس قدر بڑا شہر ہو گا۔ سٹی ریلوے اسٹیشن سے باہر آ کر جب اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو اس کو ایسا لگا جیسے وہ کسی جادوئی دنیا میں آ گیا ہے یہاں تو ہر چیز کس قدر عجیب و غریب اور ناقابلِ یقین تھی۔

امیر خان نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ انسان اتنی اونچی عمارتیں بھی بنا سکتا ہے۔ اس نے پہاڑ تو بہت دیکھتے تھے لیکن پہاڑ جیسی اونچی عمارتیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ یہاں اسے پہاڑوں جیسی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ پہلی نظریں میں تو اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ یہ عمارتیں ہیں اور ان کے اندر انسان ہوتے ہیں اور جب اسے اس بات کا علم ہوا تو اس پر جیسے سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی یہ عمارتیں تھیں اس قدر اونچی اونچی اور ان میں لوگ تھے یہ سب کچھ کس قدر حیرت انگیز تھا۔

امیر خان کو ایک پٹھان رکشہ ڈرائیور مل گیا جس کو اس نے ظہور احمد کا پتہ بتایا پشتو بولنے والے رکشہ ڈرائیور نے بتایا کہ اس کو اس پتے پر پہنچا دے گا اور اس نے اس کے ساتھ کرایہ طے کر لیا۔ امیر خان کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ کرایہ کم ہے یا زیادہ نہ ہی اس کو رکشوں اور ٹیکسیوں کے میٹر سے چلنے کے بارے میں کچھ معلوم تھا۔ اس نے اس رکشہ والے کی بات مان لی اور رکشے میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

وہ میکلوڈ روڈ پر کاروں کی ریل پیل کو غیر معمولی حیرت اور تجسس کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اس قدر گاڑیاں تھیں .... اس قدر کاریں تھیں .... کوئی شمار ہی نہ تھا۔

رکشہ شہر کے سب سے زیادہ گنجان آبادی والے علاقوں سے گزر رہا تھا اور امیر خان اپنے اردگرد انسانوں کے سمندر کو ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دیکھ رہا تھا وہ دم بخود تھا۔ اف خدا .... اتنے بہت سے لوگ .... اتنی گاڑیاں .... ایسی رونق یہ سب کچھ کس قدر عجیب و غریب تھا۔

رکشہ والا اس کو شیر شاہ کے علاقہ میں لے آیا میکلوڈ روڈ وغیرہ کے علاقہ سے یہ علاقہ کس قدر مختلف تھا کسی حد تک اس بات کا اندازہ کر سکتا تھا اسے بہت فرق محسوس ہو رہا تھا۔

وہ رکشہ والے سے باتیں کرنا چاہتا تھا اس سے اس علاقے کے بارے میں' اس شہر

کے بارے میں' یہاں کے لوگوں کے بارے میں وغیرہ وغیرہ۔ بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ رکشہ کی آواز اس قدر خوفناک تھی کہ نہ تو وہ رکشہ والے کی آواز صاف طور پر سن سکتا تھا اور نہ رکشہ والا اس کی آواز کو صاف طور پر سن سکتا تھا۔ شروع شروع میں امیر خان نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اس کو معلوم ہو گیا کہ اس کی یہ کوشش بیکار ہے۔

رکشہ برابر چلا جا رہا تھا اور امیر خان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا یہ سفر کبھی ختم ہی نہیں ہو گا۔ کتنی دیر ہو گئی تھی پھٹ .... پھٹ .... پھٹ رکشہ بھاگا چلا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ آگے پیچھے' دائیں بائیں ان گنت طرح طرح کی گاڑیاں تھیں جو طرح طرح کی آوازیں نکالتی ہوئی بھاگی چلی جا رہی تھیں۔

رکشہ ڈرائیور نے شیر شاہ کے علاقے میں داخل ہونے کے بعد کئی جگہ رک کر پتہ پوچھا اور بالآخر اس نے ایک جگہ رک کر رکشہ کھڑا کر دیا۔

"یہ ہے وہ مکان۔" اس نے سامنے ایک مکان کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امیر خان رکشہ سے اتر پڑا اور اس نے رکشے والے سے ایک بار پھر اس امر کی تصدیق چاہی کہ اس نے اس کو صحیح جگہ پر پہنچا دیا ہے۔

"ہاں۔" رکشہ ڈرائیور نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "یہی وہ مکان ہے تم اطمینان رکھو میں نے تم کو صحیح جگہ پہنچا دیا ہے۔"

امیر خان نے اس کو پیسے دے دیئے اور رکشہ والا فوراً ہی وہاں سے چلا گیا۔

امیر خان اس جگہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ آس پاس وہی چیزیں نظر آ رہی تھیں جو ظہور احمد نے کبھی اس کو بتائی تھیں دائیں جانب کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا بائیں جانب ایک لکڑی کی ٹال تھی اس کے بعد چند دکانیں پھلوں اور سبزیوں کی تھیں ظہور احمد نے یہی ساری نشانیاں اپنے مکان کی بتائی تھیں۔

وہ سڑک پر کھڑا ہوا اس مکان کی طرف دیکھ رہا تھا جو ظہور احمد کا مکان ہونا چاہئے تھا اور ساتھ آس پاس بھی دیکھ رہا تھا۔ اتنی دیر میں اس کو یہ اندازہ ہو گیا کہ یہاں رہنے والے زیادہ تر پٹھان تھے۔ اسے کئی جگہ پشتو میں بات چیت کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ظہور احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کراچی میں رہتا تھا اور اسے یہاں رہتے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ یہاں اس کا کباڑیے کا کاروبار تھا اور اس کام میں اس کو بہت اچھی آمدنی ہوتی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا گودام بھی تھا جو اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر واقع تھا امیر خان کو اس کے بارے میں یہ ساری باتیں پہلے سے اچھی طرح معلوم تھیں۔

اس نے ظہور احمد کے مکان کے دروازے پر دستک دی اس کے جواب میں ایک لڑکے نے دروازہ کھولا جس کی عمر کوئی دس گیارہ سال کی تھی۔ امیر خان نے اس سے پشتو میں ظہور احمد کے بارے میں پوچھا لڑکے نے اس کو پشتو میں ہی جواب دیا اور یہ بتایا کہ ظہور احمد گودام میں ہے۔

"مجھے گودام تک پہنچا دو۔" اس نے لڑکے سے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں گودام کہاں ہے۔"

"تم کون ہو؟" لڑکے نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"

"میرا نام امیر خان ہے اور میں ظہور احمد کے گاؤں سے آیا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اچھا ذرا ٹھہرو۔" لڑکے نے کہا اور اندر چلا گیا چند منٹ کے بعد اندر سے ایک عورت نکل کر دروازے تک آئی وہ ذرا آڑ میں کھڑی ہوئی تھی لیکن جب اس نے باہر جھانک کر دیکھا تو امیر خان نے اس کو فوراً پہچان لیا وہ ظہور احمد کی بیوی نسیم تھی نسیم نے بھی امیر خان کو پہچان لیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بخوبی واقف تھے۔ نسیم اپنے شوہر کے ساتھ ہر دو تین سال کے وقفے سے گاؤں آتی رہتی تھی۔

"ارے بھائی امیر خان؟" نسیم نے حیرت اور خوشی کے ساتھ کہا۔ "تم .... یہاں؟"

"ہاں بھابی۔" امیر خان نے بہت زیادہ خوش اور مطمئن لہجے میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ میں صحیح جگہ پر پہنچ گیا۔ اس شہر میں قدم رکھنے کے بعد تو مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ افوہ .... خدا کی پناہ کس قدر بڑا شہر ہے۔ یہاں تو جیسے زمین سے انسان ابلتے ہیں۔"

"آؤ .... اندر آ جاؤ بھائی۔" نسیم نے دروازہ کھول کر اس کو اندر بلاتے ہوئے

کہا۔ "میں ظہور احمد کو ابھی بلواتی ہوں۔ وہ گودام میں ہے ابھی آ جائے گا۔"

امیر خان اس کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہو گیا ایک عمر رسیدہ عورت ہاتھ میں ایک لمبی سی جھاڑو لئے ہوئے تھی جسے ایک بانس میں باندھا گیا تھا سامنے برآمدے کی چھت اور دیواروں سے جالے صاف کر رہی تھی۔ ایک چھوٹا بچہ تقریباً پانچ سال کا' مکان کے برآمدے میں کھڑا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سامنے ہی برآمدے میں دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں اور چند کرسیاں۔ نسیم نے جلدی سے امیر خان کو ایک کرسی پر بٹھایا اور بڑے لڑکے سے کہا کہ وہ دکان پر جا کر اپنے بہنوئی کو خبر کر دے کہ گاؤں سے اس کا دوست امیر خان آیا ہے۔ لڑکا فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔

"یہ .... یہ غالباً فلک شیر ہے۔" امیر خان نے نسیم کی بات سننے کے بعد لڑکے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا جو اس وقت دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

"ہاں..........." نسیم نے جواب دیا۔ "یہ فلک شیر ہے اب تو ماشاء اللہ بارہ سال کا ہو گیا ہے تم نے تو اس کو بہت عرصہ پہلے دیکھا ہو گا۔"

"ہاں بھابی۔" امیر خان نے کہا۔ "تم لوگ جب پچھلی سے پچھلی بار گاؤں آئے تھے تو فلک شیر تمہارے ساتھ تھا تب سے اب تک کافی وقت گزر چکا ہے اور ظاہر ہے کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ فلک شیر کی شکل بھی بدل گئی ہے۔"

"ہاں بھائی۔" نسیم نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ میرے والدین زندہ نہ رہے اور فلک شیر پانچ سال کا تھا جب وہ دونوں حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے چلے گئے اور اب فلک شیر ہمارے ساتھ رہتا ہے وہ میرا اکلوتا بھائی ہے۔ ظہور احمد اس کا بہت خیال کرتا ہے اس کو اسکول بھیجتا ہے فلک شیر اب چھٹی کلاس میں پڑھتا ہے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے .... بہت خوشی کی بات ہے۔" امیر خان نے مکان میں چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ برآمدے میں صفائی کرنے والی عورت نے دو ایک بار اس کو دیکھا تھا۔ امیر خان نے بھی اس پر نظریں ڈالی تھیں۔

"یہ ماسی مریم ہے۔" نسیم نے امیر خان کو بتایا۔ "ہمارے گھر میں صفائی وغیرہ کا کام کرتی ہے۔ بہت اچھی عورت ہے اس کی وجہ سے مجھ کو بہت آرام رہتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے .... یہ ملازمہ ہے؟" امیر خان نے قدرے تعجب کے ساتھ کہا۔ "تم اس کو تنخواہ دیتی ہو؟"

"ہاں بھائی۔" نسیم نے کہا۔ "ہم اس کو تنخواہ دیتے ہیں۔ پچھلے کئی سال سے ہمارے گھر میں کام کر رہی ہے۔ اصل میں ہمارے یہاں کھانا کافی زیادہ پکتا ہے اور وہ زیادہ تر مجھ کو ہی پکانا پڑتا ہے۔ دکان پر دو آدمی کام کرتے ہیں پھر ظہور احمد کے پاس کاروباری لوگ آتے جاتے رہتے ہیں ان کے لئے بھی کھانا چاہئے ہوتا ہے۔"

امیر خان کو اس بات پر بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ ظہور احمد کی بیوی نسیم نے اپنے گھر میں ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی اس کے لئے تو یہ چیز ناقابل تصور تھی گاؤں میں سارے گھروں کی عورتیں خود اپنے اپنے گھروں کا کام کرتی تھیں' اور یہ تو صرف بڑے بڑے خانوں' سرداروں اور دولتمند زمینداروں کی حیثیت تھی کہ وہ گھروں میں عورتوں کو ملازم رکھیں اور یہ ظہور احمد .... یہ کراچی آ کر اتنا بڑا آدمی ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی نے گھر میں ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔

"تم سناؤ بھائی امیر خان اچانک کیسے آنا ہو گیا؟" نسیم نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "ظہور احمد بتا رہا تھا کہ آج سے دو دن پہلے تمہارا خط بھی موصول ہوا تھا جس میں تم نے لکھا تھا کہ تم کراچی آنے والے ہو لیکن تم نے کوئی دن تاریخ وغیرہ نہیں لکھا تھا۔"

"اچھا تو میرا خط مل گیا۔" امیر خان نے مسکرا کر کہا۔ "بس اچانک ہی میرے جی میں آئی کہ ایک چکر کراچی کا لگا کر آؤں۔ نہ جانے کتنے عرصے سے سوچ رہا تھا اور پچھلی بار جب ظہور احمد گاؤں آیا تھا تو اس نے بہت کہا تھا کہ میں کسی وقت کراچی آؤں۔ چنانچہ موسم ٹھیک ہوتے ہی میں کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔"

"بہت اچھا کیا بھائی امیر خان۔" نسیم نے کہا۔ "ایک بار گاؤں سے نکل کر باہر کی دنیا کو تو دیکھو ہمارے گاؤں کے لوگوں کو تو اس بات کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہے کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے وہ تو صدیوں پرانی دنیا میں سانس لے رہے ہیں۔ یہاں کراچی میں سب کچھ کتنا نیا ہے اور کیسی کیسی عجیب و غریب چیزیں یہاں موجود ہیں ہمارے گاؤں والوں کو تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ اب تم آئے ہو تو اچھی طرح سے شہر کو دیکھنا۔"

"ہاں بھابی۔" امیر خان نے کہا۔ "میں اس شہر کو اچھی طرح سے دیکھوں گا شہر

دیکھنے کے لئے ہی تو میں آیا ہوں۔"

اس وقت کام کرنے والی عورت نے اردو میں نسیم سے کہا کہ اب وہ اندر والے کمرے کے جالے صاف کرنے جا رہی ہے اور نسیم نے اردو میں ہی اس کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ اندر والے کمرے میں چلی جائے۔

"یہ .... عورت .... پشتو نہیں بولتی؟" امیر خان نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" نسیم نے جواب دیا۔ "یہ عورت پٹھان نہیں ہے یہ سندھی ہے۔ یہ یا تو سندھی بولتی ہے یا پھر اردو بولتی ہے۔"

سندھی کون ہوتے ہیں اور کیسے ہوتے ہیں اس کے بارے میں امیر خان کو بہت کم معلوم تھا' بہت ہی کم اور اس نے سندھی زبان تو کبھی سنی ہی نہیں تھی۔

اس وقت گھر کا دروازہ کھلا اور ظہور احمد فلک شیر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

"ارے تم .... امیر خان .... واہ واہ .... کتنی خوشی کی بات ہے کہ تم یہاں آئے۔" اور جوشِ مسرت میں بھرے ہوئے ظہور احمد نے آگے بڑھ کر امیر خان کو گلے لگایا۔ دونوں دوستوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ آپس میں مصافحہ کیا۔

"مجھے تمہارا خط مل گیا تھا۔" ظہور احمد نے کہا۔ "اور مجھے یہ جان کر بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی کہ تم کراچی آ رہے ہو۔ آخر تم نے یہاں آنے کا فیصلہ کر ہی ڈالا مگر تم نے اپنے خط میں یہ نہیں لکھا تھا کہ تم کون سی گاڑی سے آ رہے ہو۔ اگر مجھے پہلے سے یہ معلوم ہو جاتا کہ تم کون سی گاڑی سے آ رہے ہو تو میں تم کو لینے اسٹیشن آ جاتا۔ تم ٹرین سے ہی آئے ہو نا؟" اچانک ظہور احمد کو اس بات کا خیال آ گیا تھا۔

"ہاں .... میں ٹرین سے ہی آیا ہوں۔" امیر خان نے اس کو بتایا۔ "اور میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں ایک ہفتہ پہلے لکھوائے جانے والے خط میں تم کو اپنی آمد کی تاریخ اور وقت سے مطلع کر دیتا۔ اس وقت تو مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرح اور کون سی گاڑی سے روانہ ہوں گا۔"

"خیر بہت اچھا ہوا کہ تم آ گئے ہو۔" ظہور احمد نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اب کچھ دن تک یہاں رہو اور یہاں کی زندگی دیکھو۔"

نسیم چائے بنانے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی تھی اور اس کا پانچ سالہ بیٹا نور احمد اس کے ساتھ ساتھ باورچی خانے میں چلا گیا تھا۔

امیر خان اور ظہور احمد دونوں اکیلے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اور باتیں تو ابھی بس شروع ہی ہوئی تھیں ان دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کہنے سننے کے لئے بہت کچھ تھا۔

امیر خان، ظہور احمد کو فوراً ہی سب کچھ نہیں بتا دینا چاہتا تھا اس کا ارادہ تھا کہ ایک آدھ دن بعد اطمینان اور سکون کے ساتھ اس کو ساری بات بتائے گا اور پھر اپنے مقصد کے حصول میں اس سے مدد کے لئے درخواست کرے گا۔ فوری طور پر وہ اس کو کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چنانچہ جب ظہور احمد نے اس سے اس کے گھر والوں کی خیریت پوچھی تو اس نے یہی بتایا کہ سب لوگ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اس نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ اس کی سگی چچا زاد بہن شمروز خان کی بڑی بیٹی زرینہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔

گاؤں کی باتیں جو شروع ہوئیں تو کسی طرح سے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ نسیم اس دوران چائے بنا کر لے آئی تھی اور خود بھی ان کے ساتھ چائے پیتی رہی تھی۔ ظہور احمد امیر خان سے گاؤں کے حالات پوچھنے کے علاوہ اس سے اس کے سفر کی تفصیلات بھی پوچھتا رہا۔ امیر خان پہلی بار اپنے گھر سے اتنے لمبے سفر کے لئے نکلا تھا اس کے لئے یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا جس کے دوران اس نے بہت کچھ سیکھا اور جانا تھا۔

وہ لوگ تقریباً ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے اور پھر ظہور احمد نے امیر خان سے کہا کہ وہ نہا دھو لے اور تازہ دم ہو جائے اس کے بعد وہ اس کو اپنی دکان پر لے جائے گا اور اس کے قیام کا بندوبست بھی وہیں کرے گا۔

"ٹھیک ہے۔" امیر خان نے کہا۔

کچھ دیر کے بعد اس نے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کئے اور جب وہ غسل خانے سے باہر آیا تو ظہور احمد اپنی دکان پر جا چکا تھا اور فلک شیر اس کا منتظر تھا۔

"میں آپ کو اپنے ساتھ دکان پر لے چلوں گا۔" فلک شیر نے اس سے کہا۔ "بھائی صاحب مجھ سے کہہ گئے تھے۔"

"ٹھیک ہے چلو۔" امیر خان نے کہا اور فلک شیر کے ساتھ گھر سے چل پڑا۔

شام ہونے والی تھی اور دن کے اجالے کی چادر سمٹ رہی تھی امیر خان جس وقت سے یہاں آیا تھا اس کو بڑی بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی یہاں کا موسم بڑا عجیب و

غریب اور تکلیف دہ تھا ہر چیز چپک رہی تھی ہر چیز میں چپکنے کا اور گیلے پن کا احساس ہوتا تھا کپڑے جسم سے چپکے جاتے تھے۔ پسینہ تھا کہ سوکھنے میں ہی نہیں آتا تھا اور ہوا ایسی تھی جیسے بارش میں بھیگی بھیگی۔

ظہور احمد کی دکان گھر سے زیادہ دور نہیں تھی بس ایک گلی چھوڑ کر تھی۔ دکان ان کے چھوٹے سے گودام کا حصہ تھی یا یوں کہا جا سکتا تھا کہ گودام اور دکان ایک ہی تھے۔ اگلے حصے میں دکان تھی اور پیچھے گودام تھا اس گودام میں نہ جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ امیر خان نے اس کو غور سے دیکھا اور اس میں موجود زیادہ تر چیزیں اس کو ایسی نظر آئیں جن کو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ لوہے، لکڑی کی اور نہ جانے کس کس چیز کی بنی ہوئی کون کون سی چیزیں، اسے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ ٹوٹی پھوٹی خراب و خستہ چیزیں کس کے کام آتی ہوں گی بھلا۔

گودام میں اندر کی جانب ایک چھوٹا سا صحن بھی تھا جس کے ایک حصے کو خاص طور سے صاف ستھرا رکھا گیا تھا اور یہاں دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کھلے آسمان کے نیچے اس جگہ رات کو بڑے آرام سے سویا جا سکتا تھا۔

"تم رات کو یہیں سو جایا کرنا۔" ظہور احمد نے امیر خان سے کہا۔ "یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی ضرورت کی ساری چیزیں یہاں مہیا کر دی جائیں گی۔ یہاں پانی وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ کل سے میں خود بھی رات کو یہیں سویا کروں گا۔ آج مجھے ذرا کام ہے۔ دیر سے گھر واپس آؤں گا اس لئے آج کی رات تم اکیلے یہاں سو لو۔ کل سے میں بھی تمہارے ساتھ رات کو یہیں سویا کروں گا۔"

"لیکن بھابی اور بچے جو اکیلے رہیں گے؟" امیر خان نے پوچھا۔

"فلک شیر اچھا خاصا بڑا لڑکا ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "اور پھر......... گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لینے کے بعد سارا گھر محفوظ ہو جاتا ہے میں نے اپنے گھر کی حفاظت کا خاص بندوبست کر رکھا ہے۔"

"بھابی کو تمہارے بغیر اچھا نہیں لگے گا۔" امیر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھ کو الزام دیں گی کہ میں نے تم کو ان سے چھین لیا ہے۔"

"اگر تم کوئی عورت ہوتے تو وہ ضرور تم کو یہ الزام دے سکتی تھی۔" ظہور احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

باتوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا اس دوران کچھ گاہک وغیرہ بھی آتے رہے اور ظہور احمد ان سے بھی نپٹتا رہا۔

علاقہ میں بڑی رونق تھی یہاں زیادہ تر آبادی پٹھانوں کی تھی لیکن اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ اپنی وضع قطع اور لباس وغیرہ کے حساب سے تو سب ہی لوگ ایک جیسے نظر آتے تھے فرق صرف اس وقت معلوم ہوتا تھا جب وہ بولتے تھے۔ ان کی زبانیں الگ الگ تھیں لیکن وہ سب کے سب اردو بولتے اور سمجھتے تھے۔

امیر خان کو تھوڑی بہت اردو آتی تھی اس کے پاس ایک ریڈیو ٹرانزسٹر تھا جس کو وہ بڑے شوق سے سنا کرتا تھا اور پشتو کے علاوہ اردو زبان کے پروگرام بھی سنا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے تھوڑی بہت اردو سیکھ لی تھی اور اب اس کو اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کتنی زیادہ عقلمندی کی تھی۔

اندھیرا ہونے کے کچھ دیر کے بعد ظہور احمد نے اپنی دکان بند کر دی اور امیر خان کو ساتھ لے کر گھر آ گیا۔

رات کا کھانا مزیدار تھا مہمان کی آمد کے موقع پر خاص طور سے بہت اچھی اچھی چیزیں تیار کی گئی تھیں ان میں سے بعض ایسی بھی تھیں جن کے نام اور ذائقے سے امیر خان بالکل ناواقف تھا۔

"تم لوگ کراچی آ کر کتنا بدل گئے ہو۔" اس نے ظہور احمد اور نسیم کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "گاؤں میں تو ایسی چیزیں کوئی بھی نہیں پکاتا۔ کوئی جانتا بھی نہیں۔ یہاں آ کر تو تم لوگوں نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔"

"انسان جہاں جا کر رہتا ہے وہاں کے طور طریقوں کا اسے عادی بن جانا پڑتا ہے۔" نسیم نے اس سے کہا۔ "یہاں کراچی میں تو طرح طرح کے لوگ آباد ہیں ہر جگہ کا آدمی کراچی میں موجود ہے اور وہ سب لوگ ایک دوسرے کی چیزوں کو سیکھتے رہتے ہیں ہم لوگ یہاں کتنے طویل عرصے سے رہ رہے ہیں اور اس دوران ہم نے یہاں بہت کچھ سیکھا ہے بھائی امیر خان۔"

"ہاں بھابی' تم ٹھیک کہتی ہو۔" امیر خان نے کہا۔ "انسان جب اپنی جگہ بدلتا ہے اور دوسری کسی جگہ جا کر رہنے بسنے لگتا ہے تو اس میں بہت ساری تبدیلیاں نمودار ہو جاتی

ہیں۔"

وہ لوگ کھانا کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے نسیم اس سے بابر خیل کے مختلف گھرانوں کے لوگوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور امیر خان اسے ان کے بارے میں بتاتا رہا۔ نسیم نے اس سے اس کے والدین اور بھائی بہنوں کے بارے میں پوچھنے کے علاوہ اس کے چچا شمروز خان اور اس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھا۔

"ہاں بھابی وہ سب لوگ بھی خیریت سے ہیں۔" امیر خان نے سرسری سا جواب دے کر اس بات کو ختم کر دیا اور فوراً ہی کوئی دوسری بات کرنے لگا۔ نسیم نے بھی پھر ان لوگوں کے بارے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

امیر خان نے بہت عرصہ پہلے اس وقت ٹی وی دیکھا تھا جب وہ ایک دو دن کے لئے پشاور گیا تھا تب وہاں اس نے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر ٹی وی کے اسکرین پر چلتی پھرتی اور بولتی ہوئی انسانی تصویریں دیکھی تھیں جنہیں دیکھ کر وہ بہت خوش اور متحیر ہوا تھا اور یہاں کراچی میں ظہور احمد کے گھر میں بھی ٹی وی تھا۔ کھانا کھانے کے دوران ٹی وی بھی چلتا رہا تھا لیکن اس وقت وہ لوگ اس کی طرف زیادہ متوجہ نہیں تھے کیونکہ ٹی وی سے کوئی انگریزی کا پروگرام آ رہا تھا اور ان لوگوں میں سے کوئی بھی اس کی سمجھ نہیں رکھتا تھا۔ تاہم' امیر خان کے لئے ان چلتی پھرتی بولتی تصویروں کا خالی نظارہ ہی گہری دلچسپی اور تجسس کا باعث تھا وہ کھانے کے دوران ٹی وی دیکھتا رہا اور اس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

پھر جیسے ہی ان لوگوں نے کھانا ختم کیا ویسے ہی ٹی وی سے انگریزی کا پروگرام ختم ہو گیا اور اس کی جگہ کوئی اردو کا پروگرام شروع ہو گیا' اس پروگرام میں کئی لوگ گانا گا رہے تھے جن میں عورتیں بھی شامل تھیں کس قدر خوبصورت بنی سنوری' بہترین کپڑوں میں ملبوس ایسی عورتیں تھیں کہ ان کی شکلیں آنکھوں میں سمائی جا رہی تھیں۔ امیر خان کے دل و دماغ پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگا اور وہ وارفتگی کے عالم میں اس دل آویز منظر کو دیکھتا رہا۔ ظہور احمد اس کی اس محویت کو دیکھ کر آہستہ سے مسکرایا اور کہنے لگا۔ "اب بابر خیل کی بلند پہاڑیوں سے نیچے اتر آؤ امیر خان! بہت ہو چکا ان اجاڑ اور سرد ویرانوں میں بہت رہ چکے۔ شہر میں آ کر رہو اور دیکھو کہ شہری زندگی میں کیا کچھ موجود نہیں ہے۔"

"ہاں یار بات تو ٹھیک ہے۔" امیر خان نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے کہ اجاڑ اور سرد علاقوں میں زندگی بہت دشوار ہے لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت

ہے کہ جو کچھ وہاں ہے وہ یہاں نہیں۔"

"اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو کچھ یہاں ہے وہ وہاں نہیں ہے۔" نسیم نے کہا۔ "مجھے یاد ہے پچھلی بار جب میں گاؤں گئی تھی تو ایک دن سر کے درد کی گولی کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ پورے بابر خیل میں کہیں سر کے درد کی گولی نہیں مل سکی تھی۔ وہاں تو لوگ بس اسی طرح جیتے ہیں قسمت کے سہارے۔"

"ہاں بھابی۔" امیر خان نے ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "قسمت کے سہارے تو ہم سب ہی زندہ رہتے ہیں۔"

کھانا کھانے کے بعد ظہور احمد تقریباً آدھے گھنٹے رکا۔ پھر اس کو کسی کام سے جانا تھا وہ اور امیر خان ایک ساتھ ہی گھر سے باہر نکلے۔ اس نے امیرخان کو گودام تک پہنچا دیا ظہور احمد کے گھر کی طرح اس کے گودام اور دکان میں بھی بجلی تھی ظہور احمد نے امیر خان کو بجلی کے سوئچ دکھا دیئے اور اسے بتا دیا کہ ان کو کس طرح سے کھولا اور بند کیا جاتا ہے۔

"اب تم آرام سے سو جاؤ۔" ظہور احمد نے اس سے کہا۔ "دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ رات کو چوکیدار باہر گشت کرتا رہتا ہے وہ رات میں کئی بار زمین پر زور زور سے ڈنڈا کھٹکھٹائے گا تم اس کی آواز سے پریشان مت ہو جانا اور آرام سے سوتے رہنا' صبح کو اٹھ کر ہاتھ منہ دھو لینا غسل خانہ موجود ہے۔ نل لگا ہوا ہے پانی کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" امیر خان نے کہاں "تم اطمینان رکھو میں آرام سے سو جاؤں گا۔"

"بس صرف آج کی رات کی بات ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "کل سے تو میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔ رات کو ہم دونوں یہاں سویا کریں گے۔"

"تم میری وجہ سے تکلیف مت کرو۔" امیر خان نے کہا۔ "مجھے کوئی اکیلے سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے؟ کیا میں بچہ ہوں۔" وہ زور سے ہنسا۔

"ڈر لگنے کی بات نہیں ہے یار۔" ظہور احمد نے مسکرا کر کہا۔ "اب تم میلوں کا سفر طے کر کے کراچی آئے ہو پہلی بار میرے گھر میں مہمان ٹھہرے ہوئے۔ تو بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں تم کو رات کو اس گودام میں اکیلا سونے کے لئے چھوڑ دوں؟ ابھی تو تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ رات کو آرام سے لیٹ کر باتیں کیا کریں گے اور ابھی تو تم کو کراچی گھمانا ہے۔ میں ذرا دو ایک دن تک مصروف ہوں اس کے بعد میرے پاس کافی وقت ہو گا۔ پھر میں تم کو ساتھ لے کر کراچی گھماؤں گا تم اس شہر کو دیکھو گے تو عش عش

کر اٹھو گے اور پھر تمہیں احساس ہو گا کہ تم نے اب تک کراچی نہ آ کر کتنی بڑی غلطی کی۔"

"مجھے کچھ اندازہ ہوا ہے۔" امیر خان نے مسکرا کر کہا۔ "اسٹیشن سے تمہارے گھر تک آنے کے دوران میں نے بہت کچھ دیکھ ڈالا بہت زبردست' بہت عجیب و غریب شہر ہے تمہارا۔"

ظہور احمد اس کو وہاں گودام میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ صبح کو آ جائے گا اور امیر خان دروازہ اندر سے بند کر کے اطمینان سے چارپائی پر لیٹ گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ وہ بخیر و عافیت کراچی میں آن پہنچا تھا اور بغیر کسی دقت کے اپنے بچپن کے دوست ظہور احمد کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اسے سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی کہ وہ ظہور احمد کا گھر تلاش کر لے اور اس کے پاس پہنچ جائے۔ اگر ظہور احمد کا گھر نہ ملتا' یا ظہور احمد نہ ملتا تو اس کے لئے بڑا ہی ٹیڑھا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ اس اجنبی شہر میں اور کوئی بھی شخص اس کا جاننے والا نہیں تھا۔ یہاں تو کوئی ایسا بھی نہیں تھا جو ایک رات کے لئے ہی اسے پناہ دے سکتا اور اس کو معلوم تھا کہ کراچی کے لوگ کسی بھی اجنبی کو اپنے گھر میں پناہ نہیں دیتے ہیں۔

اب اسے آہستہ آہستہ اصل معاملے کی طرف آنا تھا۔ ظہور احمد نے اور اس کی بیوی نسیم نے اس سے اس کے چچا شمروز خان کے خاندان کے بارے میں پوچھا تھا اور اس نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔

"دو ایک دن میں ان کو سب کچھ بتا دوں گا۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "میں یہاں صرف گھومنے پھرنے' تفریح کرنے اور شہر دیکھنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ مجھے جلد از جلد اپنا کام ختم کرنا ہے۔ جتنی جلدی میں اپنا کام ختم کرلوں گا اتنا ہی زیادہ میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کروں گا اور مجھے اطمینان حاصل ہو گا۔"

اجنبی شہر کے اجنبی آسمان کے نیچے لیٹے ہوئے وہ بہت دیر تک جاگتا رہا اور اس معاملے کے بارے میں سوچتا رہا۔

اسے پوری امید تھی کہ ظہور احمد اس کی مدد کرے گا اور یہ کہ جب وہ ظہور احمد کو اس ساری بات کے بارے میں بتائے گا تو خود ظہور احمد کا خون بھی کھول اٹھے گا اور اس

کی غیرت بھی جوش میں آ جائے گی۔ آخر وہ بھی بابر خیل کا رہنے والا تھا اور اس کے گاؤں کی ایک لڑکی ایک دوسرے گاؤں کے نوجوان کے ساتھ جس کا تعلق ایک دشمن خاندان سے تھا بھاگ گئی تھی۔ تو اس لڑکی کو اور اس نوجوان کو سبق دینا صرف اس لڑکی کے خاندان والوں کی ہی نہیں بلکہ سارے گاؤں کے لوگوں کی ذمہ داری تھی۔ وہ سارے گاؤں کی مجرم تھی اس نے سارے گاؤں کے لوگوں کو ذلیل و رسوا کیا تھا۔ تو پھر کوئی بھی اس کو سزا دے سکتا تھا۔ گاؤں کا تو کوئی بھی شخص اس کو سزا دے سکتا تھا اور ظہور احمد اس گاؤں سے الگ تو نہیں تھا۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گیا۔

نئی جگہ تھی اور وہ ذہنی طور پر بہت زیادہ دباؤ کا شکار بھی تھا۔ رات کو اچھی طرح سے نیند نہیں آئی۔ بار بار آنکھ کھل جاتی تھی۔ سوتے اور جاگتے کی سی کیفیت میں اس کے سامنے زرینہ اور خیر زماں کی دھندلی دھندلی سی تصویریں ابھرتیں۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ دونوں اس کا مذاق اڑا رہے ہوں اس پر ہنس رہے ہوں اور اس پر ایک عجیب و غریب قسم کی مایوسی آمیز جھلاہٹ طاری ہو جاتی۔

یوں ہی سوتے جاگتے صبح ہو گئی۔ رات کو کئی بار اس نے چوکیدار کے ڈنڈا کھٹکھٹانے کی آواز بھی سنی تھی بڑی زوردار اور خوفناک قسم کی آواز تھی اور اگر ظہور احمد نے پہلے سے اس کو اس آواز کے بارے میں نہ بتایا ہوتا تو وہ اس کو سن کر پریشان ہو جاتا اور بہت سی چیزوں کی طرح یہ چیز بھی اس کے لئے بالکل نئی تھی اس کے گاؤں میں نہ کوئی چوکیدار تھا اور نہ کوئی راتوں کو اس طرح سے ڈنڈا کھٹکھٹاتا پھرتا تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کو پشتوں سے جانتے تھے باہر سے اگر کوئی شخص کچھ وقت کے لئے آتا تھا تو سارے گاؤں کے لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم رہتا تھا۔ گاؤں میں چوریاں نہیں ہوتی تھیں۔

وہ جلدی ہی ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو گیا اور اس نے گودام کا دروازہ کھول دیا۔ باہر گلی میں تقریباً سناٹا پڑا ہوا تھا البتہ دو چار لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک اخبار والا سائیکل پر بہت سارے اخبارات لادے ہوئے تیزی سے بھاگتا چلا جا رہا تھا‘ ایک دودھ والا موٹر سائیکل پر دودھ کے بڑے بڑے ڈبے لٹکائے ہوئے گلی میں داخل ہوا اور سیدھا ٹال کے اندر چلا گیا زندگی کی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد فلک شیر گودام میں آیا اور اس نے اس سے کہا کہ وہ گھر چل کر ناشتہ کر لے۔ "بھائی صاحب آپ

کو بلا رہے ہیں۔"

"اور .... یہاں .... گودام میں کون رہے گا۔ کیا اس کو خالی چھوڑ دوں؟"

"نہیں۔" فلک شیر نے جواب دیا۔ "میں اس میں تالا لگا دوں گا ابھی کام شروع ہونے میں دیر ہے۔"

"اچھا چلو۔" امیر خان نے کہا اور اس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔

فلک شیر نے دکان میں باہر سے تالا لگا دیا اور دکان اور گودام بند ہو گئے پھر وہ امیر خان کو اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ ذرا دیر میں دونوں گھر پہنچ گئے۔

"آج تمہیں کراچی کا بہت مزے دار ناشتہ کرائیں گے۔" ظہور احمد نے ہنستے ہوئے اس سے کہا۔ "پوری اور ترکاری‘ یہ اپنے گاؤں میں نہیں ہوتی۔ شہروں میں تو ہوتی ہے یہاں بہت عام ہے۔"

کمرے میں میز پر ایک برتن میں بہت ساری پوریاں رکھی ہوئی تھیں اور ایک دوسرے برتن میں ترکاری اور آس پاس خالی پلیٹیں اور چائے کے برتن۔

رات کو بھی امیر خان نے جب کھانا کھایا تھا تو اس کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا تھا کہ ظہور احمد اور اس کے گھر والے ہوٹل کی طرح میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے تھے‘ انہوں نے فرش پر دسترخوان بچھا کر یا چارپائیوں پر بیٹھ کر کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا اور اب وہ میز کرسی پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ ان لوگوں سے اس بارے میں پوچھے گا لیکن پھر اور بہت ساری باتوں کے درمیان یہ بات رہ ہی گئی۔ اب صبح کو جب وہ ناشتے کے لئے گیا تو اس نے ایک بار پھر میز سجی ہوئی دیکھی۔ جس کے گرد کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم لوگوں نے ہوٹل کی طرح میز کرسی پر کھانا کب سے شروع کر دیا؟" اس نے مسکرا کر ظہور احمد سے پوچھا۔

"یہاں کراچی میں اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں سب لوگ میز کرسی پر ہی کھاتے ہیں۔" ظہور احمد کے بجائے اس کی بیوی نسیم نے فوراً ہی جواب دیا۔ "یہاں ہمارے علاقے میں بہت سارے گھر ایسے ہیں جہاں میزوں پر کھایا جاتا ہے۔ ویسے تو فرش پر اور چارپائیوں پر بیٹھ کر کھانے کا رواج بھی بہت ہے لیکن وہ بات اب پرانی ہوتی جا رہی ہے۔ اچھا لگتا ہے میز کرسی پر کھاتے ہوئے آدمی اطمینان اور سہولت کے ساتھ کھا لیتا ہے۔"

امیر خان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ لوگ کراچی میں رہ کر بہت بدل گئے تھے۔ انہوں نے کئی نئی نئی باتیں اپنا لی تھیں جن کا گاؤں میں تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

پوریوں اور ترکاریوں کا ناشتہ بہت مزیدار تھا امیر خان نے اس سے پہلے ایک بار پشاور میں یہ ناشتہ کیا تھا اس کو بہت پسند آیا تھا۔

"اچھی طرح کھاؤ۔" ظہور احمد نے کہا۔ "کوئی تکلف مت کرنا یہ تمہارا ہی گھر ہے۔"

"جانتا ہوں۔" امیر خان نے مسکرا کر کہا۔ "تکلف بھلا کیوں کروں گا؟"

ناشتے کے بعد وہ دونوں واپس دکان میں آ گئے اور ظہور احمد نے دکان کھولی۔

"رات کو کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟" ظہور احمد نے اس سے پوچھا۔ "آرام سے سوئے؟"

"پریشانی بھلا کس بات کی ہوتی؟" امیر خان نے جواب دیا۔ "میں آرام سے سویا۔ البتہ یہ کہ نئی جگہ نیند ذرا دیر سے آتی ہے۔"

وہ ظہور احمد کو اپنے ذہنی خلجان کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد دکان میں ایک اور آدمی آ گیا اس کا نام ارشاد حسین تھا ظہور احمد نے ان دونوں کا آپس میں تعارف کرایا۔

ارشاد حسین ظہور احمد کی دکان میں منشی کا کام کرتا تھا وہ اردو لکھنا پڑھنا جانتا تھا اور کباڑی کے کام سے بھی بخوبی واقف تھا۔ وہ کوہاٹ کا رہنے والا تھا لیکن گزشتہ پندرہ سولہ سال سے کراچی میں رہ رہا تھا۔ کوہاٹ سے نویں کلاس پاس کر کے وہ کراچی آ گیا تھا اور تب سے یہیں کا ہو رہا تھا۔ ظہور احمد کے ساتھ وہ پچھلے پانچ سال سے کام کر رہا تھا اور ظہور احمد اس پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔

ارشاد حسین اپنے ساتھ اردو کا ایک اخبار بھی لے کر آیا تھا۔

"ہاں بھئی ارشاد حسین۔" کچھ دیر کے بعد ظہور احمد نے اس سے کہا۔ "کون کون سی خاص خاص خبریں ہیں؟ کچھ ہمیں بھی سناؤ۔" اور پھر وہ امیر خان سے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "ارشاد حسین صبح کو مجھے اخبار سے خاص خاص خبریں پڑھ کر

سناتا ہے۔"

"اچھا؟" امیر خان نے دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا کیا خبریں ہوتی ہیں اخبار میں؟"

"ساری خبریں ہوتی ہیں۔" ظہور احمد نے قدرے فخریہ انداز میں کہا۔ "دنیا بھر کی خبریں۔ ملک کی بھی اور ملک سے باہر کی بھی۔"

"میرے لئے تو آج اس میں سب سے اہم خبر میرے ضلع کے ایک گاؤں کی ہے۔" ارشاد حسین نے کہا۔ "میں قتل ہونے والے خاندان کے افراد کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔"

"کون؟ کون قتل ہو گیا؟" ظہور احمد نے چونک کر پوچھا۔ "کیوں قتل ہو گیا؟"

"یہ میرے ضلع کے ایک گاؤں کی خبر ہے اور جن لوگوں کے بارے میں خبر ہے میں انہیں جانتا تھا۔" اور ارشاد حسین وہ خبر پڑھ کر سنانے لگا۔

اس خبر کے مطابق ضلع کوہاٹ کے ایک گاؤں میں اکبر نامی ایک شخص نے اپنے سگے چچا، چچی، چچازاد بھائی اور چچا زاد بہن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ ملزم کے گھر والوں نے ملزم کی چچا زاد بہن زرینہ کے لئے ملزم کا پیغام دیا تھا جو کہ زرینہ کے گھر والوں نے مسترد کر دیا اور زرینہ کی شادی زرینہ کی مرضی کے مطابق ایک ایسے نوجوان سے کر دی جس کا تعلق غیر قبیلے اور غیر برادری سے تھا۔ ملزم کو اس بات پر بہت غصہ تھا اور اس نے ایک روز زرینہ کے گھر میں گھس کر پہلے تو زرینہ کو قتل کیا اور پھر اس کے والدین کے گھر میں داخل ہو کر اپنے سگے چچا، چچی اور چچا زاد بھائی کو بھی قتل کر دیا پولیس نے ملزم کو گرفتار کر لیا تھا۔

"بہت بری خبر ہے۔" ارشاد حسین نے پوری خبر ختم کرنے کے بعد کہا۔ "میں مرنے والوں کو جانتا تھا وہ سب بہت اچھے لوگ تھے۔"

"ہم لوگ ابھی بہت پیچھے ہیں ارشاد حسین۔" ظہور احمد نے ایک لمبی اور گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان ساری چیزوں پر قابو پانے میں اور ان کا خاتمہ کرنے میں بہت وقت لگے گا۔ بتاؤ بھلا اگر وہ لڑکی ملزم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی تو یہ اس کا حق تھا آخر زندگی تو اس کو گزارنی تھی اور جب اس کے والدین نے بھی اس کی خواہش کے مطابق عمل کیا تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہیں رہا۔"

"ملزم نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس کو اس بات پر زیادہ غصہ تھا کہ زرینہ کے گھر والوں نے اس کی شادی برادری سے باہر کر دی۔"

"نہ جانے ہم لوگ کب تک ایسی فضول پابندیوں کا شکار رہیں گے۔" ظہور احمد نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "ابھی پچھلے ہی ہفتے میں نے ایک ایسی شادی میں شرکت کی تھی ہمارے محلہ میں ہی' جس میں دولہا سندھی ہے اور دلہن گجراتی۔ اور ہاں کراچی میں تو ایسی شادیاں بہت ہو رہی ہیں۔ ایک قوم کے لوگ دوسری قوم کے لوگوں میں شادیاں کر رہے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔"

"بات یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک زندگی کی قدر کرنا نہیں سیکھی ہے۔" ارشاد حسین نے کہا۔ "ہم لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر قتل ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ انسان کو زندگی بار بار نہیں ملتی اور زندگی ایسی شے تو نہیں ہے جسے یوں بے دردی سے ضائع کر دیا جائے۔"

"اور کیا۔" ظہور احمد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اب کیا مل گیا اس شخص کو یہ حماقت کر کے؟ اس نے کتنے گھروں کو اجاڑ دیا اور خود بھی اجڑ گیا۔ اب پھانسی سے کم کی سزا تو نہیں ہو گی اس کو۔ کیا مل گیا یہ سب کچھ کر کے؟"

"پھانسی کا تختہ اور کچھ نہیں۔" ارشاد حسین نے آہستہ سے کہا۔ "اچھا' اب یہ ایک اور خبر سنو۔ ایک عورت نے ایک ساتھ پانچ بچوں کو جنم دیا.........."

ارشاد حسین خبر پڑھ کر سنا رہا تھا لیکن امیر خان کچھ نہیں سن رہا تھا۔ ابھی ابھی اس نے ان دونوں کی جو باتیں سنی تھیں اس کے بعد اس کے دل پر کچھ مایوسی سی طاری ہو گئی تھی اور ساتھ ہی اس کے دل میں کچھ خدشات نے بھی جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ ظہور احمد اس کی مدد کرنے سے انکار تو نہیں کر دے گا؟

"نہیں .... وہ انکار نہیں کر سکتا۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "وہ بھلا کس طرح سے انکار کر سکتا ہے؟ کیا یہ معاملہ ایسا ہے جس میں میری مدد کرنے سے انکار کیا جائے؟ اور پھر.......... میں اس سے یہ کب کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے ساتھ مل کر ان دونوں کو گولی مار دے؟ میں تو یہ کام خود اپنے ہاتھ سے کروں گا۔ اس کی تو مجھے ان لوگوں کی تلاش میں اور بعض دوسری چیزوں میں مدد درکار ہے وہ میری مدد ضرور کرے گا۔"

ارشاد حسین نے اخبار میں سے پڑھ کر اور بھی کئی خبریں سنائیں لیکن امیر خان کو

کسی خبر وغیرہ میں دلچسپی نہیں تھی اس کا ذہن تو اور بہت سی دوسری باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

اس روز ظہور احمد کافی مصروف رہا وہ بار بار آتا اور جاتا رہا اور امیر خان اندر گودام میں آرام کرتا رہا۔ دوپہر اور رات کا کھانا دونوں نے گھر میں ایک ساتھ ہی کھایا تھا اور پھر رات کو ظہور احمد بھی سونے کے لئے گودام میں آ گیا۔

"بس کل تھوڑی سی اور مصروفیت ہے۔" ظہور احمد نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد پھر فرصت ہو گی اور پھر میں تم کو کراچی گھماؤں گا۔ خوب اچھی طرح سے یہاں کے خاص خاص مقامات کی سیر کراؤں گا اور تم کو سمندر بھی دکھاؤں گا۔"

امیر خان کے دل میں سمندر سمیت ان ساری چیزوں کے دیکھنے کا شوق تو بہت تھا لیکن فی الحال تو اسے سب سے زیادہ دلچسپی اپنے کام سے تھی۔ جس خوفناک عزم کو اپنے دل میں لئے ہوئے وہ بابر خیل سے کراچی آیا تھا وہ اس کی دوسری تمام خواہشات پر غالب تھا اور دوسرے تمام شوق اس کے سامنے مدھم پڑ گئے تھے۔ ہر دوسری چیز دھندلا گئی تھی۔ امیر خان نے آج کی رات سے ہی اپنا کام شروع کر دیا وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے اپنے لئے راستہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔

"ڈیرہ امین گل کے بخت خان کا سالا دراز گل بھی تو کراچی میں ہے۔" اس نے باتوں باتوں میں ظہور احمد سے کہا۔ "اس کا پتہ معلوم ہے تم کو؟"

"دراز گل؟" ظہور احمد نے کہا۔ "میں برسوں سے اس سے نہیں ملا لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ ہے یہاں کراچی میں ہی اور غالباً سبزی منڈی میں کام کرتا ہے۔ کیوں؟ کیا تم ملنا چاہتے ہو اس سے؟"

"لیکن اس کا پتہ کہاں سے ملے گا؟ کس طرح ملے گا؟" امیر خان نے اس کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی ایسی زیادہ مشکل بات نہیں؟" ظہور احمد نے کہا۔ "میرے کئی جاننے والے ایسے ہیں جو سبزی منڈی میں کام کرتے ہیں۔ میں ان سے معلوم کر سکتا ہوں' کیا تم دراز گل سے ملنا چاہتے ہو؟"

"تم پہلے اس کا پتہ معلوم کرا لو۔" امیر خان نے کہا۔ "وہ کہاں کام کرتا ہے اور کہاں رہتا ہے۔ یہ معلوم ہو جائے تو پھر اس کے پاس جانے کے بارے میں بھی سوچیں

گئے۔"

"لیکن .... بخت خان کی تو تمہارے خاندان کے ساتھ دشمنی ہے؟" ظہور احمد نے کہا۔ "تم درازگل سے..........."

"درازگل کا خاندان الگ ہے اور بخت خان کا خاندان الگ ہے۔" امیر خان نے کہا۔ "وہ پچھلے دنوں اپنے گاؤں آیا تھا۔ میری بھی اس سے دعا سلام ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں کراچی آیا ہوں تو اس سے بھی مل لوں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "میں کل ہی اس کا پتہ معلوم کر لوں گا۔"

اس وقت امیر خان کے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور وہ قدرے پریشان ہو گیا۔

"اگر درازگل کا پتہ بتانے والے شخص نے درازگل کو یہ بھی بتا دیا کہ اس کے علاقے سے کوئی شخص یا فلاں فلاں شخص آیا ہوا ہے اور اس کا پتہ تلاش کر رہا ہے تو پھر تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی اگر وہ دونوں وہاں موجود ہوں گے تو عین ممکن ہے کہ درازگل ان کو چھپا دے گا۔"

"لیکن .... تم درازگل کا پتہ جس شخص کے ذریعے بھی معلوم کرنا اس کو یہ نہ بتانا کہ کون آیا ہوا ہے جو درازگل سے ملنا چاہتا ہے۔"

"نہیں .... مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "لیکن تم کس وجہ سے اپنے آپ کو اس سے چھپانا چاہتے ہو؟"

"ارے نہیں .... یہ بات نہیں۔" امیر خان نے کہا۔ "کیا معلوم میں اس سے مل سکوں یا نہ مل سکوں' وہ خواہ مخواہ آس لگائے بیٹھا رہے گا اور میرا انتظار کرتا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "میں اس کا خاص طور سے خیال رکھوں گا۔"

امیر خان بڑی ہوشیاری اور خوش اسلوبی کے ساتھ اصل بات کو چھپا گیا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ ظہور احمد کو ساری بات تفصیل کے ساتھ بتائے بغیر چارہ نہیں تھا لیکن ابھی فوری طور پر سب کچھ بتا دینے کے بجائے وہ یہ چاہتا تھا کہ پہلے درازگل کا پتہ معلوم ہو جائے اس کے بعد ہی وہ اس کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔

دونوں رات کو بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بچپن سے لے کر آج تک کے دور کی بہت ساری خوشگوار اور ناخوشگوار باتیں۔

اگلے دن بھی امیر خان نے زیادہ تر وقت گودام میں ہی گزارا' جہاں ارشاد حسین سارا وقت موجود رہا تھا اور کام کے ساتھ ساتھ اس سے باتیں بھی کرتا رہا تھا۔ ظہور احمد آج بھی زیادہ تر باہر ہی رہا تھا۔

شام کو ظہور احمد نے اس کو بتایا کہ کل اسے درازگل کے گھر کا پتہ معلوم ہو جائے گا۔

"وہ سبزی منڈی میں فروٹ کا کاروبار کرتا ہے۔" ظہور احمد نے امیر خان کو بتایا۔

"اچھا خاصہ چلتا ہوا کاروبار ہے اس کا اور وہ پی آئی بی کالونی میں کہیں رہتا ہے۔ پی آئی بی کالونی سبزی منڈی کے پیچھے واقع ہے۔"

"اچھا .... تو یہاں تک معلوم کر لیا تم۔" امیر خان نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" ظہور احمد نے کہا۔ "میں نے تم کو بتایا تھا کہ منڈی میں میرے کئی جاننے والے موجود ہیں۔ آج ہی ایک آدمی سے میں نے بات کی تھی اس نے کہا کہ وہ کل تک اس کے گھر کا پتہ معلوم کر کے مجھے بتا دے گا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" امیر خان نے کہا۔

"پھر اگر تم اس کے پاس چلنا چاہو گے تو میں تمہیں اپنے ساتھ پی آئی بی کالونی لے چلوں گا۔" ظہور احمد نے کہا۔

"ہاں..........." امیر خان نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ "پھر دیکھیں گے۔"

اگلے دن صبح ہی کو ناشتے کے بعد ظہور احمد امیر خان کو ساتھ لے کر کراچی کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ اس نے ایک جاننے والے کی سوزوکی دوپہر تک کے لئے کرائے پر لے لی تھی اور وہ اپنے ساتھ ایک اور دوست کو بھی لے گیا تھا جو اس کے پڑوس میں ہی رہتا تھا اس کا نام بیدار خان تھا۔

سب سے پہلے وہ لوگ سمندر گئے اور امیر خان کا سب سے پہلا تاثر خوف کا تھا اس نے سمندر کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اور اسے سمندر دیکھنے کا بڑا شوق تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اس قدر خوفناک شے ہوتی ہے۔ سمندر کے عظیم الشان پھیلاؤ اور اس کی زبردست طاقت کو دیکھ کر امیر خان کو انسان کی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس ہوا تھا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس طاقتور اور خوفناک شے کے سامنے ایک انسانی جسم کی بھلا کیا

حیثیت ہے۔ موج کا ایک ہلکا سا تھپیڑا انسان کی زندگی کو ختم کر دینے کے لئے کافی تھا۔

لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی اس کے سامنے تھا' انسان نے اپنی بے ضاعتی اور کم مائیگی کے باوجود سمندر کے سینے پر چلنے کا فن سیکھ لیا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے دیو پیکر جہاز تیر رہے تھے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے جہاز جو انسانی عقل و دانش کا کرشمہ تھے اور جنہیں چلانے والے بھی انسان تھے۔ سمندر میں کئی جہاز نظر آ رہے تھے اور ظہور احمد ایک خاص قسم کے احساسِ تفاخر کے ساتھ امیر خان کو ان کے بارے میں بتا رہا تھا۔ امیر خان کے لئے تو یہ سب کچھ بالکل نیا تھا اور ظہور احمد اس کو ان ساری چیزوں کے بارے میں اس طرح بتا رہا تھا جیسے ان ساری چیزوں کے بنانے کا' انہیں وجود میں لانے کا سہرا اس کے ہی سر ہو۔

اس دن امیر خان نے کراچی کی خوب سیر کی۔ ظہور احمد اس کا دوست اسے ساتھ لئے ہوئے مختلف جگہوں پر گئے اور انہوں نے اس کو ان کے بارے میں بتایا۔ قائداعظم کے مقبرے کی عظیم الشان اور خوبصورت عمارت دیکھ کر امیر خان دنگ رہ گیا۔ "اتنے بڑے اونچے گنبد کو بنانے کے لئے نہ جانے کتنی محنت کرنی پڑی ہو گی۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر وہ اس عمارت کے سحر اور دلکشی میں جیسے کھو کر رہ گیا۔

"بہت بڑا شہر ہے کراچی۔" اس نے آہستہ سے ظہور احمد سے کہا۔ "اس کو دیکھ کر تو جیسے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے! کیوں؟" ظہور احمد نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے ڈر لگتا ہے کہ اگر کہیں آدمی یہاں کھو جائے تو پھر کیا ہو؟" امیر خان نے کہا۔ "یہاں تو آدمی خود اپنے آپ کو نہیں ڈھونڈ سکتا۔"

وہ تینوں ایک ساتھ ہنسنے لگے اور اس لمحے امیر خان کو محسوس ہوا کہ زندگی واقعی بڑی خوبصورت ہے۔ اپنی زندگی بھی اور دوسروں کی زندگی بھی۔ مگر یہ احساس کوئی زیادہ دیرپا صورت اختیار نہیں کر سکا۔

دوپہر کا کھانا انہوں نے باہر ہی کھایا اور سہ پہر کے قریب وہ واپس آ گئے پہلے وہ سیدھے دکان پر گئے جہاں ارشاد حسین موجود تھا اور فلک شیر بھی اس کے ساتھ تھا۔ اسکول سے واپس آنے کے بعد فلک شیر تھوڑا بہت وقت دکان کو بھی دے دیتا تھا۔ اگرچہ ظہور احمد کی طرف سے اس پر ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔

دکان پر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا ارشاد حسین نے ایک پرچہ نکال کر ظہور احمد کی طرف بڑھایا۔ "عبداللہ خان آیا تھا۔" اس نے کہا۔ "دراز گل کا پتہ دے گیا ہے میں نے اس کاغذ پر لکھ لیا ہے۔"

"اوہ .... اچھا .... اس نے تو رات کو آنے کا کہا تھا۔"

"ہاں وہ کہہ رہا تھا کہ وہ آج شام کو کسی ضروری کام سے حیدر آباد جا رہا ہے اس لئے اس نے جانے سے پہلے تم کو دراز گل کا پتہ دینا ضروری سمجھا۔ پتہ تو اس نے کل رات کو ہی معلوم کر لیا تھا کہہ رہا تھا کہ دراز گل ایک عرصہ دراز سے پی آئی بی کالونی میں رہ رہا ہے اور سبزی منڈی میں پھلوں کا کاروبار کرتا ہے۔"

"اچھا .... کیا پتہ ہے؟" ظہور احمد نے کہا۔ "ذرا پڑھو۔"

ارشاد حسین نے پتہ پڑھ دیا۔ بڑا ہی مختصر سا پتہ تھا بس کوارٹر نمبر فلاں فلاں پی آئی بی کالونی۔

"کیا اس پتے سے کوئی اس کے مکان پر پہنچ سکتا ہے؟" امیر خان نے حیرت سے پوچھا۔

"پہنچ سکتا ہے۔" ظہور احمد نے جواب دیا۔ "کوئی مشکل نہیں۔ پی آئی بی کالونی کوئی بہت بڑی اور پھیلی ہوئی جگہ نہیں ہے۔ آدمی کالونی پہنچ جائے اور اسے مکان نمبر معلوم ہو تو پھر وہ پوچھتے پوچھتے مکان تلاش کر لیتا ہے۔"

ارشاد حسین نے جو مکان نمبر بتایا تھا اسے امیر خان نے سنا اور اپنے دل میں محفوظ کر لیا اس نے اس کو دہرایا بھی نہیں۔ بس دل پر نقش کر لیا۔ اب وہ اس کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

"میں اکیلا پی آئی بی کالونی جا سکتا ہوں۔" اس نے دل میں کہا۔ "پی آئی بی کالونی یقیناً مشہور جگہ ہو گی اور سارے رکشہ ٹیکسی والے اسے جانتے ہوں گے۔ میں کسی بھی رکشہ میں بیٹھ کر پی آئی بی کالونی جا سکتا ہوں اور وہاں اس نمبر کے مکان کو بھی تلاش کر سکتا ہوں اور پھر .... میں دراز گل کے پاس بھی پہنچ سکتا ہوں اس سے مل سکتا ہوں۔ لیکن اس طرح سارا کام خراب ہو جائے گا۔ دراز گل کو فوراً ہی میرے عزائم کا علم ہو جائے گا اور اگر وہ دونوں وہاں موجود ہوئے تو وہ ان کو وہاں سے بھگا دے گا کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دے گا اور پھر میرے لئے ان کو تلاش کرنا بہت مشکل ہو گا۔"

امیر خان کے لئے ضروری تھا کہ وہ خاموشی کے ساتھ یہ بات معلوم کرے کہ آیا دراز گل کا بھانجہ خیر زماں اکیلا یا کسی لڑکی کے ساتھ گاؤں سے اس کے پاس آیا ہے یا نہیں' اور یہ کہ آیا وہ کہیں اور مقیم ہے۔ یہ بات خفیہ طور پر معلوم کی جائے گی اور پھر اس کے بعد ہی اگلا قدم اٹھایا جا سکتا تھا۔ ان دونوں کے بارے میں پوری معلومات حاصل ہو جانے کے بعد ہی ان کو نشانہ بنایا جا سکتا تھا اور ان سارے کاموں کے لئے اب ظہور احمد کی مدد کی ضرورت تھی۔

"ایک نہ ایک دن تو پوری بات اس کو بتانی ہی ہے۔" اس نے دل میں کہا۔ "تو پھر آج رات ہی سہی۔ دراز گل کا پتہ تو معلوم ہو چکا ہے اور یہ اس سلسلے میں سب سے اہم کڑی ہے۔ اب ان دونوں کے بارے میں بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں موجود ہیں یا نہیں لیکن انہیں یہیں موجود ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ اور کہاں جا سکتے ہیں۔"

اس رات کو جب وہ دونوں گودام میں اپنے اپنے بستروں پر بیٹھے ہوئے تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے تو امیر خان نے اس اہم بات چیت کا آغاز کیا۔

"تم نے دراز گل کا پتہ تو معلوم کروا لیا ظہور احمد اب ایک اور بہت اہم بات معلوم کرنی ہے۔"

"وہ کیا؟" ظہور احمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"معلوم یہ کرنا ہے ظہور احمد کہ آیا ڈیرہ امین گل کے بخت خان کا بیٹا خیر زماں اکیلا یا کسی لڑکی کے ساتھ دراز گل کے گھر میں مقیم ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ دراز گل کو اس بارے میں کچھ معلوم یا نہیں۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" ظہور احمد نے الجھتے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ ہے ظہور احمد کہ بخت خان کا بڑا بیٹا خیر زماں اپنے گاؤں سے بھاگ آیا ہے اور ہم سب لوگوں کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ کراچی میں اپنے ماموں اور دراز گل کے پاس موجود ہو گا۔"

"بھاگ آیا ہے؟" ظہور احمد نے تعجب سے کہا۔ "اچھا تو اگر وہ اپنے گاؤں سے بھاگ آیا ہے تو تم کو اس کی تلاش کس لئے ہے؟ کیا وہ وہاں سے کسی کو نقصان پہنچا کر بھاگا ہے؟ کسی کو قتل کر کے بھاگا ہے؟"

"اس نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔" امیر خان نے کہا۔ "لیکن وہ وہاں سے اکیلا

نہیں بھاگا وہ وہاں سے ایک لڑکی کے ساتھ بھاگا ہے۔"

"لڑکی کے ساتھ؟" ظہور احمد ایک دم چونک پڑا اور پوری طرح مستعد ہو کر اس کی بات سننے لگا۔ "لڑکی؟ کون لڑکی؟"

"میری چچا زاد بہن زرینہ۔" امیر خان نے جواب دیا۔ "شمروز خان کی بڑی بیٹی۔"

"شمروز خان کی بیٹی .... اور بخت خان کا بیٹا؟" ظہور احمد نے سخت حیرت کے ساتھ کہا۔ "یہ کیسی بات کہہ رہے ہو تم؟ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے دشمن خاندان ہیں ان کے درمیان تو صدیوں پرانی دشمنی چلی آ رہی ہے۔"

"ہاں ظہور احمد۔" امیر خان نے کہا۔ "اس دشمنی کے باوجود بات کچھ ایسی ہی ہے۔ زرینہ خیر زماں کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے اور قرائن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں بھاگ کر خیر زماں کے ماموں دراز گل کے پاس کراچی آئے ہوں گے۔"

"گویا اس بات کا یقین نہیں ہے؟" ظہور احمد نے کہا۔ "تم جو کچھ بھی کہہ رہے ہو وہ صرف شک کی بنیاد پر کہہ رہے ہو؟ بہتر ہو گا کہ تم مجھ کو ساری بات بتاؤ آخر معاملہ کیا ہے۔"

"میں تم کو بتاتا ہوں۔" امیر خان نے کہا اور اس نے تفصیل کے ساتھ ظہور احمد کو پوری بات بتائی کہ کس طرح دراز گل زرینہ کے لئے اپنے بھانجے کا پیغام لے کر گیا تھا جسے شمروز خان نے بڑی سختی کے ساتھ مسترد کر دیا تھا جبکہ دراز گل نے یہ اشارہ بھی دے دیا تھا کہ ان دونوں کی مرضی بھی یہی تھی اور اس کے بعد دراز گل ڈیرہ امین گل کے دو بزرگوں کو اپنے ساتھ لے کر دوبارہ شمروز خان کے پاس گیا تھا اور شمروز خان نے اس بار بھی اس کی بات کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا تھا۔

ظہور احمد اس کی بات غور سے سنتا رہا اور بیچ بیچ میں کوئی سوال بھی پوچھتا رہا اور اس پر حیرت و اضطراب کے آثار نمایاں نظر آ رہے تھے۔

امیر خان نے جب اپنی بات کا پہلا حصہ ختم کر دیا جس کا تعلق صرف واقعات کے بیان سے تھا تو ظہور احمد نے کہا "زرینہ اور خیر زماں دونوں ایک ہی رات اپنے اپنے گھروں سے غائب ہو گئے اور پھر ان کا کوئی پتہ نہیں چلا؟"

"ہاں۔" امیر خان نے کہا۔ "ایسا ہی ہوا تھا۔"

"تو کیا کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے ان دونوں کو ایک ساتھ جاتے دیکھا ہو یا جسے یقینی طور پر اس بات کا علم ہو کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہی گئے ہیں؟"

"نہیں۔" امیر خان نے کہا۔ "ایسا کوئی آدمی موجود نہیں ہے کسی نے بھی ان کو نہیں دیکھا۔"

"تو گویا ساری بات صرف قیاس کی ہے؟" ظہور احمد نے کہا۔

"نہیں' قیاس کی نہیں یقین کی بات ہے؟" امیر خان نے کہا۔ "یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے تھے۔"

"ہاں .... قرائن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نکل گئے جب شمروز خان نے اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر انہوں نے یہی راستہ اپنایا۔"

"ہاں ظہور احمد۔ امیر خان نے جلدی سے کہا۔ "انہوں نے بدی اور گناہ کا راستہ اپنایا' وہ ایک دوسرے کے ساتھ بھاگ گئے اور دونوں نے اپنے خاندان کو ذلیل و رسوا کیا۔"

ظہور احمد کچھ دیر تک بالکل خاموش رہا وہ کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔

"تو .... تو .... اب تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ خیر زماں اور زرینہ دراز گل کے گھر میں موجود ہیں یا نہیں؟" ظہور احمد نے اس سے پوچھا۔

"ہاں..........." امیر خان نے جواب دیا۔ "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان دونوں کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ آیا وہ دراز گل کے گھر موجود ہیں یا یہ کہ دراز گل ان کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔"

"فرض کرو کہ وہ دونوں دراز گل کے گھر میں موجود ہوئے یا دراز گل کے ذریعے ان کا پتہ معلوم ہو گیا تو .... تو پھر تم کیا کرو گے؟"

"تمہارے خیال میں مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟" امیر خان نے الٹا اس سے سوال کیا۔
"اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر جواب دینا کہ وہ لڑکی میری سگی چچا زاد بہن ہے۔"

"اسی بات کے پیشِ نظر میں کہہ رہا ہوں۔" ظہور احمد نے کہا۔ "سب سے پہلے تو تم کو یہ معلوم کرنا چاہئے کہ آیا ان دونوں نے شادی کر لی ہے یا نہیں کی ہے۔ اگر نہیں کی ہے تو ان کو اس بات پر تیار کرو کہ وہ فوراً شادی کر لیں اور پھر ان کو ان کے حال پر چھوڑ

دو۔"

"کیا مطلب؟" امیر خان نے حیرت' مایوسی اور ناامیدی کے سمندر میں غوطے لگاتے ہوئے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"تمہارا مطلب ہے ان کی اس شرم ناک حرکت کو معاف کر دیا جائے؟ برداشت کر لیا جانا چاہئے انہیں کوئی سزا نہیں ملنی چاہئے؟"

"بھئی .... دیکھو نا امیر خان .... اگر وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں' محبت کرتے ہیں ایک دوسرے سے' تو ان کی شادی کر دینی چاہئے تھی لیکن جیسا کہ تم بتا رہے ہو تمہارے چچا شمروز خان نے اس پر آمادگی ظاہر نہیں کی اور اس کے نتیجے میں وہ دونوں گھر سے بھاگ گئے۔ تمہیں کیا خبر ان دونوں نے شادی کر لی ہو' یقیناً کر لی ہو گی۔ اس بات کو تو کئی ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ اب تک بغیر شادی کے نہیں ہوں گے۔ انہوں نے یقیناً شادی کر لی ہو گی تو بس قصہ ختم کرو۔ ظاہر ہے وہ لوگ اب اپنے علاقے میں واپس آنے کی ہمت نہیں کریں گے بس ان کو بھول جاؤ کوئی ان سے تعلق نہ رکھے' سارے لوگ ان سے قطع تعلق کریں ان کی اس حرکت کی یہ سزا کافی ہے کہ ان کے والدین اور ان کے رشتے دار وغیرہ ان سے قطع تعلق کر لیں۔"

امیر خان کا دل ڈوب رہا تھا۔ اسے اپنا سارا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آ رہا تھا۔ ظہور احمد کیسی باتیں کر رہا تھا؟ کیا ہو گیا تھا اس کو؟ اس کی غیرت کہاں مر گئی تھی؟ یہ کیسا پٹھان تھا؟

"ظہور احمد..........." امیر خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا تم یہ بات بھول گئے ہو کہ اس قسم کے لوگوں کے ساتھ ہمارے ہاں کیسا سلوک کیا جاتا ہے؟ تم اگر اب اپنے علاقے میں نہیں رہتے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اپنی غیرت کو بھی دفن کر دو' اس قسم کی لڑکیوں کے ساتھ ہمارے ہاں کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے اور اس قسم کے آدمیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ تم بھول گئے؟"

"میں بھولا کچھ نہیں ہوں امیر خان۔" ظہور احمد نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن اس قتل و غارت گری سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ اس قسم کی چیزوں کا اب خاتمہ ہونا چاہئے۔ انسانی جان اتنی ارزاں نہیں کہ اسے یوں اتنی آسانی سے ضائع کر دیا جائے اگر دو افراد اپنی مرضی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اس کا حق تو ملنا چاہئے؟ آخر

اس میں کون سی برائی ہے؟ اور پھر.......... چلو.......... اگر ہمارے علاقے کے لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے تو پھر یہی کریں کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان سے قطع تعلق کرلیں۔ یہاں کراچی میں کتنے لڑکے لڑکیاں اپنی مرضی سے شادیاں کر لیتے ہیں۔"

"کراچی کی بات مت کرو ظہور احمد۔" امیر خان نے بیزاری کے ساتھ کہا۔ "کراچی سے ہمارا کیا واسطہ؟ ہم تو وہی کریں گے جو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے ہوتا چلا آیا ہے۔"

"تم.......... کیا کرنا چاہتے ہو؟" ظہور احمد نے بڑے محتاط انداز میں پوچھا اس کا لب و لہجہ بدل گیا تھا۔

"میں.......... میں وہی کرنا چاہتا ہوں جو ایک بھائی کو اس معاملے میں کرنا چاہئے۔" امیر خان نے صاف طور پر کہا اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اس معاملے کو مزید ٹال نہیں سکتا تھا۔ اسے ظہور احمد سے صاف صاف بات کرلینی تھی۔ "ان دونوں نے ہمارے خاندان کی عزت کو بٹہ لگایا ہے اور وہ دونوں واجب القتل ہیں۔"

"اوہ تم بڑی خوفناک بات سوچ رہے ہو امیر خان!" ظہور احمد کے لہجے میں گہری سنجیدگی کے ساتھ ساتھ خوف کی جھلک بھی موجود تھی۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک ظالمانہ فعل ہو گا۔ دنیا بدل گئی ہے امیر خان۔ اس قسم کی باتوں میں قتل نہیں ہونے چاہئیں اور دوسری بات یہ کہ تم یہ کام اگر اپنے علاقے میں کرتے تو کچھ اور صورت ہوتی' لیکن اگر تم یہ کام کراچی میں کرو گے تو بالکل مختلف صورت ہو گی۔ یہاں پولیس ہے' جیل ہے' قانون ہے جو ہمارے علاقے کے رسم و رواج سے بالکل مختلف ہیں۔ جو کچھ تم سوچ رہے ہو وہ یہاں کرنا کوئی آسان نہیں ہے اگر تم پکڑے گئے تو سیدھے سیدھے پھانسی کے تختے پر جاؤ گے اور.........."

"لیکن میں کیوں پکڑا جاؤں گا۔" امیر خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں ہر کام بہت ہوشیاری سے کروں گا۔ بڑی خاموشی سے سب کچھ کروں گا اور بچ نکلوں گا۔ ظاہر ہے کہ تم میری مدد کرو گے ہم دونوں مل کر سارا منصوبہ بنائیں گے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے کیونکہ تم یہاں کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو۔ ان دونوں کو گولی مارنا میرا کام ہے تم کو صرف میری مدد کرنا ہے۔"

"تم.......... تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" ظہور احمد نے اس سے پوچھا۔

"سب سے پہلا کام تو یہ ہے ظہور احمد کہ یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا وہ دونوں دراز گل کے گھر میں ہیں یا نہیں اور اگر وہ دراز گل کے گھر میں نہیں تو کہاں ہیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ وہ کراچی میں آئے ہوں گے اور سیدھے دراز گل کے پاس پہنچے ہوں گے۔ دراز گل نے پہلے بھی ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی تھی اور یہ دراز گل ہی تھا جو خیر زماں کا پیغام لے کر میرے چچا کے پاس آیا تھا اور پھر بعد میں اپنے گاؤں کے دو بزرگوں کو لے کر دوبارہ وہاں آیا۔ وہ دراز گل کے پاس ہی آئے ہوں گے اور اس نے ان کو پناہ دی ہو گی۔ مجھے تم سے سب سے پہلے تو یہ مدد چاہئے کہ تم مجھے اس کے ٹھکانے کے بارے میں معلومات فراہم کر دو اور اس کے بعد.......... اس کے بعد ان کو ٹھکانے تو میں اپنے ہاتھ سے لگا دوں گا تم کو اس میں کچھ نہیں کرنا ہو گا باقی کام میں خود کرلوں گا اور جب میں ان دونوں کو ختم کر دوں گا تو اس کے بعد میں تمہارے پاس واپس نہیں آؤں گا بلکہ فوراً ہی کراچی سے نکل جاؤں گا۔"

ظہور احمد نے فوری طور پر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ فضا پر بوجھل خاموشی طاری تھی۔ دونوں اپنی اپنی سوچ میں غرق تھے۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سب کچھ اتنا آسان ہو گا؟" کچھ دیر کے بعد ظہور احمد نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں امیر خان! یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہو گا یہاں پولیس قاتل کو تلاش کر لیتی ہے اور اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو بس سمجھ لو کہ مصیبت آ جائے گی۔"

"جو ہو سو ہو۔" امیر خان نے کہا۔ "میں تم کو صاف بتا دوں کہ میں خاص طور سے اسی کام کے لئے کراچی آیا ہوں۔ میرے چچا اور چچی نے مجھے بھیجا ہے اگر زرینہ کا کوئی اپنا سگا بھائی ہوتا تو یہ کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتا لیکن زرینہ کا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔ میں اس کا چچا زاد بھائی ہوں۔ اس لئے یہ کام مجھ کو اپنے ہاتھ سے کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں اپنے خاندان کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کو سزا دوں اور میں اپنے اس فرض کو ضرور پورا کروں گا۔"

"اچھا امیر خان اب رات بہت زیادہ ہو گئی ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "اب ہم کو سو جانا چاہئے۔ میں اس معاملے کے بارے میں سوچوں گا اور پھر ہی تمہیں کچھ بتاؤں گا فی الحال تو آرام کرو۔" اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

امیر خان سمجھ گیا کہ وہ فی الحال کوئی وعدہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور سوچ بچار

کے بعد ہی کچھ فیصلہ کرے گا اس کو اس ساری صورت حال سے سخت صدمہ پہنچا۔ اسے تو پورا یقین تھا کہ ظہور احمد سب سے پہلے تو ایک پٹھان ہونے کے ناطے اور پھر ایک دوست ہونے کے ناطے اس کی مدد کرے گا کیونکہ وہ جو کچھ کرنے جا رہا تھا اس میں کوئی برائی نہیں تھی بلکہ یہ تو ایک ضروری اور قابلِ فخر کارنامہ تھا اور ظہور احمد کو اس کی تعریف کرنی چاہئے تھی لیکن ظہور احمد کا رویہ تو بڑا مایوس کن تھا اس نے اس کی تعریف اور مدد کرنے کے بجائے الٹا اس کی مخالفت کی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی مدد کرنے سے کنی کاٹ رہا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے فی الحال اس موضوع کو ہی ٹال دیا تھا۔

امیر خان کے دل و دماغ میں ایک زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ سینکڑوں میل کا سفر کر کے اپنے گاؤں سے کراچی صرف اس لئے نہیں آیا تھا کہ سمندر دیکھے' اونچی اونچی عمارتیں اور چوڑی چوڑی سڑکیں دیکھے اور ظہور احمد کی میزبانی سے لطف اندوز ہو۔ یہ ساری چیزیں تو ضمنی تھیں اصل کام تو وہ تھا جو اس کو اب کرنا تھا۔ اس کے بغیر تو وہ اپنے وجود میں بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ زرینہ اور خیر زماں کو قتل کرنے کی خواہش اور عزم لے کر کراچی آیا تھا اور یہی اس کی آمد کا اصل مقصد تھا۔ ان دونوں نے بہت بھیانک جرم کیا تھا اور انہیں اس کی سزا ضرور ملنی چاہئے تھی۔

اگلے دن صبح کو جب اس کی آنکھ کھلی تو ظہور احمد بھی اس وقت تک بیدار ہو چکا تھا اور اپنے بستر پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

"ایک بات کا خیال رکھنا امیر خان۔" ظہور احمد نے اس سے مخاطب ہو کر گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اپنی بھابی کو اس معاملے کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ ان کو یہ مت بتانا کہ تم کس مقصد کے لئے کراچی آئے ہو۔"

"نہیں۔" امیر خان نے کہا۔ "عورتوں کو اس قسم کے معاملات میں الجھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھابی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم اطمینان رکھو۔"

اس روز ظہور احمد نے دن کا زیادہ تر وقت باہر گزارا اور اس نے صبح ہی امیر خان کو بتا دیا تھا کہ اس کو آج کئی ضروری کاموں کے سلسلے میں جانا تھا امیر خان دکان پر ہی رہا ارشاد حسین بھی دکان پر تھا اور سارا دن رہا۔ ظہور احمد کی عدم موجودگی میں وہ دکان کو پوری ذمہ داری کے ساتھ سنبھال لیتا تھا۔

ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر مزید گفتگو رات کو ہی ہوئی۔ جب کہ وہ

دونوں گودام میں اکیلے تھے اور اپنے اپنے بستروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"میں نے اس معاملے کے بارے میں بہت سوچا ہے امیر خان!" ظہور احمد نے بات چیت کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "اور میں تم کو بھی مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ تم اپنے اس ارادے سے باز آ جاؤ اور ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر واپس گاؤں چلے جاؤ۔ وہ دونوں جانیں اور ان کا مقدر .... جہنم میں ڈالو ان کو۔ تم ان کی خاطر اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔"

"میں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈال رہا ہوں' ظہور احمد۔" امیر خان نے کہا۔ "میں تو صرف وہ کر رہا ہوں جو کہ مجھے کرنا چاہئے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔"

"نہیں امیر خان۔" ظہور احمد نے کہا۔ "ان دونوں نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے جو تم بدلے میں ان کو قتل کر دو۔ اس بات کو بھول جاؤ۔ گاؤں واپس چلے جاؤ امیر خان اور انہیں بھول جاؤ۔ وہ لوگ تم سے کچھ طلب نہیں کر رہے ہیں۔ تم بھی ان سے کچھ طلب نہ کرو۔"

"گویا تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم اس معاملے میں میری کوئی مدد نہیں کرنا چاہتے؟" امیر خان نے مایوسی آمیز تلخی کے ساتھ اس سے کہا۔ "مجھے تو تمہاری دوستی پر بڑا مان تھا۔"

"میں پہلے بھی تمہارا دوست تھا امیر خان اور اب بھی تمہارا دوست ہوں۔" ظہور احمد نے کہا۔ "اور ایک دوست کے ناطے ہی میں تم کو یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ اس بات کو بھول جاؤ اور اپنے آپ کو خطرے میں مت ڈالو۔ یہ ہمارا علاقہ نہیں ہے۔ یہاں ہم من مانی نہیں کر سکتے ہم اپنے علاقے سے باہر ہیں امیر خان۔ اس جگہ کے اپنے قاعدے قوانین ہیں یہاں تمہارے مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لئے کوئی جرگہ نہیں بیٹھے گا۔"

"تم کو اس بات کا اتنا خوف کیوں ہے کہ میں پکڑا جاؤں گا؟" امیر خان نے کہا۔

"اس لئے کہ تم ایک ناتجربہ کار آدمی ہو اور پولیس والے بہت تجربہ کار ہوتے ہیں۔" ظہور احمد نے کہا۔ "انہیں ایک ذرا سا سراغ مل جائے تو وہ سارے معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور مجرم کو گرفتار کر لیتے ہیں۔"

"اگر تم میری مدد کرو گے تو میں پوری طرح محفوظ رہتے ہوئے یہ کام کر سکوں گا۔" امیر خان نے کہا۔

"دیکھو امیر خان۔ میں تم سے صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔" ظہور احمد نے کہا۔ "تم میرے بچپن کے دوست ہو اور میں تمہاری دوستی کی بہت قدر کرتا ہوں اور تمہاری خاطر ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہوں لیکن تم ذرا اس صورت حال پر غور کرو کہ میں صرف تمہارا دوست ہی تو نہیں ہوں۔ میں ایک بال بچے دار آدمی بھی ہوں۔ میرا گھر ہے' گھر والے ہیں جن کی طرف سے مجھ پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ میں یہاں کراچی میں ایک مطمئن زندگی گزار رہا ہوں میرا اپنا کاروبار ہے۔ اچھا کھاتا کماتا ہوں۔ اب اگر میں قتل کی واردات میں تمہارے ساتھ ملوث ہو جاؤں تو میرا کیا حشر ہو گا؟ تم کو شاید معلوم نہیں کہ یہاں جو سزا جرم کی ہے وہی اعانت جرم کی بھی ہے۔ اگر تم پکڑے جاؤ گے تو تمہارے ساتھ تمہاری مدد کرنے کے جرم میں' میں بھی پکڑا جاؤں گا اور جو سزا تم کو ملے گی وہی مجھ کو بھی ملے گی اور میں جان بوجھ کر ایک ایسے فضول کام کے لئے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہتا جس سے کسی کا بھی فائدہ نہیں۔ ذرا تم خود ہی سوچو .... اس کام سے کس کا فائدہ ہے؟ تمہارا؟ زرینہ کے گھر والوں کا؟ خیر زماں کے گھر والوں کا؟ کس کا فائدہ ہے؟ کسی کا بھی نہیں' تو پھر تم اپنے آپ کو کیوں برباد کر رہے ہو؟ اور میں اپنے آپ کو کیوں برباد کروں؟ میرا تو سارا گھر تباہ ہو جائے گا۔ میرے بچوں کی پرورش کون کرے گا؟ میری بیوی کس کے آگے ہاتھ پھیلائے گی؟ نہیں امیر خان نہیں .... میں اس جرم میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا۔"

ظہور احمد بولتے بولتے رک گیا اور امیر خان تو پہلے ہی سے خاموش تھا اس نے ظہور احمد کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

اور اب وہ پورے طور سے سمجھ چکا تھا کہ ظہور احمد کی مرضی کیا ہے۔ ساری بات یہ تھی کہ ظہور احمد اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے گھر کی' اپنے بیوی بچوں کی' اپنے کاروبار وغیرہ کی فکر تھی اور وہ اپنی جان کے لئے ذرا سا بھی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

"کراچی کی زندگی نے پٹھانوں کو بزدل بنا دیا ہے۔" امیر خان نے بڑی بیزاری اور نفرت کے ساتھ سوچا۔

"پھر بھی میں صرف ایک حد تک تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" کچھ دیر کے بعد ظہور احمد نے دوبارہ اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے دراز گل کا پتہ تو معلوم کر ہی لیا

ہے میں یہ بھی معلوم کروا سکتا ہوں کہ آیا وہ دونوں دراز گل کے گھر میں موجود ہیں یا نہیں اور اگر دراز گل کے گھر میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں۔ میں اپنے ذرائع سے خاموشی سے یہ معلومات حاصل کر کے تم کو دے سکتا ہوں اور جہاں تک ریوالور کا تعلق ہے تو میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ تم کو ایک جگہ کا پتہ بتا سکتا ہوں جہاں سے تم کو ریوالور مل سکتا ہے۔ تم کو کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے اگر پیسوں کی کچھ کمی ہو گی تو وہ میں پوری کر دوں گا۔"

"اگر تم اتنا بھی کر دو گے تو میں اس کے لئے تمہارا بہت بہت شکر گزار ہوں گا۔" امیر خان نے کہا۔

"لیکن دو ایک باتیں اور بھی ہیں امیر خان۔" ظہور احمد نے جلدی سے کہا۔ "ان پر تم اچھی طرح غور کر لو۔"

"ہاں ہاں کہو۔" امیر خان نے جلدی سے کہا۔ "میں تو تمہاری ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوں۔"

"تو یہ بات مان لو کہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ صرف اور صرف تمہاری دوستی کے حوالے سے کر رہا ہوں ورنہ بصورت دیگر مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لئے تم بھی کسی بھی مرحلے پر مجھے اپنے ساتھ ملوث نہیں کرو گے۔ اگر خدا نخواستہ .... خدا نخواستہ تم پکڑے گئے تو تم اس معاملے کے کسی بھی مرحلے میں مجھے ملوث نہیں کرو گے۔ تمہاری زبان بالکل خاموش رہے گی۔ تم پولیس کو ہرگز نہیں بتاؤ گے کہ میں نے تمہاری مدد کی تھی.........."

"اطمینان رکھو۔" امیر خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ میرا قول ہے میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی بھی مرحلے پر تمہارا نام نہیں لوں گا۔ اگر خدا نخواستہ ایسی کوئی صورت ہوئی تو تمہارا نام میری زبان پر کبھی نہیں آئے گا۔"

"اور یہ بھی امیر خان کہ تم پولیس کو بھی یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم نے مجھے زرینہ اور خیر زماں کے بارے میں اپنے عزائم سے آگاہ کیا تھا۔ تمہیں یہ ظاہر کرنا ہو گا کہ تم نے مجھ کو اس معاملے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ تم میرے گھر آ کر چند روز مہمان ٹھہرے تھے اور پھر چلے گئے تھے اور تم نے مجھ سے زرینہ اور خیر زماں کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔"

"بالکل .... ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہو گا۔" امیر خان نے کہا۔ "مجھ پر بھروسہ رکھو

میری زبان چاہے کٹ جائے لیکن اس پر تمہارا نام نہیں آئے گا۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں۔"

"بس تو پھر ہمارے درمیان یہ بات طے ہو گئی۔" ظہور احمد نے کہا۔ "دیکھو امیر خان برا مت ماننا میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا میں بال بچے والا آدمی ہوں میری ایک جمی جمائی زندگی ہے جما جمایا کاروبار ہے میں محض دو انسانوں کی ایک حماقت آمیز غلطی کی خاطر اپنے آپ کو تباہی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔ میں اپنے آپ کو تباہ نہیں کر سکتا۔ میں اپنے بیوی بچوں کو آخر کس بات کی سزا دوں؟"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" امیر خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش رہو میں تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا اور چاہے میری جان چلی جائے میں تمہارا نام کبھی نہیں لوں گا۔"

"بس میں یہی چاہتا ہوں۔" ظہور احمد نے کہا۔ "لیکن دیکھو امیر خان ایک دوست کی حیثیت سے' ایک بھائی کی حیثیت سے میں تم کو ایک بار پھر یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ اس خیال سے باز آ جاؤ اس کام میں کچھ نہیں رکھا سوائے نقصان کے۔ آخر ان دونوں کو ختم کر کے تم کو کیا مل جائے گا؟ کچھ بھی نہیں .... ارے وہ اگر گناہگار ہیں تو ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو سب سے بڑا منصف تو وہی ہے وہ خود ہی ان کو سزا دے لے گا تم کیوں خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگتے ہو۔"

"میں یہاں سے خالی ہاتھ صرف اس صورت میں جا سکتا ہوں ظہور احمد جب وہ دونوں یہاں اس شہر میں موجود نہ ہوں۔" امیر خان نے گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "مجھے یہاں سے جا کر شمروز چاچا کو اور آمنہ چاچی اور اپنے باپ کو منہ دکھانا ہے۔ میں ان کو کیا جواب دوں گا؟ کیا میں ان سے یہ کہوں گا کہ وہ دونوں وہاں موجود تھے میں نے ان کا پتہ لگا لیا تھا اور اس کے بعد ان کو زندہ رہنے کے لئے چھوڑ کر چلا آیا۔ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ کیا وہ لوگ مجھے معاف کر دیں گے؟ کبھی نہیں ظہور احمد کبھی نہیں۔ بات یہ ہے کہ تم کراچی میں آ کر آباد ہو گئے ہو' اور تم نے اپنے علاقے سے اپنا ناطہ توڑ لیا ہے۔ تم کراچی میں تو جس طرح سے چاہو رہ سکتے ہو یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا لیکن وہاں اپنے علاقے میں ہم اس طرح تو نہیں رہ سکتے۔ ہمارے گھر کی لڑکی ایک غیر نوجوان کے ساتھ گھر سے بھاگ جائے اور ہم خاموش بیٹھے رہیں اور ان دونوں کو آزاد چھوڑ دیں۔

نہیں ظہور احمد .... ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں کو اس کی سزا ملنی ضروری ہے۔"

"تمہاری مرضی۔" ظہور احمد نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے تم کو اونچ نیچ سمجھا دی ہے آگے تم جانو اور تمہارا کام۔"

"اب جو بھی ہو میرا مقدر۔" امیر خان نے کہا۔ "میں جو کچھ طے کر کے آیا ہوں' اس پر عمل تو مجھ کو کرنا ہی ہے۔ اگر اس میں میری جان بھی جاتی ہے تو جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "تو اب ہمارے درمیان ساری باتیں طے ہو گئی ہیں۔ میں جلد از جلد ان دونوں کے بارے میں تم کو معلومات فراہم کر دوں گا۔"

ظہور احمد نے جو کچھ کہا تھا وہ بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا۔ امیر خان اگر اس کے بچپن کا دوست نہ ہوتا تو وہ اس کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیتا لیکن امیر خان کے ساتھ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم وہ اپنے آپ کو تباہ کرنے کے لئے بھی قطعی تیار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے امیر خان کی صرف جزوی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے اپنی بیوی نسیم کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اسے اچھی طرح سے علم تھا کہ اگر وہ نسیم کو اس کے متعلق بتائے گا تو نسیم فوراً بھڑک اٹھے گی اور اس سے کہے گی کہ اس خطرناک مہمان کو فوراً گھر سے رخصت کر دیا جائے اور اس سے کسی بھی قسم کا واسطہ نہ رکھا جائے۔ نسیم ہرگز اس بات کے لئے تیار نہ ہوتی کہ زرینہ اور خیر زماں کو قتل کرنے کے سلسلے میں امیر خان کی مدد کی جائے۔ وہ اس کو کسی حالت میں بھی گوارا نہ کرتی کہ اس کا شوہر ایسے بھیانک جرم میں حصے دار بن کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دے اور اپنے خاندان کو تباہی سے دوچار کر دے اور اس صورت میں ظہور احمد کے لئے اپنی بیوی اور اپنے بچپن کے قابل اعتماد دوست کے درمیان توازن برقرار رکھنا بڑا مشکل ہو جاتا اس لئے اس نے یہ محفوظ راستہ اختیار کیا کہ نسیم کو اس سارے معاملے سے بے خبر رکھا۔

امیر خان اور ظہور احمد کے درمیان تعلقات میں اب خوشی اور گرم جوشی کا عنصر تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اگلے دن بھی دونوں ایک دوسرے سے کٹے کٹے سے رہے۔ دو دن پہلے تک وہ دونوں جیسے شیر و شکر تھے لیکن اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ ان کے درمیان اجنبیت کی ایک دیوار آن کھڑی ہوئی تھی۔ اگلے دن ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ امیر خان تو دکان پر ہی رہا اور زیادہ تر وقت ارشاد حسین کے ساتھ

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ ظہور احمد صبح کو ہی دکان سے چلا گیا تھا اور پھر وہ دوپہر کے کھانے کے وقت آیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ دوبارہ کہیں اور چلا گیا تھا پھر وہ سہ پہر کے قریب واپس آیا تھا۔

"معاف کرنا یار۔" واپسی کے بعد ظہور احمد نے امیر خان سے کہا۔ "کاروبار میں بھاگ دوڑ بہت کرنی پڑتی ہے اگر یہ سب کچھ نہ کریں تو کام نہیں چلتا۔"

"ہاں .... میں سمجھ سکتا ہوں۔" امیر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "محنت اور بھاگ دوڑ کے بغیر بھلا کون سا کاروبار ہو سکتا ہے۔"

دو دن کے بعد رات کو ظہور احمد نے امیر خان کو بتایا کہ اس نے ضروری معلومات حاصل کرلی ہیں۔

"کیا؟" امیر خان نے چونک کر سخت اضطراب اور ہیجان کے عالم میں کیا۔ "کیا .... کیا معلوم کیا ہے تم نے؟ کیا وہ دونوں..........."

"وہ دونوں کراچی میں ہی موجود ہیں اور انہوں نے شادی کرلی ہے۔" ظہور احمد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "معلوم ہوا ہے کہ دراز گل کا بھانجا خیر زماں اپنی بیوی کے ساتھ پچھلے کئی ماہ سے پی آئی بی کالونی میں رہ رہا ہے اور سبزی منڈی میں ہی پھلوں کا کاروبار کر رہا ہے۔ پہلے کچھ عرصہ تک تو وہ دونوں میاں بیوی دراز گل کے مکان میں ہی رہے تھے' لیکن پھر انہوں نے پی آئی بی کالونی میں ہی الگ مکان کرائے پر لے لیا ہے اور دونوں اس میں رہ رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ خیر زماں کی بیوی کا نام زرینہ ہے۔ تو تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ وہی زرینہ ہو گی۔"

"بالکل .... بالکل۔" امیر خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے .... ظاہر ہے .... کوئی دوسری زرینہ تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اچھا اس کا مطلب ہے کہ ان دونوں نے شادی کرلی ہے اور انہیں دراز گل کی طرف سے پورا تحفظ اور حمایت حاصل ہے۔"

"اب جبکہ انہوں نے شادی کرلی ہے اور وہ میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں تو بہتر ہو گا امیر خان ان کا پیچھا چھوڑ دو۔" ظہور احمد نے ایک بار اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "خود بھی چین سے رہو اور ان دونوں کو بھی چین سے رہنے دو۔"

"ان دونوں کو تو اب ہمیشہ کے لئے چین مل جائے گا۔" امیر خان نے زہریلے لہجے

میں کہا۔ "اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کو بھی چین مل جائے گا۔"

"یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ خیر زماں کراچی آنے کے بعد بہت بیمار ہو گیا تھا۔" ظہور احمد نے کہا۔ "اس کے سر میں چوٹ لگ گئی تھی اور پھر اس کے سر کا آپریشن ہوا تھا' بہت بڑا آپریشن تھا جس میں اس کی جان کو بھی خطرہ لاحق تھا۔"

"یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ بیمار ہو کر مر نہیں گیا۔" امیر خان نے آہستہ سے کہا۔ "نہیں .... اس کو یا زرینہ کو بیمار ہو کر نہیں مرنا چاہئے۔ انہیں زندہ رہنا چاہئے۔ انہیں زندہ رہنا چاہئے تاکہ میں انہیں اپنے ہاتھ سے مار سکوں۔" اس کی آنکھوں کی خوفناک چمک دیکھ کر ظہور احمد چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ یہ خالص حیوانی چمک تھی' خون کی پیاسی نفرت اور انتقام کی آگ سے دہکتی ہوئی چمک اور ظہور احمد اب اس قسم کی چمک سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا اس کی نظروں کے سامنے اپنی بیوی نسیم اپنے بیٹے نور احمد اور اپنے سالے فلک شیر کے چہرے ابھر رہے تھے جن کی خاطر وہ زندہ تھا' جنہیں وہ خوش رکھنا اور خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ انہیں برباد نہیں کر سکتا تھا۔ نہیں .... نہیں اسے اس حیوانی چمک سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"بہرحال .... وہ دونوں کراچی میں ہی ہیں اور پی آئی بی کالونی میں دراز گل کے گھر سے کچھ فاصلے پر رہ رہے ہیں۔ دراز گل کا پی آئی بی کالونی میں اپنا ذاتی مکان ہے اور خیر زماں اور زرینہ کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔"

"تو اب مجھے دراز گل کے مکان کا اور خیر زماں کے مکان کا پتہ سمجھاؤ۔" امیر خان نے کہا۔

"میں بتاتا ہوں۔" ظہور احمد نے کہا اور اپنی جیب میں سے ایک کاغذ نکالا اور اسے کھول کر امیر خان کے سامنے کر دیا۔

"دیکھو .... یہ پی آئی بی کالونی کا بس اسٹاپ ہے۔" اس نے کاغذ پر بنے ہوئے ایک گولے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا جہاں سے ایک سیدھی لکیر آگے جاتی ہوئی دکھائی گئی تھی۔ کاغذ پر پنسل سے وہ نقشہ پہلے سے بنا ہوا تھا۔

"یہ ایک ہی سڑک ہے' سیدھی اور لمبی سڑک جو آگے دور تک چلی جاتی ہے سڑک پر سیدھے چلے جاؤ۔" اور وہ تفصیل کے ساتھ امیر خان کو دونوں مکانوں کا پتہ سمجھانے لگا کس ہاتھ کو کتنی گلیاں چھوڑ کر کس گلی میں مڑنا تھا۔ اس گلی کی کیا پہچان تھی

وغیرہ وغیرہ۔ وہ اس کو ساری نشانیاں بتا رہا تھا اور ظہور احمد کاغذ پر نظریں گاڑے ہوئے بڑے انہماک کے ساتھ سب کچھ سن رہا تھا۔

"کیا .... کیا .... ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک بار تم مجھ کو اپنے ساتھ وہاں لے چلو۔" امیر خان نے کہا۔ "صرف ایک بار .... اور دور سے مجھے وہ دونوں گھر دکھا دو تم وہاں رکنا نہیں۔"

"میں .... میں اس بارے میں سوچوں گا۔" ظہور احمد نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "اصل میں' میں نہیں چاہتا کہ مجھے اس علاقے میں تمہارے ساتھ دیکھا جائے وہاں میرے کئی جاننے والے رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" امیر خان نے کہا۔ "تم سوچ لو۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھے اپنے ساتھ لے چلنا اور اگر مناسب نہ سمجھو تو کوئی بات نہیں۔ میں خود ہی تلاش کر لوں گا۔"

"پی آئی بی کالونی جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "بس سے بھی جا سکتے ہیں اور رکشہ وغیرہ سے بھی۔ رکشہ والے سے کہہ دو کہ پیر کالونی جانا ہے وہ سیدھا وہیں لے جائے گا۔ پی آئی بی کالونی کو پیر کالونی بھی کہتے ہیں ویسے اس کا پورا نام پیر الٰہی بخش کالونی ہے۔ سارے رکشہ اور ٹیکسی ڈرائیور پیر کالونی کے نام سے اس کو خوب جانتے ہیں اور وہاں بسیں بھی جاتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے ظہور احمد۔" امیر خان نے کہا۔ "تم نے میرا یہ بہت بڑا کام کر دیا ہے۔ اب ایک کام اور کر دو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک ریوالور............"

"اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔" ظہور احمد نے کہا۔ "میرے پاس ایک پرانا ریوالور پڑا ہوا ہے مجھے ایک جگہ کباڑ خانے میں مل گیا تھا میں نے اس کو ٹھیک ٹھاک کر لیا ہے اور وہ بالکل درست حالت میں ہے۔ تم اس کو آزما کر دیکھ سکتے ہو۔ وہ بہت اعلیٰ درجے کا ریوالور ہے گولیوں کا بندوبست بھی کر دوں گا۔"

"بس .... پھر اور کیا چاہئے مجھ کو بھلا؟" امیر خان نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تم وہ ریوالور اور گولیاں مجھ کو دے دو اور میں پیر کالونی پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "میں کل ہی وہ چیزیں تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"اچھا' تو یوں کہو کہ خیر زماں اب بیوپاری بن گیا ہے۔" کچھ دیر کے وقفے کے بعد

امیر خان نے کہا۔ "اس نے منڈی میں پھلوں کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔"

"اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔" ظہور احمد نے کہا۔ "دراز گل اس کی اور اس کی بیوی کی ساری عمر تو مہمان داری نہیں کر سکتا تھا۔ ان لوگوں کو یہاں آئے ہوئے کئی ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔"

"ہاں ظہور احمد۔" امیر خان نے کہا۔ "ان دونوں کو یہاں آئے ہوئے کئی ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ دونوں جب وہاں سے بھاگے تھے تو اسی وقت یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ میں ان کو سزا دینے کے لئے کراچی آؤں گا لیکن تب سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا اور اگر اس وقت میں وہاں سے کراچی کے لئے روانہ ہو جاتا تو پھر میں واپس گاؤں نہیں جا سکتا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ مجھ کو کراچی میں اپنا کام کرنے میں کتنے دن لگ جاتے اور اس عرصے میں ہمارے علاقے کے سارے راستے بند ہو جاتے۔ برف باری اور سردی کے باعث ہمارا علاقہ ساری دنیا سے کٹ کر رہ جاتا ہے پھر میں اس وقت تک واپس گاؤں نہیں جا سکتا تھا جب تک کہ گرمیوں کا آغاز نہ ہو جاتا اور برف پگھل کر راستے نہ کھل جاتے اس لئے مجھے انتظار کرنا پڑا اور میں اس وقت کراچی آیا جب سردیوں کا موسم ختم ہو کر گرمیاں شروع ہو رہی تھیں اور اب میں اپنا کام ختم کرتے ہی یہاں سے واپس گاؤں چلا جاؤں گا۔"

☆======☆======☆

اگلے روز ناشتے کے بعد دکان میں آنے کے تقریباً فوراً ہی بعد ظہور احمد نے امیر خان سے کہا کہ "اس کے ساتھ چلے ہم پیر کالونی جا رہے ہیں۔"

"پیر کالونی؟" امیر خان نے حیرت سے کہا۔ "یعنی .... تم مجھے اپنے ساتھ............؟"

"ہاں امیر خان۔" ظہور احمد نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "میں تمہیں اپنے ساتھ پیر کالونی لئے چلتا ہوں اور تم کو دراز گل اور خیر زماں کے مکان دکھا دوں گا یہ وقت ایسا ہے کہ وہ دونوں ہی اس وقت منڈی میں ہوں گے اور اس بات کا بہت ہی کم امکان ہے کہ ان میں سے کوئی اپنے گھر میں موجود ہو یا گھر کے باہر کہیں آس پاس گھوم پھر رہا ہو۔ منڈی میں پھلوں کا کاروبار کرنے والے عام طور سے رات کے آخری پہر میں منڈی جاتے ہیں اور پھر کوئی دس گیارہ بجے کے قریب واپس آ جاتے ہیں۔ بعد میں شام کو پھر چکر لگاتے ہیں۔ بہرحال اس وقت ان دونوں کے گھر پر موجود ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ مگر پھر بھی ہم احتیاط برتیں گے۔ ہمارے سروں پر ٹوپیاں ہوں گی اور ہم اپنی گردنوں کے گرد اپنی چادروں کو اس طرح لپیٹیں گے کہ ہماری شکلیں ایک نظر میں پہچانی نہ جا سکیں۔"

"ٹھیک ہے۔" امیر خان نے خوش ہوتے ہوئے جلدی سے کہا' اور پھر ان دونوں نے اپنے آپ کو اس حلئے میں ڈھال لیا اور باہر نکل گئے۔

دکان پر ارشاد حسین کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ ظہور احمد نے فلک شیر کو وہاں بٹھا دیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ جب تک ارشاد حسین نہ آ جائے اس وقت تک دکان پر موجود رہے۔

اپنے گھر اور دکان سے کافی دور پیدل جانے کے بعد ظہور احمد نے ایک رکشہ والے کو روکا۔

"پیر کالونی چلنا ہے۔" اس نے رکشہ والے سے کہا اور رکشہ والے نے فوراً گردن

ہلا کر ان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پیر کالونی یہاں سے بہت دور تھی اور کسی بھی رکشہ والے کو اتنی لمبی مسافت تک جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔

"میں تم کو وہاں تک بس سے جانے کا راستہ بھی بتا دوں۔" ظہور احمد نے کہا۔ "تم اگر چاہو تو بس سے بھی جا سکتے ہو۔" اور پھر وہ اس کو بتانے لگا کہ پیر کالونی جانے کے لئے کہاں کہاں سے بس مل سکتی ہے۔

"ٹاور پر آ جاؤ تو یہاں سے تمہیں آٹھ نمبر کی بس ملے گی............" وہ اسے تفصیل سے بتانے لگا۔ امیر خان نہایت انہماک اور توجہ کے ساتھ اس کی بات سن رہا تھا اور ایک ایک لفظ کو جیسے گھول کر پی جانا چاہتا تھا۔

رکشہ پھٹ پھٹ کرتا ہوا بے تحاشہ بھاگتا ہوا بھری پُری سڑکوں پر سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔ شیر شاہ سے پیر کالونی تک کا راستہ بہت طویل تھا اور ساری سڑکیں ٹریفک سے بھرپور تھیں اگرچہ ابھی صرف آٹھ بجے کا وقت ہوا تھا اور سڑکوں پر ہجوم کا اصل وقت شروع نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود سڑکیں جیسے گاڑیوں سے بھری ہوئی تھیں اور رکشہ والے کے لئے گاڑی چلانا آسان نہیں تھا۔

جن جن راستوں سے وہ گزرتے جا رہے تھے ان کے بارے میں ظہور احمد اس کو بتاتا جا رہا تھا ان میں سے بعض علاقے ایسے تھے جو امیر خان نے اس سے پہلے دیکھے تھے لیکن زیادہ تر علاقے اس کے لئے بالکل نئے تھے۔

بالآخر رکشہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک بڑے سے کھلے میدان جیسی جگہ میں بہت ساری بسیں متوازی قطاروں میں کھڑی ہوئی تھیں۔

"یہ ہے پیر کالونی کا بس اسٹاپ۔" ظہور احمد نے امیر خان کو بتایا۔ "اور یہ سیدھی سڑک ہے۔ بس اسٹاپ سے شروع ہو کر سیدھی اندر تک چلی جاتی ہے.اور آگے جا کر ندی پر ختم ہو جاتی ہے اور اس سڑک کے دونوں طرف پیر کالونی ہی پیر کالونی ہے۔ یہ سارے مکانات پیر کالونی کے ہیں۔"

امیر خان رکشے میں سے جھک جھک کر سڑک کے دونوں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا اور گنجان آبادی تھی یہاں تک ساری عمارتیں اور مکانات کئی کئی منزلہ بھی تھے لیکن زیادہ تر تو ایک منزلہ مکانات تھے۔ پتلی سی سڑک پر دو طرفہ ٹریفک تھا اور بہت چہل پہل تھی۔ گاڑیوں کو گزرنے میں خاصی

مشکل پیش آ رہی تھی۔

زیادہ تر دکانیں بند تھیں صرف کھانے پینے کی چیزوں کی دکانیں اور ہوٹل وغیرہ کھلے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سارا بازار بند پڑا ہوا تھا لیکن پھر بھی سڑک پر کافی رش تھا۔

ظہور احمد نے مین روڈ پر مینا بازار کے قریب پہنچ کر رکشہ رکوایا اور کرایہ ادا کر کے اس کو رخصت کر دیا وہ دونوں اب رکشہ سے باہر آ چکے تھے اور انہوں نے اپنی اپنی چادروں کو اپنی گردنوں کے گرد اس طرح سے لپیٹ رکھا تھا کہ ان کے چہروں کا کچھ نچلا حصہ ان سے ڈھک گیا تھا۔

"اب اس جگہ کو پہچانو۔" ظہور احمد نے سرگوشی میں کہا اور اس جگہ کی نشانیاں بتانے لگا۔ چونکہ دونوں ہی ان پڑھ تھے اس لئے دکانوں کے سائن بورڈوں وغیرہ سے ان کو کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی انہیں کچھ دوسری ہی نشانیوں پر بھروسہ کرنا پڑ رہا تھا۔

ظہور احمد اس کو نشانیاں بتاتا گیا اور امیر خان ان کو خوب اچھی طرح سے ذہن نشین کرتا گیا اس نے بخوبی یاد رکھا تھا کہ وہ لوگ رکشہ سے کس جگہ پر اترے تھے اور اس جگہ کی پہچان کیا تھی۔

"اب ہم اس چوڑی سڑک پر چل رہے ہیں جس کے بائیں ہاتھ کے کنارے پر یہ ہوٹل ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "اور پھر ذرا سا آگے یہ بڑی سی دکان' آٹا دالیں چاول' گھی' شکر وغیرہ۔ ابھی یہ دکان بند ہے۔"

امیر خان ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں مینا بازار والی سڑک پر چل رہے تھے۔

"اور اب یہ دیکھو............" ظہور احمد نے اپنے دائیں جانب والی ایک گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس گلی میں دراز گل کا مکان ہے۔ اس گلی کو اچھی طرح پہچان لو۔ اس کے کونے پر کیا ہے وہ بھی دیکھ لو۔"

وہ دونوں اس گلی میں داخل ہو گئے جس کے دونوں طرف مکان ہی مکان تھے۔ کس قدر گھنی آبادی تھی۔ مکان سے مکان ملا ہوا تھا درمیان میں ذرا سا بھی فاصلہ نہیں تھا اور صاف ظاہر تھا کہ ہر مکان میں آبادی ہے۔ گلی گاڑیوں سے بھری پڑی تھی جگہ جگہ کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔

"یہ مکان۔ لال دروازے والا۔" ظہور احمد نے بہت ہی آہستہ سے کہا۔ "یہ دراز

گل کا مکان ہے۔"

ان دونوں کے قدم بہت دھیمے ہو گئے تھے گلی میں اس وقت زیادہ چہل پہل نہیں تھی امیر خان نے اپنی نظریں اس مکان پر گاڑ دیں جس کے بڑے سے آہنی دروازے کا رنگ لال تھا۔ وہ اس مکان کے بیرونی حصے کو خوب غور سے دیکھ رہا تھا۔

ظہور احمد کے قدم بالکل آہستہ ہو گئے تھے لیکن وہ رکا نہیں۔ وہ دراز گل کے مکان کے سامنے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ٹھہرا بلکہ گزرتا چلا گیا اور امیر خان بھی اس کے ساتھ ہی تھا دونوں چلتے ہوئے گلی کے دوسرے کونے تک جا پہنچے۔

ظہور احمد بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ دراز گل یا جان پہچان کا کوئی اور آدمی تو ان دونوں کو نہیں دیکھ رہا ہے لیکن ایسا کچھ نہیں تھا دراز گل کے مکان کا دروازہ بند تھا اور اس مختصر سے عرصے کے دوران وہاں نہ کوئی اندر سے باہر آیا نہ کوئی باہر سے اندر گیا۔

گلی کے کونے پر پہنچ کر ظہور احمد نے اپنے قدم ذرا تیز کر دیئے۔ اس نے امیر خان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ امیر خان خود بھی اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

"اچھی طرح دیکھ لیا اور پہچان لیا؟ سمجھ لیا؟" کچھ فاصلے پر آنے کے بعد ظہور احمد نے اس سے کہا۔

"ہاں۔" امیر خان نے آہستہ سے جواب دیا۔ "دیکھ لیا۔"

خیر زماں کا گھر وہاں سے کچھ فاصلے پر واقع تھا ظہور احمد نے امیر خان کو وہ بھی دکھا دیا اور اس کی بھی اچھی طرح سے پہچان کروا دی۔ اس مکان کا جو سامنے والا دروازہ تھا وہ مالک مکان اور اس کے افراد خاندان کے استعمال میں رہتا تھا اور آدھے کوارٹر میں رہنے والے کرایہ داروں کے لئے پچھلی گلی کا دروازہ تھا۔ ظہور احمد پچھلی گلی میں داخل نہیں ہوا یہ مناسب نہیں تھا اس نے گلی کے کونے سے ہی امیر خان کو وہ دروازہ دکھا دیا امیر خان کے لئے اس کو یاد رکھنا مشکل نہیں تھا گلی کے سارے مکانوں میں پچھلا دروازہ موجود تھا اور وہ دروازوں کو گنتا ہوا اپنے مطلوبہ دروازے تک با آسانی پہنچ سکتا تھا۔

"تم نے سب کچھ دیکھ لیا اور سمجھ لیا؟" اس نے امیر خان سے پوچھا جو چاروں طرف متجسس نظروں سے دیکھتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"ہاں۔" امیر خان نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ وہ اس وقت گلیوں کے

کناروں کی عمارتوں اور دکانوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ "میں نے .... سب کچھ اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور پہچان لیا ہے۔"

"اب تو تم اکیلے بڑی آسانی سے یہاں آ سکو گے؟"

ظہور احمد نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔" امیر خان نے کہا۔ "اب مجھ کو کوئی مشکل درپیش نہیں آئے گی۔ یہ بتاؤ کہ سبزی منڈی کدھر ہے؟"

"آؤ بتاتا ہوں۔" ظہور احمد نے کہا اور اس کو ساتھ لئے ہوئے ایک بار پھر مینا بازار والی سڑک پر آ گیا اور وہاں سے پیچھے کی جانب چلتا ہوا اس پتلی سی سڑک پر پہنچا جہاں کچھ آگے جا کر ایک پیدل کا راستہ منڈی کی طرف جاتا ہے جسے لوہے کے کھمبے لگا کر گاڑیوں وغیرہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔

"یہاں سے پیدل نکل جائیں تو چند منٹ چلنے کے بعد منڈی پہنچ جائیں گے۔" اس نے امیر خان سے کہا۔ "اور الٹے ہاتھ کو منڈی پڑے گی لیکن ہم اس وقت منڈی نہیں جا رہے ہیں تم بعد میں آ کر اس راستے سے منڈی بھی جا سکتے ہو۔"

"بس ٹھیک ہے۔" امیر خان نے کہا۔ "میں تو صرف معلوم کرنا چاہتا تھا۔"

ظہور احمد نے اس کو یہ بھی بتا دیا کہ یہ راستہ سیدھا یونیورسٹی روڈ پر جا کر نکلتا ہے اور اس طرف سے بھی ہم پیر کالونی آ سکتے تھے۔

"اس طرف سے اگر یونیورسٹی روڈ پر نکل جاؤ گے تو وہاں سے شہر کے بہت سے علاقوں کی طرف جانا آسان ہے۔" ظہور احمد نے کہا اور اسے اس طرف کے راستوں اور علاقوں کے بارے میں بتانے لگا۔

وہ دونوں وہاں سے واپس آ گئے۔ آگے منڈی کی طرف نہیں گئے۔ مینا بازار سے گزرتے ہوئے وہ کالونی کی مین روڈ پر آ گئے اور وہاں سے انہوں نے ایک رکشہ لے لیا اور واپس شیر شاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

"پیر کالونی اور سبزی منڈی تو آپس میں ملی ہوئی ہیں۔" امیر خان نے ظہور احمد سے کہا۔ "جو لوگ پیر کالونی میں رہ کر منڈی میں کام کرتے ہیں ان کو تو بڑی آسانی ہوتی ہو گی؟"

"ہاں۔" ظہور احمد نے کہا۔ "ان کو تو بڑی آسانی ہوتی ہے۔ وہ چاہیں تو دن میں

دس چکر منڈی کے لگا سکتے ہیں۔"

ایک بار پھر انہیں کافی طویل راستہ طے کرنا پڑا اور وہ شیر شاہ پہنچ گئے۔ ظہور احمد نے اپنی دکان سے کافی پہلے ہی رکشہ رکوا لیا اور دونوں اتر پڑے امیر خان اس کی احتیاطی تدابیر کو خوب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

اس رات کو ظہور احمد نے ایک ریوالور امیر خان کے حوالے کیا۔ ریوالور اگرچہ پرانی طرز کا تھا لیکن بہت عمدہ تھا اور عمدہ حالت میں تھا اس میں کوئی بھی چیز خراب نہیں تھی۔

"میں نے اس کو اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے اور اس کا جائزہ لے لیا ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "تم بھی ہر طرح سے اس کا جائزہ لے کر اپنی تسلی کر لو۔ یہ مکمل طور پر لائق اعتماد ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" امیر خان نے مسکرا کر کہا اور ریوالور کا جائزہ لینے لگا اس ریوالور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کی جسامت چھوٹی تھی۔

"یہ بڑی آسانی سے جیب میں آ جائے گا۔" امیر خان نے کہا۔ "میں اس کو بغیر کسی خاص مشکل کے اپنے ساتھ رکھ سکوں گا۔"

"ہاں............" ظہور احمد نے کہا۔ "اور اب یہ تمہارا ہے استعمال سے پہلے اور استعمال کے بعد تم اس کے ساتھ جو چاہو کرو۔ میں نے یہ تم کو دے دیا۔"

"شکریہ دوست۔" امیر خان نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مجھے تو بس ایک ہی کام کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد مجھے شاید ہی اس کی ضرورت ہو۔" اس کے بعد ایک بڑی عجیب بات ہوئی۔

ظہور احمد نے اپنی جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر امیر خان کی طرف بڑھایا۔

"اسے رکھ لو امیر خان۔"

"یہ .... یہ کیا ہے؟" امیر خان نے چونک کر پوچھا۔

"اس میں کچھ رقم ہے میرے دوست۔" ظہور احمد اپنی آواز اور لب و لہجہ کو ممکنہ حد تک خوشگوار بنائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہاں سے جانے کے بعد تم جتنے دن کراچی میں رہو گے یہ تمہارے کام آئے گی اچھی خاصی رقم ہے۔"

امیر خان فوری طور پر اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ "یہاں سے جانے کے بعد؟"

اس کا کیا مطلب ہوا؟ وہ تو کہیں نہیں جا رہا تھا جب تک اس کا کام پورا نہ ہو جاتا اس وقت تک وہ بھلا کہاں جا سکتا تھا۔

"میں سمجھا نہیں ظہور احمد۔" امیر خان نے الجھتے ہوئے کہا۔ "تم .... کیا کہہ رہے ہو۔"

"میں یہ کہہ رہا ہوں میرے عزیز دوست کہ جو کچھ تم کرنے جا رہے ہو اس صورت میں میرا مطلب ہے اس دوران تمہارا میرے ساتھ رہنا مناسب نہیں ہو گا۔" وہ چند لمحوں کے لئے رکا اور پھر جیسے اس نے ہمت پکڑ لی۔ اس کے لہجے میں ذرا زیادہ اعتماد آ گیا۔

"تم کل صبح سے اپنی رہائش کا کوئی دوسرا بندوبست کر لو۔ یہ کوئی مشکل نہیں، شہر میں بے شمار ہوٹل اور مسافر خانے وغیرہ موجود ہیں۔ میں تمہیں ان کے بارے میں تفصیل سے بتا دوں گا میں چاہتا ہوں کہ جب تم اپنے اس کام کے لئے جاؤ تو اس وقت تمہارا قیام میرے گھر میں نہیں ہو بلکہ..........."

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ظہور احمد۔" امیر خان نے بڑی تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور میں ویسا ہی کروں گا جیسا کہ تم چاہتے ہو، میں کل صبح کو یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن یہ رقم تم واپس لے لو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نہیں .... ہرگز نہیں۔" ظہور احمد نے کہا۔ "میں نے یہ رقم تم کو اپنا دوست اور بھائی سمجھ کر تحفے میں دی ہے اور تحفے میں دی ہوئی شے واپس تو نہیں لی جاتی۔ یہ رقم اب تمہاری ہو چکی ہے اس کو رکھو یہ تمہارے کام آئے گی۔"

امیر خان اچانک بہت دل گرفتہ ہو گیا تھا اسے ظہور احمد سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کو اپنے گھر سے ہی نکال دے گا۔ ظہور احمد کے گھر کو تو اس نے اپنی پناہ گاہ سمجھا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔

اور پھر آنے والے لمحوں میں اس نے اس صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا ظہور احمد کسی طرح بھی کسی بھی مشکل میں اپنے آپ کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس نے اب تک جو کچھ کر دیا تھا وہی بہت زیادہ تھا۔

"مجھے معاف کر دینا میرے دوست۔" ظہور احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کو میری یہ بات اچھی نہیں لگی ہو گی لیکن میری بھی اپنی مجبوریاں ہیں جن

کے بارے میں، میں تم کو تفصیل کے ساتھ بتا چکا ہوں۔ اب تم یوں سمجھ لو کہ تم بس آج کی رات تک کے لئے میرے پاس مہمان آئے تھے، اور کل صبح تم مجھ سے رخصت ہو گئے تم نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ تم کسی اور جگہ رہنے کے لئے جا رہے ہو اور میرے اصرار کے باوجود تم نے اس جگہ کا پتہ نہیں بتایا اور میرے پاس سے چلے گئے، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

امیر خان اس کی باتوں کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا۔

"ہاں، ٹھیک ہے، دوست۔" اس نے کہا۔ "میں تم کو ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو میری زبان پر تمہارا نام کبھی اور کسی حالت میں بھی نہیں آئے گا۔ ہاں میں یہی کہوں گا کہ کل صبح تک تمہارے گھر میں مہمان تھا اور پھر وہاں سے چلا گیا میں نے تم کو اپنے عزائم کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا اور تم میرے ارادے سے بالکل لاعلم تھے میں یہی کہوں گا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہوں گا۔"

"میں نے تمہاری بھابی کو اس سارے معاملے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔" ظہور احمد نے کہا۔ "انہیں کچھ نہیں معلوم ہے تم کل صبح ان سے یہی کہہ دینا کہ تم اب کسی اور دوست کے ساتھ رہنے کے لئے جا رہے ہو جس سے تمہاری کل ہی ملاقات ہوئی ہے اور یہ کہ اگلے چند روز کے بعد تم واپس گاؤں چلے جاؤ گے۔"

"ہاں .... میں بھابی کو بتا دوں گا۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اب میں تم کو بتاتا ہوں کہ تم کہاں کہاں رہ سکتے ہو۔" ظہور احمد نے اس سے کہا اور اس کو کراچی کے معمولی درجے کے ہوٹلوں اور مسافرخانوں وغیرہ کے بارے میں بتانے لگا۔

"خود منڈی میں بھی سینکڑوں لوگ راتیں گزارتے ہیں۔" ظہور احمد نے اس کو بتایا۔ "منڈی میں بہت جگہ ہے لوگوں نے رات کو سونے کے لئے طرح طرح کی جگہیں بنا رکھی ہیں اور منڈی کے آس پاس ہوٹل بھی ہیں۔" وہ اس کو منڈی کے قریب کے رہائشی ہوٹلوں کے بارے میں بتانے لگا۔

"یہ شہر اب تمہارے لئے اجنبی نہیں رہا ہے۔" اس نے مسکرا کر امیر خان سے کہا۔ "تم اس سے کافی حد تک واقف ہو چکے ہو مجھے امید ہے کہ اب تم کو کوئی خاص دقت پیش نہیں آئے گی۔"

"نہیں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔" امیر خان نے کہا۔ "میں اپنا راستہ خود تلاش کر لوں گا۔"

"امیر خان .... میں ایک بار آخری بار پھر تم سے یہ بات کہنا چاہوں گا کہ اس سارے قصہ کو بھول جاؤ .... بھول جاؤ اور معاف کر دو .... ان دونوں کو ان کی مرضی کی زندگی گزارنے دو اور خاموشی سے گاؤں واپس لوٹ جاؤ۔ تمہیں اس بات کا خدشہ ہے نا کہ تمہارے خاندان والے تم سے بازپُرس کریں گے تو سنو .... تم ان سے کہہ سکتے ہو کہ تم ان دونوں کو نہیں تلاش کر سکے۔ یہ بات تو سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ کراچی کوئی گاؤں نہیں ہے یہ تو لاکھوں آدمیوں کی آبادی کا شہر ہے۔ اس میں کسی ایک دو آدمیوں کو تلاش کرنا بھلا کس طرح ممکن ہے؟ تم یہ بات کہہ کر اپنی جان چھڑا سکتے ہو۔"

"کاش .... میں ایسا کر سکتا۔" امیر خان نے ایک لمبی اور گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "مگر افسوس ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں ان لوگوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا، اور نہ ہی میں اپنے آپ کو دھوکہ دے سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے دوست۔ تمہاری مرضی۔ میں تمہاری سلامتی کے لئے دعا کروں گا۔ خدا کرے کہ تم کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

"خدا نے چاہا تو کچھ نہیں ہو گا۔" امیر خان نے کہا۔ "ان لوگوں کا پتہ چل گیا ہے ان کا گھر مجھے معلوم ہو گیا ہے اب میں اپنا کام بہت آسانی کے ساتھ کر سکوں گا۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

ظہور احمد نے جو کچھ کیا تھا وہ کافی اچھی طرح غور کرنے کے بعد کیا تھا۔

پہلے اس کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ امیر خان کو اپنے ساتھ پیر کالونی لے جائے اور اس نے اس کو پتہ بتانے پر اکتفا کیا تھا لیکن امیر خان کے لئے وہ سارا علاقہ، وہ سب کچھ بالکل نیا تھا ظہور احمد کو یہ خوف لاحق ہوا کہ دراز گل اور خیر زماں کے مکانوں کو ڈھونڈنے کے دوران علاقہ کے لوگوں سے ان مکانوں کا پتہ پوچھنے کے دوران کوئی ایسی حماقت نہ کر بیٹھے جس سے آگے چل کر ظہور احمد کے لئے کوئی مشکل پیدا ہو جائے۔ بہت ساری باتیں ہو سکتی تھیں چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک بار امیر خان کو اپنے ساتھ لے جائے گا اور اسے ان دونوں کے مکانات دکھا دے گا اس طرح امیر خان کو لوگوں سے ان مکانوں کا پتہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہو گی اور کسی گڑبڑ کا امکان نہیں رہے گا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ امیر خان کے اپنے گھر میں قیام کے دوران اس حرکت کے ارتکاب کا موقع نہیں دے گا۔ امیر خان کا اس کے گھر سے ہر قسم کا تعلق ختم ہو جانا چاہئے اس لئے اس نے امیر خان کو کچھ رقم دے کر اس سے کہا کہ وہ اپنے رہنے کا کوئی دوسرا بندوبست کر لے وہ امیر خان سے جلد از جلد نجات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

امیر خان کو بھی ان ساری باتوں کا بخوبی احساس تھا لیکن وہ اپنے دوست سے کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ظہور احمد نے اس کے ساتھ جو کچھ کر دیا تھا وہی بہت زیادہ تھا اس سے زیادہ کی توقع رکھنا شاید بے سود تھا۔ کراچی میں رہنے والا ظہور احمد بہت بدل چکا تھا۔

اگلی صبح کو ظہور احمد کے گھر میں ناشتہ کرنے کے بعد امیر خان نے اس کی بیوی نسیم کو بتایا کہ وہ آج ان لوگوں کے گھر سے رخصت ہو رہا ہے۔

"ارے، اتنی جلدی۔" نسیم نے حیرت سے کہا۔ "ابھی تو تم کو آئے ہوئے محض چند دن ہوئے ہیں تم اتنی جلدی کیوں واپس جا رہے ہو؟"

"میں ابھی گاؤں واپس نہیں جا رہا ہوں بھابی۔" امیر خان نے کہا۔ "میں ابھی کچھ دن کے لئے کراچی میں ہی ہوں لیکن دوسری جگہ۔"

"مگر کیوں بھائی؟" نسیم نے کہا۔ "کیا تم کو ہمارے ہاں کوئی تکلیف ہے؟ کوئی ناراضگی ہے ہم سے؟"

"ارے نہیں بھابی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھلا تم لوگوں سے مجھ کو کیا شکایت ہو گی؟ تم لوگوں نے تو میرے آرام کا اتنا خیال رکھا کہ میں نے یہاں گھر سے بھی زیادہ آرام پایا۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک پرانے دوست سے ملاقات ہو گئی اور اس کا یہ اصرار ہے کہ میں چند دن اس کے پاس بھی قیام کروں اس لئے میں چند دن اس کے پاس رہنے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"ہماری مرضی اور اور خواہش تو یہی تھی کہ تم ہم لوگوں کے ساتھ رہتے۔" نسیم نے کہا۔ "مگر.........."

"میں پھر آؤں گا ان شاء اللہ۔" امیر خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اب مجھ کو اجازت دو اور تم لوگوں نے میری جس طرح سے میزبانی کی اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔"

"نہیں بھائی' اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟" نسیم نے کہا۔ "مہمان کی خاطر تواضع کرنا تو ہمارا ایمان ہے ہم بھلا اپنے اس فرض سے کس طرح غافل ہو سکتے ہیں۔"

امیر خان نسیم سے رخصت ہو کر مکان سے باہر آیا۔ ظہور احمد اس کے ساتھ تھا وہ دونوں دکان میں آئے جہاں آ کر امیر خان نے اپنا تھیلا اٹھایا جس میں اس کے کچھ کپڑے وغیرہ تھے اور پھر وہ آگے بڑھ کر ظہور احمد سے گرمجوشی کے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔

"میں تمہارا بہت بہت احسان مند ہوں ظہور احمد۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا اگر تم یہاں موجود نہ ہوتے اور تم نے میری مدد نہ کی ہوتی تو میرا کام اتنا آسان نہ ہوتا۔"

"تمہارا کام اب بھی آسان نہیں ہے امیر خان۔" اچانک اس کی زبان سے نکل گیا۔

"ہاں' میں جانتا ہوں دوست۔" امیر خان نے کہا۔ "بہرحال آسان ہو یا مشکل اب کرنا تو ہے ہی۔ اچھا اب مجھ کو اجازت دو اور میں ایک بار پھر تم کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ اگر خدا نخواستہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو تمہارا نام میری زبان پر کبھی نہیں آئے گا۔"

"تمہارا شکریہ امیر خان۔" ظہور احمد نے کہا۔

ظہور احمد اس کو چھوڑنے کے لئے مکان کے باہر گلی کے کونے تک گیا اور وہاں پہنچ کر دونوں نے ایک بار پھر گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر امیر خان وہاں سے روانہ ہو گیا ظہور احمد گلی کے کونے پر کھڑا ہوا کچھ دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر واپس آ گیا۔

امیر خان یہاں سے کہاں گیا تھا' ظہور احمد کو نہیں معلوم تھا نہ اس نے امیر خان سے پوچھا تھا اور نہ امیر خان نے اس کو بتایا تھا۔

دکان کے اندر واپس آ کر ظہور احمد نہ اطمینان کی ایک لمبی اور گہری سانس لی ارشاد حسین ابھی نہیں آیا تھا اور امیر خان اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔

گو کہ سب کچھ ٹھیک نہیں تھا اور ظہور احمد اپنے آپ کو خطرے سے بالکل آزاد نہیں پاتا تھا تاہم یہ امر بڑی حد تک اطمینان بخش تھا کہ امیر خان اب اس کے پاس سے چلا گیا تھا اور امیر خان کے کسی بھی فعل سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔

"اگر مجھے پہلے سے اس سارے قصے کا علم ہوتا تو میں اس کو دراز گل کا پتہ ہی نہ بتاتا۔" ظہور احمد دل میں سوچتا تھا۔ "میری مدد کے بغیر اس کے لئے کراچی میں دراز گل کو

تلاش کر لینا تقریباً ناممکن تھا۔ جب تک کہ کوئی اور جاننے والا اس کی مدد نہ کرتا اور امیر خان کا اور کون جاننے والا یہاں موجود تھا؟ کوئی بھی تو نہیں تھا! لیکن اس نے چالاکی سے کام لیا اس نے پہلے مجھ سے دراز گل کے بارے میں معلوم کر لیا اس کا پتہ بھی پوچھ لیا اور اس وقت تک اصل بات نہیں بتائی۔

لیکن اب تو سب کچھ ہو چکا تھا۔ ظہور احمد نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی مرضی کے خلاف کافی حد تک اس معاملے میں ملوث ہو چکا تھا۔

"خدا کرے کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جائے کہ امیر خان اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے اور وہ پکڑا بھی نہ جائے۔" ظہور احمد دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ "خدا کرے وہ دونوں قتل ہونے سے بچ جائیں اور امیر خان بھی بچ جائے۔"

اسے اپنی اس خواہش کے عجیب و غریب اور تقریباً ناقابل عمل ہونے کا بخوبی احساس تھا اب جبکہ امیر خان کو ان لوگوں کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا اور وہ اپنے ارادے کو پورا کرنے پر مصر تھا تو پھر تو دو ہی صورتیں ممکن تھیں یا تو امیر خان ان دونوں پر قاتلانہ حملے کے دوران یا بعد میں پکڑا جاتا اور یا پھر وہ بچ کر صاف نکل جاتا دونوں ہی صورتوں میں کسی ایک فریق کا زبردست نقصان تو ہونا ہی تھا۔ بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ سب کے سب لوگ پوری طرح محفوظ رہیں مگر خواہش کر لینے اور دعا مانگ لینے میں کیا ہرج تھا؟ آدمی کو کم از کم اتنا اختیار تو حاصل تھا۔

امیر خان گزشتہ رات بہت دیر جاگتا رہا تھا وہ اپنے بستر پر خاموش پڑا تھا اور آئندہ کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس کے لئے صورت حال ایک دم بدل گئی تھی۔ ابھی تک تو اس کو یقین تھا کہ اس کے پاس رہنے کا ایک ٹھکانہ موجود ہے جہاں رہ کر وہ اطمینان کے ساتھ اپنا کام کر سکتا ہے لیکن اب یہ یقین بھی ختم ہو گیا تھا اس سے اس کا ٹھکانہ بھی چھن گیا تھا اور اسے اب ایک نیا ٹھکانہ تلاش کرنا تھا۔

ظہور احمد نے اس کو کراچی کے معمولی درجے کے ہوٹلوں اور مسافرخانوں وغیرہ کے بارے میں کافی معلومات فراہم کر دی تھیں اور اب اس کو فیصلہ کرنا تھا کہ کل صبح کو اس گھر کو چھوڑنے کے بعد وہ اپنی رہائش کے لئے کس جگہ کا انتخاب کرے۔

ظہور احمد نے اس کو یہ تو بتا ہی دیا تھا کہ پیر کالونی میں ایسا کوئی ہوٹل یا مسافرخانہ موجود نہیں جس میں وہ قیام کر سکے البتہ منڈی کے اندر اور منڈی کے آس پاس ایسی

جگہیں موجود ہیں اور اس نے کافی سوچ بچار کے بعد ایسی ہی ایک جگہ قیام کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس کے بارے میں بھی اس کو ظہور احمد نے ہی بتایا تھا۔ وہ بہت کم پیسوں کے خرچ سے اس جگہ قیام کر سکتا تھا۔

چنانچہ اگلی صبح کو جب شیر شاہ سے روانہ ہوا تو سیدھا منڈی کے علاقے میں پہنچ گیا گو کہ اس کے پاس اچھی خاصی رقم موجود تھی جو کہ ظہور احمد نے اس کو دی تھی پھر بھی اس نے ضروری سمجھا کہ پیسے کو بہت سنبھال سنبھال کر خرچ کیا جائے کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کو کراچی میں ابھی کتنے روز اور قیام کرنا تھا اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آگے اسے کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا چنانچہ اس نے رکشہ یا ٹیکسی میں سفر کرنے کے بجائے بس کے ذریعے سفر کیا اور کافی دیر کے بعد وہ منڈی کے علاقے میں پہنچا لیکن اس کے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ منڈی کے علاقے میں پہنچنے کے بعد اس نے اس معمولی درجے کے ہوٹل یا مسافر خانے میں قیام کیا' سامان کے نام پر اس کے پاس ایک تھیلے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا جس میں اس کے تھوڑے سے کپڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ اس کو بستر تو لئے لئے پھرنے کی ضرورت نہیں تھی اور جہاں تک ریوالور کا تعلق تھا تو وہ اس کی جیب میں موجود تھا اسے تو وہ اب اپنے سے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں کر سکتا تھا۔

"بس ایک بار وہ لوگ نظر آ جائیں۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "پھر میری گولیوں سے بچ کر کہاں جائیں گے بھلا؟ میرا نشانہ تو بہت اچھا ہے گاؤں کے سب ہی لوگ میرے نشانے کی تعریف کرتے ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کا نشانہ واقعی بہت اچھا تھا اور وہ اپنے گاؤں کے بہترین نشانہ بازوں میں سے ایک تھا۔

منڈی کے علاقے میں پہنچنے کے کچھ ہی دیر کے بعد وہ دراز گل کے مکان کے اردگرد منڈلا رہا تھا اس نے اپنے حلیے میں کچھ ایسی ہی تبدیلی کر لی جیسی گزشتہ روز کی تھی یعنی سر پر اس طرح ٹوپی پہننے کے بعد کہ اس کا چھجا پیشانی سے کافی نیچے تک جھکتا چلا آیا تھا اس نے چادر کو گردن کے گرد اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ چہرے کا کچھ حصہ بھی اس میں چھپ گیا تھا۔

اس نے دراز گل کے مکان کے آس پاس دو چکر لگائے اور جلد ہی اس کو اس بات

کا اندازہ ہو گیا کہ اگر وہ اسی طرح سے چکر لگاتا رہے گا تو لوگ اس پر شک بھی کر سکتے ہیں چنانچہ وہ کچھ فاصلے پر جا کر ایک ہوٹل کے سامنے کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ دراز گل کے گھر پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنا انداز ایسا بنایا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہا ہو۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس نے دراز گل کو دیکھا وہ اس راستے کی طرف سے نمودار ہوا جو منڈی کو جاتا تھا۔

امیر خان کی آنکھیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔ اس نے ایک لمحے کے اندر اندر دراز گل کو پہچان لیا دراز گل کی تصویر تو اس کی آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ پھر وہ تو ان تین چہروں میں سے ایک تھا جن کی اس کو تلاش تھی۔ دراز گل کا چہرہ' خیر زماں کا چہرہ اور زرینہ کا چہرہ' اور ان تین چہروں کو تلاش کرتا ہوا وہ بابر خیل کی بلندیوں سے اتر کر دور دراز کراچی کے میدانوں میں آن پہنچا تھا۔

اس نے اپنی ٹوپی کے چھجے کو کچھ اور نیچے کر لیا تاکہ اس کا چہرہ مزید چھپ جائے ویسے اس حال میں بھی کوئی اس کو آسانی سے پہچان نہیں سکتا تھا۔

دراز گل نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا وہ سیدھا اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا اور پھر امیر خان نے اس کو اس مکان کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا اس نے دروازے پر دستک دی تھی اور اس کی دستک کے جواب میں کسی نے دروازہ کھولا تھا اور اس کے ساتھ ہی دراز گل گھر کے اندر غائب ہو گیا تھا دروازہ دوبارہ بند ہو گیا تھا۔

چنانچہ اس طرح اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ وہ مکان دراز گل کا ہی تھا۔ امیر خان کو اطمینان ہو گیا اس نے اپنی آنکھوں سے دراز گل کو اس مکان کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

اور اب اس کو یہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی خواہ مخواہ اپنے آپ کو مشکوک بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ وہاں سے چل پڑا اور خیر زماں کے مکان کے قریب پہنچ گیا یہاں بھی اس کو ایک ایسی قدرے محفوظ جگہ مل گئی جہاں وہ کچھ دیر تک بیٹھ سکتا تھا یہ ایک بند دکان کا چبوترہ تھا جس پر دو لڑکے پہلے سے بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ امیر خان اس چبوترے پر ایک کونے میں بیٹھ گیا ان دونوں لڑکوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

خیر زماں اپنے مکان میں عقبی گلی والے راستے سے داخل ہوا تھا اور امیر خان اس انداز سے بیٹھا تھا کہ وہ اگلی گلی کے نکڑ پر نظریں جمائے ہوئے تھا وہ یہاں سے تقریباً پوری گلی کو صاف طور سے دیکھ سکتا تھا۔

”اسے بھی آنا چاہیے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”اگر دراز گل اس وقت آ گیا ہے تو پھر خیر زماں کو بھی اس وقت آنا چاہیے۔ اس کا مطلب ہے کہ منڈی میں پھلوں کا کام کرنے والے اس وقت آ جاتے ہیں۔“

لیکن کافی دیر کے انتظار کے بعد بھی اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا نہ تو کوئی اس گلی میں داخل ہوا اور نہ کوئی اس گلی سے باہر نکلا۔

دونوں لڑکے اب وہاں سے جا چکے تھے اور امیر خان چبوترے پر اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس کو اب یہاں سے اٹھ جانا چاہیے کیونکہ اس طرح یہاں خالی بیٹھے رہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا۔

ابھی وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ یکبارگی اس کی نگاہیں گلی کے تقریباً وسط میں جم کر رہ گئیں۔

ایک مکان کے پچھلے دروازے سے وہ دونوں باہر نکل رہے تھے۔

امیر خان کی بے چین اور تڑپتی نظروں نے ان میں سے ایک کو تو فوراً ہی پہچان لیا وہ خیر زماں تھا۔

لیکن خیر زماں تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جس نے چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ اس کا چہرہ نہ تو پوری طرح سے کھلا ہوا تھا نہ ہی پوری طرح سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ دونوں عقبی گلی سے نکل کر سڑک کی طرف آ رہے تھے۔

امیر خان کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہو گئیں وہ دونوں آ رہے تھے۔ اس نے اس ادھ کھلے چہرے والی عورت کو بھی پہچان لیا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ غلطی نہیں کر رہا ہے وہ زرینہ ہی تھی۔

امیر خان اس چبوترے پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور تھوڑی دور جا کر سڑک کے کنارے سے لگے ہوئے ایک پیڑ کے تنے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا وہ ان دونوں کے قریب آنے کا انتظار کر رہا تھا تا کہ ان کی شکلوں کو صاف طور پر دیکھ کر انہیں پہچان سکے۔

وہ دونوں درمیانی رفتار سے چلتے ہوئے ادھر آ رہے تھے اور امیر خان دور سے انہیں

دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں سے جیسے آگ نکلنے لگی تھی اور دل میں ایک زبردست طوفان اٹھ رہا تھا اس کے ہاتھ پیروں میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی۔ بے ساختہ جی چاہ رہا تھا کہ دونوں کو ابھی اور اسی وقت گولی کا نشانہ بنا دے اور وہ ایسا کر بھی سکتا تھا ریوالور اس کے پاس موجود تھا اور وہ دونوں بے خبری کے عالم میں اس طرف آ رہے تھے اور سولہ آنے اس کے نشانے کی زد میں تھے وہ بلا کسی وقت کے ان کو گولی مار سکتا تھا دونوں وہیں ڈھیر ہو جاتے قصہ ختم۔

لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھرا بازار تھا ہر طرف لوگ موجود تھے اس کے لئے یہاں سے فرار ہو کر جانا ناممکن تھا بہت سارے لوگ موجود تھے اور وہ ان سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا۔ ان دونوں کو ہلاک کرنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو بھی ہلاک کر ڈالے، اسے بہت احتیاط کے ساتھ اور سنبھل کر قدم اٹھانا تھا اپنی جان کی حفاظت بہرحال کرنی تھی۔

وہ دونوں اس کے بالکل قریب سے گزرے اور اس نے ان کو اچھی طرح سے دیکھا اور پہچانا۔ ہاں وہی دونوں تھے اس نے ان دونوں کو باآسانی پہچان لیا تھا۔ زرینہ کے چہرے کا خاصا حصہ اگرچہ چادر میں تھا تاہم اس نے اس کو پہچان لیا تھا۔

دونوں اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سڑک پر چلے جا رہے تھے وہ امیر خان کے سامنے سے گزر گئے۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دراز گل سے بھی پہلے اپنے گھر واپس آ چکا تھا۔“ اس نے دل میں سوچا۔ ”وہ اپنے گھر کے اندر ہی موجود تھا اور میں اس کی منڈی سے واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گھر واپس آ چکا تھا اور اب اپنی بیوی کے ساتھ گھر سے نکل کر کہیں جا رہا تھا۔“ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر رہا تھا۔ جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کے دستے پر اس کی انگلیوں کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور ہاتھ پیروں پر ایک تشنج کی سی کیفیت طاری تھی۔

جب وہ دونوں خاصا آگے نکل گئے تو امیر خان نے ان کا تعاقب شروع کر دیا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ دونوں کہاں جاتے ہیں۔

وہ دونوں کالونی کی مین روڈ پر آ گئے وہاں اس وقت کافی چہل پہل تھی اور بہت سارے لوگ چل پھر رہے تھے جن میں بہت بڑی تعداد عورتوں کی تھی۔ دکانوں میں بہت

سارے گاہک موجود تھے اور ان میں بھی بھاری تعداد عورتوں کی تھی۔ سڑک پر چلنے والوں میں بھی عورتیں بڑی تعداد میں شامل تھیں۔

اس نے ان دونوں کو ایک دکان کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک جنرل اسٹول تھا اور طرح طرح کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ امیر خان سڑک کے دوسری طرف اسٹور کے سامنے سے کافی ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ اسٹور میں ان کے علاوہ اور بھی کئی گاہک تھے اور دکان میں موجود دو آدمی ان کو ان کی مطلوبہ چیزیں دکھا رہے تھے۔

امیر خان دور سے دیکھتا رہا کچھ دیر کے بعد وہ دونوں اندر سے باہر نکلے خیر زماں کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک بڑا سا تھیلا تھا جس میں نہ جانے کیا کیا سامان بھرا ہوا تھا۔ زرینہ کا چہرہ ذرا زیادہ کھل گیا تھا اور وہ ہنس رہی تھی امیر خان اس کے ہنستے ہوئے چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔

اور اس ہنسی کو دیکھتے ہی اس کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی یہ ہنسی اس کے لئے نہیں تھی اس نے تو کتنا چاہا تھا کہ یہ ہنسی اس کی ہو جائے۔ اس ہنسی پر اس کا اختیار اور اقتدار قائم ہو جائے لیکن اس ہنسی کو تو کوئی اور ہی اس سے چھین کر لے گیا تھا۔ وہ ہنسی اس کی نہیں ہو سکی تھی .... وہ تو کسی اور کی ہو گئی تھی۔ غم و غصے کی آگ امیر خان کے وجود کو جیسے بھسم کئے ڈال رہی تھی۔ اپنی شکستہ انا کو اپنے شکستہ وجود میں سمیٹے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ان دونوں کا پیچھا کرتا رہا اور اس نے ان دونوں کو ان کے گھر تک پہنچا دیا وہ دونوں دروازہ کھول کر اندر جا چکے تھے اور دروازہ اندر سے بند ہو گیا تھا۔

کتنی خوش ہے وہ خیر زماں کے ساتھ شادی کر کے اور خود خیر زماں بھی کتنا خوش ہے ان دونوں کو اس کے سوا اور کیا چاہئے؟ دونوں نے ایک دوسرے کو پا لیا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہنس رہے ہیں۔

زرینہ کی ہنسی کے جواب میں خیر زماں بھی آہستہ سے ہنسا تھا اور خیر زماں کی ہنسی تو برچھی بن کر امیر خان کے دل میں اترتی چلی گئی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ دونوں اس کی موجودگی سے آگاہ ہوں۔ انہیں علم ہو کہ وہ ان کے قریب موجود ہے اور احمقوں کی طرح ان کا پیچھا کر رہا ہے اور وہ دونوں اس کی بے بسی پر اس کی محرومی پر ہنس رہے ہوں۔ اس کا مذاق اڑا رہے ہوں' اس وقت اس نے اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کیا تھا۔

اور اب وہ دونوں اپنے گھر کے اندر جا کر بند ہو چکے تھے امیر خان اکیلا باہر رہ گیا تھا۔

امیر خان نے ان دونوں کو کافی غور سے دیکھا تھا۔ خیر زماں اس کو پہلے کے مقابلے میں کافی دبلا لگ رہا تھا اس کے رخساروں کی ہڈیاں بھی ابھر آئی تھیں اور نظر آ رہی تھیں۔ امیر خان کو ظہور احمد کی بات یاد آ گئی کہ خیر زماں کافی بیمار رہا تھا اور ہسپتال میں اس کے سر کا کوئی بڑا آپریشن ہوا تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس آپریشن سے وہ مرا نہیں صرف دبلا ہوا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "اگر وہ بیماری سے مر جاتا تو اس کی موت کا مجھے زیادہ غم ہوتا اب وہ زندہ ہے اور میں خوش ہوں کہ وہ زندہ ہے ۔ وہ دونوں زندہ ہیں ہاں میں ان کو بتاؤں گا کہ میرے اوپر ہنسنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے وہ میرے اوپر ہنس رہے تھے۔" اس پر ایک عجیب و غریب قسم کی دیوانگی کی کیفیت طاری ہو رہی تھی اور اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

وہ ان دونوں کے گھر کے پاس سے چلا آیا اور پھر وہ آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا مین روڈ پر آ کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک بار پھر ان لوگوں کے مکان کی طرف جا رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ اس عقبی گلی کے اندر داخل ہوا اور ان دونوں کے مکان کے سامنے سے گزرا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور اس کی نظریں مکان کی دیوار اور دروازے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے عقبی دیوار کی اونچائی کا جائزہ لیا۔ یہ اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ دروازے کے آہنی کنڈے پر ایک پیر رکھ کر وہ بڑی آسانی کے ساتھ دیوار کے اوپر جا سکتا تھا اور پھر وہاں سے نیچے اترنا کوئی مسئلہ نہیں تھا ایک بار اندر داخل ہونے کے بعد پھر وہ دروازے کو اندر سے کھول سکتا تھا۔

اس نے مکان کو دیکھ کر صورت حال کا اچھی طرح سے اندازہ لگایا اس کے لئے بہترین طریقہ یہی تھا کہ وہ مکان کے اندر گھس کر ان دونوں کو گولیوں کا نشانہ بنائے اور پھر وہاں سے بھاگ کھڑا ہو۔ گھر سے باہر ان کو ہلاک کرنے میں پکڑے جانے کا زیادہ اندیشہ تھا اور پھر بھلا یہ کس طرح سے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ دونوں کب ایک ساتھ گھر سے باہر نکلیں گے؟ یہ تو آج محض ایک اتفاق تھا کہ اس نے ان دونوں کو ایک ساتھ گھر سے باہر

نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ دوبارہ تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

اور گھر میں گھس کر ہلاک کرنے کے لئے رات کا وقت زیادہ موزوں تھا تاکہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاگنے میں بھی آسانی ہو۔

گو کہ اس نے اس مکان کو اندر سے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کو اس بات کا اندازہ ضرور تھا کہ یہ کوئی بڑا مکان نہیں ہو سکتا۔ اس نے پیر کالونی کے مکانوں کو باہر سے تو دیکھ لیا تھا ایک دوسرے سے ملے ہوئے مکانوں کا ایک طویل سلسلہ چلا گیا تھا اور ظہور احمد نے اس کو بتایا تھا کہ خیر زماں ایک کوارٹر کے آدھے حصے میں رہتا ہے۔ چنانچہ اس کا مکان تو اور بھی زیادہ چھوٹا ہونا چاہئے تھا۔

باہر سے جس حد تک ممکن ہو سکتا تھا اس نے مکان کی مکانت کا اندازہ لگایا صحن میں کھینچی ہوئی اس دیوار کی بھی کچھ جھلک باہر سے نظر آتی تھی جس کے ذریعے مکان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اس طرح خیر زماں اور زرینہ کے حصے میں آنے والا مکان اور بھی زیادہ چھوٹا ہو گیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اس مکان کے پاس رہا لیکن اس طرح کہ وہ وہاں رک کر کھڑا نہیں رہا اس نے وقفے وقفے سے اس گلی کے دو چکر لگائے اور جن چیزوں کو وہ دیکھنا چاہتا تھا انہیں اس نے اچھی طرح سے دیکھ لیا۔

اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا ایک ہی دن میں اتنی بہت ساری کامیابی بہت تھی۔ پہلے ہی دن یہاں آنے کے ساتھ ہی اس کو دراز گل بھی نظر آ گیا تھا اور وہ دونوں بھی نظر آ گئے تھے تمام باتوں کی تصدیق ہو گئی تھی۔

وہاں سے واپس اپنے ٹھکانے پر چلا آیا اور پھر وہ کہیں نہیں گیا۔ اب، اس کا کہیں اور جانے کو جی بھی نہیں چاہتا تھا بس آج کی رات آج ہی کی رات اسے اپنا کام کر ڈالنا تھا۔ زیادہ انتظار کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ انتظار تو کسی کا بھی نہیں کرنا تھا کسی چیز کا بھی انتظار نہیں کرنا تھا۔ سب کچھ تیار تھا سارا معاملہ تیار تھا بس آگے بڑھ کر ہوشیاری کے ساتھ ضرب لگا دینے کی ضرورت تھی۔

اس رات اس نے بہت تھوڑا سا کھانا کھایا اور وہ زیادہ کھانا کھا کر اپنا پیٹ بوجھل نہیں کرنا چاہتا تھا اسے پوری طرح سے چاق وچوبند' ہلکا پھلکا اور مستعد رہنے کی ضرورت تھی۔ یہ زندگی اور موت کا معرکہ تھا۔

اس نے اپنے ریوالور کا ایک سے زائد مرتبہ اچھی طرح سے جائزہ لے لیا تھا۔ وہ بہت عمدہ حالت میں تھا اور بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اس کے پاس گولیاں بھی پوری تعداد میں موجود تھیں اسے اپنے نشانے پر اعتماد تھا۔

آج کی رات .... بس آج کی رات ان دونوں کا خاتمہ تھا .... آج کی رات فیصلے کی رات تھی .... اور وہ دونوں کل صبح کا سورج دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہیں گے۔

اس نے اپنے ذہن میں ایک ڈھیلا ڈھالا سا منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔ وہ آدھی رات کے قریب ان کے گھر میں گھس کر ان دونوں کو گولیوں کا نشانہ بنائے گا اور اس کے بعد وہاں سے نکل بھاگے گا وہ کوشش کرے گا کہ وہاں سے سیدھا کینٹ ریلوے اسٹیشن پہنچ جائے۔ اس نے پہلے ہی وہاں کے بارے میں معلوم کر لیا تھا وہ پیر کالونی سے سٹی اسٹیشن کے مقابلے میں زیادہ قریب تھا اور وہاں سے بھی کئی گاڑیاں روانہ ہوتی تھیں۔ کینٹ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر وہ وہاں سے پہلی گاڑی سے روانہ ہو سکتا تھا جو کراچی سے باہر جا رہی ہو اور اس طرح وہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد جلد از جلد کراچی سے باہر نکل جاتا۔

آدھی رات سے کچھ دیر پہلے اس نے اپنا تھیلا اٹھایا جس میں چند جوڑی کپڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اس نے اس تھیلے کو کچھ اور بھی چھوٹا کر لیا تھا کیونکہ اس نے اس میں سے کئی فالتو چیزیں کم کر دی تھیں اور اب وہ اس کو بڑی آسانی کے ساتھ اپنے شانے پر یا گردن میں اس طرح لٹکا سکتا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ عمل کے لئے آزاد ہو جاتے۔ اس کے پاس جتنی بھی رقم تھی وہ اس نے کئی حصوں میں بانٹ کر اپنے پاس الگ الگ جیبوں میں رکھ لی تھی اور بھرا ہوا ریوالور بھی اس کے پاس جیب میں موجود تھا۔

اس نے اپنے اس عارضی ٹھکانے کو الوداع کہا اور پیدل ہی وہاں سے روانہ ہو گیا کچھ دیر کے بعد وہ منڈی اور ٹیلی فون ایکسچینج کے درمیان والی سڑک پر آ گیا اور وہاں سے آگے بڑھنے لگا جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہاں اس وقت اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کوئی اکا دکا راہ گیر بھی نظر نہیں آتا تھا۔

وہ اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں لوہے کے کھمبے لگا کر راستے کو گاڑیوں کے لئے بند کیا گیا تھا۔ وہ کھمبوں کے درمیان میں سے گزر کر پیر کالونی کے اندر داخل ہو گیا۔

پیر کالونی کی گلیوں میں اگرچہ بہت سارے مکانات میں ابھی اجالا تھا اور جگہ جگہ

لوگ جاگ رہے تھے پھر بھی کافی گہرا سناٹا پھیل چکا تھا اور گلیاں اور سڑکیں وغیرہ زیادہ تر خالی پڑی ہوئی تھیں۔

"اس وقت وہ دونوں لازمی طور پر گھر میں ہوں گے۔" وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ "اس وقت کہاں جا سکتے ہیں؟ خیر زماں بھی رات کے آخری پہر میں اپنے کام پر جانے کے لئے روانہ ہوتا ہے' اور رات کا آخری پہر تو ابھی بہت دور ہے۔ وہ دونوں آج کی رات کا آخری پہر نہیں دیکھ سکیں گے۔"

امیر خان کے لئے پیر کالونی میں یہ پہلی رات تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ پیر کالونی میں رات کو کتنے بجے تک چہل پہل رہتی ہے اور گھروں میں لوگ کتنے بجے تک جاگتے رہتے ہیں۔ رات کے بارہ بجے یہاں جتنی روشنی اور زندگی اس کو نظر آ رہی تھی وہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھی اب تک تو یہاں مکمل طور پر سناٹا ہو جانا چاہئے تھا اور سارے لوگوں کو سو جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔

جب وہ خیر زماں کے گھر والی عقبی گلی کے سامنے پہنچا تو اس کو شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس گلی میں ایک مکان کے پچھلے دروازے کے سامنے ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی جس پر دو لڑکے بیٹھے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ مکان کے عقبی دروازے کے اوپر ایک تیز بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں دونوں لڑکے پڑھتے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔

امیر خان کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے فی الحال اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑے گا۔ کیونکہ خدا معلوم یہ لڑکے کب تک پڑھتے رہتے۔

اس نے دل ہی دل میں ان دونوں لڑکوں کو درجن بھر گالیاں دے ڈالیں اور گلی کے سامنے سے گزرتا ہوا چلا گیا۔

وہ مین روڈ پر آ کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔

بازار میں سناٹا پڑا تھا لیکن بعض دکانیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں جب وہ بس اسٹاپ کے قریب پہنچا تو اس نے خالی بسوں کو لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے ہوئے پایا۔ بڑا دلچسپ منظر تھا اتنی بہت ساری بسیں الگ الگ قطاروں میں کھڑی ہوئی بہت اچھی معلوم ہو رہی تھیں سامنے ایک ہوٹل بھی ابھی تک کھلا ہوا تھا۔

اس نے اس کھلے ہوئے ہوٹل کو غنیمت جانا اور اس کے اندر چلا گیا کچھ تھوڑے سے لوگ وہاں موجود تھے اس نے اپنے لئے ایک پیالی چائے منگوائی اور آہستہ آہستہ کر

کے اس کو ختم کرنے لگا اس نے چائے پینے میں کافی دیر لگا دی اور پھر وہ وہاں سے اٹھا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ایک بار پھر خیر زماں کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب خیر زماں کے مکان والی گلی کے سامنے پہنچا تو اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا اور گلی کے اندر بالکل اندھیرا ہو رہا تھا۔ نہ تو اب وہ بلب جل رہا تھا اور نہ کوئی چارپائی پڑی ہوئی تھی نہ پڑھنے والے لڑکے تھے وہ سارا روشن منظر غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک بے نام اندھیرے نے لے لی تھی۔

بارہ بجے کے مقابلے میں اب ساری فضا میں تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا روشنیاں بہت کم ہو گئی تھیں زیادہ تر مکانات مکمل تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے اور سناٹا بہت گہرا ہو گیا تھا۔

امیر خان گلی کے نکڑ پر رک گیا اس نے پہلے تو سامنے سے اس مکان کا جائزہ لیا اس کے سامنے والا دروازہ بند تھا اور مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا پھر وہ گھوم کر وہاں عقبی گلی کی طرف آ گیا اور کچھ دیر تک نکڑ پر کھڑے رہ کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔

گلی کے اندر مکمل و گہرا سناٹا تھا اس نے اِدھر اُدھر اچھی طرح دیکھا کسی بھی گھر کی جانب سے اسے خطرے کا احساس نہیں ہوا۔ پھر وہ دبے پاؤں چلتا ہوا خیر زماں کے مکان کے دروازے تک پہنچ گیا اس کے چاروں طرف اندھیرا اور سناٹا تھا۔

چاند تاروں کی ہلکی ہلکی قدرتی روشنی نے مناظر کی سیاہی کو کچھ کم کر دیا تھا اور آنکھیں قریب کی چیزوں کو دیکھ کر اندازے سے پہچان سکتی تھیں۔

امیر خان نے آہنی دروازے کے بیرونی کنڈے پر ایک پیر رکھا اور اپنے جسم کو آہستہ سے اوپر کی جانب اچھالا اس کا جسم ایک دم سے اوپر اٹھا اور اب وہ کنڈے پر ایک پیر ٹکائے ہوئے کھڑا تھا اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ بڑھا کر دروازے کے اوپر کی دیوار کی کگر کو پکڑ لیا تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ اس کے جسم کا سارا بوجھ اس آہنی کنڈے پر آ گیا تھا جو اگرچہ چھوٹا سا تھا لیکن مضبوط بہت تھا۔ وہ اس کے پورے جسم کے بوجھ کو بڑی آسانی کے ساتھ برداشت کر سکتا تھا جبکہ امیر خان کے جسم کا کچھ بوجھ اس کے دونوں ہاتھوں کے ذریعے دیوار کی بالائی کگر پر منتقل ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے جسم کو اوپر کی جانب کھینچا اور بغیر کسی خاص دقت کے وہ دیوار کے اوپر پہنچ گیا جہاں اس نے چند سیکنڈ تک رک کر اندر کا جائزہ لیا' مختصر سے مکان کا زیادہ تر حصہ

تو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا البتہ ایک کمرے میں بہت ہلکی سی مردہ سی روشنی ہو رہی تھی۔

اس نے آہستہ سے دیوار کی کگر کو چھوڑ کر اپنے آپ کو نیچے گرا دیا اور اس دوران اس نے اپنے توازن کو برقرار رکھا اس کے پیروں نے فرش کو چھوا اور جلد ہی دیوار کا سہارا لے لیا۔

اب وہ مکان کے اندر تھا اور دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا اس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا اس نے جلدی سے اندر کی طرف دیکھا وہاں بدستور گہرا سناٹا تھا۔

اس نے سب سے پہلے دروازے کا جائزہ لیا اس کی کنڈی اندر سے بند تھی لیکن اس میں اندر سے تالا نہیں لگا ہوا تھا اس نے آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھول دی لیکن کنڈی کھلتے ہی دروازے کے پٹ بھی کھل گئے تھے۔ یہ صورت حال ٹھیک نہیں تھی اس نے پٹوں کو آہستہ سے بند کر دیا اور دوبارہ کنڈی لگا دی کنڈی لگائے بغیر پٹ نہیں رک سکتے تھے۔

اب اس کا ایک ہاتھ اپنی جیب کے اندر چلا گیا جہاں بھرا ہوا ریوالور موجود تھا اس نے اس کی موجودگی کو محسوس کر کے اطمینان حاصل کیا اور پھر وہ مکان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔

مختصر سے مکان میں بہت زیادہ ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ دونوں اس کمرے میں موجود تھے جس میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا امیر خان بڑی آسانی کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہو گیا اور اس نے بہت ہلکے بلب کی بہت ہلکی روشنی میں ان دونوں کو اپنے اپنے بستروں پر سوتے ہوئے دیکھا دونوں گہری نیند میں تھے اور آڑے ترچھے بے ترتیب سے انداز میں بستروں میں پڑے ہوئے تھے۔

امیر خان کچھ دیر تک ان کو دیکھتا رہا۔

آن واحد میں درجنوں دل دکھانے والے مناظر اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ زرینہ اور خیرزماں۔ خیرزماں اور زرینہ۔

امیر خان نے اپنی آنکھوں میں نمی سی محسوس کی وہ چند لمحوں تک باری باری ان دونوں کے جسموں کو دیکھتا رہا دونوں بے خبر سو رہے تھے۔

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا اس کا پہلا نشانہ خیرزماں تھا۔

لیکن یوں ہی تو گولی مار کر سب کچھ ختم نہیں کر دینا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ان دونوں کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ ان کو ہلاک کرنے والا کون ہے اور وہ انہیں کیوں ہلاک کر رہا ہے۔ "انہیں ان کے جرم کا احساس تو ہونا چاہئے۔" امیر خان نے دل ہی دل میں کہا۔

صورت حال اب تقریباً مکمل طور پر امیر خان کے قابو میں تھی۔ بھرا ہوا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا جس میں پوری چھ گولیاں تھیں اور وہ دونوں بالکل بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ امیر خان کی انگلی کی بس ایک جنبش ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے لئے کافی تھی اور اس کو اب گولی چلانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

اس نے اپنے چہرے کو پوری طرح کھول دیا تھا آنے والے لمحات بڑے خطرناک تھے اس کو انہیں ہوشیار ہونے اور شور مچانے کا کوئی موقع نہیں دینا تھا قبل اس کے کہ وہ شور مچانے کے قابل ہو سکیں اسے ان کو ختم کر دینا تھا اور پھر وہاں سے تیزی کے ساتھ بھاگ نکلنا تھا۔

اس نے خیرزماں کے بالکل قریب جا کر اس کے پیر کو زور سے ہلایا۔ خیرزماں ایک دم چونک پڑا۔

"مجھے دیکھو حرامزادے۔" امیر خان نے قہر مجسم بن کر اس کو گھورتے ہوئے پھنسی پھنسی، دبی دبی، سنسناتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں ہوں امیر خان۔ تیری موت۔"

نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں دھندلی دھندلی نظروں سے یقین اور بے یقینی کی حالت میں خیرزماں نے امیر خان کے چہرے کی طرف دیکھا اور اسے پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہی ان چند لمحوں کے دوران اس کے دل دماغ پر سینکڑوں قیامتیں گزر گئیں اس کی نظروں کے سامنے سے کتنے ہی عالم سرسراتے ہوئے گزر گئے۔

امیر خان .... زرینہ کا چچازاد بھائی احمد خان کا بیٹا .... اس کے سامنے ریوالور ہاتھ میں لئے نفرت، غضب، قہر اور عداوت کی تصویر بنا ہوا کھڑا تھا۔

"امیر خان .... تم .... ؟" خیرزماں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم .... یہاں .... یہاں .... تک .... کس طرح ...."

امیر خان نے زیادہ سوال جواب کا موقع نہیں دیا بولنے کا زیادہ موقع دینے کی صورت میں وہ چیخ بھی سکتا تھا اور اس کی چیخ کے نتیجے میں امیر خان کے لئے مشکلات پیدا

ہو سکتی تھیں۔

کمرے کی گھٹی گھٹی فضا میں ایک فائر کی آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی ایک بھیانک انسانی چیخ۔ چیخ کی آواز امیر خان کی توقع سے کہیں زیادہ بلند تھی۔ خیر زماں کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

خیر زماں کے پہلو میں سوئی ہوئی زرینہ ایک دم اچھلی اور اس کے حلق سے بھی ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی۔ اس نے خیر زماں کو خیر زماں نے اس کو دیکھ لیا تھا۔ موت کا فرشتہ اس کی نظروں کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

زرینہ بڑے زور سے اچھلی تھی کئی چیزیں ایک ساتھ ایک ہی وقت میں رونما ہوئیں۔

"زرینہ .... لے دیکھ لے انجام اپنی بے غیرتی کا۔" امیر خان کی زبان سے الفاظ اور گن سے گولی نکلی۔ "میں امیر خان ہوں جسے تُو نے دھتکار دیا تھا۔ اچھی طرح سے دیکھ لے میں امیر خان ہوں۔" زرینہ زور سے اچھلی اور قریبی اسٹول پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ جس میں لگا ہوا زیرو کا بلب کمرے میں روشنی کر رہا تھا نیچے گر پڑا اور کمرے میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔

زرینہ کی ہذیانی چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں اور اسی وقت امیر خان نے اندھیرے میں ایک اور فائر کیا۔ چیخوں کی آواز ایک دم بلند ہوئی اور اس میں دم توڑتے ہوئے خیر زماں کی دم توڑتی ہوئی زرینہ کی آخری چیخیں بھی شامل تھیں۔

"کیا ہوا۔ کیا ہوا زرینہ۔" مکان کے کسی اور حصے سے ایک تیز اور واضح نسوانی آواز گونجی اور اس کے ساتھ امیر خان نے کمرے سے باہر قدم نکالا۔

کام ہو گیا تھا اس نے دو گولیاں خیر زماں کے ماری تھیں اور دو گولیاں زرینہ کے' اتنا کافی تھا اس کے بعد ان دونوں کے زندہ بچنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ امیر خان نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ خیر زماں کا سینہ خون سے تر ہو گیا تھا اور جہاں تک زرینہ کا تعلق تھا تو اس کے بھی یقیناً گولیاں لگی تھیں اور اب اس کا مر جانا بھی یقینی تھا۔

جاگ ہو گئی تھی۔ چار فائروں کی آواز اور اس کے ساتھ ہی دو مرتے ہوئے' دم توڑتے ہوئے افراد کی آخری چیخوں کی آواز۔ دونوں آوازیں آپس میں ضم ہو کر ایک طاقتور ہنگامے کی شکل اختیار کر چکی تھیں جس کے نتیجے میں مکان میں جاگ ہو گئی تھی اور

کوئی عورت زرینہ کو آوازیں دے رہی تھی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا ہو جانے کے باعث امیر خان کو اب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور ابھی چند منٹوں میں بلکہ چند لمحوں میں کوئی آنے والا تھا۔

اس کا کام ہو گیا تھا اور اب یہاں رکنے کی اس کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور نیم تاریکی میں صحن میں آیا صحن میں دو دروازے تھے ایک دورازہ تو باہر گلی میں کھلتا تھا امیر خان مکان کے اس حصے کی طرف سے آنے والی آوازوں اور آہٹوں کو صاف سن رہا تھا جو دم بدم تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

"کیا ہوا زرینہ؟" کوئی نسوانی آواز کہہ رہی تھی اور اس کے ساتھ قدموں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر اندرونی دروازے کے دوسری جانب سے کوئی دروازے کو کھولنے لگا۔

امیر خان نے تیزی سے دروازے کی کنڈی کھولی اور عین اس وقت جبکہ وہ اس دروازے کی کنڈی کھول کر باہر نکل رہا تھا اس نے اس دروازے سے باہر جاتے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔

لیکن اب وہ رک نہیں سکتا تھا اس کو ہر صورت میں یہاں سے بھاگنا تھا ایک لمحے کی تاخیر بھی اس کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ تیزی سے ایک طرف کو بھاگا اور اس وقت اس نے ایک تیز اور کڑک دار آواز سنی۔

"رک جاؤ .... اوئے رک جاؤ ...."

ریوالور امیر خان کے ہاتھ میں تھا اور اس میں ابھی دو گولیاں بھی موجود تھیں وہ رک کر اس شخص پر فائر بھی کر سکتا تھا جو اس کو رکنے کا حکم دے رہا تھا' لیکن اس نے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بھاگ جانے کا فیصلہ کیا لیکن عین اس وقت اس کے سر پر جیسے آسمان پھٹ پڑا کوئی چیز بہت زور سے اس کے سر سے ٹکرائی اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں سنبھل سکا اور گرنے لگا۔ اس وقت دوسری زور دار ضرب اس کے دائیں شانے پر لگی اور یہ ضرب اتنی زور دار تھی کہ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

"دوڑو .... دوڑو ...." رات کو گلیوں میں گشت کرنے والا چوکیدار زور زور

سے چلا رہا تھا اور گھروں کے دروازے جلدی جلدی کھل رہے تھے روشنیاں جل رہی تھیں اور گلی میں روشنی تیزی سے بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

"زرینہ کیا ہوا زرینہ..........." چلاتی ہوئی شازیہ صحن کا دروازہ کھول کر مکان کے دوسرے حصے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے صغیر احمد بھی تھا اور ان دونوں کے پیچھے صفیہ وہ تینوں آگے پیچھے اپنے بستروں سے نکلے تھے۔ شازیہ کوئی ساڑھے بارہ بجے تک تو پڑھتی ہی رہی تھی اور ابھی ذرا دیر پہلے اس کی آنکھ لگی تھی اور صفیہ بھی عشاء کی نماز وغیرہ پڑھ کر تقریباً بارہ بجے لیٹی تھی اور کافی دیر تک تو جاگتی ہی رہی تھی اس نے اچانک ہی ادھر سے چیخوں کی آواز سنی تھی۔

وہ آواز اس سے پہلے شازیہ نے سن لی تھی اور وہ زرینہ کو زور زور سے آوازیں دیتی ہوئی اس کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ صغیر احمد کی نیند تو ہمیشہ سے بہت کچی رہی تھی وہ بھی شور کی آواز سن کر جاگ اٹھا تھا اور بستر سے نکل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا وہ تینوں ہی مکان کے دوسرے حصے کی طرف جا رہے تھے۔

شازیہ نے اس طرف آتے ہی دیوار میں لگا ہوا بجلی کا سوئچ دبا دیا تھا اور آنگن کے اس حصے میں روشنی ہو گئی تھی۔ یہاں جو بلب لگا ہوا تھا اس کو زرینہ سونے سے پہلے بجھا دیتی تھی۔

بلب کے روشن ہوتے ہی جس چیز پر شازیہ کی نظر پڑی وہ مکان کا کھلا ہوا دروازہ تھا اور دروازے کے باہر بھی کچھ غیر معمولی سرگرمیوں کا احساس ہوا تھا پھر ایک دھماکہ سا ہوا کوئی زور سے گرا اور پھر دوسرا دھماکہ اور اس کے ساتھ ہی رات کو گشت کرنے والے چوکیدار کی تیز اور کرخت آواز۔ "دوڑو........... دوڑو........... پکڑو........... پکڑو..........."

شازیہ، صفیہ اور صغیر احمد آنگن کی تیز روشنی میں تیزی سے زرینہ اور خیر زماں کے کمرے کی طرف بڑھے شازیہ سب سے آگے تھی اس نے جلدی سے برآمدے کا بلب جلا دیا اور اس کے ساتھ ہی سارے مکان میں روشنی پھیل گئی وہ لوگ روشنی میں کمرے کے اندر داخل ہوئے اور شازیہ نے جلدی سے اندر کا بلب جلا دیا۔

اندر سے برابر کراہوں کی سی آوازیں آ رہی تھیں اور روشنی ہوتے ہی وہاں ایک دلدوز اور روح فرسا منظر ان تینوں کی آنکھوں کے لئے حیرت اور اذیت کا باعث بنا ہوا تھا۔

خیر زماں اور زرینہ دونوں خون میں لت پت پڑے ہوئے تھے۔

شازیہ اور صفیہ کی چیخیں فلک شگاف تھیں اور ان کی گونج بہت دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ "ارے قتل ہو گیا........... ارے قتل ہو گیا۔" صغیر احمد اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کے باوجود سراسیمگی کے عالم میں چلا رہا تھا۔

دروازے کے باہر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے چوکیدار کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جو اس نے روشن کر دی تھی اس کے علاوہ گھروں کے دروازے کھل جانے کے باعث کافی روشنی گلی میں آ رہی تھی۔ کسی نے گھر کے باہر گلی میں لگا ہوا بلب جلا دیا اور روشنی اور بھی زیادہ تیز ہو گئی۔

وہ آدمی گر گیا تھا اور اس سے تھوڑے سے فاصلے پر اس کا ریوالور پڑا ہوا تھا جو صاف نظر آ رہا تھا۔

"اسے پکڑ لو........... پکڑ لو سالے کو۔" سامنے والے مکان میں رہنے والا عمر رسیدہ سعید الدین ایڈووکیٹ زور زور سے چلا کر لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ "مگر ریوالور کو ہاتھ مت لگانا۔ پولیس کے آنے تک اسے اسی طرح پڑا رہنے دو میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔"

"ہاں ہاں، ریوالور کو کوئی نہیں چھوئے گا۔" ایک اور آدمی نے کہا۔ "آپ جلدی سے پولیس کو فون کر دیجئے مگر ایک منٹ ذرا معلوم تو کر لیں کہ اس نے کیا کیا ہے۔"

اس وقت صغیر احمد اندر سے حواس باختگی کے عالم میں چلاتا ہوا آیا۔ "اس نے ہمارے کرائے داروں کو مار دیا ہے۔ قتل کر دیا ہے دونوں کو..........."

"میں ابھی فون کرتا ہوں۔" ایڈووکیٹ سعید الدین تیزی سے اپنے گھر کی طرف لپکا۔ "ریوالور کو کوئی نہ چھوئے۔"

لوگوں نے نیم بے ہوش امیر خان کو پکڑ رکھا تھا۔ امیر خان کے اندر اس وقت کوئی قوت مدافعت باقی نہ رہی تھی۔ رات کو گشت کرنے والے محلے کے چوکیدار کے بھاری بھر کم اور مضبوط ڈنڈے کی دو ضربات نے جن میں سے ایک اس کے سر پر اور دوسری اس کے شانے پر لگی تھی اس کو نڈھال اور نیم بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی کئی لوگوں نے اس کو دبوچ لیا تھا۔

امیر خان کا دماغ اس وقت چوٹ کی شدت سے ماؤف سا ہو رہا تھا اس کے سر میں

بڑے زور زور سے چکر آرہے تھے اور تکلیف کی شدت اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ وہ فرار ہونے میں ناکام ہو گیا ہے اور پکڑا جا چکا ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

"تم نے کمال کر دیا دلبر خان۔" صغیر احمد نے رات کے چوکیدار کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے تعریفی انداز میں کہا۔ "بڑے موقع سے پکڑ لیا تم نے اس کو یہ ان دونوں کو قتل کر کے بھاگ رہا تھا۔"

"میں نے چیخوں کی آواز سن لی تھی صاحب۔" چوکیدار دلبر خان نے کہا۔ "میں گلی کے کنارے پر تھا آواز سن کر میں بھاگا ہوا آیا اس وقت یہ دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا میں نے اس کو آواز دی لیکن یہ رکا نہیں بلکہ بھاگا تب میں نے اس کے سر پر ڈنڈا مارا اور پھر ایک اور ڈنڈا مارا۔"

"ہے کون یہ ملعون؟" ایک اور شخص نے کہا وہ غور سے امیر خان کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس وقت چوکیدار دلبر خان نے پہلی بار امیر خان کو غور سے دیکھا۔

"کون ہے تم؟ کون ہے؟" دلبر خان نے اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے اس کے سر کو اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈپٹ کر پوچھا۔

امیر خان نے آنکھیں جھکا لیں اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

"ارے کیوں خون کیا تُو نے ان دونوں کا؟" ایک اور شخص نے امیر خان کے ایک لات مارتے ہوئے کڑک کر پوچھا۔ "کیوں مار دیا تُو نے ان کو؟"

"میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے۔" اس وقت سعید الدین ایڈووکیٹ کی آواز سنائی دی۔ "اور ایدھی والوں کو بھی فون کر دیا ہے ایمبولینس کے لئے۔ وہ سب ابھی فوراً آ رہے ہیں۔"

اس وقت شازیہ گھر کے دروازے میں نمودار ہوئی تھی اس نے روتے ہوئے بتایا کہ خیر زماں تو شدید طور پر زخمی ہے بلکہ شاید مر چکا ہے جبکہ زرینہ کے صرف ایک گولی شانے میں لگی ہے۔

"اس کا مطلب ہے وہ بچ جائے گی۔" سعید الدین ایڈووکیٹ نے جلدی سے کہا۔ "اگر گولی صرف شانے میں لگی ہے تو وہ بچ سکتی ہے بس جلدی سے ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

پولیس آنے والی ہے اور ایمبولینس بھی۔"

"میں .... میں درازگل کو تو اطلاع کر دوں۔" صغیر احمد نے کہا۔ "بس ابھی آتا ہوں اس کو بتا کر۔"

"آپ یہیں رکیئے انکل۔" ایک نوجوان لڑکے نے کہا۔ "میں درازگل کا گھر جانتا ہوں میں اسے بتا دیتا ہوں۔ آپ یہیں رکیئے۔ ابھی پولیس وغیرہ آتی ہو گی آپ کا یہاں رہنا ضروری ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ لڑکا تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ان لوگوں نے امیر خان کو قابو میں کرنے کے بعد اس کو رسیوں سے باندھ دیا تھا اور اب اس کے لئے اپنے ہاتھ پیر ہلانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ بالکل خاموشی کے ساتھ زمین پر پڑا ہوا تھا اس کا دماغ کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں تھا۔ سر میں بڑی شدید تکلیف ہو رہی تھی۔

پولیس اور ایمبولینس کے آنے سے پہلے ہی درازگل آ گیا اس لڑکے نے اس کے گھر پہنچ کر اس کو اطلاع دے دی تھی کہ کسی نامعلوم شخص نے گھر میں گھس کر خیر زماں اور زرینہ کو قتل کر دیا ہے اور محلے کے چوکیدار اور دوسرے لوگوں نے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔

درازگل شدید سراسیمگی اور بدحواسی کے عالم میں بھاگا اس نے اپنے بیٹے شہزاد سے کہا کہ اپنی ماں کو لے کر وہاں پہنچے اور خود اس لڑکے کے ساتھ ہی خیر زماں کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

درازگل کے دل میں درد و الم کا ایک طوفان امنڈ رہا تھا جس بات کا اسے خدشہ تھا وہ آخر نمودار ہو کر رہی تھی۔ جب سے خیر زماں اور زرینہ کراچی آئے تھے تب سے درازگل کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ شمروز خان کا کوئی آدمی آ کر ان دونوں کو قتل کر دے گا .... وہ اپنے لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا ایک گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کے گھر والے اسے زندہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ سردیوں کا موسم تو خیریت سے گزر گیا تھا لیکن درازگل ایک لمحے کے لئے بھی پورے طور سے مطمئن نہیں رہا تھا۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ وہ ان دونوں کو کراچی کے علاوہ اور کہیں بھیج بھی تو نہیں سکتا تھا۔

"وہ .... آدمی کون ہے؟" درازگل نے اس لڑکے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے

پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" لڑکے نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کوئی ڈاکو وغیرہ ہو محلے میں تو کوئی بھی اس کو نہیں جانتا۔"

دراز گل بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہو گا۔ شاید خود شمروز خان' زرینہ کا باپ کیونکہ شمروز خان کے کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے شمروز خان کو خود ہی آنا پڑا ہو گا۔

دراز گل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ اس نے ان سب لوگوں کو کتنا سمجھایا تھا لیکن کسی نے بھی اس کی بات نہیں مانی تھی۔ کاش' کاش کوئی تو اس کی بات سن لیتا۔

وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا صغیر احمد کے مکان کے سامنے ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ دراز گل جلدی جلدی مجمع کو چیرتا ہوا صغیر احمد کے پاس پہنچا لیکن صغیر احمد سے کوئی بات کرنے سے پہلے ہی اس کی نظر اس شخص پر پڑی جو وہاں رسیوں سے بندھا ہوا موجود تھا۔

محض ایک نظر ڈالنے کی دیر تھی اور دراز گل نے اس شخص کو پہچان لیا وہ شمروز خان کے بھائی احمد خان کا بیٹا امیر خان تھا۔ دراز گل کے دل پر گہری چوٹ لگی امیر خان نے بھی دراز گل کو دیکھا تیز روشنی میں دونوں کی نظریں ملیں اور پھر امیر خان نے اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔

"زرینہ زندہ ہے دراز گل۔" صغیر احمد نے جلدی سے دراز گل سے کہا۔ "اس کے شانے میں گولی لگی ہے۔ ابھی ایمبولینس اور پولیس آنے والی ہے۔ مگر خیر زماں کی حالت نازک ہے اس کے سینے میں گولیاں لگی ہیں۔"

صغیر احمد کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کو صرف دراز گل نے ہی نہیں دوسرے لوگوں کے علاوہ امیر خان نے بھی سنا۔

"مگر یہ ہے کون؟" ایک پڑوسی نے کہا۔ "صورت سے کوئی پٹھان معلوم ہوتا ہے۔"

دراز گل نے اس شخص کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور صغیر احمد سے کہا۔ "مجھے ادھر لے چلئے۔"

صغیر احمد دراز گل کو جلدی سے ادھر اس کمرے میں لے گیا جہاں واردات ہوئی تھی

بڑا دلدوز اور خوفناک منظر تھا دراز گل نے خیر زماں کو خون میں لت پت دیکھا وہ بالکل بے حس و حرکت تھا۔ زرینہ بھی خون میں ڈوبی ہوئی تھی اس پر بھی نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔

اس وقت پولیس کی گاڑیاں آگئیں۔ ایمبولینس بھی آگئی دراز گل باہر آگیا اور پھر پولیس نے فوراً ہی اپنی کارروائی شروع کر دی۔ حملہ آور چونکہ موقع سے گرفتار کیا گیا تھا اور بہت سارے لوگ اس واقعے کے چشم دید گواہ تھے اور سب سے اہم گواہ تو وہ چوکیدار تھا جس نے حملہ آور کو بھاگتے ہوئے پکڑا تھا اس لئے اس کیس میں کوئی ایسی بہت زیادہ پیچیدگی نہیں تھی اور پولیس کو اس میں بہت زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔

خیر زماں کی لاش کو اور زخمی زرینہ کو ہسپتال پہنچا دیا گیا دراز گل نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے قاتل کے بارے میں بتا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ واردات دونوں خاندانوں کے درمیان دیرینہ دشمنی کا شاخسانہ تھی کیونکہ زرینہ نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف خیر زماں سے شادی کی تھی۔

زرینہ کے شانے میں گولی لگی تھی اور اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔

دراز گل نے صغیر احمد کے گھر والوں کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

اب کچھ بھی چھپانا بے کار تھا اس نے ان لوگوں کو بتا دیا تھا کہ زرینہ اور خیر زماں کی شادی زرینہ کے والدین کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی اور خیر زماں اور زرینہ چپکے سے اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر اپنی محبت کی دنیا آباد کرنے کے لئے اپنے گاؤں سے کراچی آئے تھے جہاں آتے ہی فوراً ان کا نکاح ہو گیا تھا۔

"مجھے تو پہلے ہی ڈر تھا کہ اس قصے کا یہی انجام ہو گا۔" دراز گل نے روتے ہوئے صغیر احمد سے کہا۔ "میں نے ان سب لوگوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر میری کسی نے نہیں سنی۔"

"مگر میں ان دونوں کے حوصلے کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا جنھوں نے سب کچھ جاننے کے باوجود اتنا بڑا خطرہ مول لیا۔" صغیر احمد نے کہا۔ "انہیں بھی یقیناً یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ زرینہ کے گھر والے ان کو کبھی نہیں معاف کریں گے اور جب بھی موقع ملے گا دونوں کو قتل کروا دیں گے۔ پھر بھی انہوں نے اتنی بڑی جرأت کی۔"

"انہوں نے اس سے کہیں زیادہ بڑی جرأت کی جتنی کہ ہم اور آپ سمجھ رہے

ہیں۔" دراز گل نے کہا۔ "ان دونوں نے کبھی اپنے علاقے سے باہر قدم نہیں نکالا تھا کراچی تک آنے کا تو بھلا کیا سوال پیدا ہوتا اور کوئی ان کی رہنمائی کرنے والا بھی نہیں تھا۔ میں تو یہاں کراچی میں بیٹھا ہوا تھا وہ دونوں بس ایک دم وہاں سے بھاگ نکلے۔ آپ کو نہیں معلوم ہمارے گاؤں میں تو ریل بھی نہیں چلتی ریلوے اسٹیشن دوسرے شہر میں واقع ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے بس سے جانا پڑتا ہے۔ یا پھر لوگ پیدل چلے جاتے ہیں ان دونوں کے لئے یہ سفر بہت زیادہ مشکل تھا۔ خاص طور سے ان حالات میں جبکہ پکڑے جانے اور مار دیئے جانے کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلا رہا تھا۔"

"ہم سب کو خیر زماں کی موت کا بہت افسوس ہے۔" صغیر احمد نے کہا۔ "وہ بہت اچھا اور ہونہار نوجوان تھا خدا اس کی مغفرت کرے۔"

امیر خان نے پولیس کی تفتیش کے جواب میں اپنے جرم کا اقبال کر لیا تھا اور پولیس کو اس کی اصل وجہ بھی بتا دی تھی کہ اس کے چچا کی بیٹی زرینہ نے دشمن کے بیٹے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر خاندان کی عزت کو للکارا تھا اور ان کو قبائلی روایات کے مطابق واجب القتل قرار دے دیا گیا تھا۔

زرینہ ہسپتال میں تھی اس کے بازو میں سے گولی نکال دی گئی تھی اور اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ اس ایک زخم کے علاوہ اس کے جسم میں اور کوئی زخم نہیں لگا تھا۔

لیکن جو زخم اس کے دل میں لگا تھا اس کے ازالے کی کوئی دوا کسی کے پاس نہیں تھی۔ زرینہ کو ہسپتال میں ہی اس کا بات کا علم ہو چکا تھا کہ خیر زماں کی موت واقع ہو گئی ہے اور وہ شدید ترین دکھ اور صدمے کے عالم میں اپنے آپ سے شرمسار تھی' اپنی زندگی سے اپنے وجود سے شرمسار تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی تھی خیر زماں کے بغیر بھی زندگی کوئی معنی رکھتی تھی؟ ان دونوں نے تو ایک ساتھ مرنے اور جینے کی قسمیں کھائی تھیں زندگی بھر ساتھ نبھانے کے پیمان کئے تھے تو پھر وہ اس کو تنہا چھوڑ کر کیوں چلا گیا اور وہ اس کے بغیر تنہا کیوں زندہ تھی؟

شدت غم سے اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا کاش امیر خان کی ایک اور گولی اس کے جسم میں پیوست ہو جاتی اور ایسی پیوست ہوتی کہ پھر اس کو نکالنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی وہ گولی اس کے جسم کا حصہ بن کر اس کے ساتھ ہی قبر میں جاتی۔

دراز گل کے گھر والوں کے علاوہ صغیر احمد اور شازیہ بھی برابر زرینہ کی خبر گیری اور

اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ دراز گل نے اس کے علاج معالجے کی جانب سے ذرا بھی غفلت نہیں برتی۔

شدید ترین غم کے طوفان کا جب پہلا ریلا گزر گیا اور زرینہ نے ذہنی طور پر اس کے ساتھ مفاہمت کر لی کہ اس کا شوہر اس کی عزیز ترین ہستی خیر زماں اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے تو پھر زرینہ کے ذہن میں دوسرے بہت سارے سوالات نے سر اٹھانا شروع کیا۔

اسے اس وجود کی فکر ہوئی جو اس کے جسم کے اندر پل رہا تھا اب تک کسی نے اس کو اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

اس نے شازیہ سے کہا کہ وہ ڈاکٹر سے اس بارے میں پوچھ کر اس کو بتائے اس کے پاس آنے والے زیادہ تر ڈاکٹر مرد تھے اور وہ ان سے خود بات نہیں کر سکتی تھی۔

شازیہ نے اس کو بتایا کہ وہ اس معاملے میں پہلے ہی ڈاکٹروں سے بات کر چکی ہے اور اس کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے ڈاکٹروں نے اس کو بتایا کہ اگرچہ یہ بہت نازک معاملہ تھا لیکن انہوں نے سب کچھ سنبھال لیا اور زرینہ کا حمل ضائع نہیں ہوا۔

"تم اطمینان رکھو ...." شازیہ نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "مرنے والا تو چلا گیا لیکن اس کی نشانی تمہاری گود میں ضرور آ جائے گی۔ انشاء اللہ تم خیر زماں کے بیٹے کی ماں بنو گی۔ خیر زماں کا بیٹا تمہاری زندگی کا سہارا بنے گا۔"

زرینہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ہائے خیر زماں چلا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا تھا اتنی جلدی .... سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔

راتوں کی تنہائی میں ہسپتال کے بستر پر پڑی ہوئی اکیلی زرینہ آنے والے وقت کے بارے میں خوف' تشویش بے اطمینانی اور بے یقینی کے ساتھ سوچا کرتی تھی۔ خیر زماں کی موت کے بعد وہ اپنے آپ کو بڑی شدت کے ساتھ تنہا محسوس کر رہی تھی اس کے والدین تھے' چھوٹی بہن تھی لیکن کوئی نہیں تھا۔ وہ گھر تو اب اس کے لئے مقتل بن چکا تھا وہاں سے اس کی موت کا فرمان جاری ہوا تھا اگر اس کا کوئی سگا بھائی ہوتا تو اس فرمان پر وہ عمل کرتا لیکن موجودہ صورت میں اس کا سگا چچا زاد بھائی اس فرمان پر عملدرآمد کرنے کے لئے ایک طویل فاصلہ طے کر کے کراچی آیا تھا۔

زرینہ کو قتل کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ امیر خان نے پولیس کے سامنے اعتراف جرم کر لیا ہے۔ زرینہ کو اس بات پر کوئی

حیرت نہیں ہوئی تھی نہ ہی اسے امیر خان کے اس اقدام پر کوئی حیرت تھی۔ اسے اگر حیرت تھی تو اس بات پر کہ امیر خان نے کراچی جیسے بڑے شہر میں ان دونوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ کس طرح تلاش کرلیا اور وہ کس طرح اتنی جلدی ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔

دراز گل نے اس واقعے کے اگلے ہی دن اپنے گاؤں کے قریبی شہر میں اپنے ایک رشتے دار کو فون کیا جو گاؤں آتا جاتا رہتا تھا اس شخص کا نام واحد خان تھا۔ اس نے فون پر واحد خان کو اس واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ فوراً ہی یا تو خود ڈیرہ امین گل چلا جائے یا کسی دوسرے معتبر آدمی کو بھیج کر بخت خان کو اس کے بارے میں بتا دے اور بخت خان سے یہ پوچھے کہ آیا خیر زماں کی لاش کو کراچی میں ہی دفن کر دیا جائے یا اس کو ڈیرہ امین گل بھیجنے کے انتظامات کئے جائیں۔ لاش فی الحال سرد خانے میں رکھی ہوئی تھی اور اسے وہاں کچھ دنوں تک مزید رکھا جا سکتا تھا۔ واحد خان نے بتایا کہ وہ خود ہی فوراً ڈیرہ امین گل کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔

☆======☆======☆

بخت خان کی بیوی گل بی بی کا رشتہ دار واحد خان جب ڈیرہ امین گل میں بخت خان کے مکان پر پہنچا تو بخت خان نے بڑی خوش دلی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا واحد خان کو گھر کے اندر بلا لیا گیا وہ تو رشتے دار تھا۔

لیکن واحد خان کے چہرے پر خوشی اور مسرت کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی بخت خان سے زیادہ آمنہ اس چیز کو محسوس کر رہی تھی اور پریشان تھی۔

"میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا ہوں بخت خان۔"

واحد خان نے بغیر کسی تمہید کے اپنی بات شروع کر دی۔ "تم لوگوں کو ایک بری خبر سننے کے لیے تیار ہونا چاہئے۔"

"تیار ہیں بالکل تیار ہیں۔" بخت خان نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"ہم تو ہر بری خبر سننے کے لیے تیار ہیں۔ ہماری قسمت میں تو اب بری خبروں کے سوا اور کیا رہ گیا ہے؟ اس کم بخت خیر زماں نے جو حرکت کی ہے اس کے بعد........"

"خیر زماں........ اس دنیا میں نہیں رہا۔" واحد خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "میرے پاس کراچی سے دراز گل کا فون آیا تھا ہے خیر زماں کو قتل کر دیا گیا

ہے۔"

"ہائے میرا بیٹا۔" گل بی بی کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ "ہائے........ ہائے۔" اور وہ زور زور سے رونے لگی۔

"ارے چپ ہو جاؤ نیک بخت!" بخت خان نے آہستہ سے نیم مردہ آواز میں کہا۔ "پوری بات تو سن لینے دو۔" اور پھر اس نے واحد خان سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "کس نے قتل کیا اس کو دراز گل نے اس بارے میں کچھ بتایا۔"

"ہاں۔" واحد خان نے کہا۔ "اسے شمروز خان کے بھتیجے امیر خان نے قتل کیا ہے اور امیر خان کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے امیر خان نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہے۔"

"اور........ زرینہ؟" بخت خان نے بہت آہستہ سے پوچھا۔ "کیا اسے بھی؟"

"نہیں وہ زخمی ہوئی۔ مری نہیں۔" واحد خان نے کہا۔ "اس کے شانے میں گولی لگی تھی۔"

واحد خان نے ان لوگوں کو وہ سب کچھ بتا دیا جو اس سے دراز گل نے کہا تھا اور پھر اس نے دراز گل کا سوال ان لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔

"دراز گل سے کہو وہ اس کو وہیں دفنا دے۔" بخت خان نے کمزور اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جب اس نے ہم سے سارے رشتے ہی توڑ لئے تو پھر ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔"

"نہیں۔" گل بی بی اپنے شوہر کی بات سن کر بڑے زور سے چلائی۔ "میں اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہائے........ ہائے........ ارے ظالموں نے اس کو مار دیا۔"

"اب ایک مردہ شکل میں کچھ نہیں رکھا ہے نیک بخت۔" بخت خان نے کہا۔ "وہ کسی کی لڑکی کو لے کر بھاگا تھا اور ان لوگوں نے اس کو قتل کر دیا۔ اگر کوئی ہماری بیٹی کے ساتھ ایسا کرے گا تو ہم بھی اس کا یہی حشر کریں گے۔ ہمیں کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ دراز گل سے کہہ دینا کہ اس کو وہیں دفنا دے ہم اس کے لئے دعائے مغفرت کریں گے۔"

گل بی بی نے بہت چاہا اس کا شوہر اس بات کے لئے راضی ہو جائے کہ خیر زماں کی لاش کراچی سے لائی جائے لیکن بخت خان راضی نہیں ہوا۔

"دراز گل تمہارا بھائی ہے۔" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "وہ سارا انتظام کرلے

گا۔ لاش کو اس طرح دفنا دیا جائے گا جس طرح اس کو دفنایا جانا چاہئے۔"

واحد خان ایک دن ان لوگوں کے ساتھ گاؤں میں رکنے کے بعد اگلے دن شہر واپس چلا گیا اور وہاں جا کر اس نے دراز گل کو فون کر کے اس کو بخت خان کے ساتھ اپنی بات چیت کے بارے میں بتا دیا۔

دراز گل نے زرینہ کو بتا دیا کہ بخت خان کے کہنے کے مطابق خیر زماں کو کراچی میں دفن کر دیا جائے گا اور اس کی لاش کو گاؤں نہیں لے جایا جائے گا۔

"میں خود بھی یہی چاہتی تھی ماما۔" زرینہ نے روتے ہوئے کہا۔ "خیر زماں کی قبر کراچی میں ہو گی تو میں اس پر آنسو بہانے کے لئے جا تو سکوں گی۔ اگر اس کو ڈیرہ امین گل میں دفن کیا جاتا تو میں کبھی بھی وہاں جا کر اس کی قبر پر دو پھول بھی نہیں چڑھا سکتی تھی۔" اور اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

گاؤں بابر خیل میں اس واقعے کی خبر کئی دن کے بعد پہنچی کراچی میں امیر خان کے دوست ظہور احمد کو اگلے ہی دن سارے واقعے کا اخبارات کے ذریعے علم ہو گیا تھا اور ساتھ ہی وہ سخت خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔ امیر خان اپنے گاؤں سے آنے کے بعد اس کے ہی گھر تو ٹھہرا تھا اور پولیس اس سے پوچھ گچھ کر سکتی تھی بلکہ اس مقدمے میں اس کو پھنسا بھی سکتی تھی محض مال بٹورنے کی غرض سے۔

لیکن ایسا اس لئے نہیں ہوا کیونکہ امیر خان نے خود ہی اعتراف جرم کر لیا اور پولیس کو صاف بتا دیا کہ اس نے اپنے خاندان کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے خیر زماں کو قتل کیا ہے اور اس معاملے سے کسی اور کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ظہور احمد نے اسی دن ایک آدمی کو بابر خیل روانہ کر دیا تاکہ وہ وہاں جا کر امیر خان کے گھر والوں کو ساری بات بتا دے۔ وہ خود امیر خان کے اس معاملے میں اپنے آپ کو زیادہ نہیں الجھانا چاہتا تھا کہ گاؤں سے امیر خان کے رشتے دار آجائیں اور جو کچھ کرنا ہے وہ لوگ ہی کریں وہ خود کو قتل و خون کے ان واقعات سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔

بابر خیل میں جب امیر خان کے پکڑے جانے کی خبر پہنچی تو اس کے باپ احمد خان پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اب امیر خان کو سزا سے کون بچا سکتا تھا؟ اس کو تو سزائے موت بھی ہو سکتی تھی۔

احمد خان کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ کہرام تو شمروز خان کے گھر میں بھی مچا ہوا تھا لیکن

غم کی شدت احمد خان کے گھر میں زیادہ تھی امیر خان شمروز خان کا تو بھتیجا تھا لیکن احمد خان کا تو وہ بیٹا تھا احمد خان کا اس کے علاوہ ایک بیٹا اور تھا جو اس سے کافی چھوٹا تھا اس کے علاوہ ایک بیٹی تھی جس کی کچھ ہی دن پہلے شادی ہوئی تھی۔ اس کا نام شاہدہ اور اس کے شوہر کا نام منیر خان تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے قریبی گاؤں میں رہتے تھے امیر خان کی گرفتاری کی خبر جیسے ہی بابر خیل پہنچی ویسے ہی اس کی بہن اور بہنوئی کو بھی مطلع کر دیا گیا اور وہ دونوں بھی فوراً ہی بابر خیل آن پہنچے۔

امیر خان کی ماں زربخت زار و قطار رو رہی تھی وہ تو پہلے ہی اس بات کی مخالف تھی کہ اس کا بیٹا خیر زماں کو قتل کرنے کے لئے کراچی جائے اس کا کہنا یہی تھا کہ اس معاملے کا تعلق بنیادی طور پر شمروز خان سے ہے شمروز خان خود ہی اس کو نمٹائے اور اس کے شوہر اور بیٹے کو اس میں ملوث نہ کرے لیکن امیر خان تو خود ہی اس میں کود پڑا تھا اس کی ماں نے اس کو منع بھی کیا تھا کہ وہ اس معاملے میں اس حد تک اپنی ٹانگ نہ اڑائے لیکن وہ نہیں مانا تھا اور اس نے کہا تھا کہ یہ تو پورے خاندان کی عزت اور غیرت کا معاملہ ہے۔

"میں سب کچھ بڑی ہوشیاری کے ساتھ کروں گا اماں؟" اس نے اپنی ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ "اپنا کام پورا کرنے کے بعد میں خاموشی اور سلامتی کے ساتھ واپس گھر آجاؤں گا۔ تم دیکھنا میں کس طرح سب کچھ کرنے کے بعد گھر واپس آجاتا ہوں۔"

لیکن اس کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ خاموشی اور سلامتی کے ساتھ گھر واپس نہیں آسکا تھا اس کو تو وہیں موقع پر رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا گیا تھا اور اس نے اقبال جرم بھی کر لیا تھا۔ خیر زماں اس کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور زرینہ زخمی ہوئی تھی امیر خان قتل کا مجرم تھا اور اب خدا جانے اس کا انجام کیا ہونے والا تھا۔ زربخت کا رو رو کر برا حال تھا اور امیر خان کی اکلوتی شادی شدہ چھوٹی بہن شاہدہ بھی غم سے نڈھال تھی شاہدہ کا شوہر منیر خان ان سب لوگوں کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب رونے دھونے اور ماتم کرنے سے تو کچھ نہیں ہو گا۔" منیر خان نے ان لوگوں سے کہا۔ "یہ سوچئے کہ اب کیا کرنا ہے۔ امیر خان نے پولیس کے سامنے اقبال جرم کیا ہے اور اس اقبال جرم کی کوئی عدالتی حیثیت نہیں ہوتی ہمیں سارے حالات معلوم کرنے چاہئیں اور پھر اس کی قانونی طور پر مدد کرنی چاہئے۔"

"قانونی مدد تو ہم کریں گے۔" احمد خان نے بڑی گہری افسردگی کے ساتھ ٹوٹے

ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں خود کراچی جاؤں گا وکیل کروں گا جو کچھ بھی مجھ سے ہو سکتا ہے وہ میں کروں گا۔"

مقدمے کے اخراجات پورے کرنے کی ذمہ داری شمروز خان اپنے سر لینے کے لئے مصر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ چونکہ بنیادی طور پر اس کا معاملہ تھا اس لئے وہی اخراجات ادا کرے گا لیکن احمد خان نے اس سے رقم لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ امیر خان اس کا بیٹا ہے اور اس کے سلسلے میں ساری ذمہ داری اس پر ہی عائد ہوتی ہے۔ منیر خان نے اس معاملے میں مداخلت کرتے ہوئے یہ تصفیہ کرا دیا کہ مقدمے وغیرہ کے جو بھی اخراجات ہوں گے دونوں بھائی ان کو آدھا آدھا آپس میں بانٹ لیں گے۔

"اور میں خود اپنے خرچے پر کراچی جاؤں گا۔" منیر خان نے کہا۔ "وہاں میرے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے' میرے کچھ رشتے دار وہاں موجود ہیں اور وہ لوگ تو ہماری ہر طرح سے مدد کریں گے۔"

احمد خان اپنے داماد منیر خان کے ساتھ کراچی کے لئے روانہ ہو گیا اور وہ دونوں کراچی پہنچے۔ منیر خان کے رشتے داروں نے ان لوگوں کی کافی مدد کی احمد خان کراچی کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کے لئے بالکل نیا شہر تھا لوگ نئے تھے' یہاں کے طور طریقے نئے تھے زبان دوسری تھی اور ان ساری چیزوں نے احمد خان کو بہت پریشان کیا وہ ایک ایسی دنیا میں آگیا تھا جو اس کی اپنی دنیا سے بہت مختلف تھی اور جہاں ہر شخص ایک نامعلوم اور ناقابل فہم قسم کی بھاگ دوڑ میں لگا رہتا تھا۔

ان لوگوں نے ظہور احمد سے بھی ملاقات کی جس نے ان کو وہ سب کچھ بتایا جو اسے معلوم تھا امیر خان اپنے گاؤں سے آنے کے بعد ظہور احمد کے پاس ہی ٹھہرا تھا تاہم ظہور احمد نے ان لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ امیر خان نے اس کو اس امر سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ خیر زماں اور زرینہ کو قتل کرنے کے ارادے سے کراچی آیا ہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ کے دوران بھی ظہور احمد نے یہی مؤقف اختیار کیا تھا وہ اس معاملے میں خود کو بالکل ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا اور جب امیر خان نے اس کو اپنی کراچی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا تو اس وقت اس نے امیر خان کو ایسا کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا تھا لیکن امیر خان نہیں مانا تھا تب ظہور احمد نے اس سے صاف طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ اگر اس کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو وہ اس میں اس کا نام نہ لے اور امیر خان نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کا

نام کہیں نہیں آنے دے گا' اور امیر خان اپنے اس وعدے پر قائم رہا تھا اس نے پولیس کو یہی بتایا تھا کہ وہ شیر شاہ میں ظہور احمد کے گھر ضرور ٹھہرا تھا لیکن اس سارے معاملے کا ظہور احمد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہی بات ظہور احمد نے احمد خان اور منیر خان سے بھی کہی اس نے کہا کہ اسے امیر خان کے اصل عزائم کا کوئی علم نہیں تھا اور اس نے ان لوگوں کی مدد کرنے میں کوئی خاص گرم جوشی کا بھی مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کی بیوی نے اس کو سختی کے ساتھ روک رکھا تھا اور وہ بالکل نہیں چاہتی تھی کہ اس کا شوہر قتل جیسے سنگین جرم کے کسی معاملے میں اس حد تک ملوث ہو جائے۔

ان دونوں نے جیل میں امیر خان سے ملاقات کی اپنے بیٹے کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر احمد خان کی آنکھیں نم ہو گئیں اس نے ایسا تو نہیں سوچا تھا۔

"اگر امیر خان نے یہ کام کراچی کے بجائے اپنے علاقے میں کیا ہوتا تو اس کو کوئی گرفتار نہ کرتا۔" اس نے دل میں سوچا۔ "یہ تو خاندانی عزت اور غیرت کا معاملہ تھا کاش یہ سب کچھ کراچی میں نہ ہوا ہوتا بلکہ ہمارے علاقے میں ہوا ہوتا۔ تو آج میرے بیٹے کی یہ حالت نہ ہوتی۔"

لیکن جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ گزرے ہوئے وقت کو تو واپس نہیں لایا جا سکتا تھا' اور نہ گزرے ہوئے واقعات کو لوٹایا جا سکتا تھا۔ اب تو جو کچھ ہو چکا تھا اس کی تلافی اور اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرنی تھی۔

لیکن ہر چیز کی تلافی اور ہر چیز کا ازالہ ممکن نہیں ہوتا۔ امیر خان جو کچھ کر چکا تھا اور جس انداز میں کر چکا تھا اس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور اس نے خود بھی پولیس کے سامنے اپنے جرم کا اقبال کر لیا تھا۔

امیر خان پر قتل اور اقدام قتل کا مقدمہ قائم ہوا اس کے وکیل نے اس کی ضمانت کے لئے بہت کوشش کی لیکن اس کی ضمانت نہ ہو سکی۔ استغاثہ کے وکیل نے ضمانت کی درخواست کی سخت مخالفت کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا کہ اگر ملزم بھاگ کر علاقہ غیر میں چلا گیا تو پھر وہ وہاں سے کبھی واپس نہیں آئے گا اور کوئی اس کو وہاں سے نہیں لا سکے گا۔

زرینہ ہسپتال سے گھر واپس آ گئی اس کے بازو کا زخم ابھی بھرا نہیں تھا اور اس کے

لئے مزید کچھ وقت درکار تھا لیکن اب اس کو ہسپتال میں رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

دراز گل اور اس کی بیوی زرینہ کو ہسپتال سے سیدھا اپنے گھر لے آئے تھے زرینہ کو ابھی دیکھ بھال کی ضرورت تھی شانے کے زخم کی وجہ سے وہ اپنے سارے کام ٹھیک سے نہیں کر سکتی تھی دراز گل اور تاجور اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

ہسپتال سے آنے کے بعد زرینہ کو ہر چیز بالکل بدلی ہوئی' ویران اجاڑ بے کیف اور افسردہ معلوم ہوتی تھی گو کہ سب کچھ وہی تھا' ویسا ہی تھا جیسا کہ اس کے زخمی ہو کر ہسپتال جانے سے پہلے تھا۔ ماما دراز گل کا مکان وہی تھا' در و دیوار وہی تھے' لوگ وہی تھے چاچا صغیر احمد کا مکان وہی تھا' ویسا ہی تھا لوگ بھی وہی تھے ویسے ہی تھے لیکن کچھ بھی تو ویسا نہیں تھا سب کچھ بدل گیا تھا۔ ہر چیز مردہ تھی زندگی سے محروم' اف .... دنیا کس قدر ویران ہو گئی تھی۔

اگر اس کے جسم کے اندر ایک دوسرا وجود پرورش نہ پا رہا ہوتا تو وہ اپنی موت کی دعائیں مانگتی خیر زماں تو اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے چلا گیا تھا لیکن وہ خیر زماں کی نشانی کو جنم دینا چاہتی تھی اور اسے زندہ رکھنا چاہتی تھی۔

"کاش .... کاش خدا مجھے ایک بیٹا دے دے۔" وہ دل ہی دل میں کہتی۔ "میرا بیٹا .... میرے خیر زماں کا بیٹا جو اپنے باپ کے قاتل سے اس کے خون کا بدلہ لے گا میں اس کو بتاؤں گی کہ کیا ہوا تھا۔ میں اس کو سب کچھ بتاؤں گی اور بچپن سے ہی اس کو اس بات کے لئے تیار کروں گی کہ وہ بڑا ہونے کے بعد اپنے باپ کے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دے اور میرے کلیجے کو ٹھنڈا کرے۔"

لیکن آگے کیا ہو گا؟ زندگی اپنے لئے کون سا راستہ اختیار کرے گی؟ جینے کا اب کون سا ڈھب ہو گا؟ وہ اپنی اور اپنے ہونے والے بچے کی پرورش کس طرح کرے گی؟ یہ سارے سوالات تھے جو اس کے ذہن کو مسلسل پریشان کرتے رہتے تھے۔

اگرچہ ماما دراز گل اور مامی تاجور کے ہوتے ہوئے اس کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ ساری زندگی ان پر بوجھ بن کر تو نہیں رہ سکتی تھی اور ابھی تو بہت عرصہ باقی تھا۔ اس کے بیٹے کو وجود میں آنا تھا۔ پھر اس کو بڑا ہونا تھا' اور تب کہیں جا کر اس قابل ہونا تھا کہ وہ اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام لے سکے اور تب تک اسے خود بھی زندہ رہنا تھا۔ اپنے بیٹے کو بھی زندہ رکھنا تھا۔ مگر کیسے؟ کیا ماما دراز گل کے گھر پر رہ کر ان کی

روٹیاں کھا کر؟ کیا وہ اور اس کا بیٹا خیرات کی روٹیاں کھا کر زندہ رہیں گے؟ نہیں نہیں' ہرگز نہیں۔ وہ کانپ اٹھی .... تو پھر وہ کیا کرے گی؟

والدین تھے' بہن تھی' گھر تھا' گاؤں تھا مگر کچھ نہیں تھا۔ شوہر کے والدین تھے' گھر تھا' گاؤں تھا مگر کچھ نہیں تھا۔ اس کے لئے تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے تو اس کا سب کچھ چھین لیا گیا تھا اور وہ زندگی کی بھول بھلیوں میں تنہا کھڑی ہوئی اپنے لئے راستہ تلاش کر رہی تھی۔

دراز گل اور تاجور نے اس کی کافی دل جوئی کی زرینہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایسے لوگ نہیں تھے جو طعن و تشنیع سے اس کا کلیجہ چھلنی کر دیتے اور اس کے لئے سانس لینا بھی دشوار کر دیتے۔ وہ اس کی مشکلات کو سمجھتے تھے اور اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔

شازیہ اور صفیہ بھی برابر اس کے پاس آتی رہتی تھیں اور اس کو تسلی دیتی رہتی تھیں۔ پڑھائی کا جو سلسلہ ان سارے ہنگامہ خیز واقعات کی وجہ سے رک گیا تھا ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ زرینہ کو اب چلنے پھرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود ہی شازیہ کے گھر چلی جاتی تھی اس مکان میں وہ والا حصہ جس میں وہ خیر زماں کے ساتھ رہتی تھی اب بھی اس کے ہی قبضے میں تھا اور ان لوگوں نے اس سے مکان خالی نہیں کروایا تھا۔

زرینہ تو ابھی ایک عبوری اور بحرانی دور سے گزر رہی تھی جہاں ساری چیزیں ٹوٹنے' اور بننے کے عذاب سے دوچار تھیں۔ ابھی تک ٹوٹ پھوٹ تو بہت کچھ ہو گئی تھی لیکن بنا کچھ نہیں تھا۔

دراز گل کی زبانی زرینہ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا چچا احمد خان اپنے داماد منیر خان کے ساتھ کراچی آیا ہوا ہے اور وہ لوگ امیر خان کی مدد کر رہے ہیں۔ احمد خان اور منیر خان نے دراز گل سے ملاقات کی کوشش نہیں کی تھی دراز گل خود بھی ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔

احمد خان اور منیر خان کی آمد کا سن کر زرینہ کے دل میں خوف کی ایک ہلکی سی لہر اٹھی تھی۔ کہیں یہ لوگ اس کو ہلاک کرنے کی دوبارہ کوشش نہ کریں۔

"نہیں زرینہ۔" دراز گل نے اس کو سمجھایا۔ "وہ اب ایسا نہیں کریں گے۔ امیر خان پکڑا جا چکا ہے اور یقین ہے کہ اس کو لمبی سزا ہو جائے گی۔ ان کے لئے یہ بہت بڑا نقصان ہو گا۔ اب وہ مزید کوئی حماقت نہیں کریں گے اور پھر وہ لوگ جس کو مار دینا چاہتے

تھے اس کو تو انہوں نے مار ہی دیا۔"

یہ کیسے لوگ تھے! کیسے رشتے تھے! کہاں تھا خون؟ کہاں تھا خونی رشتوں کا تقدس؟ زرینہ سخت برہمی اور بیزاری کے عالم میں سوچتی تھی اس کے ماں باپ' اس کے چچا کے خاندان کے لوگ' وہ سب اس کے دشمن بن گئے تھے اس کی خوشیوں کے' اس کی جان کے دشمن تھے۔ لعنت ہو .... لعنت ہو ایسے خون کے رشتوں پر .... جھوٹ ہے .... سب جھوٹ ہے۔ اس کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہنے لگے۔

پولیس نے زرینہ کا بیان اس وقت لے لیا تھا جب وہ ہسپتال میں تھی' اور زرینہ نے دراز گل کی ہدایت کے مطابق پولیس کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ دراز گل نے اس سارے معاملے میں شروع سے ایک ہی مؤقف اختیار کیا تھا۔ جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا اب اس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے کسی قسم کی غلط بیانی کی ضرورت نہیں تھی اور غلط بیانی سے کوئی فائدہ بھی تو نہیں تھا۔ آدمی جتنا زیادہ سچ بولے اتنا ہی کم سے کم الجھنوں کا شکار ہوتا ہے اور اس لئے اس نے زرینہ کو بھی ہدایت کی تھی کہ وہ اس معاملے کے اصل پس منظر سے پولیس کو آگاہ کر دے چنانچہ پولیس کے لئے اس کیس میں کہیں کوئی الجھن نہیں تھی جو کچھ زرینہ نے اپنے بیان میں کہا تھا اس سے ملزم امیر خان کے بیان کی بھی توثیق ہوتی تھی جو کہ اقبالی مجرم تھا۔ اور اب مقدمہ شروع ہو چکا تھا احمد خان اور اس کا داماد منیر خان ابھی کراچی میں ہی تھے انہیں کم از کم پہلی پیشی تک تو کراچی میں رہنا تھا اس کے بعد تو وہ ضرورت کے وقت کراچی آ سکتے تھے۔

"میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے بیٹا دے۔" زرینہ نے شازیہ سے کہا۔ وہ شازیہ کے گھر گئی ہوئی تھی اور وہ دونوں شازیہ کے کمرے میں بیٹھی ہوئی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ "بیٹی نہ دے' بیٹا دے۔"

"کیوں؟ کیا بیٹی اتنی بری ہوتی ہے؟" شازیہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "آخر تم خود بھی تو ایک عورت ہو اور یہ عورت ہی تو ہوتی ہے جو جنم دیتی ہے۔ اگر بیٹیوں کا وجود دنیا میں نہ رہے تو انسان کا وجود بھی ختم ہو جائے۔"

"وہ میں جانتی ہوں شازیہ باجی۔" زرینہ نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔ "لیکن میں تو خدا سے ایک خاص مقصد کے تحت بیٹا مانگ رہی ہوں۔"

"تمہارا خاص مقصد کیا ہے؟" شازیہ نے اس سے پوچھا۔ حالانکہ اسے اندازہ تھا کہ

اس کا مقصد کیا ہو گا۔

"بیٹا ہو تاکہ وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے سکے۔" زرینہ نے کہا۔

"بدلے کی کیا ضرورت ہے۔" شازیہ نے اس سے کہا۔ "اس کو پولیس نے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا ہے۔ اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہے۔ اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ عدالت خود اس کو سزا دے گی تو پھر تم کو کیا ضرورت ہے کہ تم اپنے بیٹے کی جان کو خطرے میں ڈالو؟"

"عدالت کی سزا سے میری تشفی نہیں ہو گی باجی۔" زرینہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "اور کیا معلوم عدالت اس کو کیا سزا دے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے پھانسی کی سزا نہ ملے تو پھر تو وہ زندہ رہے گا اور کبھی نہ کبھی جیل سے باہر نکل کر آئے گا۔ بس جب بھی وہ جیل سے باہر نکل کر آئے گا تب ہی میرا بیٹا اس کا خون کر کے اپنے باپ کے خون کا حساب چکائے گا۔"

"نہیں زرینہ اس طرح مت سوچو۔" شازیہ نے اس کو سمجھانا چاہا۔ "بدلے کی اس آگ میں اپنے آپ کو اتنا زیادہ مت جلاؤ کہ تمہارا سارا وجود ہی بھسم ہو کر رہ جائے۔ ملزم کو تو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس کو سزا بھی ہو جائے گی تم اپنے آپ کو زیادہ ہلکان مت کرو۔ تمہیں بیٹے کی آرزو صرف اس لئے ہے کہ تم اس کو اپنے انتقام کی آگ میں جھونک سکو لیکن اگر تمہارے بیٹی ہوئی تو پھر تم کیا کرو گی؟ بیٹے یا بیٹی کی پیدائش انسان کے اپنے اختیار کی تو بات نہیں ہے۔"

"اگر بیٹی پیدا ہوئی تو میں اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاؤں گی۔" زرینہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "اس کے سوا میں کیا کر سکتی ہوں؟"

شازیہ نے اس کو سمجھایا کہ وہ اس انداز سے نہ سوچے اور عدالت کے فیصلے کا انتظار کرے۔

"ایسے خواب مت دیکھو جن کی تعبیر کی کوئی بھی صورت تمہارے ہاتھ میں نہ ہو اور تمہیں صرف مایوسی اور ناامیدی کا سامنا کرنا پڑے۔" شازیہ نے اس سے کہا۔ "اپنے آپ کو اس بات کے لئے تیار رکھو کہ تمہارے بیٹی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔"

گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ زرینہ کی وحشتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آگے کیا ہو گا؟ ابھی تک تو وہ ماما دراز گل اور مامی تاجور کے گھر میں رہ رہی تھی اور کم از کم بچے کی

پیدائش تک تو اس کو وہیں رہنا تھا اس کے بعد تو کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

وہ اپنے دل کا حال کس سے کہتی؟ لے دے کر صرف ایک شازیہ ہی تھی جس سے وہ ہر بات کھل کر کہہ سکتی تھی۔ ماما دراز گل اور مامی تاجور سے تو ایک خاص حد کے اندر رہ کر ہی بات کی جا سکتی تھی لیکن شازیہ سے تو بے تکلفی کی حد تک دوستی تھی۔

جیسے جیسے ولادت کے دن قریب آتے جا رہے تھے ویسے ویسے زرینہ کی پریشانیاں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ سب سے بڑی فکر تو یہی تھی کہ آگے کیا ہو گا۔ ماما دراز گل اور مامی تاجور نے ایک سے زائد بار اپنے اس ارادے سے اس کو آگاہ کر دیا تھا کہ وہ اس کو اور اس کے ہونے والے بچے کو اپنے ساتھ رکھیں گے اور ان دونوں کو پورا تحفظ فراہم کریں گے، تاہم زرینہ اس طرح کسی پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔

"تم اس بارے میں اتنا زیادہ پریشان مت ہو۔" ایک روز شازیہ نے اس سے کہا۔

زرینہ اس سے آنے والے دنوں کی ممکنہ مشکلات کے بارے میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ اکثر شازیہ سے اس بارے میں گفتگو کرتی رہتی تھی۔ "تم دنیا کی وہ واحد عورت نہیں ہو جو شوہر کے بغیر اور بے سہارا ہو۔ ہمارے سماج میں ایسی ہزاروں لاکھوں عورتیں موجود ہیں وہ خود کو بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اپنے یتیم بچوں کو بھی پال رہی ہیں اور باعزت زندگی گزار رہی ہیں۔"

"میں بھی .... میں بھی ایسا ہی چاہتی ہوں شازیہ باجی۔" زرینہ نے کہا۔ "میں بھی خود کو اور اپنے ہونے والے بچے کو باعزت طور پر زندہ رکھنا چاہتی ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ میں ماما دراز گل کے سر پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی۔"

"وقت آنے دو زرینہ۔" شازیہ نے کہا۔ "ابھی تو تم کو آرام کی ضرورت ہے بچے کی پیدائش کے بعد دیکھیں گے عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کے بہت سے راستے موجود ہیں۔ مجھے تم سے یہ بات کہنی تو نہیں چاہئے شاید تم برا مان جاؤ لیکن تم اگر چاہو تو دوسری شادی بھی کر سکتی ہو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ تم تو مجھ سے بھی چھوٹی ہو۔"

"نہیں شازیہ باجی۔" زرینہ نے جلدی سے کہا۔ "میں اس کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ میں تو اپنی برادری سے اپنے خاندان سے نکالی ہوئی ایک عورت ہوں لیکن ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی خیر زماں کی موت کے بعد میں دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اب تو مجھے خیر زماں کی یاد کے ساتھ اور اس کے ہونے والے بچے کے ساتھ اپنی زندگی

گزارنی ہے اور اس طرح گزارنی ہے کہ میں کسی پر بوجھ نہ بنوں۔"

"اس شہر میں ہزارہا عورتیں ایسی ہیں جو جسمانی محنت کے باعزت کاموں میں مصروف ہیں اور آبرومندانہ زندگی گزار رہی ہیں۔" شازیہ نے کہا۔ "تم بھی ایسا کچھ کر سکتی ہو۔ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

زرینہ اب اپنے ماموں کے گھر میں ہی رہ رہی تھی اور صغیر احمد کے کرائے کا مکان چھوڑ دیا تھا موجودہ حالت میں وہ تنہا کسی مکان میں نہیں رہ سکتی تھی۔

بالآخر زچگی کا وقت آ گیا اور زرینہ نے ایک میٹرنٹی ہوم میں جہاں اس کی مامی نے اس کا شروع ہی سے رجسٹریشن کروا دیا تھا ایک بیٹے کو جنم دیا۔ ڈلیوری بالکل نارمل انداز میں ہوئی تھی اور کسی قسم کی کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

زرینہ کو جس وقت یہ اطلاع دی گئی کہ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے تو وہ خوشی کے مارے رونے لگی۔ ہسپتال آنے سے پہلے امید و بیم کی ایک بہت ہی جان لیوا اور عذاب ناک کیفیت سے دوچار تھی جو کچھ بھی ہونا تھا بس ایک بار، اسی بار ہو جانا تھا۔ لڑکا یا لڑکی .... بس ایک ہی بار۔ اب وہ دوبارہ کسی بچے کو جنم نہیں دے سکتی تھی وہ اب دوبارہ خیر زماں کے کسی بچے کی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

وقت نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا اس کا بیٹا اس کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا اور وہ اس کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے دل میں آنے والا سب سے پہلا خیال یہی تھا کہ اب وہ اپنے شوہر کے قتل کا انتقام لے سکے گی۔ اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے والا وجود میں آ چکا تھا۔

اگلے چند ماہ بعد مقدمے کا فیصلہ ہو گیا امیر خان کو قتل کے جرم میں چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔

زرینہ کو جب اس فیصلے کی اطلاع ملی تو اس نے سخت مایوسی اور برہمی کا اظہار کیا۔

"بھلا یہ بھی کوئی سزا ہوئی؟" اس نے شازیہ سے کہا۔ "اس نے ایک آدمی کو قتل کیا، میرے شوہر کو قتل کیا اور صرف چودہ سال قید کی سزا۔ نہیں شازیہ باجی نہیں میں نہیں مانتی اس فیصلے کو۔ فیصلہ تو میں خود کروں گی۔ فیصلہ میرا بیٹا کرے گا۔ میں خدا سے دعا کروں گی کہ امیر خان جیل میں زندہ رہے۔ وہ زندہ سلامت وہاں سے رہا ہو کر باہر آئے تاکہ میرا بیٹا اپنے ہاتھوں سے اس کا خون کر سکے۔"

"خدا کے واسطے زرینہ۔" شازیہ نے اس کو روکتے ہوئے کہا۔ "اس قدر خوفناک باتیں مت کرو۔ اس معصوم نے تو ابھی دنیا میں قدم ہی رکھا ہے اور تم ابھی سے اس کے بارے میں ایسی بُری بُری باتیں سوچ رہی ہو۔ نہیں زرینہ اس کو ایک اچھا انسان بناؤ۔ اسے مجرم مت بناؤ اور شروع سے اس کے دماغ میں اس قسم کی باتیں ڈالنے کی کوشش مت کرو۔"

"کل کس نے دیکھا ہے شازیہ باجی۔" زرینہ نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔ "کیا معلوم میری زندگی کتنی ہے' اور میں اپنے بیٹے کے جوان ہونے تک زندہ بھی رہوں گی یا نہیں لیکن میں اس کو اس بارے میں سب کچھ بتا ضرور دوں گی اور اس سے کہوں گی کہ وہ اس قرض کو ضرور ادا کرے آگے جو اس کی مرضی۔"

امیر خان کی سزا اس کے گھر والوں کے لئے کوئی غیر متوقع نہیں تھی معاملات جس ڈگر پر جا رہے تھے ان کے پیش نظر یہ سزا توقع سے کم تھی اسے پھانسی بھی ہو سکتی تھی اور اس کے گھر والوں نے اس سزا کے خلاف اپیل نہیں کی اپیل کی صورت میں سزا میں اضافے کا بھی امکان ہو سکتا تھا۔

لیکن امیر خان کی ماں زر بخت کے لئے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس کا بڑا بیٹا چودہ سال کے لئے جیل چلا گیا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال سے تو وہ جیل میں تھا ہی اور اس اثناء میں وہ صرف دو بار اس سے ملنے کے لئے کراچی جا سکی تھی بار بار کراچی جانا کوئی آسان بات تو نہیں تھی اور اب بیٹے سے جدائی کے طویل چودہ سال۔ اتنا لمبا عرصہ اسے اپنے بیٹے کے بغیر گزارنا تھا اور زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ پل کی خبر نہیں تھی۔

اس کے دل میں تو بیٹے کی شادی کی آرزو تھی وہ اپنے گھر کے آنگن میں بہو کے قدموں کی نرم و نازک چاپ سننا چاہتی تھی اور ننھے منے بچوں کے پیارے پیارے' ہنستے مسکراتے ہوئے چہرے دیکھنا چاہتی تھی لیکن اب تو یہ سب کچھ محض ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔ اب اس خواب کی تعبیر بھی کبھی مل سکے گی یا نہیں۔

آنے والے دن اس خاندان کے لئے بڑے اذیت ناک اور مشکلات سے بھرپور ثابت ہوئے۔

امیر خان کراچی جیل میں کلاس سی میں قید بامشقت کے کڑے شب و روز گزار رہا تھا۔ اپنے گاؤں سے' گھر والوں سے' سب لوگوں سے دور اجنبیوں کے درمیان جن میں

کچھ مہربان تھے تو کچھ نامہربان' زندگی کا یہ اسلوب بڑا صبر آزما اور کڑی آزمائش سے بھرپور تھا۔ بڑے نپے تلے روز و شب تھے۔ اب نہ وہ طلوع آفتاب کا منظر دیکھ پاتا تھا نہ غروب آفتاب کا۔ زندگی کی ساعتیں جو جیل کی چہار دیواری میں قید تھیں اور بھی کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھیں۔ بیرک' کوٹھری' ہتھکڑی بس ایک دائرہ سا بن گیا تھا جس کے اندر وہ گھوم رہا تھا اور اپنے آپ کو کولہو کے اس بیل کی طرح محسوس کرتا تھا جس کی آنکھوں پر کالی پٹی باندھ دی جاتی ہے۔

سب کچھ چھوٹ گیا تھا سب لوگ چھوٹ گئے تھے اور اب ایک طویل عرصہ تک اسی انداز کی زندگی گزارنی تھی' اسی طرح کے نپے تلے' گنے چنے ایک ہی دائرے میں گھومتے ہوئے روز و شب۔

اذیت اور آزار کی ان ساعتوں میں وہ اکثر سوچتا کہ اگر یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ خیر زماں مر گیا' زرینہ بیوہ ہو گئی اور اسے کیا ملا؟ جیل کی اذیت ناک زندگی۔ اس کے گھر والوں کو کیا ملا؟ بابر خیل سے کراچی تک کے دھکے دکھ' صدمے' مالی دشواریاں پیسے کا زیاں کیا حاصل ہوا؟ کس کو کیا حاصل ہوا؟

جیل میں رہ کر اس کو ان ساری باتوں کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کا موقع ملا تھا اور اب وہ اس بات سے بالکل خوش نہیں تھا کہ اس نے خیر زماں کو قتل کر ڈالا۔

جیل میں وقت بھی بڑا رینگ رینگ کر گزرتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وقت کی رفتار ہی تھم گئی ہو لمحوں نے دوڑنا چھوڑ دیا ہو اور کائنات کی نبض تھم گئی ہو۔

کراچی میں اس کا کوئی نہیں تھا ظہور احمد جو اس کا بچپن کا دوست تھا اور جس کے گھر آ کر وہ ٹھہرا تھا ایک بار بھی اس سے ملنے کے لئے جیل نہیں آیا۔ وہ ایک ایسے شخص سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا تھا جسے قتل کے جرم میں سزا ملی ہو۔ اس کے بہنوئی منیر خان کے جو رشتے دار تھے وہ کبھی کبھار اس کی خبر لینے کے لئے آ جاتے تھے اور جب آتے تھے تو اپنے ساتھ اس کے لئے ضرورت کی اور کھانے پینے کی کچھ اشیاء لے آتے تھے اور جہاں تک گھر سے آنے والوں کا تعلق تھا تو یہ ان کے لئے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سردیوں کے موسم میں تو اس علاقے سے نکلنے کے سارے راستے ہی بند ہو جاتے تھے اور سردیوں کا موسم بھی وہاں ذرا لمبا ہی چلتا تھا۔

چنانچہ گھر سے آنے والی ملاقاتوں کے درمیان طویل وقفے حائل ہوتے تھے اور ابتدائی چار برسوں کے دوران گھر سے صرف چار ملاقاتیں آ سکیں اور امیر خان کو ایسا لگتا جیسے وہ اپنے گھر والوں کی شکلیں بھولتا جا رہا ہے جیسے وہ لوگ اب کسی اور دنیا کے باشندے ہیں اور وہ خود کسی دوسری دنیا کا باشندہ ہے۔ اس ایک رات کی کارروائی نے اس کو اپنے لوگوں سے بھی کتنا دور کر دیا تھا۔

جیل میں اس کی زندگی کا چوتھا سال شروع ہو رہا تھا اس کی چھوٹی بہن شاہدہ اور اس کا شوہر منیر خان اس سے ملنے کے لئے آئے۔ شاہدہ نے چھ ماہ پیشتر ہی ایک بچی کو جنم دیا تھا اور وہ بہت خوش تھی اس کے ایک بیٹا پہلے سے موجود تھا جس کا نام سعد اللہ خان تھا۔ شاہدہ اور منیر خان بچی کو پہلی بار کراچی لے کر آئے تھے اور منیر خان کے رشتے داروں کے پاس ٹھہرے تھے لیکن وہ جیل میں اپنی نومولود بیٹی کو اپنے ساتھ لے کر نہیں آئے تھے تاہم امیر خان کو یہ بات بذریعہ خط معلوم ہو گئی تھی کہ اس کی بہن ایک بیٹی کی ماں بن گئی ہے۔

چنانچہ جب وہ دونوں اس سے ملاقات کے لئے جیل میں آئے تو امیر خان نے ان دونوں کو بہت بہت مبارکباد دی۔

"تم نے اچھا کیا کہ تم اس کو یہاں نہیں لائیں۔" اس نے اپنی بہن سے کہا۔ "جیل ایسی جگہ نہیں ہے جہاں بچوں کو لایا جائے اور میں تو اس کو بس اس وقت دیکھوں گا جب میں جیل سے رہا ہوں گا ابھی تو اس میں بہت دیر ہے اس وقت تک تو وہ اچھی خاصی بڑی ہو چکی ہو گی۔"

"بہت دیر نہیں امیر خان۔" منیر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وقت تو پر لگا کر اڑتا ہے دیکھ لو .... دیکھتے ہی دیکھتے چار سال کا عرصہ کیسا گزر گیا کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔"

منیر خان نے تو یہ الفاظ بڑی آسانی سے کہہ دیئے تھے لیکن امیر خان کے لئے سب کچھ ایسا نہیں تھا اس نے جیل میں یہ چار سال کا عرصہ کس طرح گزارا تھا اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس نے تو ایک ایک دن جیسے سولی پر کاٹا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ دوسرے لوگ اس کی اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ کوئی بھی اس کے دکھ کی گہرائی کو اور اس عذاب کی شدت کو نہیں سمجھ سکتا تھا جس سے وہ گزر رہا تھا اس لئے اس نے منیر خان کی

بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

"اور پھر .... تمہیں کوئی پورے چودہ سال تو جیل میں نہیں رہنا ہو گا۔" شاہدہ نے کہا۔ "معافیاں وغیرہ ملا کر کافی کم ہو جاتی ہے سزا کی مدت۔"

"ہاں۔" امیر خان نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "کم تو ہو جاتی ہے .... لیکن یہ کم مدت بھی کاٹنا کوئی آسان تو نہیں ہے۔ بہرحال کاٹنی تو ہے جیسی بھی کٹے۔"

شاہدہ اور منیر خان نے اسے خاندان کے تمام افراد کی خیریت سے مطلع کیا۔ اس کی ماں زر بخت نے اسے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اپنے ہاتھ کا کچھ خشک پکوان بھی بھیجا تھا۔ اس کے باپ احمد خان نے بھی اس کے لئے کچھ چیزیں بھیجی تھیں۔ چچا شمروز خان اور چچی آمنہ نے بہت بہت دعائیں دی تھیں۔ ان کی چھوٹی بیٹی زرینہ کی چھوٹی بہن فیروزہ کی پچھلے دنوں شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش تھی۔ فیروزہ کی شادی میں اس کے والدین کو کافی دقت پیش آئی تھی اس کے لئے رشتے نہیں آ رہے تھے کیونکہ اس کی بڑی بہن گھر سے بھاگ گئی تھی پھر کسی نہ کسی طرح اس کی شادی ہو گئی اور اس کی شادی کرانے میں منیر خان کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔

شاہدہ اور منیر خان سے اس کی بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں یہاں تک کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اور جیل کے سپاہی نے ان لوگوں کو اس کی اطلاع دی۔

"ہم لوگ جلد ہی دوبارہ کراچی آئیں گے۔" منیر خان نے اس سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ "اور ان شاء اللہ تم سے ملاقات کریں گے۔"

"اور اس بار ہم بابا اور اماں کو بھی ساتھ لے کر آئیں گے۔" شاہدہ نے کہا۔ "بابا تو اس دفعہ بھی ساتھ آنے والے تھے لیکن عین وقت پر ان کی طبیعت خراب ہو گئی اس وجہ سے وہ نہیں آئے۔"

ان لوگوں میں سے کسی کو بھی یہ بات نہیں معلوم تھی کہ امیر خان اور منیر خان کی یہ آخری ملاقات ہے۔

منیر خان اور شاہدہ جیل سے ٹیکسی میں واپس جا رہے تھے کہ راستے میں ٹیکسی کا ایک ٹرک سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ٹیکسی چکنا چور ہو گئی ٹیکسی ڈرائیور تو موقع پر ہی ہلاک ہو گیا اور منیر خان اور شاہدہ سخت زخمی ہو گئے منیر خان کے سر میں چوٹ لگی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا لیکن شاہدہ شدید زخمی ہونے کے باوجود ہوش میں تھی۔

ان دونوں کو ہسپتال پہنچا دیا گیا اور شاہدہ نے کسی نہ کسی طرح منیر خان کے رشتے داروں کو اطلاع کروا دی جہاں وہ دونوں ٹھہرے ہوئے تھے وہ لوگ ہسپتال آ گئے۔

منیر خان کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور پھر اس کو ہوش نہیں آیا اسی بے ہوشی کے عالم میں اس رات اس نے ہسپتال میں دم توڑ دیا۔

شاہدہ کے اگرچہ کافی چوٹیں لگی تھیں اور اس کے جسم سے کافی خون نکلا تھا لیکن اس کی کوئی بھی چوٹ جان لیوا نہیں تھی اس کا سر محفوظ تھا اور جسم کی کوئی ہڈی بھی نہیں ٹوٹی تھی اس کی حالت خطرے سے باہر تھی تاہم اس کو فوری طور پر اس کے شوہر کی موت کے بارے میں نہیں بتایا گیا۔

منیر خان کے رشتے داروں نے اس کے گاؤں اطلاع بھجوا دی تھی اور اب وہ اس کے گھر والوں کی ہدایت کے مطابق اس کی لاش کو اس کے گاؤں بھجوانے کا بندوبست کر رہے تھے شاہدہ بیوہ ہو گئی تھی۔

چند دن کے بعد شاہدہ کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی اور پھر اسے اپنے شوہر کی موت کا علم ہوا اس کی تو دنیا ہی لٹ گئی وہ بیوہ ہو گئی تھی اپنے دو یتیم بچوں کے ساتھ۔ زندگی کس قدر ویران اور ستم کار ہو گئی تھی۔ آن کی آن میں ساری بساط ہی الٹ کر رہ گئی تھی وہ سب کچھ ہو گیا تھا جس کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔

شاہدہ اور منیر خان کے کچھ رشتے دار گاؤں کے لئے روانہ ہو گئے اور ایک رشتے دار اس گاڑی میں روانہ ہوا جس میں منیر خان کی لاش جا رہی تھی۔

احمد خان اور زر بخت اپنی بدنصیبی کا ماتم کرتے نہیں تھکتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تقدیر نے ان کے دامن کے لئے صرف کانٹوں کو ہی چنا تھا ان کی دنیا جیسے ویران ہو کر رہ گئی تھی۔ تین اولادوں میں سے سب سے بڑا بیٹا تو قتل کے الزام میں چودہ سال کے لئے جیل چلا گیا جہاں وہ بدنصیبی کے دن گزار رہا تھا اور بیٹی جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ دو یتیم بچوں کے ساتھ .... سارے گھر پر جیسے قیامت نازل ہو گئی تھی۔

زر بخت اپنی موجودہ تمام مصیبتوں کا ذمہ دار شمروز خان کے خاندان والوں کو ہی سمجھتی تھی۔ شمروز خان کی بیٹی ہی کی وجہ سے اس کے بیٹے کو چودہ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی اور اس کی وجہ سے اس [illegible] کی موت واقع ہوئی۔ وہ بے چارہ شاہدہ کے ساتھ امیر خان سے ملنے کے لئے ہی تو گیا تھا ورنہ اس کو کراچی جانے کی کیا ضرورت تھی؟ امیر

خان سے مل کر ہی تو وہ دونوں آ رہے تھے کہ ٹیکسی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔

اور زر بخت کو جب بھی موقع ملتا وہ اپنے ان خیالات کا اظہار کرنے سے چوکتی بھی نہیں تھی احمد خان اپنی بیوی کی باتیں خاموشی سے سن لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دل بہت زیادہ دکھا ہوا ہے دل تو اس کا اپنا بھی بہت دکھا ہوا تھا اور وہ خود بھی اس بات کا حامی نہیں تھا کہ اس کا بیٹا امیر خان کراچی جا کر خیر زماں اور زرینہ کو قتل کر دے لیکن چونکہ شمروز خان کا اپنا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے امیر خان کو یہ کام کرنا پڑا تھا تاہم امیر خان کو کسی نے مجبور نہیں کیا تھا وہ اگر ایسا نہ کرنا چاہتا تو کوئی بھی اس سے اصرار نہیں کرتا' لیکن اس نے تو خود ہی پیشکش کی تھی کہ وہ یہ کام کرے گا اور اب وہ اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ جیل میں گزارنے کے لئے چلا گیا تھا۔

احمد خان کافی بیمار رہنے لگا تھا اور بعض اوقات تو اس پر سخت مایوسی طاری ہو جاتی .... کون جانے وہ امیر خان کی رہائی تک زندہ بھی رہ سکے گا یا نہیں۔ داماد کی جواں عمری کی موت کے صدمے نے اس کو اور بھی زیادہ نڈھال کر دیا تھا اکلوتی بیٹی بیوہ ہو گئی تھی دو بچوں کا ساتھ تھا خدا جانے آگے زندگی کس طرح بسر ہو گی۔

احمد خان کا چھوٹا بیٹا حبیب خان اب تقریباً چودہ سال کا ہو گیا تھا اور اب تو ماں باپ کا وہی سہارا تھا لیکن فی الحال تو خود اس کو سہارے کی ضرورت تھی کیونکہ وہ ابھی کافی چھوٹا تھا۔

منیر خان کی موت کی اطلاع امیر خان کو کراچی میں جیل میں ملی اور اس پر جیسے بجلی گر پڑی اس کو بتایا گیا کہ منیر خان اور شاہدہ اس سے ملاقات کرنے کے بعد واپس جا رہے تھے کہ راستے میں ان کی ٹیکسی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ دونوں شدید زخمی حالت میں ہسپتال میں پہنچ گئے جہاں منیر خان اسی رات مر گیا۔

امیر خان اپنی گرفتاری پر نہیں رویا تھا وہ اپنی سزا پر نہیں رویا تھا لیکن اپنے بہنوئی منیر خان کی موت کی خبر سن کر وہ بہت رویا۔ اسے منیر خان کے ساتھ ہونے والی وہ آخری ملاقات یاد آ رہی تھی جب منیر خان نے اس سے کہا تھا کہ جلد ہی دوبارہ ملاقات ہو گی بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ اب ان کی ملاقات کبھی نہیں ہو گی۔

وہ اپنے والدین کے بارے میں ان پر ٹوٹ پڑنے والی اس اچانک قیامت کے بارے میں سوچتا تھا۔

کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا........... اس کو تو کسی نے مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ کراچی جا کر خیر زماں اور زرینہ کو قتل کر دے اس نے تو از خود یہ ذمہ داری قبول کی تھی کیونکہ وہ زرینہ سے اس بات کا انتقام لینا چاہتا تھا کہ زرینہ نے اس کو مسترد کیا تھا........... کاش اس نے زرینہ اور خیر زماں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہوتا اور ان کے پیچھے کراچی نہ آیا ہوتا تو آج حالات کتنے مختلف ہوتے۔ نہ تو وہ ایک طویل عرصے کے لئے جیل میں ہوتا اور نہ ہی اس کا بہنوئی حادثے میں مرتا وہ اس سے مل کر تو واپس جا رہا تھا جو یہ حادثہ ہوا۔

لیکن اب ان تمام باتوں کے سوچنے میں کیا رکھا تھا؟ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا........... بہن بیوہ ہو چکی تھی اور وہ خود ایک لمبے عرصے کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے آ کر بند ہو گیا تھا۔

زرینہ نے اپنے بیٹے کا نام گل زماں رکھا اور یہ نام صرف اس کی نہیں بلکہ اس کے مرحوم شوہر کی پسند تھا۔ خیر زماں اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ اپنے پہلے بیٹے کا نام گل زماں رکھے گا اور جب پہلا بیٹا ہوا تو خیر زماں زندہ نہیں تھا لیکن وہ زندہ تھا گل زماں کی صورت میں اس کے بیٹے کی صورت میں........... زرینہ اس کو اپنی زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع سمجھتی تھی اب وہ صرف اپنے بیٹے کے لئے جینا چاہتی تھی۔

بیٹا تو دنیا میں آ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ سوال ایک نئی صورت اختیار کر گیا تھا کہ اب آئندہ زندگی کا اسلوب کیا ہو گا۔ اب وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک جان اور تھی جس کی اس کو پرورش کرنی تھی۔

شازیہ نے اس کو زندگی کا ایک نیا راستہ دکھایا اس نے اس کے لئے ایک انڈسٹریل ہوم میں نوکری کا بندوبست کر دیا جہاں سے اسے کام کی بنیاد پر اچھے خاصے پیسے مل سکتے تھے۔

دراز گل اور اس کی بیوی تاجور اس بات کے حق میں بالکل نہیں تھے کہ زرینہ نوکری کرے یہ بات تو ان کی خاندانی روایات کے بالکل خلاف تھی ان کے خاندان میں آج تک کسی لڑکی نے نوکری نہیں کی تھی۔

لیکن زرینہ نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ یہ اب کوئی دو چار دن کا مسئلہ نہیں تھا اسے تو اب ساری زندگی کاٹنی تھی وہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے بغیر ماں باپ کے تھی اور بیوہ تھی اسے اپنے سہارے، اپنے بل بوتے پر زندہ رہنا تھا اور اپنی اور اپنے بیٹے کی پرورش

کرنی تھی۔

شازیہ نے دراز گل اور تاجور کو اس بات پر قائل کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی اور بالآخر ان کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا۔

طے یہ پایا کہ زرینہ بدستور دراز گل کے گھر میں رہے گی اور صبح سے لے کر دوپہر تک انڈسٹریل ہوم میں کام کرے گی جو کہ گھر سے زیادہ دور واقع نہیں تھا اور اس دوران تاجور اس کے بیٹے کی دیکھ بھال کرے گی دوپہر کو جب وہ کام پر سے واپس آ جائے گی تو پھر اپنے بیٹے کو سنبھالے گی۔

"جو بھی پیسے تم کما کر لاؤ گی وہ تمہارے اور تمہارے بیٹے کے ہوں گے۔" دراز گل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان پیسوں سے کوئی مطلب نہیں ہو گا اور تم جس طرح اب تک یہاں رہتی رہی ہو اسی طرح رہتی رہو گی یعنی یہ کہ تمہارے کھانے پینے وغیرہ کے تمام اخراجات آج کی طرح ہمارے ہی ذمے ہوں گے۔"

"یہی اب میرا گھر ہے۔" زرینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں اس گھر کے لئے جو کچھ بھی کر سکتی ہوں ضرور کروں گی۔ اگر یہ گھر مجھے اتنا کچھ دے رہا ہے تو میں بھی اس گھر کو کچھ نہ کچھ تو ضرور دوں گی، جتنی میری حیثیت ہے، جتنی میری اوقات ہے اور جب میرا گل زماں بڑا ہو جائے گا اس قابل ہو جائے گا کہ وہ اپنا خیال خود رکھ سکے تو میں سارے دن کی نوکری کر لوں گی تب گل زماں بھی اسکول جانے لگے گا۔ میں اس کو تعلیم دلواؤں گی جس طرح کراچی میں زیادہ تر بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں تو پڑھنے لکھنے کا کوئی رواج ہی نہیں ہے۔"

"گاؤں کے سارے رواجوں کو بھول جاؤ زرینہ۔" تاجور نے اسے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم اب گاؤں میں نہیں رہ رہے ہیں، اور ہمیں وہاں رہنا بھی نہیں ہے گاؤں کی جو روایات ہیں انہیں وہیں گاؤں میں چھوڑ دینا چاہئے۔"

تاجور جو کچھ کہہ رہی تھی زرینہ اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہی تھی اس سے پہلے بھی تاجور کئی بار زرینہ سے اشارتاً یہ کہہ چکی تھی کہ اس کو اب انتقام وغیرہ کی بات بھول جانا چاہئے اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کراچی میں اپنے بچوں کے ساتھ رہنے والی تاجور قتل، غارت گری خون اور انتقام وغیرہ کے معاملات میں اپنے خاندان والوں کو ملوث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک عرصہ دراز سے کراچی میں رہ رہی تھی اس

کے تمام بچے کراچی میں ہی پیدا ہوئے تھے ان کی پرورش و پرداخت اس شہر میں ہوئی تھی اور انہوں نے یہیں ہوش سنبھالا تھا ان میں سے کسی کو گاؤں جا کر نہ ہل چلانا تھا نہ بھیڑیں ہانکنی تھیں۔ ان سب کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی تھی اور ایک جدید تعلیم یافتہ اور مہذب معاشرے میں اپنا مقام بنانا تھا وہ اپنے بچوں کی اور اپنے شوہر کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی اس لئے اس نے انتقام وغیرہ کے سلسلے میں زرینہ کی بالکل حوصلہ افزائی نہیں کی تھی اور اس کو بالکل اس انداز میں سمجھانا چاہا تھا جس انداز میں اس کو شازیہ نے سمجھایا تھا کہ جب عدالت نے امیر خان کو سزا دے دی ہے تو پھر اس کو اپنی طرف سے مزید سزا دینے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے۔ زرینہ نے بہرحال ان لوگوں کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا تھا اور وہ اپنے اس ارادے پر قائم رہی تھی کہ وہ شروع سے ہی اپنے بیٹے کو اس بات کے لئے تیار کرتی رہے گی کہ وہ جوان ہونے کے بعد اپنے باپ کے قتل کا بدلہ ضرور لے۔

زرینہ نے انڈسٹریل ہوم میں جز وقتی نوکری کر لی یہاں اس کے علاوہ اور بھی بہت سی لڑکیاں اور عورتیں کام کرتی تھیں اور زرینہ کو زندگی میں پہلی بار اتنی بہت ساری ایسی عورتوں کے قریب آنے کا موقع ملا جو اس کی ذات برادری اور قبیل کی نہیں تھیں بلکہ الگ الگ جگہوں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن ان سب میں ایک چیز مشترک تھی یہ سب ضرورت مند تھیں اور یا تو تنہا اپنے خاندانوں کی کفالت کر رہی تھیں اور یا پھر اپنے خاندان کی آمدنی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ان میں کئی بیوائیں تھیں جن کا کوئی سہارا نہیں تھا اور جو خود ہی اپنا اور اپنے بچوں کا سہارا تھیں کچھ ایسی لڑکیاں تھیں جو اپنا خرچ خود اٹھانے پر مجبور تھیں کچھ اپنے والدین اور چھوٹے بھائی بہنوں کا سہارا تھیں یہ ایک الگ دنیا تھی۔

زرینہ کو یہ دنیا بہت اچھی لگی یہاں کی فضا بڑی دوستانہ تھی اور لوگ ایک دوسرے کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ زرینہ کے لئے یہ پہلا تجربہ تھا جس کے دوران اس نے اجتماعی زندگی کے ایک نئے رخ کو دیکھا اور اسے بہت پسند کیا۔

وقت گزرتا گیا اور زرینہ اپنے کام میں مہارت حاصل کرتی گئی اس کا بیٹا دراز گل کے گھر میں پرورش پا رہا تھا اور وہ خود بھی وہیں رہ رہی تھی۔

خیر زماں کی موت کے کچھ ہی عرصے کے بعد دراز گل اکیلا گاؤں گیا تھا تاجور اور

بچوں کو ساتھ نہیں لے گیا تھا وہ اپنی بہن اور بہنوئی سے ان کے جوان بیٹے کی موت پر تعزیت کے لئے گیا تھا۔ گل بی بی اپنے بھائی سے مل کر زار و قطار روئی اور دراز گل کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے بخت خان اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا اور خیر زماں کے قتل کو اس کی اپنی نامعقول حرکتوں کا نتیجہ قرار دے رہا تھا۔ اس نے دراز گل سے اپنی بہو زرینہ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ حالانکہ سب کو یہ بات معلوم تھی کہ زرینہ کراچی میں دراز گل کے گھر میں رہ رہی تھی لیکن گل بی بی نے اس کے بارے میں رو رو کر پوچھا۔ ایک ایک بات پوچھی اس واقعے کی پوری تفصیل پوچھی اور جب دراز گل نے اس کو یہ بتایا کہ زرینہ ماں بننے والی ہے تو گل بی بی خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات میں ڈوب کر بہت روئی۔

"مگر ہمارا اب زرینہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" بخت خان نے سرد مہری کے ساتھ کہا۔ "ہمارا اس سے یا اس کے ہونے والے بچے سے کوئی تعلق نہیں ہے اس سے کہہ دینا کہ اس گھر کے دروازے اب اس پر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں اور وہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرے۔"

"وہ ادھر کا رخ کیوں کرے گی بخت خان؟" دراز گل نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہاں اس کے لئے کچھ نہیں رکھا ہے۔ وہ جانتی ہے تو پھر وہ یہاں کیوں آئے گی؟ میں نے اس کو اپنے گھر میں پناہ دی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں زرینہ میرے ساتھ ہی رہے گی۔"

"تمہاری مرضی ہے دراز گل۔" بخت خان نے کہا۔ "جی چاہے اسے رکھو اور جی چاہے تو اسے قتل کر دو۔ ہم تم سے اس معاملے میں کچھ نہیں کہیں گے۔"

دراز گل چند دن سے زیادہ ڈیرہ امین گل میں نہیں رہا۔ اسے یہاں کے ماحول سے وحشت ہوئی تھی۔ یہاں کی فضاؤں میں اسے خون کی بو گھلی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے یہاں قیام کے دوران ہی پرانی دشمنی کی بنا پر اس علاقے میں ایک اور قتل ہو گیا تھا قتل کی نئی وجہ تو کوئی نہیں تھی بس کوئی پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ ڈیرہ امین گل میں اپنے قیام کے دوران دراز گل کو امیر خان کے خاندان کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں دونوں گاؤں کے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے تھے یہ معاملہ تو ایسا تھا جس نے سارے ہی گاؤں کے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔

"احمد خان کو فی الحقیقت اس بات کا افسوس ہے کہ اس کے بیٹے نے یہ ذمہ داری اپنے سر کیوں لی۔" بخت خان نے دراز گل کو بتایا۔ "احمد خان نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا خیر زماں کو قتل کرنے کے لئے کراچی جائے اور اس کی بیوی زر بخت تو بالکل نہیں چاہتی تھی۔"

"اگر ایسی بات تھی تو شمروز خان کو خود چاہئے تھا کہ امیر خان کو روکتا۔" دراز گل نے کہا۔ "اگر امیر خان کے والدین کی مرضی نہیں تھی تو پھر امیر خان کو یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"معلوم نہیں۔" بخت خان نے کہا۔ "لیکن بعض لوگوں سے میں نے یہ سنا ہے کہ امیر خان خود ہی بضد تھا اس نے خود ہی اصرار کیا تھا کہ وہ یہ کام کرے گا۔ خدا معلوم وہ کیوں اپنے آپ کو اس معاملے میں اس قدر ملوث کرنا چاہتا تھا۔"

دراز گل کچھ دن تک اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہ کر کراچی واپس آ گیا۔ زرینہ کو دراز گل کی زبانی خیر زماں کے گھر والوں کے بارے میں تو بہت ساری باتیں معلوم ہوئیں لیکن خود اپنے والدین اور گھر والوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا' سوائے اس کے کہ وہ لوگ خیریت سے ہیں' وہ لوگ جو کبھی اس کے اپنے تھے اب اس کے لئے اتنے غیر بن گئے تھے کہ ان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے لئے صرف غیر ہی نہیں بن گئے تھے وہ تو اس کے دشمن بھی بن گئے تھے اس کے خون کے پیاسے' دیکھتے ہی دیکھتے خون کے رشتوں نے کیا خونی رنگ اختیار کیا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور زرینہ کے شب و روز اسی انداز میں گزرتے رہے۔ وہ صبح سے لے کر دوپہر تک انڈسٹریل ہوم میں کام کرتی اور اس دوران تاجور اس کے بیٹے کی دیکھ بھال کرتی پھر دوپہر کو جب وہ واپس آ جاتی تو خود اپنے بیٹے کو سنبھالتی۔

وہ اب بہت اچھا کام کرنے لگی تھی اس کے پیسے بھی بڑھ گئے تھے اور اب وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ کام کر لیتی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنے کام میں مہارت حاصل کر لی تھی۔

اس کا بیٹا گل زماں اس کی بے پناہ محبتوں اور شفقتوں کے سائے میں پل رہا تھا اور اب اس کی عمر کوئی چھ سال کی ہونے والی تھی کچھ ہی دن پہلے اس نے گل زماں کو ایک اسکول میں بھیجنا شروع کر دیا تھا۔

گل زماں کو اسکول بھیجنے سے زندگی میں ایک بڑی خوشگوار تبدیلی آ گئی اب اسے گل زماں کو اپنی مامی تاجور کی تحویل میں چھوڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب زرینہ نے نوکری کی تھی تب سے گل زماں آدھے دن کے لئے اس کی تحویل میں رہتا تھا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں تھی تاجور اس پابندی سے اور اس ذمہ داری سے آزاد ہو گئی تھی۔

زرینہ گل زماں کو دیکھتی تھی تو اس کے دل میں خوشیوں کا سمندر موجزن ہو جاتا تھا یہ اس کا بیٹا تھا اس کا اپنا بیٹا .... اس کا اور خیر زماں کا بیٹا .... وہ گل زماں کو دیکھتی تو اس کو یوں محسوس ہوتا کہ خیر زماں زندہ ہو گیا ہے۔ خیر زماں ایک نئی شکل میں' ایک نیا روپ دھار کر اس کے سامنے آ گیا تھا جیسے خیر زماں کو ایک نئی زندگی مل گئی ہے۔

گل زماں اسکول جانے لگا تھا اس نے کراچی میں آنکھ کھولی تھی اور وہ ایک شہری ماحول میں پرورش پا رہا تھا۔ اس نے ایک ایسے نئے انداز کی زندگی گزارنی شروع کی جس کا قدیم طرز کی قبائلی' پسماندہ اور دیہی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

گل زماں کی عمر تقریباً ساڑھے چار سال کی تھی جب امیر خان کے بہنوئی کا حادثے میں انتقال ہو گیا۔

دراز گل کو یہ خبر اس حادثے کے دوسرے ہی دن مل گئی تھی منیر خان کے جو رشتے دار کراچی میں رہتے تھے ان کے اور دراز گل کے کچھ مشترکہ جاننے والے بھی تھے۔ انہی لوگوں کی زبانی دراز گل کو منیر خان کی حادثاتی موت کا علم ہوا دراز گل نے یہ خبر اپنے گھر والوں کو بھی سنائی جس میں زرینہ بھی شامل تھی۔

زرینہ کو اس خبر سے کوئی خوشی نہیں ہوئی اسے منیر خان سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور اپنی چچازاد بہن شاہدہ سے اس کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے تھے اس نے کبھی شاہدہ کا برا نہیں چاہا تھا اس نے تو کسی کا بھی برا نہیں چاہا تھا اس نے تو صرف اپنے لئے خوشیاں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور ان سب لوگوں نے اس کو خوشیوں سے محروم کرنے کے لئے محاذ بنا لیا تھا۔

"احمد خان کے لئے یہ دوسرا بڑا صدمہ ہے۔" دراز گل نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹے کی سزا کے بعد اب یہ دوسری افتاد پڑی ہے اس پر۔"

"بیٹے کے غم کے ساتھ ساتھ اب اس کو بیٹی کا غم بھی جھیلنا ہو گا۔" تاجور نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "اور یہ زیادہ بڑا غم ہے۔ بیٹے کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی

اور اس کے بیوی بچوں کا کوئی مسئلہ نہیں لیکن شاہدہ بے چاری تو بیوہ ہو گئی اور اس کے بچے یتیم ہو گئے یہ واقعی دکھ کی بات ہے۔"

ڈیرہ امین گل کی خبروں کے مقابلے میں بابر خیل کی خبریں تو اور بھی کم ملتی تھیں بلکہ ملتی ہی نہیں تھیں۔ زرینہ کو اپنے والدین کے بارے میں اپنی بہن فیروزہ کے بارے میں اپنے چچا احمد خان اور چچی زر بخت کے بارے میں اپنی چچاز زاد بیوہ بہن شاہدہ کے اور اس کے بچوں کے بارے میں بہت ہی کم معلوم ہو سکا تھا بلکہ کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ اپنی چچا زاد بہن شاہدہ کے شوہر منیر خان کی موت کے بعد اس کو عملاً ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور اسے ان کے بارے میں جاننے کی کوئی خواہش بھی نہیں تھی۔ ان لوگوں سے' اس خاندان سے' ان فضاؤں سے اس نے اپنا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توڑ لیا تھا اس نے اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر ایک الگ دنیا بسا لی تھی اور اب اس کو یا اس کے بیٹے کو اس پرانی دنیا میں کبھی واپس نہیں جانا تھا لیکن ایک بڑا مضبوط مستحکم رشتہ تھا جس نے اس کو پرانی دنیا سے بڑی سختی کے ساتھ جوڑ رکھا تھا۔ یہ دشمنی' عداوت اور انتقام کا رشتہ تھا۔

اسے اپنے شوہر کے قاتل سے انتقام لینا تھا۔ اس کے شوہر کا قاتل ابھی جیل میں تھا اور زرینہ کا اپنا بیٹا جس کے ذریعے وہ اپنے شوہر کے خون کا بدلہ لینا چاہتی تھی ابھی بہت چھوٹا تھا اس وقت کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی جب یہ معاملہ صحیح معنوں میں عملی صورت اختیار کر سکے۔

"اسے ایک نہ ایک دن تو رہا ہونا ہی ہے۔" زرینہ اکثر سوچتی۔ "خدا کرے وہ جیل میں نہ مر جائے۔ بلکہ جیل سے زندہ سلامت حالت میں رہا ہو۔ وہ جیل سے رہا ہو کر آئے گا تو گل زماں اس کو اپنی بندوق کی گولی کا نشانہ بنائے گا اور اس وقت کے آنے میں بھی دیر ہے .... بہت دیر ہے۔"

گل زماں نے ذرا ہوش سنبھالا ہی تھا کہ زرینہ نے اس کو اس واقعے کے بارے میں بتانا شروع کر دیا وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا شروع سے ہی سب کچھ جان لے اور اس کو اس بات کا علم ہو جائے کہ اس کے باپ کو کس نے قتل کیا ہے' اور وہ شخص ابھی جیل میں ہے اور جب وہ جیل سے رہا ہو کر باہر آئے گا تو پھر اسے اس کو قتل کرنا ہو گا۔
رفتہ رفتہ گل زماں اس بات کو سمجھنے لگا کہ اس کے باپ کو قتل کیا گیا تھا اور یہ کہ

اس کے باپ کا قاتل فی الوقت جیل میں ہے اور جب وہ جیل سے رہا ہو گا .... گل زماں جوان ہو جائے گا تو اس وقت اسے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا ہو گا وہ ابھی کافی چھوٹا اور ناسمجھ تھا اور ان ساری باتوں کو پوری طرح سے نہیں سمجھ پاتا تھا۔ تاہم زرینہ اس کے دماغ میں یہ سب کچھ ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

☆======☆======☆

"تم کسی دن ہمارے گھر آؤ۔" شائلہ نے گل زماں سے کہا۔ "میں تمہیں ممی اور ماما سے ملاؤں گی وہ لوگ تم سے مل کر خوش ہوں گے اور تم بھی ان سے مل کر خوش ہو گے۔"

"لیکن کیا وہ اس بات کو پسند کریں گے کہ کوئی لڑکا تم سے ملنے کے لئے تمہارے گھر آئے؟" گل زماں نے اس سے سوال کیا۔ "پرانے خیالات کے لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے۔"

"وہ لوگ ان پڑھ ضرور ہیں لیکن اتنے زیادہ قدامت پرست نہیں ہیں۔" شائلہ نے کہا۔ "انہوں نے مجھے کالج میں اور وہ بھی مخلوط تعلیم کے کالج میں پڑھنے کے لئے اجازت دے رکھی ہے اور میں یہاں پڑھ رہی ہوں ظاہر ہے کہ لڑکوں کے ساتھ پڑھ رہی ہوں تو اگر کوئی لڑکا مجھ سے ملنے کے لئے میرے گھر آ جائے گا تو کیا قیامت ہو جائے گی۔"

"اصل میں آنا تو اس وقت ہو گا جب میں اپنی ماں کو ساتھ لے کر تمہارے گھر آؤں گا اور تمہاری ماں اور تمہارے ماما سے تمہارا ہاتھ مانگوں گا۔" گل زماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہائے .... کیا وقت ہو گا وہ بھی.........."

شائلہ کے چہرے کا رنگ ایک دم گلابی ہو گیا اور اس نے پہلے تو نظریں جھکا لیں اور پھر مسکرا کر گل زماں کی آنکھوں میں جھانکنے لگی اسے یوں لگا جیسے ساری کائنات اس گھڑی جس قدر خوبصورت تھی اتنی خوبصورت کبھی نہیں تھی۔ ہر چیز میں یکایک اتنے بہت سے رنگ نمودار ہو گئے تھے کہ ان کو گننا مشکل تھا۔ زمین سے لے کر آسمان تک' رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے اور وہ ان رنگوں کے درمیان اڑتی چلی جا رہی تھی۔ نرم و نازک اور لطیف جذبوں میں ڈوبی ہوئی روح کی بالیدگی کے ساتھ' دل کی شگفتگی کے ساتھ۔
گل زماں اور شائلہ کی دوستی کا آغاز کالج میں ہوا تھا اور اس دوستی کو تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا اس عرصے کے دوران ان کے درمیان پیدا ہونے والی اس سیدھی

سادی سی دوستی نے جو کہ ایک ساتھ پڑھنے والوں کے درمیان ہوتی ہے کچھ دوسرا ہی رنگ اختیار کر لیا تھا وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔

گل زماں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد ایک بڑے سائنس کالج میں داخلہ لے لیا تھا اس کے نمبر بہت اچھے آئے تھے اس لئے اس کو کالج میں داخلہ باآسانی مل گیا تھا یہ ایک بڑا سائنس کالج تھا جس میں لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔

گل زماں کے ساتھ فرسٹ ایئر میں کئی لڑکیاں تھیں اس کی ان سے واقفیت تھی بات چیت ہوتی تھی ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا بعض کے ساتھ بے تکلفی بھی تھی لیکن کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جس کے آگے چل کر کوئی سنجیدہ اور مستقل صورت اختیار کر لینے کا امکان ہو۔ وہ کالج سے گھر آتا تو ان لڑکیوں کے بارے میں سب کچھ بھول چکا ہوتا تھا۔

اس نے اس کالج میں دو سال گزار دیئے اور انٹر کا امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا اس کے بعد اس نے اسی کالج میں بی ایس سی میں داخلہ لے لیا اسے فزکس سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور وہ فزکس میں ایم ایس سی کرنا چاہتا تھا۔ کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد پھر اس کا ارادہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا تھا۔

انٹر پاس کرنے کے بعد جب نئے سال کے داخلے شروع ہوئے تو فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے والوں میں شائلہ نامی ایک لڑکی بھی شامل تھی۔

کالج میں لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی اور جو بھی لڑکیاں تھیں گل زماں ان سب کو جانتا تھا فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے والی لڑکیوں سے بھی جلد ہی واقفیت ہو جاتی تھی۔

گل زماں نے شائلہ کو پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ کالج کے آفس میں داخلہ فارم جمع کروا رہی تھی اور بھی دوسری کئی لڑکیاں تھیں لیکن شائلہ ان سب میں ممتاز نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی اس کے بیضوی چہرے کے سجل خدوخال کسی یونانی دیوی کے مجسمے کی طرح تراشیدہ لگ رہے تھے اس کی آنکھیں اس قدر سیاہ اور اتنی گہری تھیں کہ دیکھنے والا خود کو ان میں ڈوبتا ہوا محسوس کرتا تھا۔

گل زماں نے اس بہت خوبصورت لڑکی کو دیکھا اور وہ پہلی ہی نظر میں اس کو بہت اچھی لگی اس کا بے ساختہ جی چاہا کہ وہ اس سے بات کرے اس سے اس کے بارے میں پوچھے اور اگر اس کو کسی مدد کی ضرورت ہو تو اس کی مدد کرے۔ وہ نئی تھی اور فرسٹ ایئر

کے فارم جمع کرانے والوں میں شامل تھی لیکن اس سے بات چیت کرنے کا یہ کوئی موقع نہیں تھا۔

اس کے بعد وہ لڑکی اس کو اکثر نظر آنے لگی لڑکیوں کے ہجوم میں گل زماں کی نظریں اس کو تلاش کیا کرتی تھیں اور جب وہ اسے مل جاتی تھی تو وہ چپکے چپکے اسے دیکھتا رہتا تھا کلاس ابھی شروع نہیں ہوئی تھی صرف داخلے جاری تھے اور داخلہ لینے والے طالب علموں کو باضابطہ طور پر کالج آنے کی ضرورت نہیں تھی وہ لڑکی بھی کسی کسی دن کالج میں نظر آتی تھی۔

گل زماں تقریباً روز ہی کالج آتا تھا وہ اب بی ایس سی پارٹ ون کا طالب علم تھا اور بی ایس سی پارٹ ون کی کچھ کلاسیں ابھی شروع ہو چکی تھیں فرسٹ ایئر اور انٹر کی کلاسیں ابھی نہیں ہو رہی تھیں۔ گل زماں کی نگاہیں کالج میں داخل ہونے کے فوراً ہی بعد اس لڑکی کو اِدھر اُدھر تلاش کرنا شروع کر دیتیں جس کے نام سے بھی وہ ابھی تک واقف نہیں تھا اور جس دن وہ اس کو نظر آ جاتی اس دن وہ سارا دن خوش رہتا اس دن تو اس کو کسی کی بری بات بھی بری نہیں لگتی تھی سب کچھ اچھا لگتا تھا۔

اس کی اس لڑکی سے نہ تو کوئی ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی وہ اس کے بارے میں کچھ جانتا تھا لیکن پھر بھی اس کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ تو اسے ہمیشہ سے جانتا ہے جیسے ہمیشہ سے وہ لڑکی اس کے ساتھ ہے وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں وہ عالم تصور میں اس کے ساتھ باتیں کیا کرتا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا تھا۔

اس کی اس لڑکی سے ایک بار بھی بات نہیں ہوئی تھی لیکن وہ اس کے خیالوں میں بس گئی تھی اور اس نے بڑی خاموشی کے ساتھ اس کے دل میں اپنا گھر بنا لیا تھا۔

پھر کلاسیں شروع ہو گئیں اور وہ لڑکی پابندی کے ساتھ کالج آنے لگی۔ گل زماں اس لڑکی کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ اس نے فرسٹ ایئر میں بیالوجی گروپ میں داخلہ لیا ہے۔

اگر وہ دونوں ہم جماعت ہوتے تو گل زماں کے لئے اس سے راہ و رسم پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ کسی بھی بہانے سے اس سے بات کر سکتا تھا لیکن وہ اس کی ہم جماعت نہیں تھی ان دونوں کے درمیان ابھی تک کوئی بھی چیز مشترک نہیں تھی وہ اس

لڑکی سے راہ و رسم بڑھانے کے لئے بے چین تھا لیکن اس کو کوئی طریقہ نظر نہیں آتا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کرے۔ کسی اور کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنا اور اس لڑکی کا تماشہ نہیں بنوانا چاہتا تھا اس کے دل میں اس انجانی لڑکی کے لئے محبت کے ساتھ ساتھ عزت کا جذبہ بھی موجود تھا بھلا ایسا کس طرح ہو سکتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا اور اس کی عزت نہ کرتا۔

ایک دن اس کو اس لڑکی کا نام معلوم ہو گیا اس کا نام شائلہ تھا اس کی ایک سہیلی نے اس کو اسی نام سے مخاطب کیا تھا۔ شائلہ۔

گل زماں نے جیسے ہی یہ نام سنا یہ لفظ اس کے دل پر نقش ہو گیا۔ شائلہ۔ اس وقت اس کے لئے ساری دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی دوسرا لفظ نہیں تھا۔ شائلہ .... اس ایک لفظ میں دنیا کا سارا حسن' ساری خوبصورتی' ساری لطافت سمائی ہوئی تھی۔

اسے اس لڑکی کا نام تو معلوم ہو گیا تھا لیکن اس سے زیادہ اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوا تھا اور وہ ابھی تک کوئی ایسا طریقہ تلاش نہیں کر سکا تھا جس کی مدد سے وہ اس کے بارے میں مزید کچھ جان سکتا۔

پھر اچانک ایک دن قسمت نے اس کی مدد کی اور مدد بھی ایسی کہ وہ خوشی کے مارے دیوانہ ہو گیا اس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی۔

اس روز اس نے شائلہ کو کالج کے چوکیدار سے باتیں کرتے سنا وہ چوکیدار سے ایک ٹیچر کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور انتہائی حیران کن بات یہ تھی کہ وہ پٹھان چوکیدار سے پشتو میں بات کر رہی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ اس کا تعلق پشتو بولنے والے خاندان سے تھا۔ وہ پٹھان تھی۔

گل زماں کا تعلق خود بھی پشتو بولنے والے خاندان سے تھا۔ اگرچہ اس نے بچپن سے ہی ہوش سنبھالتے ہی پشتو کے ساتھ ساتھ اردو بھی سیکھ لی تھی اور اب تو اردو اس طرح بولتا تھا جیسے یہی اس کی مادری زبان ہو تاہم اس کی مادری زبان پشتو ہی تھی اور وہ اور اس کی ماں ایک دوسرے سے پشتو زبان میں ہی گفتگو کرتے تھے۔

اس خوشگوار اتفاق نے گل زماں کو مبہوت کر کے رکھ دیا۔ شائلہ پشتو بول رہی تھی وہ اس کی ہم زبان تھی۔ قربت اور یگانگت کا ایک بہت زیادہ اہم اور طاقتور ذریعہ نکل آیا

تھا۔

چوکیدار کو اس ٹیچر کے بارے میں نہیں معلوم تھا اور وہ پشتو میں شائلہ کو بتانے لگا کہ اس نے آج اس ٹیچر کو نہیں دیکھا اور اسے نہیں معلوم کہ وہ ٹیچر کالج میں آیا ہے یا نہیں۔

چوکیدار کو کسی نے آواز دی اور وہ جلدی سے وہاں سے چلا گیا گل زماں تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے شائلہ کے قریب جا کر اس سے پشتو میں کہا کہ وہ ٹیچر آج کالج نہیں آیا تھا۔

شائلہ ایک دم پلٹ کر اس کو حیرت سے دیکھنے لگی حیرت کے ساتھ ہی اس کو خوشی بھی ہوئی جس کے آثار اس کے چہرے سے ظاہر تھے۔ اس لڑکے نے بڑے ہی دل نواز اور خوشگوار انداز میں اس سے پشتو میں بات کی تھی۔

اس طرح ان کے درمیان تعارف ہوا۔ دونوں کا تعلق پشتو بولنے والے خاندانوں سے تھا لیکن دونوں کی پرورش و پرداخت کراچی میں ہوئی تھی اور اس شہر میں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی دونوں پشتو کے علاوہ اردو بھی اپنی مادری زبان کی طرح بولتے تھے۔

اس تعارف کے وقت ہی دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔

"میں آپ سے دو سال سینئر ہوں۔" گل زماں نے اپنی آنکھوں میں بے پایاں مسرت' محبت اور یگانگت کو سمیٹتے ہوئے مسکراتے ہوئے شائلہ سے کہا۔ "اگر آپ کو کوئی پرابلم ہو کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو آپ بلا تکلف مجھ کو بتایئے گا مجھے آپ کی مدد کر کے بہت خوشی ہو گی۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" شائلہ نے اس کی مسکراہٹ کا جواب ایک نرم و لطیف مسکراہٹ سے دیتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے تو واقعی یہ خوشی کی بات ہے مجھے کسی سینئر کی مدد اور تعاون حاصل ہو رہا ہے میں تو یہاں بالکل نئی ہوں اور کسی کو جانتی بھی نہیں۔ بس کچھ لڑکیوں سے دوستی ہو گئی ہے جنہوں نے میرے ساتھ فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا ہے۔"

اس دن کے بعد سے گل زماں اور شائلہ کی دوستی میں اضافہ ہوتا گیا وہ دونوں کالج میں روز ملتے تھے اور ان کے درمیان کافی باتیں ہوتی تھیں دونوں ایک دوسرے کے زیادہ سے زیادہ قریب آتے جا رہے تھے۔

گل زماں نے شائلہ کی واقعی بہت مدد کی۔ شائلہ کو پڑھائی کے سلسلے میں جن جن

چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب گل زماں نے اس کو فراہم کیں دونوں کی دوستی رفتہ رفتہ ایک خاص رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی۔

اس طرح ایک سال کا عرصہ گزر گیا شمائلہ نے فرسٹ ایئر کا امتحان دیا اور گل زماں نے بی ایس سی پارٹ ون کا۔ دونوں کی تیاری بہت اچھی تھی اور دونوں ہی کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جائیں گے۔

امتحانات کے خاتمے کے ساتھ ہی کالج بھی بند ہو گیا ویسے تو کلاسیں امتحانات سے کچھ پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طور پر آنے جانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اور ان دونوں کی پہلے سے طے شدہ ملاقاتیں کالج میں ہوا کرتی تھیں اور اب وہ ایک لمبے عرصے کے لئے جدا ہو رہے تھے انہیں چھٹیوں کے بعد بھی دوبارہ اس وقت ملنا تھا جب کالج دوبارہ کھلتا۔

اس ایک سال کے عرصہ کے دوران ان کی دوستی بہت گہری ہو گئی تھی اور اگرچہ اس نے محبت کا رنگ اختیار کر لیا تھا لیکن ابھی تک دونوں میں سے کسی جانب سے بھی محبت کا باقاعدہ اظہار نہیں ہوا تھا۔

امتحانات ختم ہو چکے تھے اور اس سیشن کے دوران وہ کالج میں آخری بار مل رہے تھے۔

"اب تو چھٹیوں کے بعد ہی ملاقات ہو گی۔" گل زماں نے اداسی کے بعد کہا۔ "بڑا لمبا وقفہ آ جائے گا۔"

"ہاں۔" شمائلہ نے کہا۔ "اور ہم لوگ تو شاید کراچی میں رہیں گے بھی نہیں ممی کہہ رہی تھیں کہ شاید چھٹیوں میں لاہور چلے جائیں گے میرے چچا کے پاس۔"

"اوہ .... تو اس کا مطلب ہوا کہ چھٹیوں کے دوران ملاقات کی کوئی بھی صورت موجود نہیں ہے تم لوگ کراچی میں ہو گے ہی نہیں۔"

"ہاں گل زماں۔" شمائلہ نے کہا۔ "ہم لوگ کراچی میں نہیں رہیں گے۔ ابھی ٹھیک سے تو نہیں معلوم لیکن ممی کہہ رہی تھیں۔"

"تو پھر مجھ کو کیسے معلوم ہو گا؟" گل زماں نے پوچھا۔

"میں تم کو خط لکھ دوں گی۔" شمائلہ نے کہا۔ "اگر ہم لوگوں کا لاہور جانے کا پروگرام بن گیا تو میں تم کو تمہارے گھر کے پتے پر خط لکھ دوں گی جس میں' میں تم کو اپنے پروگرام

کی اطلاع دے دوں گی۔ تم اپنے گھر کا پتہ مجھے دے دو۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" گل زماں نے کہا۔ "میں تم کو اپنا پتہ دے دیتا ہوں۔ تم مجھ کو خط لکھ دینا اور اگر تم لوگوں کا لاہور جانے کا پروگرام نہ بنے تو پھر تم ملاقات کی کوئی سبیل نکالنا تم مجھے جہاں کہیں بھی بلاؤ گی جو جگہ بھی ملاقات کے لئے مناسب سمجھو گی میں وہاں آ جاؤں گا۔"

"اب تھوڑے دن صبر بھی کر لو نا۔" شمائلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جب کالج دوبارہ کھل جائے تب ملاقات کر لینا۔"

"کالج کھلنے میں ابھی بہت دن پڑے ہیں۔" گل زماں نے محبت آمیز ہنسی کے ساتھ کہا۔ "اتنے دن تک انتظار کون کرے گا۔ کم از کم ایک بار تو ملاقات ہونی ہی چاہئے۔"

"انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔" شمائلہ نے اٹھلا کر کہا۔ "جس کو ملاقات کی غرض ہو گی وہ انتظار کرے گا۔" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

گل زماں کو ایسا لگا جیسے ساری کائنات میں روشنیاں ہی روشنیاں بکھر گئی ہوں ہر چیز اس قدر خوبصورت اس قدر دلفریب تھی کہ اس سے زیادہ حسن و دلربائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وہ دونوں جب ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو ایک دوسرے کی محبت کے نشے میں پوری طرح سرشار تھے جو کچھ آج تک ان کی زبانوں نے نہیں کیا تھا وہ اتنا ہی ظاہر اور قابل فہم اور حقیقی تھا جتنے کہ خود ان کے اپنے وجود۔

تین دن کے بعد ہی گل زماں نے شمائلہ کے خط کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی کسی کے خط کا انتظار نہیں کیا تھا کیونکہ اس کو خط لکھنے والا کوئی نہیں تھا کسی کے ساتھ اس کی خط و کتابت نہیں ہوتی تھی اور اسے تو صحیح طور سے ڈاکئے کی آمد کا وقت بھی نہیں معلوم تھا اور روزانہ اس وقت وہ گھر پر موجود رہتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا خط اس کی ماں کے ہاتھ لگے اس کی ماں اردو لکھنا پڑھنا جانتی تھی اس کا خط پڑھ سکتی تھی۔

کوئی ایک ہفتے کے بعد اس کو شمائلہ کا خط موصول ہوا خط اس نے ڈاکئے سے خود ہی وصول کیا تھا اور اس طرح اس کی ماں کو اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔

اس نے مرتعش ہاتھوں سے بصد شوق شمائلہ کا خط کھولا اس کے اور شمائلہ کے

درمیان آج تک کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی تھی یہ پہلی بار تھا کہ شائلہ نے اس کو خط لکھا تھا۔

"ڈیئر گل زماں........." شائلہ نے اردو میں لکھے ہوئے اپنے خط کا آغاز ان الفاظ سے کیا تھا اور گل زماں کی نظریں بہت دیر تک ان الفاظ سے الجھتی رہیں اگرچہ کسی کو خط لکھتے وقت لفظ ڈیئر کا لفظ ایک عام' کاروباری سی بات تھی لیکن گل زماں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ لفظ صرف اسی کے لئے ایجاد ہوا ہے صرف اس لئے ایجاد ہوا کہ شائلہ اس کو اس لفظ سے یاد کرے۔ "ڈیئر" کتنی مٹھاس .... کتنی اپنائیت کس درجہ یگانگت تھی اس لفظ میں آج دنیا میں اس سے زیادہ حسین اور پُراثر کوئی دوسرا لفظ نہیں تھا۔

خط میں آگے جو مضمون تھا وہ کوئی مسرت انگیز نہیں تھا۔ شائلہ نے اس کو اطلاع دی تھی کہ اس کی امی نے چھٹیوں کے دوران اس کے چچا کے پاس لاہور جانے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ لوگ دو چار دن میں لاہور کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ اب ان کی ملاقات کالج کھلنے پر ہی ہو سکے گی۔

"ہم لوگ پوری چھٹیاں وہیں گزاریں گے۔" شائلہ نے اس کو اطلاع دی۔ "اور کالج کھلنے سے چند روز پہلے واپس کراچی آئیں گے۔"

خط کا سارا مضمون بالکل سیدھا سادا اور کاروباری انداز کا تھا اس کو کسی بھی اعتبار سے کوئی محبت نامہ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن گل زماں کے لئے اس خط کا ایک ایک لفظ محبت کی ایک پوری دنیا کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ محبت محبت' محبت اور صرف محبت۔

اس نے ایک بالکل سیدھے سادے اور عام سے خط کو نہ جانے کتنی بار پڑھا ہر بار جب وہ اس کو پڑھتا تھا تو اس کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ پہلی بار اس کو پڑھ رہا ہو اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھتے وقت اسے ایک نئی مسرت کا احساس ہوتا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کو اس مختصر سے خط کا ایک ایک جملہ ایک ایک لفظ زبانی یاد ہو گیا۔

کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا اور بہت کچھ بھی تھا۔ کتنے بہت سارے کام تھے جو ادھورے پڑے ہوئے تھے اور کتنے بہت سارے کام تھے جن کو انجام دینا تھا۔ آدمی خود کو مصروف رکھنا چاہے تو مصروفیات کا سلسلہ تو بہت دراز ہو سکتا ہے۔ گل زماں نے بھی طرح طرح سے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کی اور شائلہ کی یاد کے سہارے چھٹیوں کے دن کاٹ دیئے۔

رزلٹ آ گیا تھا اس کا بھی اور شائلہ کا بھی اسے شائلہ کا رول نمبر معلوم تھا شائلہ پاس ہو گئی تھی اور وہ خود بھی پاس ہو گیا تھا اور جہاں تک ڈویژن کا تعلق تھا تو وہ تو اگلے سال ہی ملتی مارکس شیٹ آنے پر نمبروں کا پتہ چل سکتا تھا۔

کالج دوبارہ کھل گئے اور شائلہ واپس آ گئی تھی پہلے ہی دن دونوں کالج میں موجود تھے دونوں نے خاصے دنوں کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں ہی ایک دوسرے کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ اچھے لگے۔

اگرچہ کلاسیں شروع ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے اور ابھی تو داخلے ہی ہو رہے تھے تاہم وہ دونوں ہر دوسرے تیسرے دن کالج آیا کرتے تھے اور ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے مگر وہ دونوں اس بات کی خاص طور سے احتیاط کرتے تھے کہ زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ نہ رہیں۔ گل زماں خود کو اور شائلہ کو بدنامی سے بچانے کی پوری کوشش کرتا تھا لیکن پھر بھی بہت سے لوگوں کو ان کی اس بڑھتی ہوئی اور قریبی دوستی کا علم تھا کچھ لوگ اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔

داخلے ختم ہو گئے اور کلاسیں شروع ہو گئیں شائلہ سیکنڈ ایئر میں اور گل زماں بی ایس سی پارٹ ٹو میں آ چکا تھا۔ گل زماں کو اس کالج میں اب بس ایک سال اور گزارنا تھا اور اس کے بعد اس کو یونیورسٹی چلا جانا تھا۔

گل زماں اور شائلہ کی دوستی محبت کا رنگ اختیار کر کے اب اس منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں وہ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے عہد و پیمان کر چکے تھے انہوں نے ایک دوسرے کو اپنے رازوں میں شریک کر لیا تھا اور اب وہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونا چاہتے تھے۔

اس روز پہلی بار شائلہ نے گل زماں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی اس نے گل زماں کو بتایا کہ اگرچہ اس کی ماں تعلیم یافتہ نہیں ہے اور اس کی عمر کا بڑا حصہ گاؤں کی پسماندہ فضاؤں میں گزرا ہے لیکن وہ ایک روشن خیال عورت ہے اور قدامت پرست نہیں ہے۔

"میں نے ایک بار ممی سے تمہارا ذکر بھی کیا ہے۔" شائلہ نے اس سے کہا۔ "اور اگر میں ممی سے کہوں گی کہ میں کسی دن تم کو اپنے گھر بلانا چاہتی ہوں تو وہ بُرا نہیں مانیں گی۔ میں اپنی سہیلیوں کو تو اکثر اپنے گھر بلایا کرتی ہوں لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم کو بھی

ان کے ساتھ بلاؤں میں تم کو الگ سے بلانا چاہتی ہوں۔"

"میں تو بڑی خوشی سے آنے کے لئے تیار ہوں۔" گل زماں نے کہا۔ "جب اور جس دن تم کہو گی میں آ جاؤں گا۔"

"میرے ماموں بھی گھر پر ہوں گے ان سے ملاقات کرنا۔"

شمائلہ نے گل زماں کو بتایا تھا کہ وہ اور اس کی ماں شمائلہ کے ماموں کے ساتھ رہتی ہیں اور یہ کہ اس کے باپ کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا۔

اس روز شام کو گل زماں پہلی بار شمائلہ کے گھر گیا اس نے اپنی امی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی وہ اس کو بتانا چاہتا تھا اس کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اگر وہ اپنی ماں کو یہ سب کچھ بتائے گا تو وہ اس کو کبھی بھی پسند نہیں کرے گی اور اس کی مخالفت کرے گی اور اگر اس کی ماں اس کو وہاں جانے سے روک دیتی تو پھر اس کے لئے یہ مشکل ہوتا کہ وہ ماں کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہاں جاتا اس لئے اس نے اپنی ماں کو کچھ بھی نہیں بتایا اس نے تو اس سے کبھی اس بات کا ذکر بھی نہیں کیا تھا وہ شمائلہ نامی کسی لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہے۔

گل زماں شمائلہ کے گھر گیا اور اس وقت وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا خوش نصیب انسان سمجھ رہا تھا۔ اسے شمائلہ کے گھر آنے کا اور اس کے گھر والوں سے متعارف ہونے اور ملاقات کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

اس وقت شمائلہ کے گھر میں اس کی ماں کے علاوہ اس کا ماموں بھی موجود تھا اور ان دونوں نے اس سے ملاقات کی ان چاروں کے درمیان پشتو میں ہی گفتگو ہو رہی تھی شمائلہ اور گل زماں کے درمیان کالج میں جو بھی گفتگو ہوتی تھی وہ پشتو میں ہی ہوتی تھی البتہ دوسرے لوگوں کے سامنے وہ اردو ہی بولتے تھے۔

"تم شمائلہ سے دو سال آگے ہو۔" شمائلہ کی ماں نے کہا۔ "شمائلہ تمہاری بہت تعریف کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تم نے کالج میں اس کی بہت مدد کی ہے۔ وہ تو وہاں کسی کو بھی نہیں جانتی تھی۔"

"جی آنٹی۔" گل زماں نے کہا۔ "مجھے شمائلہ کی مدد کر کے بہت خوشی ہوئی اور میں نے تو کوئی خاص مدد بھی نہیں کی بس جو تھوڑا بہت مجھ سے ہو سکتا تھا..........."

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو شمائلہ کی ماں نے اس سے پوچھا کہ وہ صوبہ سرحد کے

کس علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔

"کوئی گاؤں ہے پشاور سے کافی دور بلند پہاڑیوں میں گھرا ہوا۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا نام ہے اس گاؤں کا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" گل زماں نے جواب دیا۔ "میں وہاں کبھی نہیں گیا اور میں نے اس گاؤں کو کبھی نہیں دیکھا میں تو کراچی میں ہی پیدا ہوا تھا اور میری اب تک کی ساری زندگی اسی شہر میں گزری ہے میرے والد صاحب کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور میری پرورش میری والدہ نے کی ہے۔"

"بڑی ہمت کی بات ہے۔" شمائلہ کی ماں نے کہا۔ "شوہر کی موت کے بعد تنہا ماں کے لئے بچے پالنا ایک بہت دشوار کام ہوتا ہے۔ شمائلہ کے باپ کا بھی اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا خدا سلامت رکھے میرے بھائی کو۔" اس نے نظریں اٹھا کر اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ "انہوں نے اور میرے شوہر کے بھائیوں نے مجھے بہت سہارا دیا۔ مجھے بھی اور شمائلہ کو بھی۔"

"رشتے داروں کو مشکل وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہئے۔" گل زماں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں بیٹا۔" شمائلہ کی امی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "مگر سارے رشتے دار تو ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

باتوں کے سلسلے نے دوسری سمت اختیار کر لی وہ لوگ یہ جاننا چاہتے تھے کہ گل زماں مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے بی ایس سی کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا اور کون سا پیشہ اختیار کرے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایسا نہیں تھا کہ گل زماں کو اپنے گاؤں کا نام نہیں معلوم تھا بابر خیل کا نام تو وہ اس وقت سے سنتا چلا آ رہا تھا جب اس نے ہوش سنبھالا تھا یہ تو وہ نام تھا جس کو اس کی ماں نے بچپن سے ہی اس کے دماغ میں اچھی طرح بٹھا دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے گاؤں کا نام بھی ڈیرہ امین گل۔

گل زماں بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بابر خیل کا رہنے والا ہے اور اس کو اپنے ان سارے قریبی رشتے داروں کے نام معلوم تھے جو بابر خیل میں رہتے تھے اور اس کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ اس کا مقتول باپ ڈیرہ امین گل کا رہنے والا تھا اس کو یہ بھی معلوم

تھا کہ اس کے باپ کا قاتل امیر خان جو اس کی ماں کا سگا چچا زاد تھا بابر خیل کا رہنے والا تھا اسے سب کچھ معلوم تھا۔ یہ ساری وہ کہانیاں تھیں جو اس کی ماں اس کو بچپن سے سناتی چلی آئی تھی ایک ایک بات کے بارے میں اس کو بار بار یاد دلاتی رہتی تھی۔

اور یہ سب کچھ اتنا ہولناک تھا کہ گل زماں کسی کو بھی اس بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا اور خاص طور سے شمائلہ کے گھر والوں کو تو وہ یہ بات ہرگز نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اسے کسی آدمی کو قتل بھی کرنا ہے۔ اس لئے اس نے شمائلہ کے گھر والوں کو اپنے گاؤں وغیرہ کا نام نہیں بتایا تھا۔ وہ اپنی اس شناخت کو جو اس کے مقتول باپ اور قاتل ماموں کے حوالے سے تھی، چھپانا چاہتا تھا اس نے کبھی کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے باپ کو قتل کیا گیا تھا اور یہ کہ اس کے باپ کے قاتل کو چودہ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔

گل زماں اس شام کافی دیر تک شمائلہ کے گھر والوں کے ساتھ رہا اور ان لوگوں سے بہت ساری باتیں کرتا رہا۔

شمائلہ کی ماں اور اس کے ماموں کے سامنے شمائلہ کی شادی کا مسئلہ ایک خصوصی اہمیت کا حامل تھا اتفاق سے ان کے اپنے خاندان میں شمائلہ کے لائق کوئی لڑکا موجود نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ خاندان میں لڑکے موجود ہی نہیں تھے لڑکے تھے اور شمائلہ کے جوڑ کے بھی تھے لیکن وہ زیادہ تر اَن پڑھ تھے اور جو کوئی کچھ پڑھا لکھا تھا بھی تو اس نے چند جماعتوں سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی جبکہ شمائلہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی اور وہ آگے بھی مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ شمائلہ کی ماں کی نظریں ایسے پشتو بولنے والے نوجوان کی تلاش میں رہتی تھیں جو تعلیم یافتہ ہو اور جس کے ساتھ شمائلہ خوش رہ سکے۔ نفسیاتی طور پر شمائلہ کسی ایسے مرد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی تھی جو علم اور تعلیم میں اس سے بہت کم ہو تھوڑا بہت فرق تو چل سکتا تھا لیکن اتنا زیادہ فرق بھی نہیں چل سکتا تھا جتنا کہ شمائلہ اور خاندان کے ان لڑکوں کے درمیان تھا جو شمائلہ کے جوڑ کے تھے۔

شمائلہ کی ماں بہت عرصہ پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ اس کو شمائلہ کی شادی خاندان سے باہر کہیں کرنی ہوگی اور اس خیال کے تحت وہ کراچی میں جہاں کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھی ایسے پشتون نوجوانوں کو نظر میں رکھنے کی کوشش کرتی تھی جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اس تلاش و جستجو میں اس کا بھائی بھی شریک تھا۔

اس لئے جب شمائلہ نے اس کو یہ بتایا کہ اس کے کالج میں گل زماں نامی ایک پٹھان

لڑکا ہے جس نے اس کی کالج کے معاملات میں بہت مدد کی ہے اور جو برابر اس کی مدد کرتا رہتا ہے اور وہ کسی دن اس کو گھر بلانا چاہتی ہے تو اس نے بڑی خوشی سے شمائلہ کو اس کی اجازت دے دی۔ وہ اس پشتون نوجوان سے ملنا چاہتی تھی ان کے گھر اور خاندان کے بارے میں جاننا چاہتی تھی اس لئے اپنے بھائی کو بھی اس کے متعلق بتایا اور اس نے اس لڑکے کو کسی دن گھر بلا لے۔

مگر گل زماں تو اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکا۔ اسے تو اپنے گاؤں کا نام بھی معلوم نہیں تھا وہ وہاں کبھی نہیں گیا تھا وہ تو کراچی میں پیدا ہوا تھا اور اس کی اب تک کی ساری زندگی کراچی میں ہی گزری تھی۔ شمائلہ کی ماں اس سے اس کے بارے میں کوئی بھی خاص بات معلوم نہیں کر سکی۔

"تم کسی دن اپنی ماں کو لے کر آؤ۔" شمائلہ کی ماں نے گل زماں سے کہا۔ "ہم لوگوں کو ان سے مل کر خوشی ہوگی۔"

"جی آنٹی میں کسی دن ان کو ضرور لاؤں گا۔" اس نے کہا۔

لیکن وہ ابھی اپنی ماں کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا اور نہ ہی اسے وہاں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی ماں ابھی اس کی اس قسم کی سرگرمیوں کی حمایت نہ کرتی یہ بات اس کو اچھی طرح معلوم تھی اس کی ماں کے تو خواب ہی کچھ اور تھے .... اور یہ خواب گل زماں کے اپنے خوابوں سے بالکل مختلف تھے۔

گل زماں کو شمائلہ کے گھر گئے ہوئے کافی دن گزر گئے تھے ایک روز شمائلہ نے اس سے کہا کہ اس کی امی نے کہلوایا ہے کہ وہ کسی دن اپنی امی کو ان سے ملوانے کے لئے لائے۔ گل زماں نے کہا کہ وہ کسی دن اپنی امی کو لے کر آئے گا۔ گل زماں اب خود وہاں اکیلا نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ شمائلہ کی ماں اس سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھتی اور گل زماں نے اس بارے میں اپنی ماں کو ابھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

وہ شمائلہ کے گھر جانا چاہتا تھا لیکن اب مشکل یہ آن پڑی تھی کہ وہ کم از کم ایک بار تو اپنی امی کو لے کر اس کے گھر جاتا اور اس کی ماں سے اس کی ملاقات کرواتا۔ اس کے بغیر جانا مشکل تھا جبکہ شمائلہ نے ایک بار پھر اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو لے کر اس کے گھر آئے لیکن گل زماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کس طرح کرے۔

انہی دنوں شمائلہ کی ماں کی طبیعت خراب ہوگئی اور شمائلہ نے باتوں ہی باتوں میں گل

زماں کو بتایا کہ اس کی ماں کی طبیعت خراب ہے۔

"میری طرف سے ان کو بہت بہت پوچھ لینا۔" گل زماں نے کہا۔

"کیوں؟ میں کیوں پوچھوں؟" شائلہ نے عشوہ طرازی کے ساتھ کہا۔ "تم خود پوچھ لو جا کر۔ تمہارے پیروں میں کیا مہندی لگی ہوئی ہے؟"

"اچھا بھئی اچھا۔" گل زماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں خود ہی آ کر پوچھ لوں گا۔"

اس دن اچانک اس کے ذہن میں ایک بات آئی شائلہ کی ماں بیمار تھی وہ اپنی ماں کو یہ کہہ کر لا سکتا تھا کہ اس کے کالج کی ایک پشتون لڑکی کی ماں بیمار ہے اور وہ اپنی ماں کو ساتھ لے کر اس کی عیادت کو جانا چاہتا ہے۔ اب آخر ایک بار تو ماں کو وہاں لے جانا ہی تھا کسی نہ کسی دن کسی نہ کسی وقت ایک بار تو لے جانا ہی تھا تو پھر ابھی کیوں نہیں .... اس نے یہ فیصلہ کر ہی ڈالا کہ وہ اپنی ماں کو شائلہ کے گھر لے جائے گا۔

اس نے اس روز اپنی ماں سے کہا کہ اس کے کالج میں ایک پشتون لڑکی پڑھتی ہے جو اس سے دو سال جونیئر ہے اور جب اس لڑکی نے کالج میں داخلہ لیا تھا تو اس نے اس لڑکی کی کالج میں بہت مدد کی تھی اور ایک بار وہ اس کے گھر بھی گیا تھا۔

"اس لڑکی کی ماں بیمار ہے۔" گل زماں نے اپنی ماں سے کہا۔ "میں اس کی عیادت کے لئے جانا چاہتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔"

"مگر .... مگر میں تو ان لوگوں کو نہیں جانتی۔" اس کی ماں نے چونک کر کہا۔ "اور کون ہے وہ پشتون لڑکی؟ تم نے اس کا پہلے تو کبھی تذکرہ نہیں کیا۔"

"اس کا نام شائلہ ہے امی۔" گل زماں نے کہا۔ "اور وہ ہمارے کالج کی گنی چنی پشتون لڑکیوں میں سے ایک ہے۔ پڑھنے لکھنے کی بہت شوقین ہے اور میں نے اس کی بہت مدد کی تھی اگر آپ اس کی ماں کی عیادت کے لئے چلیں تو بہت اچھا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔" زرینہ نے کہا۔ "میں چلی چلوں گی اور تم وہاں کب گئے تھے؟ تم نے کبھی تذکرہ نہیں کیا۔"

"ایک دن ذرا سی دیر کے لئے گیا تھا امی۔" گل زماں نے کہا۔ اور پھر فوراً ہی اس نے بات بدل دی۔ "اس لڑکی کی ماں بہت اچھی عورت ہے امی۔ میں صرف ایک بار ذرا سی دیر کے لئے اس سے ملا ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" زرینہ نے کہا۔ "تم کہتے ہو تو میں تمہارے ساتھ چلی چلوں گی۔"

"اچھا امی، مگر ذرا ایک بات کا خیال رکھئے گا۔" اس نے کہا۔ "میں نے وہاں کسی کو بھی نہیں بتایا کہ میرے والد کو قتل کیا گیا تھا .... اگر یہ بتاؤں تو پھر لوگ طرح طرح کے سوالات پوچھنے لگتے ہیں اور ہر ایک کو اپنے قصے سنانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو بس یہی کہہ دیتا ہوں کہ میرے والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اور یہی میں نے شائلہ اور اس کی ماں سے بھی کہا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" زرینہ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "ساری دنیا میں اپنے معاملات کا ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔"

گل زماں بہت ہی خوش اور مطمئن ہوا اس کا خیال تھا کہ اس کی ماں اس معاملے میں اس کے ساتھ بہت جرح کرے گی اور اس بات کو بالکل پسند نہیں کرے گی کہ وہ اپنے کالج کی کسی لڑکی کے گھر گیا تھا لیکن اس کی ماں نے اس سے زیادہ حیل و حجت نہیں کی اور اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنی درخواست کو اپنی ماں کے سامنے رکھا تھا۔

اگلے دن اس نے کالج میں شائلہ کو یہ مسرت آمیز اطلاع دی کہ وہ اپنی ماں کو لے کر اس کے گھر آنے والا ہے اس کی ماں کی عیادت کے لئے۔ تو شائلہ نے بھی بہت خوشی کا اظہار کیا۔

"میں دراصل اس معاملے میں بڑے تذبذب کا شکار تھا۔" اس نے شائلہ سے کہا۔ "امی خاصے پرانے خیالات کی حامل ہیں اور میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ میری اس بات کو پسند کرتیں یا نہیں کرتیں کہ میں ایک لڑکی کے گھر گیا تھا۔ میں نے ان کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"تو اب بتانا تو پڑے گا۔" شائلہ نے مسکرا کر کہا۔ "آخر ایک نہ ایک دن تو ان کو سب کچھ بتانا پڑے گا۔"

"ہاں............" گل زماں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "بتانا تو ہو گا اور اس لئے میں نے اس کی ابتدائی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ پہلے ان کو تمہارے گھر لے آؤں گا پھر آہستہ آہستہ ان کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

"معلوم نہیں تمہاری امی .... میرا مطلب ہے تیار بھی ہوں گی یا نہیں۔" شمائلہ نے کہا۔

ایک انجانے خوف سے گل زماں کا دل لرز اٹھا شمائلہ نے کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں کہی تھی تاہم شمائلہ کے سامنے اس چیز کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"انہیں تو اس کو اپنی اور اپنے بیٹے کی خوش نصیبی سمجھ کر تیار ہو جانا چاہئے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھلا ان کو اس سے زیادہ اچھی بہو اور ان کے بیٹے کو اس سے زیادہ اچھی بیوی اور کہاں مل سکے گی؟"

شمائلہ صرف دھیرے سے مسکرا دی۔ اور گل زماں نے یہ الفاظ کہہ تو دیئے تھے لیکن یہ سب کچھ کہتے وقت اس کا دل اندر سے کانپ اٹھا تھا خدا جانے آگے کیا ہونے والا تھا کون جانے اس کے مقدر میں کیا لکھا تھا۔ ابھی تو اس کو نہ جانے کیسی کیسی خوفناک آزمائشوں سے گزرنا تھا۔ بہرحال شمائلہ سے یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"ویسے امی کی طبیعت پہلے کے مقابلے میں ٹھیک ہے۔" شمائلہ نے کہا۔ "لیکن چلو اس بہانے تم اپنی امی کو ہمارے گھر لے تو آؤ ان دونوں کے درمیان بات ہو جائے گی تو اچھا ہی رہے گا۔"

"ہاں۔ میں آج ہی شام کو ان کو لے کر تمہارے گھر آؤں گا۔" گل زماں نے کہا۔

اس روز کالج سے آنے کے بعد گل زماں نے اپنی ماں کو بتا دیا کہ آج شام کو شمائلہ کے گھر چلنا ہے شمائلہ کی ماں کو دیکھنے کے لئے۔

"ہاں چلوں گی۔" زرینہ نے کہا۔

شام کو گل زماں اپنی ماں کو ساتھ لے کر شمائلہ کے گھر کے لئے روانہ ہوا۔

اس وقت ان تمام خطرات و خدشات کے باوجود جن کا شکار وہ اپنے آپ کو پاتا تھا' وہ بے پایاں مسرت محسوس کر رہا تھا اگرچہ یہ محض ایک رسمی سی عام سی ملاقات ہونی تھی اور اس میں کوئی خاص بات نہیں ہونی تھی پھر بھی وہ اپنی ماں کو لے کر شمائلہ کے گھر جا رہا تھا شمائلہ کی ماں اور اس کے ماموں سے ملاقات کروانے کے لئے۔

اسے خود تو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ شمائلہ کے خاندان کا صوبہ سرحد کے کس علاقے سے تعلق ہے اور وہ لوگ کس قبیلے یا کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور کس گاؤں یا شہر کے رہنے والے ہیں اور نہ ہی اس نے شمائلہ سے کبھی اس بارے میں

تفصیلات پوچھی تھیں بلکہ اس کا اندازہ تو یہ تھا کہ شمائلہ خود بھی اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کے خاندانی معاملات کے بارے میں گل زماں کو بس اتنا ہی معلوم تھا کہ اس کے باپ کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بعد اس کی ماں نے کبھی دوسری شادی نہیں کی اور وہ اپنے بچوں کی پرورش میں لگی رہی اس کے اپنے بڑے بھائی نے اور اس کے شوہر کے بھائیوں نے اس کی بہت مدد کی اور خاص طور سے اس کے بھائی نے تو اس کا بہت خیال رکھا۔

گل زماں کو اس سے زیادہ مزید کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ شمائلہ جو بھی تھی' جس خاندان سے بھی تھی جن والدین کی بھی اولاد تھی اس کو عزیز تھی' ہر حال میں عزیز تھی' اور ساری دنیا میں اس کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ اسے صرف شمائلہ سے غرض تھی' اس کے خاندان سے نہیں۔

شمائلہ کا گھر آ گیا گل زماں اور اس کی ماں دونوں اس کے گھر کے دروازے پر موجود تھے۔ گل زماں کی دستک کے جواب میں شمائلہ نے دروازہ کھولا اور مہمانوں کو باعزت طور پر اندر بلایا۔

زرینہ نے اس نوجوان اور حسین لڑکی کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے غور سے دیکھا نہ جانے کیوں اس کے دماغ میں یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ شکل کچھ جانی پہچانی سی ہے اس نے اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے اور وہ اسے جانتی ہے لیکن کہاں دیکھا ہے' کب دیکھا ہے' اسے ہزار کوشش کے باوجود نہیں یاد آ رہا تھا اس لڑکی کے چہرے کے خد و خال اس کے لئے پورے طور پر اجنبی نہیں تھے لیکن اس نے اس کو کہاں دیکھا تھا؟

"آپ لوگ تشریف رکھئے۔" شمائلہ نے مہمانوں سے کہا۔ "میں امی کو ابھی بلاتی ہوں۔ ماموں بھی گھر پر موجود ہیں وہ بھی آپ سے ملنے کے بہت خواہش مند تھے۔"

"تم اپنی امی کو کیوں تکلیف دے رہی ہو۔" زرینہ نے شمائلہ سے نرم لہجہ میں کہا۔ "وہ تو بیمار ہیں۔ ان کو آرام کرنے دو میں خود ان کے پاس چلی چلتی ہوں۔"

"نہیں آنٹی! آپ بیٹھئے۔" شمائلہ نے اپنی نرم و شیریں آواز میں کہا۔ "امی ابھی آ رہی ہیں میں ان کو آپ لوگوں کے بارے میں بتا دیتی ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

کراچی میں کئی پشتون گھرانوں سے زرینہ کے تعلقات تھے اور زرینہ دل ہی دل میں

ان سب کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس نے اس لڑکی کو کس گھر میں دیکھا ہے لیکن وہ یاد نہیں آ پا رہی تھی۔

اس نے سوچا کہ ابھی شائلہ واپس آئے گی تو وہ اس سے پوچھے گی کہ آیا وہ اس سے پہلے کہیں اس سے ملی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے اسے یاد آ جائے۔ اس نے دل میں سوچا۔

کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا اور شائلہ ایک آدمی اور ایک عورت کے ساتھ کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

"یہ میری امی ہیں۔" شائلہ نے مسکراتے ہوئے، پُرمسرت لہجہ میں اس عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اس کے ساتھ تھی۔ "اور یہ میرے ماموں ہیں۔" اس نے مرد کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ گل زماں کی امی ہیں۔" اس نے اپنی ماں اور ماموں کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن ان تینوں افراد نے جن کا اس نے ایک دوسرے سے تعارف کروایا تھا ذرا بھی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا ان تینوں میں سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھا نہ تو اس کی اپنی ماں آگے بڑھی اور نہ گل زماں کی ماں، وہ دونوں بالکل خاموش کھڑی رہیں اور یہی حال شائلہ کے ماموں کا تھا۔

وہ تینوں اپنی اپنی جگہوں پر جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔ ایک دم منجمد۔ زمین نے جیسے ان کے قدم پکڑ لئے تھے۔

شائلہ اور گل زماں دونوں حیرت سے ان تینوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے لئے ان کا یہ ردِعمل قطعی طور پر غیر متوقع تھا ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان کے بزرگ ایک دوسرے کو دیکھ کر اس قدر حیرت زدہ کیوں ہو گئے ہیں۔

"تم .... تم .... شاہدہ ہو نا؟" اچانک زرینہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"امیر خان کی بہن .... اور یہ .... یہ امیر خان ہے؟" اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلی سے شائلہ کے ماموں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں............" شاہدہ نے کمزور اور دھیمی آواز میں کہا۔ "میں شاہدہ ہوں اور یہ امیر خان .... اور تم .... زرینہ ہو، زرینہ ہو نا؟"

"ہاں، میں زرینہ ہوں۔" زرینہ نے کہا۔ "اور گل زماں میرا بیٹا ہے۔ خیر زماں کا بیٹا

.... اور شائلہ تمہاری بیٹی ہے؟"

"ہاں۔" شاہدہ نے بہت آہستہ سے کہا۔ "شائلہ میری بیٹی ہے۔ پرانی باتیں بھول جاؤ زرینہ۔"

"ہاں زرینہ بہن۔" امیر خان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جو ہوا سو ہو گیا اب ہم سب کو ایک بار پھر ایک ہو جانا چاہئے میں تم سے معافی کا طلبگار ہوں۔"

"چلو بیٹا، یہاں سے باہر نکلو۔" اچانک زرینہ نے گل زماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "یہ قاتلوں کا گھر ہے، ہم یہاں ایک منٹ کے لئے بھی نہیں رک سکتے۔"

"مگر امی .... یہ شائلہ کا گھر ہے............" گل زماں نے کمزور سا احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارے باپ کے قاتلوں کا گھر ہے۔" زرینہ نے غم و غصے اور قہر و غضب کے عالم میں پھنکارتے ہوئے کہا۔ "یہاں خون کی بو بسی ہوئی ہے، نکلو یہاں سے۔"

زرینہ کو اب یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس نے شائلہ کو کہاں دیکھا ہے سب کچھ واضح تھا شائلہ کی صورت میں اس کے سامنے شاہدہ کا عکس تھا۔

گل زماں ایک لمحے کے اندر اندر سب کچھ سمجھ گیا تھا اسے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی امیر خان کا نام تو وہ اس وقت سے سن رہا تھا جب اس نے سننا اور سمجھنا سیکھا تھا امیر خان .... اس کے باپ کا قاتل .... احمد خان کا بیٹا .... زرینہ کا سگا چچا زاد بھائی جو زرینہ اور اس کے شوہر کو قتل کرنے کے لئے خاص طور سے صوبہ سرحد کے ایک دور دراز پہاڑی گاؤں سے کراچی آیا تھا اور پھر پی آئی بی کالونی کے اس کوارٹر میں گھس کر اس نے خیر زماں اور زرینہ دونوں کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ خیر زماں تو اسی وقت مر گیا تھا لیکن زرینہ صرف زخمی ہوئی تھی اور وہ زندہ بچ گئی تھی اور ساتھ ہی امیر خان پکڑا گیا تھا اور اسے چودہ سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی تھی۔

یہ سب کچھ گل زماں کو معلوم تھا۔ ایک ایک بات اس کو معلوم تھی ان سارے لوگوں کے نام اچھی طرح معلوم تھے جن کا ان واقعات سے تعلق تھا اسے سب کچھ معلوم تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے اس آدمی کو قتل کرنا ہے جس نے اس کے باپ کو قتل کیا تھا۔

اور اب یکایک اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ اسے شائلہ کے ماموں کو قتل کرنا ہے۔

اسے شمائلہ کی ماں کے سگے بھائی کو قتل کرنا ہے جس نے اپنی بیوہ بہن کی سرپرستی کی تھی جس نے اس کو سہارا دیا تھا اور جس کا شمائلہ کی پرورش و پرداخت میں بڑا حصہ تھا۔

کیا وہ اس شخص کو قتل کر سکتا تھا؟ کیا وہ شمائلہ کے ماموں کو قتل کر سکتا تھا جس کی نظروں میں اس نے اپنے لئے بے پایاں محبت اور پسندیدگی کے جذبات کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا تھا؟

☆======☆======☆

امیر خان جیل میں اپنی سزا کے چار سال پورے کر چکا تھا جب اچانک اس کے بہنوئی منیر خان کی حادثاتی موت واقع ہو گئی اور شاہدہ بیوہ ہو گئی۔ امیر خان کو جب اس سانحے کی اطلاع ملی تو اس کے درد و غم کا ٹھکانہ نہ رہا اس کی اکلوتی بہن بیوہ ہو گئی تھی اور اس کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا وہ اس کی بھلا کیا مدد کر سکتا تھا؟

اس سانحے کے بعد اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ شاہدہ اس کو بہت عزیز تھی اور اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی جلدی بیوہ ہو جائے گی ابھی اس بے چاری کی عمر ہی کیا تھی۔

اور ابھی امیر خان کی رہائی میں تو خاصی دیر تھی ابھی تو اس نے صرف چار سال ہی کی قید کاٹی تھی۔ ابھی تو کافی لمبے عرصے تک جیل میں رہنا تھا۔

امیر خان کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اپنی بہن کی بیوگی کی ذمہ داری بڑی حد تک خود اس کے اپنے اوپر عائد ہوتی ہے۔ شاہدہ اور منیر خان اس سے ملنے کے لئے تو کراچی آئے تھے' ورنہ ان کو بھلا کراچی آنے کی کیا ضرورت تھی؟ منیر خان کا کراچی میں تو کوئی کام نہیں تھا۔

منیر خان مرحوم کے دو بھائی تھے دونوں اپنے گاؤں میں ہی رہتے تھے مشترکہ خاندان تھا منیر خان اپنے دونوں بھائیوں سے بڑا تھا وزیر خان' منیر خان سے چھوٹا تھا اور بشیر خان وزیر خان سے چھوٹا۔

منیر خان کی موت کے وقت اس کا بیٹا سعد اللہ تو کوئی تین سال کا تھا اور اس کی بیٹی شمائلہ صرف چھ ماہ کی تھی دونوں بچے بالکل کم سنی میں ہی باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے تھے۔

منیر خان کے والد کا تو بہت عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا البتہ اس کی ماں زندہ تھی اور منیر خان کو اپنے خاندان میں سربراہ کی حیثیت حاصل تھی کیونکہ وہی بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔

منیر خان کی موت کے بعد اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں نے اپنی بڑی بھابی اور اس کے بچوں کو سہارا دیا اور ان کا پوری طرح سے خیال رکھا۔ منیر خان کی ماں زندہ تھی اور اس نے بھی اس بات کا خیال رکھا کہ اس کی بڑی بہو اور اس کے بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

لیکن شاہدہ کے لئے اس سے بڑی تکلیف اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ بیوگی سے بڑا صدمہ بھلا اور کیا ہو سکتا تھا؟ علاوہ ازیں وہ اپنے سسرال والوں سے بڑی حد تک شرمندہ بھی تھی اس کے بھائی سے ملاقات کے سلسلے میں آنے کے باعث تو اس کے شوہر کی موت واقع ہوئی تھی اس کے سسرال والوں کا اس سارے جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ منیر خان کا خاندان الگ تھا مگر اس جھگڑے کی سب سے بڑی اور المناک قیمت منیر خان کے گھر والوں کو ہی چکانی پڑی تھی۔

منیر خان اور اس کے دونوں بھائی ناخواندہ تھے ان کا بچپن تعلیم سے خالی فضا میں گزرا تھا لیکن ان کے بچوں کا بچپن قدرے مختلف فضا میں گزر رہا تھا ان کے گاؤں میں ایک اسکول قائم ہو چکا تھا جو اپنے قیام کا بڑا عرصہ گزار دینے کے باوجود ابھی تک محض مڈل اسکول تھا۔ اس کا آغاز پرائمری اسکول کے طور پر ہوا تھا اور پھر مڈل اسکول ہو گیا تھا اور پھر یہیں پر رک گیا تھا اس سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔

منیر خان کے بیٹے کو اسی اسکول میں داخل کروا دیا گیا بعد کے برسوں میں وزیر خان اور بشیر خان کے لڑکوں نے بھی ابتدائی تعلیم اسی اسکول میں حاصل کی۔

شاہدہ اپنی سسرال میں بیوگی کے دن گزارنے لگی اگرچہ احمد خان اور زر بخت نے بار بار اس سے کہا تھا کہ وہ ان کے پاس چلی آئے اور بابر خیل میں ہی رہے لیکن شاہدہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ وہ اپنے مرحوم شوہر کے گھر کو نہیں چھوڑنا چاہتی تھی اور اس کی ساس اور دیور وغیرہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کے گھر سے جائے۔

آنے والے برسوں کے دوران شاہدہ اپنے کسی نہ کسی دیور کے ساتھ اور کبھی اپنے والدین کے ساتھ کبھی صرف باپ کے ساتھ اپنے بھائی سے جیل میں ملاقات کرنے کے

لئے کراچی آتی تھی۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اگرچہ جیل میں بند امیر خان کے لئے تو ایک ایک لمحہ ایک ایک سال کے برابر معلوم ہوتا تھا لیکن گزران وقت کے احساس کا ہر شخص کا اپنا الگ الگ پیمانہ ہوتا ہے کسی کو وقت پر لگا کر اڑتا محسوس ہوتا ہے تو کسی کو وہ کچھوے کی چال چلتا ہوا لگتا ہے۔ مگر فی الحقیقت ایسا کچھ نہیں ہوتا وقت تو ہر انسان کے احساس سے بے نیاز اپنے ایک ہی انداز سے گزرتا چلا جاتا ہے۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ امیر خان میں بڑی تبدیلیاں نمودار ہو رہی تھیں اور ان میں سے بہت ساری تبدیلیاں ایسی تھیں جن کا امیر خان کو بھی احساس نہیں تھا۔

گو کہ بڑھاپا ابھی بہت دور تھا لیکن اس کے سر کے بالوں میں اکا دکا سفید بال نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے وہ جس وقت سزا یاب ہو کر جیل میں آیا تھا تو اس وقت وہ ایک صحت مند، تندرست و توانا اور بھرپور نوجوان تھا اس کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ جیل میں آن پہنچا تھا۔ ان گزرے ہوئے دنوں کے دوران اس کی صحت بری طرح گر گئی تھی وہ بلند و بالا پہاڑی گاؤں کی آزاد فضاؤں میں رہنے اور بسنے والا نوجوان تھا اور اب یہاں وہ ایک چار دیواری میں بند تھا۔ صدموں نے اسے جسمانی طور پر کمزور کر دیا تھا سب سے بڑا صدمہ اس کو اپنے بہنوئی کی موت کا تھا۔

سب لوگ دور تھے .... بہت دور .... بار بار کراچی آنا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی سال میں ایک آدھ بار کوئی نہ کوئی آ ہی جاتا تھا خط تو اکثر آتے رہتے تھے۔

شاہدہ کی بیٹی شمائلہ جب چار سال کی تھی تو شاہدہ نے اس وقت سے اس کی پڑھائی کا بندوبست شروع کر دیا تھا اس کا بیٹا سعد اللہ تو اسکول میں جاتا ہی تھا اس نے شمائلہ کو بھی اسکول بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ پرائمری سطح تک تو اسکول میں مخلوط تعلیم تھی شمائلہ نے پڑھنا شروع کر دیا وہ بہت ذہین بچی تھی اور اپنے بڑے بھائی سعد اللہ کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور پڑھاکو تھی اس نے بڑی تیزی کے ساتھ پڑھائی میں ترقی حاصل کی۔

شاہدہ کو اپنے بچوں پر بڑا مان تھا اب یہی بچے تو اس کی آئندہ زندگی کا سہارا تھے اور اسے اس بات کی بہت خوشی تھی کہ دونوں بچے پڑھائی میں دلچسپی لے رہے تھے اور خاص طور سے شمائلہ تو پڑھنے میں بہت تیز تھی اس کے اسکول کے اساتذہ اس کی بہت تعریف کرتے تھے۔

وزیر خان کی بیوی کے کچھ رشتہ دار بہت عرصہ پہلے اپنے علاقے سے ہجرت کر کے لاہور چلے گئے تھے جہاں وہ پھلوں اور خشک میوے وغیرہ کا کاروبار کرتے تھے اور اس میں ان کی بہت اچھی کمائی تھی۔ وہ لوگ کافی عرصے سے وزیر خان پر بھی زور دے رہے تھے کہ وہ لاہور آ جائے اور ان کے ساتھ مل کر کاروبار کرے۔ انہیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس علاقے سے مسلسل رابطہ رکھ سکے۔

بالآخر وزیر خان نے لاہور جا کر اپنی بیوی کے رشتے داروں کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ طے ہوا کہ فی الحال تو کچھ عرصے کے لئے وزیر خان اکیلا لاہور جائے گا اور اگر وہاں اس کا کام ٹھیک طور پر چل پڑا اور اس نے مستقل طور پر وہیں رہنے کا فیصلہ کیا تو پھر وہ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی وہیں بلوا لے گا۔ یہ بھی طے پایا کہ اس صورت میں شاہدہ اور اس کے دونوں بچے بھی لاہور چلے جائیں گے۔

منیر خان مرحوم کا چھوٹا بھائی وزیر خان لاہور آ گیا اور اس نے اپنی بیوی کے رشتے داروں کے ساتھ مل کر کام شروع کر دیا کچھ ہی دنوں میں اس کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اس کا کام وہاں اچھا چلے گا اور اس نے اپنے گھر والوں کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے اپنی بیوی اور شاہدہ کو یہ پیغام بھجوایا کہ وہ لوگ اب لاہور منتقل کے لئے تیار ہو جائیں۔

چند ماہ کے بعد وزیر خان اپنے گاؤں آیا اور اب اس کو اپنی بیوی اور شاہدہ کو ان کے بچوں کے ساتھ لاہور لے جانا تھا۔ ان لوگوں کی رہائش وغیرہ کا سارا بندوبست وہاں کیا جا چکا تھا۔

”گاؤں مین اب میرا بھی دل نہیں لگتا۔“ چھوٹے بھائی بشیر خان نے کہا۔ ”ساری عمر گزر گئی گاؤں میں رہتے رہتے، اور باپ دادا کی زندگیاں بھی گاؤں میں گزریں میں بھی چاہتا ہوں کہ اب شہر میں چل کر رہوں بچوں کو شہری زندگی کی ضرورت ہے۔“

”کاروبار میں بڑے امکانات ہیں۔“ وزیر خان نے کہا۔ ”میں تمہارے لئے بھی راہ ہموار کروں گا۔ پھر تم بھی آ جانا ہم لوگ مل کر کاروبار کریں گے۔“

چنانچہ رفتہ رفتہ وہ دونوں بھائی اپنے اپنے خاندان والوں کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئے گاؤں میں صرف ان کی ماں رہ گئی جو یہاں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہ یہاں سے جانے کے لئے تیار ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا لیکن بیٹوں اور بہوؤں کو بڑی خوشی سے شہر جانے کی اجازت دے دی۔

منیر خان کے دونوں چھوٹے بھائی اپنے گھر والوں کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئے اور انہوں نے وہیں رہائش اختیار کر لی۔ سعد اللہ خان اور شائلہ کو لاہور کے اسکول میں داخل کروا دیا گیا شائلہ کو ایک بہت اچھے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا اور اب دونوں ہی بچے بہت اچھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

دونوں بھائیوں کا کاروبار لاہور میں جم گیا اور وہ وہاں پورے طور سے مطمئن تھے ان کی ماں گاؤں میں ہی رہ رہی تھی اور انہیں اس کی فکر کرنے کی بھی زیادہ ضرورت نہیں تھی کیونکہ گاؤں میں ماں کی فکر کرنے والے بہت سارے دوسرے لوگ موجود تھے۔

جیل میں بند امیر خان کو سارے حالات کا علم تھا اسے معلوم تھا کہ اس کی بہن کے دیور لاہور منتقل ہو گئے ہیں اور انہوں نے وہیں رہائش اختیار کر لی ہے اور یہ کہ شاہدہ خود بھی اپنے بچوں کو لے کر اپنے دیوروں کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئی ہے اور دونوں بچے لاہور میں پڑھ رہے ہیں۔

امیر خان سے ملنے کے لئے اب کبھی تو کوئی اس کے گاؤں سے آتا اور کبھی کوئی لاہور سے' لاہور سے آنے والی اس کی بہن تھی جو اپنے کسی نہ کسی دیور کے ساتھ اس سے ملاقات کے لئے آتی تھی اور گاؤں سے آنے والوں میں اس کے والدین اس کا چھوٹا بھائی اور اس کے چچا چچی تھے یہ سب لوگ بھی کبھی کبھار کراچی اس سے ملاقات کے لئے آتے ہی رہتے تھے کسی نے بھی کبھی زرینہ سے ملاقات کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ زرینہ اپنے ماموں دراز گل کے ساتھ پی آئی بی کالونی میں رہتی ہے لیکن زرینہ سے تو ان کا رشتہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا تھا ان لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ زرینہ کا ایک بیٹا بھی ہے لیکن انہوں نے تو اس کو کبھی دیکھا تھا اور نہ اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔

امیر خان کو جیل میں ایک اور جھٹکا اس وقت لگا جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کا چھوٹا بھائی حبیب خان جو اب ایک نوجوان تھا کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ والدین کی مرضی کے خلاف ملک سے باہر چلا گیا ہے اسے بیرون ملک جانے کا بہت شوق تھا اور اپنے ہی علاقے کے بعض لوگوں کی مدد سے اس کو اس کا موقع مل گیا تھا اور وہ بیرون ملک چلا گیا جبکہ والدین ایسا ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا تو ان سے دور تھا ہی اور جیل میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا اب وہ دوسرے بیٹے کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا

چاہتے تھے لیکن حبیب خان نے اپنے والدین کی پرواہ نہیں کی اور وہ چلا گیا۔

امیر خان کو جیل میں اس کی خبر ملی اور وہ بہت پریشان ہو گیا والدین تو اب بالکل اکیلے رہ گئے تھے حبیب خان کی موجودگی سے تو ان کو بہت سہارا تھا لیکن اب یہ سہارا ختم ہو گیا تھا اور امیر خان بالکل مجبور تھا وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہ کر ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ پے در پے صدموں نے امیر خان کو بالکل نڈھال کر دیا تھا اس کی صحت اور اس کی جوانی اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔

حبیب خان کے جانے کے ایک سال کے بعد احمد خان کا انتقال ہو گیا حبیب خان کے جاتے وقت بھی وہ کچھ بیمار تھا بعد میں اس کی بیماری بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ ایک سال کے اندر اندر وہ اس دنیا سے سدھار گیا اور زربخت کی بدنصیبیوں میں ایک اور بدنصیبی کا اضافہ ہو گیا۔ دونوں بیٹے تو جیتے جی اس سے الگ ہو ہی گئے تھے اور اب شوہر نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا اس سے پہلے وہ جوان داماد کی موت اور بیٹی کی بیوگی کا صدمہ جھیل رہی تھی اس کی زندگی میں تو اب جیسے صدمے ہی صدمے رہ گئے تھے۔

حبیب خان کا پتہ کسی کو نہ معلوم تھا جو اسے باپ کی موت کی اطلاع دی جاتی اسے تو اس کی خبر ہی نہ ہوئی اور دونوں بیٹوں کی عدم موجودگی میں احمد خان کی تجہیز و تکفین کر دی گئی۔ اس کے اپنے سگوں میں اس کا بھائی شمروز خان ہی موجود تھا شاہدہ بھی وقت پر نہیں پہنچ سکی تھی کیونکہ لاہور اطلاع پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا تھا اور لاش کو زیادہ دن تک رکھا نہیں جا سکتا تھا شاہدہ کے ساتھ اس کی سسرال کے لوگ تعزیت کے لئے آئے تھے۔

احمد خان اپنے کسی بھی بیٹے کو پھلتا پھولتا نہ دیکھ سکا اور صرف نامرادی اور صدموں کے سارے بوجھ کو ایک ہی بار اپنے سر سے اتار کر سارے آزاروں سے یکبارگی نجات پا کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا زربخت بالکل اکیلی رہ گئی۔

احمد خان کی موت کے کوئی چھ ماہ کے بعد حبیب خان اپنے گاؤں آیا اس کو کسی ذریعے سے اپنے باپ کی موت کی اطلاع ملی تھی گاؤں میں کچھ دن گزار کر وہ اپنی ماں کو ساتھ لے کر کراچی آیا اور دونوں نے جیل میں امیر خان سے ملاقات کی۔

"میں اب کافی دنوں تک باہر ہی رہوں گا۔" حبیب خان نے اپنے بھائی کو بتایا۔

"میں نے ماں سے بات کر لی ہے' اور تم سے بھی بات کر کے تم کو بتا دینا چاہتا ہوں۔ گاؤں

میں ہمارا جو کچھ بھی ہے وہ اب تمہارا اور شاہدہ کا ہے تم دونوں اپنی مرضی سے اس کا جو جی چاہے کرو میں اپنے لئے اس میں سے کچھ نہیں چاہتا۔ تمہاری رہائی میں اب بہت زیادہ عرصہ باقی نہیں ہے جب بھی تم جیل سے رہا ہو کر آؤ گاؤں میں ہمارا جو کچھ بھی ہے اس کو سنبھال لو۔ تم اور شاہدہ مالک ہو جو چاہو جس طرح چاہو کرو۔"

امیر خان نے اپنے چھوٹے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ گاؤں میں ہی اپنی ماں کے پاس رہے لیکن حبیب خان اپنے بارے میں فیصلہ کر چکا تھا اس نے اپنے بھائی سے معذرت کر لی۔

امیر خان کو اس بات کا بہت دکھ ہوا لیکن مجبوری تھی وہ اس کو مجبور تو نہیں کر سکتا تھا ماں بھی اس کو بہت سمجھا رہی تھی لیکن حبیب خان اپنے فیصلے پر قائم تھا اس نے وہی کیا جو اس کا فیصلہ تھا۔

امیر خان کو صدمے پر صدمے برداشت کرنے پڑ رہے تھے اور وہ ان صدموں کو برداشت کرنے کے لئے مجبور تھا۔

وقت بہرحال گزر رہا تھا معافیاں بھی مل رہی تھیں اور رہائی کی منزل قریب آتی جا رہی تھی امیر خان جیل کے اہلکاروں سے اپنے بارے میں اکثر پوچھتا رہتا تھا۔ اس کی معافیاں وغیرہ ملا کر اب اس کی رہائی میں کتنا عرصہ باقی ہے۔ وہ لوگ اسے صرف اندازہ ہی بتا سکتے تھے کیونکہ اصل حساب کتاب تو جیل کے آفس میں ہوتا ہے۔

آخر خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ ہی پہنچا جب امیر خان کو جیل سے رہا ہونا تھا۔ امیر خان کو اس کے بارے میں پیشگی اطلاع ایک اہلکار نے دے دی تھی اور وہ اس کی زبانی یہ خبر سن کر خوشی سے جیسے دیوانہ ہو گیا تھا۔

پھر جب اس کو رہائی کا مژدہ سنایا گیا اور جیل کے آفس میں طلب کیا گیا تو اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی اب باہر کی دنیا دیکھ سکے گا کتنا طویل عرصہ گزر گیا تھا' کتنے بہت سارے برس جو اس نے ایک ہی جگہ' ایک ہی چار دیواری میں بند رہ کر اپنے گھر والوں سے دور محرومی اور دکھ کے عالم میں گزارے تھے وہ اپنی زندگی کا کتنا بڑا' کتنا قیمتی اور انمول حصہ جیل کی بلند و بالا دیواروں کے پیچھے چھوڑ کر جا رہا تھا۔

اور جیل کی اس چار دیواری کے پیچھے گزارے ہوئے طویل ماہ و سال کے دوران اس کی دنیا میں کتنی تبدیلیاں آ چکی تھیں' کتنے لوگ تھے جو جیل میں اس کی آمد کے وقت

زندہ تھے اور اب ان کا نام و نشان بھی مٹ چکا تھا۔ اس کے عزیز' پیارے جنہیں وہ زندہ سلامت چھوڑ کر آیا تھا اور پھر ان کے جنازوں کو کندھا بھی نہیں دے سکا تھا اور اب تو ان کے جسم خاک کا پیوند ہو چکے تھے۔

وہ جیل کے پھاٹک سے باہر نکلا تو ساری دنیا بدلی ہوئی لگ رہی تھی اس کی اپنی زندگی میں سے ساری دنیا کی زندگی میں سے دنیا کی ہر چیز کی زندگی میں سے ماہ و سال کا ایک عرصہ غائب ہو گیا تھا۔

سینکڑوں بار کی طرح ایک بار پھر اس نے سوچا۔ "کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ کاش میں نے خیر زماں کو نہ مارا ہوتا تو آج حالات کتنے مختلف ہوتے۔"

رہائی کی پیشگی اطلاع امیر خان کو صرف چند روز پہلے ہی مل سکی تھی اور اس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ دور دراز علاقے میں واقع اپنے گاؤں میں یا لاہور میں اس کی اطلاع بھجوا سکتا چنانچہ جس وقت وہ رہا ہو کر جیل کے گیٹ سے باہر آیا تو وہاں کوئی بھی اس کے خیر مقدم کے لئے موجود نہیں تھا وہ بالکل اکیلا تھا۔

وہ ایک طویل عرصے سے کراچی میں تھا لیکن وہ اس شہر سے صرف اتنا ہی واقف تھا جتنا کہ اس شہر میں اپنی آمد کے بعد ابتدائی چند دنوں کے دوران واقف ہوا تھا جبکہ اس کے دوست ظہور احمد نے اس کو کراچی میں سیر کرائی تھی اور پھر تو وہ سیدھا جیل گیا تھا۔

ایک طویل عرصہ جیل میں گزارنے کے بعد وہ اس کراچی کے بارے میں بہت کچھ بھول چکا تھا جہاں وہ برسوں پہلے آیا تھا۔ راستے بھی یاد نہیں رہے تھے اور اسے تو بہت دور جانا تھا۔

جتنے دن وہ جیل میں رہا اس کا دوست ظہور احمد جس نے شروع میں کراچی میں اس کی میزبانی کی تھی ایک بار بھی اس سے ملاقات کے لئے نہیں آیا اور نہ اس نے کسی اور طریقے سے اس کی خبر گیری کی۔ امیر خان کو اس کی وجہ بخوبی معلوم تھی ظہور احمد اور خاص طور سے اس کی بیوی اس واردات کے بعد اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے تھے اور امیر خان نے کراچی آنے کے بعد جب اپنے اصل مقصد کا ظہور احمد کے سامنے اظہار کیا تھا تو ظہور احمد نے اس کی سختی کے ساتھ مخالفت کی تھی اور پھر ان کے درمیان کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

امیر خان کا جی چاہتا تھا کہ وہ ظہور احمد سے ملے' ایک بار اس سے ملاقات کرے وہ

اس کا بچپن کا دوست تھا اور کراچی میں اس نے اس کی بڑی خوشدلی کے ساتھ میزبانی کی تھی لیکن اسے اپنی بیوی اور بچوں کا خیال تھا وہ ان کے لئے کوئی مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا اپنا سوچنے کا انداز تھا جو غلط نہیں تھا۔ امیر خان کو اپنے دوست ظہور احمد سے کوئی شکایت نہیں تھی اور اگرچہ اب وہ آزاد تھا اور ظہور احمد کے لئے کسی مشکل کا سبب نہیں بن سکتا تھا پھر بھی اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ ظہور احمد کے گھر نہ جائے اسے معلوم تھا کہ وہاں کوئی بھی اس کو پسند نہیں کرے گا۔

البتہ منیر خان مرحوم کے جو رشتے دار کراچی میں تھے وہ اس کے پاس کبھی کبھار آتے رہتے تھے اور امیر خان کے پاس ان لوگوں کا پتہ بھی تھا اس نے سوچا کہ ذرا دیر کے لئے ان لوگوں کے پاس جا کر مل لے۔

اس شہر میں اس کی سگی چچا زاد بہن زرینہ بھی رہتی تھی اور امیر خان کو وہ گھر بھی معلوم تھا جہاں زرینہ اور اس کا مقتول شوہر رہا کرتے تھے اور وہ جگہ اس کے لئے ممنوعہ حیثیت رکھتی تھی۔

وہ منیر خان کے رشتے داروں کے گھر چلا گیا ان لوگوں کو اس کی رہائی کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے گھر میں اس کا خیر مقدم کیا۔

ان لوگوں کے اصرار کے باوجود وہ وہاں ایک دن سے زیادہ نہیں رکا تاہم اس نے ان لوگوں سے اپنی واپسی کے سفر کے سلسلے میں مدد چاہی اور انہوں نے اس کی پوری مدد کی۔ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچنا چاہتا تھا اور اس کے لئے پہلے اس کو پشاور پہنچنا چاہئے تھا ان لوگوں نے اس کے لئے فوری طور پر پشاور کے لئے ٹرین کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا جو کہ عام حالات میں مشکل ہوتا اور اس کو پشاور جانے والی ٹرین میں خود سوار بھی کرا دیا۔

امیر خان پشاور پہنچا اور وہاں سے اس کے سفر کا اگلا مرحلہ شروع ہوا اور پھر وہ دشوار گزار راستوں سے گزرتا ہوا بلند و بالا پہاڑی اور سرد علاقے میں سے ہوتا ہوا اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وقت نے سانس روک لی ہو اور لمحات اپنی جگہ پر تھم گئے ہوں۔ وہی جانے پہچانے مناظر تھے وہی اونچے نیچے برف پوش پہاڑ دھوپ میں آئینے کی طرح چمکتی ہوئی ان کی چوٹیاں' جگہ جگہ سبزہ درختوں کے جھنڈ اور خالی میدان۔ سب کچھ ویسا ہی تھا......... ان مناظر نے کتنے بہت سارے ماہ و سال کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا وہ ماہ و سال جو امیر خان کی زندگی سے چھن گئے تھے اور نہ جانے کہاں کہاں

ڈوب گئے تھے۔

گاؤں میں اب اس کے گھر میں صرف اس کی ماں تھی اور اسے اس کی آمد کی پیشگی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ وہ امیر خان کو اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی اور پھر اس کی آنکھوں سے جیسے خون کے دریا رواں ہو گئے یہ خوشی اور غم کی ملی جلی ایک نیم خود فراموشی کی سی کیفیت تھی زر بخت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی برسوں کے بعد بیٹا لوٹ کر' آزاد ہو کر گھر آیا تھا اور یہاں اس کی عدم موجودگی میں کیا کیا قیامتیں گزر گئی تھیں۔ زر بخت کی نظروں کے سامنے کتنے ہی مردہ چہرے ابھر رہے تھے۔

ذرا دیر میں گاؤں کے سب ہی لوگوں کو اس کی آمد کے بارے میں معلوم ہو گیا اس کے چچا چچی کے پاس تو زر بخت نے فوراً ہی ایک لڑکے کو دوڑا دیا تھا گاؤں کے لوگ اس سے ملنے کے لئے آنا شروع ہو گئے تھے۔

امیر خان کو سب سے زیادہ فکر شاہدہ اور اس کے بچوں کی تھی اس کو بتایا گیا کہ شاہدہ اپنے دیوروں کے ساتھ لاہور میں ہے اور اس کے دونوں بچے پڑھ رہے ہیں اور وہ سب لوگ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔

امیر خان کو یہ بات معلوم تھی کہ اس کی بہن کے دونوں دیور بہت عرصہ پہلے گاؤں چھوڑ کر جا چکے ہیں اور لاہور میں کاروبار کر رہے ہیں اور وہیں رہ رہے ہیں اور شاہدہ اپنے بچوں کے ساتھ ان کے ہی پاس رہتی ہے اور اس نے جیل میں ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب گاؤں میں نہیں رہے گا۔ آخر جب دوسرے لوگ اپنے گاؤں کو چھوڑ کر جا سکتے ہیں' دوسرے شہروں میں رہائش اختیار کر سکتے ہیں تو وہ کیوں ایسا نہیں کر سکتا؟ حبیب خان تو صرف گاؤں سے ہی نہیں ملک سے بھی باہر چلا گیا تھا تو پھر وہ کیوں گاؤں سے باہر جا کر نہیں رہ سکتا؟ گاؤں کی فضا اب اس کو صدموں سے بوجھل نظر آتی اسے پہلے سے بخوبی اندازہ تھا کہ جب وہ رہا ہو کر اپنے گاؤں جائے گا تو اس کی طرف اٹھنے والی نگاہوں میں اس کے لئے چبھن ہو گی اور یہ ان نگاہوں سے بالکل مختلف ہوں گی جو کہ ایک عام آدمی کی جانب اٹھتی ہیں۔ وہ اب ایک عام آدمی نہیں تھا وہ ایک سزا یافتہ قیدی اور قاتل تھا۔ اگرچہ اس علاقے میں قاتل ہونا کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی تاہم امیر خان اپنے آپ کو ایک سزا یافتہ قیدی کی شکل میں سب کے سامنے پیش کرنا پسند نہیں کرتا تھا جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔

امیر خان نے پہلے تو یہی سوچا تھا کہ اپنے مرحوم بہنوئی کے بھائیوں کی طرح وہ بھی لاہور چلا جائے گا اور وہاں کاروبار شروع کر دے گا لیکن اس کی ماں نے اس کو ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا لاہور جانے کی صورت میں اس کے بہنوئی کے بھائی ضرور اس بات کی خواہش اور کوشش کرتے کہ وہ ان کے ساتھ مل کر کاروبار کرے اور یہ بات ٹھیک نہ ہوتی۔ کاروبار میں اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے بہن کی سسرال کا معاملہ تھا اس لئے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

گاؤں کے ایک اور آدمی شاداب گل نے جو کہ امیر خان کا بہت گہرا دوست تھا کچھ دن پہلے کراچی میں ٹرانسپورٹ کا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا تھا۔ شاداب گل اکثر کراچی آتا جاتا رہتا تھا شاداب گل اپنے کاروبار کو آگے بڑھانا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس وسائل کی کمی تھی اس نے امیر خان کو پیشکش کی کہ اگر وہ اس کے ساتھ مل کر کاروبار کرے تو دونوں کی مشترکہ کوششوں سے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ شاداب گل کو کراچی میں ٹرانسپورٹ کے کام سے خاصی واقفیت تھی۔

امیر خان اور شاداب گل دونوں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے تھے چنانچہ امیر خان اس کے ساتھ اشتراک و تعاون کے لئے تیار ہو گیا۔

اس نے شاہدہ کی مرضی اور اجازت سے گاؤں میں اپنے آبائی اثاثے فروخت کر دیئے اور ماں کو ساتھ لے کر کراچی منتقل ہو گیا۔ زر بخت کو اب گاؤں سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ شوہر اس دنیا سے اٹھ گیا تھا چھوٹا بیٹا گاؤں چھوڑ کر دور دیس جا چکا تھا اور اب بڑا بیٹا بھی رخت سفر باندھ رہا تھا تو پھر اس کے لئے گاؤں میں بزرگوں کی قبروں میں دبی ہوئی ہڈیوں کے علاوہ اور کیا رہ جاتا تھا؟ وہ تو پہلے ہی امیر خان کے ساتھ کہیں بھی جانے کے لئے تیار تھی۔

امیر خان اپنی ماں کو ساتھ لے کر کراچی آ گیا۔ وہ ایک بار پھر کراچی میں موجود تھا لیکن تب میں اور اب میں بہت فرق تھا اب وہ جیل میں نہیں تھا وہ ایک آزاد انسان تھا‘ آزاد فضاؤں میں سانس لینے والا‘ آزاد خود مختار انسان‘ جو کسی چہار دیواری کے اندر مقید نہیں تھا ایک آزاد انسان کی حیثیت سے تو اس کو کراچی بہت ہی اچھا لگا۔

امیر خان نے شاداب گل کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کر دیا اور جلد ہی ان دونوں کا کاروبار جمنا شروع ہو گیا دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایماندار تھے اور ان کی باہمی

شراکت کامیابی کے مراحل کر رہی تھی۔

لیکن گاؤں چھوڑنے اور کراچی آنے سے پہلے زر بخت نے اپنی ایک دیرینہ آرزو پوری کر لی وہ امیر خان کی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن امیر خان شادی کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ اب صرف اپنی بہن اور اس کے بچوں کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ کیونکہ بہن کی بیوگی کا اصل سبب تو وہ خود ہی ہے لیکن زر بخت بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی اس نے امیر خان کو مجبور کرنے کے لئے بہت سے دوسرے لوگوں کا سہارا لیا جن کے کچھ دوسرے بزرگ بھی آخر امیر خان ان لوگوں کے دباؤ میں آ کر اس کے لئے تیار ہو گیا کہ وہ شادی کرے گا اور اس کی ماں نے فوراً ہی شادی طے بھی کر دی۔ اس نے تو کئی لڑکیاں پہلے سے دیکھ رکھی تھیں۔ جس لڑکی کا اس نے حتمی طور پر انتخاب کیا تھا اس کا نام سلیمہ تھا اور یہ انتخاب زر بخت کا اپنا انتخاب تھا اس کا امیر خان سے کوئی تعلق نہیں تھا اگر شادی کرنی ہی تھی تو پھر کسی سے بھی کی جا سکتی تھی اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

سلیمہ نام کی لڑکی کے ساتھ جو اس گاؤں کی رہنے والی تھی امیر خان کی شادی طے ہو گئی سلیمہ عمر میں امیر خان سے بہت چھوٹی تھی عمر کے لحاظ سے تو اب کوئی بھی لڑکی امیر خان کے جوڑ کی نہیں تھی کیونکہ امیر خان تو اب درمیانہ عمر کا آدمی تھا اور اس علاقے میں اس عمر کی عورتیں تو اپنی بیٹیوں کے لئے بر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگتی ہیں۔

یہ طے پایا کہ شادی کے بعد امیر خان سلیمہ کو گاؤں میں چھوڑ کر اپنی ماں کے ساتھ کراچی چلا جائے گا اور پھر کچھ عرصے کے بعد سلیمہ کو بھی کراچی بلا لے گا اور ایسا ہی کیا گیا شادی کے دو ماہ کے بعد سلیمہ کراچی آ گئی۔

لیکن امیر خان کی شادی شدہ زندگی بہت مختصر اور ناپائیدار ثابت ہوئی شادی کے تقریباً ایک سال کے بعد ہی جبکہ وہ سلیمہ کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے گاؤں آیا ہوا تھا سلیمہ کو سانپ نے کاٹ لیا زہریلا سانپ تھا اگرچہ اس کو اسی وقت ہلاک کر دیا گیا لیکن وہ اپنا کام کر گیا تھا۔ گاؤں میں طبی سہولتوں کا کوئی وجود نہیں تھا فرسودہ اور روایتی طریقوں سے زہر اتارنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا سلیمہ جانبر نہ ہو سکی اور اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

اور تب امیر خان نے یہ سمجھ لیا کہ بدنصیبی ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا حصہ بن چکی ہے اور اسے اس سے نجات نہیں ملے گی بڑی مشکل سے تو وہ شادی کے لئے تیار ہوا تھا ورنہ اس کا تو دل ہی ان ساری چیزوں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ ایک مسلسل افسردگی اور بے نیازی کی کیفیت جیسے اس کی زندگی کا جزو بن چکی تھی اس نے اپنی ذات میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دی تھی۔ سلیمہ کی موت کے کچھ دنوں کے بعد امیر خان واپس کراچی آ گیا سلیمہ کوئی اولاد پیدا کئے بغیر ہی مر گئی تھی کچھ عرصے کے بعد زر بخت نے امیر خان پر زور دینا شروع کیا کہ وہ دوسری شادی کر لے لیکن امیر خان نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ اب وہ دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتا اس نے اس قصے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔

"میں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے اماں کہ میں شاہدہ اور اس کے بچوں کو یہاں کراچی بلوا لوں گا۔" امیر خان نے اپنی ماں سے کہا۔ "شاہدہ اپنی سسرال میں بہت دن رہ چکی اب میں باہر آ چکا ہوں باہر آئے ہوئے بھی مجھے کافی عرصہ ہو گیا ہے مجھے اب کراچی میں ہی رہنا ہے میرا کاروبار اچھا چل رہا ہے اور اس میں آئندہ ترقی کے کافی امکانات موجود ہیں اس لئے اب شاہدہ کو اپنے دیوروں کے ساتھ رہنے کی ضرورت نہیں ہے اس کو میرے پاس آ جانا چاہئے۔"

امیر خان کی ماں نے اس سے اتفاق کیا جب امیر خان نے دوسری شادی سے انکار کر ہی دیا تھا اور وہ کسی طرح بھی نہیں مانتا تھا تو پھر یہی ایک بہتر صورت تھی کہ شاہدہ اپنے بچوں کو لے کر اس کے پاس آ جائے اور یہیں اس کے ساتھ رہے۔

"مجھے اور کتنے دن زندہ رہنا ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔ "اگر شاہدہ یہاں اس کے ساتھ رہنے کے لئے آ جائے تو بہت اچھا ہو گا۔"

چنانچہ شاہدہ اپنے بھائی اور ماں کے پاس لاہور سے کراچی آ گئی اس کے دونوں بچے بھی ساتھ ہی آ گئے۔ اور انہوں نے کراچی میں پڑھنا شروع کر دیا' ماں' بہن اور بھائی بالآخر ایک بار پھر یکجا ہو گئے تھے اور انہوں نے کراچی میں ایک نئی زندگی شروع کر دی تھی شاہدہ کے بچوں سعد اللہ خان اور شائلہ کو کراچی بہت اچھا لگا تھا وہ لاہور جیسے بڑے شہر میں رہ چکے تھے اور کراچی تو ان کو لاہور سے کہیں زیادہ بڑا لگا۔ یہ تو شہروں کا شہر تھا ان دونوں کا دل یہاں لگ گیا۔

امیر خان شاہدہ اور اس کے بچوں کے آ جانے سے بہت خوش ہوا اگرچہ شاہدہ کے

سسرال والے یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کے پاس سے جائے لیکن انہوں نے شاہدہ کی خواہش کا احترام کیا اور اس کو جانے سے نہیں روکا۔ شاہدہ خود بھی اپنے بھائی اور ماں کے ساتھ رہ کر بہت خوش تھی بہرحال وہ لوگ اس کے اپنے تھے۔

کراچی آنے کے دو سال بعد زر بخت کا انتقال ہو گیا اسے حلق کا کینسر ہو گیا تھا کراچی میں علاج کی جدید ترین سہولتیں موجود تھیں لیکن زر بخت کی جان نہ بچائی جا سکی۔ وہ بے چاری مر گئی اور اس کے مرنے کے بعد دونوں بھائی بہن اکیلے رہ گئے اور اب وہی ایک دوسرے کا سہارا تھے شاہدہ کے لئے اس کا بھائی ہی سب کچھ تھا اور امیر خان کے لئے اس کی بہن ہی سب کچھ تھی۔

دونوں بچوں کو ماما بہت اچھے لگے چچاؤں کے تو اپنے بچے بھی تھے اور ان کی محبت بٹی ہوئی رہتی تھی لیکن ماما کی نہ تو بیوی تھی نہ کوئی بچہ تھا ماما تو اکیلے تھے اور ان کی ساری محبتوں کا مرکز یہی دونوں بچے تھے اور ماما کی بہن تھی .... اور یہاں تو نانی بھی تھیں وہ بھی دونوں بچوں کو بہت چاہتی تھیں۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ دونوں بچے بڑے ہوتے گئے سعد اللہ خان نے ملٹری اکیڈمی میں داخلے کے لئے کوشش کی اسے فوج میں جانے کا شوق تھا اس کو ملٹری اکیڈمی میں داخلہ مل گیا اور وہ کراچی سے چلا گیا شائلہ نے میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔

☆======☆======☆

"تم یہ بات کبھی مت بھولنا کہ تمہارے باپ کو قتل کیا گیا تھا۔" زرینہ اپنے بیٹے گل زماں سے کہہ رہی تھی۔ "اس کے قاتل کا نام امیر خان ہے اور وہ میرے سگے چچا کا بیٹا ہے اور ابھی وہ جیل میں ہے اور سزا کاٹ رہا ہے لیکن جب وہ رہا ہو کر باہر آئے گا تو تم کو اسے قتل کرنا ہے۔ تم کو اسے اپنے ہاتھ سے قتل کر کے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا ہے۔"

جس وقت زرینہ اپنے بیٹے سے یہ سب کچھ کہہ رہی تھی اس وقت گل زماں کی عمر تقریباً سات سال کی تھی وہ ایک اچھے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ زرینہ اس کو پہلی بار اس کے باپ کے قتل کے بارے میں نہیں بتا رہی تھی وہ تو اس کو بار بار یہ ساری باتیں بتا چکی تھی گل زماں کے ہوش سنبھالتے ہی اس نے اس کے دماغ میں یہ سب کچھ بھرنا شروع کر دیا

تھا۔

"مگر امی جب باپ کے قاتل کو عدالت نے سزا دے دی تو پھر اس کو مزید سزا دینے کی کیا ضرورت ہے۔" گل زماں نے سادگی سے کہا۔ "وہ بات تو اب ختم ہو گئی۔"

"نہیں بیٹا۔" زرینہ نے سختی کے ساتھ اس کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بات ختم نہیں ہوئی۔ وہ بات تو اب شروع ہو گی اس وقت شروع ہو گی جب تم بڑے ہو جاؤ گے۔ جوان ہو جاؤ گے اور امیر خان قید سے چھوٹ چکا ہو گا۔ اس وقت تم کو امیر خان کو قتل کر کے اپنے باپ کے خون کا حساب چکانا ہو گا۔"

"مگر امی ہماری ٹیچر کہتی ہیں کہ کسی کو تکلیف دینا' کسی کو مارنا بہت بُری بات ہے اور تمام انسانوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنا چاہئے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" زرینہ نے کہا۔ "انسانوں سے محبت کرنا چاہئے لیکن قاتلوں سے نہیں' امیر خان تمہارے باپ کا قاتل ہے اور تمہیں اس کو قتل کرنا ہے۔"

"مگر قتل کرنے والے تو جیل جاتے ہیں امی۔" گل زماں نے کہا۔ "امیر خان نے میرے باپ کو قتل کیا تھا تو وہ جیل میں ہے اور اگر میں امیر خان کو قتل کروں گا تو میں بھی جیل جاؤں گا۔ پھر آپ کیا کریں گی؟ میں اگر جیل چلا گیا تو آپ کیا کریں گی؟"

یکبارگی زرینہ کا دل لرز اٹھا۔ "خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے۔" اس نے دل ہی دل میں الفاظ دہرائے۔

"ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ کام کیا جائے تو کچھ نہیں ہوتا۔" زرینہ نے آہستہ سے کہا۔ "تم اپنا کام کر کے یہاں سے باہر چلے جانا۔ تمہارے باہر جانے کا پورا انتظام موجود ہو گا۔ پھر تم کو کوئی نہیں پکڑے گا۔"

گل زماں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"اور دیکھو' اچھی طرح جان لو کہ تم کو اس بات کا کسی سے ذکر نہیں کرنا۔" زرینہ نے اس سے کہا۔ "نہ اپنے دوستوں سے' نہ اسکول میں اپنی ٹیچروں سے' نہ کسی اور سے۔ کسی سے بھی نہیں' کسی ایک شخص سے بھی یہ بات نہیں کہنی ہے۔ صرف میں اور تم ....بس ہم دونوں کے علاوہ اور کسی کو یہ بات نہیں معلوم ہونی چاہئے۔"

زرینہ گل زماں کو سختی کے ساتھ اس بات کی تلقین کرتی رہتی تھی اور ننھے گل زماں نے اپنی ماں کی اس نصیحت کو سختی کے ساتھ اپنی گرہ میں باندھ لیا تھا ویسے بھی یہ ایسی

خوفناک بات تھی کہ وہ کسی بھی دوسرے شخص سے اس بات کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اسکول کے ساتھی' ٹیچر بھلا وہ کب اس کا یقین کر سکتے تھے کہ اس کی ماں اس کو کسی شخص کے قتل کرنے کا حکم بھی دے سکتی ہے۔

گل زماں ایک بالکل مختلف ماحول اور معاشرے میں پرورش پا رہا تھا۔ وہ ایک بہت اچھے اسکول میں زیر تعلیم تھا جہاں اس کے ساتھ پڑھنے والے بیشتر بچوں کا تعلق اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانوں سے تھا۔ ان بچوں کے خاندانوں میں قتل' خون اور انتقام وغیرہ کی باتیں اجنبی تھیں یہ طرح طرح کی' معلوم اور نامعلوم دشمنیوں کے جال میں جکڑے ہوئے قبائلی خاندان نہیں تھے یہ آزاد شہری خاندان تھے ان کا پورا نظام زندگی ہی الگ تھا اور ان کے بچے ورثے میں ملی ہوئی دشمنیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ گل زماں انہی فضاؤں میں پرورش پا رہا تھا اسکول سے باہر بھی اس کے جو دوست تھے وہ زیادہ تر ایسے ہی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے ان حالات میں یہ بات بڑی مشکل تھی کہ گل زماں کے تشکیل پائے ہوئے اور بنے ہوئے ذہن میں کسی کو قتل کرنے کا خیال ایک مستحکم اور مضبوط شکل اختیار کرے گو کہ اس کی ماں برابر اس کو اس کے لئے تیار کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

دراز گل کو یہ بات کبھی بھی پسند نہ آئی تھی کہ اس کے بھانجے کی بیوی اس کی بہو کہیں ملازمت کرے یہ اس کی خاندانی روایات کے خلاف تھا اور شاید وہ زرینہ کو ایسا کرنے کی اجازت کبھی نہ دیتا اگر اس کی بیوی تاجور اس کے لئے راضی نہ ہو جاتی۔ تاجور بہت سمجھ دار عورت تھی اور اس کے اندر دور تک دیکھنے کی صلاحیت اپنے شوہر سے زیادہ تھی زندگی کے معاملات میں اس کا رویہ جذباتی نہیں بلکہ ٹھوس اور حقیقت پسندانہ ہوتا تھا اس نے اپنے شوہر کو سمجھایا۔

"جب تک میں زندہ ہوں' جب تک تم زندہ ہو اس وقت تک تو زرینہ کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کل کو جب ہم نہیں ہوں گے تب اس وقت کے بارے میں سوچو۔ ہم اپنے بچوں سے یہ توقع کیوں رکھیں کہ زرینہ کا بوجھ اٹھائیں گے؟ ٹھیک ہے زرینہ کے بیٹے کے بڑا ہونے میں تو ابھی ایک عرصہ باقی ہے تب تک زرینہ کو مالی مدد کی ضرورت ہے۔ اپنے لئے بھی اور اپنے بچے کے لئے بھی اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود بھی کچھ کرے' اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرے اگر وہ انڈسٹریل

ہوم میں کام کرنا چاہتی ہے تو کرنے دو۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے میں جانتی ہوں اچھے باعزت گھرانوں کی لڑکیاں اور عورتیں انڈسٹریل ہوم میں کام کرتی ہیں۔"

دراز گل راضی ہو گیا اور زرینہ انڈسٹریل ہوم میں کام کرنے لگی لیکن دراز گل کچھ زیادہ آگے تک کی سوچ رہا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد اس نے زرینہ کو مشورہ دیا کہ وہ خود اپنا ایک چھوٹا موٹا انڈسٹریل ہوم قائم کرنے کی کوشش کرے اور یہ کہ وہ اس کام میں اس کی مدد کرے گا۔ زرینہ کو یہ خیال پسند تو بہت آیا لیکن اس سلسلے میں اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور وہ مارکیٹنگ وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی دراز گل نے اس معاملے میں اس کی بہت مدد کی اس کے دو ایک جاننے والے ایسے تھے جو اس کاروبار سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ اگلے دو برسوں کے دوران زرینہ خود اپنا چھوٹا سا انڈسٹریل ہوم قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

زرینہ اپنے گاؤں سے گاؤں میں موجود اپنے رشتے داروں سے عرصہ دراز سے بالکل کٹی ہوئی تھی۔ وہ تو ایک ایسی بدنصیب عورت تھی جس کا نہ کوئی میکہ تھا نہ سسرال' ڈیرہ امین گل میں یا بابر خیل میں کہیں بھی اس کا کوئی گھر نہیں تھا اس کے والدین تھے' چھوٹی بہن تھی بہنوئی تھا لیکن وہ سب لوگ اس کے لئے نہیں تھے اس کے لئے تو کوئی بھی نہیں تھا سوائے ماما دراز گل کے اور اب تو ماما دراز گل کا رابطہ بھی اپنے گاؤں سے تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ مدت گزر گئی تھی کہ ماما دراز گل گاؤں نہیں گئے تھے اور نہ ہی گاؤں سے کوئی اس کے پاس آیا تھا اور زرینہ کا گاؤں سے کوئی رابطہ ہو سکتا تھا۔ گاؤں کے بارے میں اسے کوئی خبر معلوم ہو سکتی تھی تو صرف دراز گل کے ذریعے اور دراز گل نے تو گاؤں سے اپنا رابطہ تقریباً توڑ ہی لیا تھا۔

زرینہ کا اپنا چھوٹا سا انڈسٹریل ہوم چل نکلا اور اس طرح اس کی مستقل معقول کمائی کا وسیلہ پیدا ہو گیا اس کے ساتھ ہی کچھ دنوں کے بعد اس کی ضرورت پیش آ گئی کہ وہ دراز گل کا گھر چھوڑ دے۔

دراز گل کے پاس برسوں پہلے کا لیا ہوا رہائشی پلاٹ فیڈرل بی ایریا میں موجود تھا لیکن اس نے ابھی تک مکان نہیں بنوایا تھا کیونکہ پیر کالونی کا مکان اس کی ضروریات کے لئے کافی تھا لیکن اب بڑے ہوتے ہوئے بچوں کی ضروریات کے لئے وہ گھر چھوٹا پڑتا جا رہا تھا چنانچہ دراز گل نے فیڈرل بی ایریا میں اپنے پلاٹ پر اپنا گھر بنوانا شروع کر دیا۔ کچھ

عرصے کے بعد اس کا گھر بن کر تیار ہو گیا اور منتقلی کا وقت آ گیا دراز گل پی آئی بی کالونی والا کوارٹر چھوڑ نہیں رہا تھا وہ اس کو اپنے دفتر کے طور پر رکھ رہا تھا اس کا تو منڈی کا کاروبار تھا اور یہ کوارٹر تو منڈی کے پیچھے ہی واقع تھا۔

زرینہ کا انڈسٹریل ہوم پی آئی بی کالونی کے ہی ایک کوارٹر کے آدھے حصے میں واقع تھا باقی آدھے حصے میں مالک مکان خود رہتا تھا لیکن اب وہ اس باقی آدھے حصے کو بھی کرائے پر دینا چاہتا تھا کیونکہ اس نے عزیز آباد میں ایک گھر بنوا لیا تھا اور وہ وہاں منتقل ہونے والا تھا۔

زرینہ نے اس پورے کوارٹر کو کرائے پر لینے اور کوارٹر کے آدھے حصے میں اپنے بیٹے گل زماں کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

دراز گل اور اس کی بیوی تاجور نے بہت چاہا کہ زرینہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ان کے نئے گھر میں چلے لیکن زرینہ اس کے لئے راضی نہیں ہوئی۔ وہ اب اپنے بیٹے کے ساتھ الگ رہنا چاہتی تھی اور اس کی مالی حیثیت اتنی مستحکم ہو چکی تھی کہ وہ ان لوگوں سے الگ رہ سکتی تھی اور پھر اس کے لئے روز فیڈرل بی ایریا سے انڈسٹریل ہوم آنا بھی آسان نہیں تھا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے انڈسٹریل ہوم میں ہی رہے گی۔

"آپ تو روز ہی منڈی آتے رہیں گے ماما۔" اس نے دراز گل سے کہا۔ "آپ مجھ سے روز مل سکتے ہیں اور خیر خیریت معلوم کر سکتے ہیں میں خود بھی یہاں آپ کے دفتر میں آ سکتی ہوں اور آپ کے گھر بھی آؤں گی۔"

ایک اور وجہ یہ تھی جس کی بناء پر زرینہ اب دراز گل کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی وہ دراصل اب اپنے بیٹے کو دراز گل اور تاجور کے ذہنی اثر سے آزاد رکھنا چاہتی تھی۔

دراز گل اور تاجور ہرگز اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ خیر زماں کے قتل کے معاملے کو اب مزید آگے بڑھایا جائے ان کے خیال کے مطابق یہ قصہ ختم ہو چکا تھا اور امیر خان کو عدالت سے جو سزا مل چکی تھی اس کے بعد اب اس قصے کو ختم کر دینا چاہئے تھا اس میں مزید جانوں کو ملوث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور گل زماں کو یا کسی کو بھی اب قربانی کا بکرا نہیں بننا چاہئے تھا۔ وہ دونوں ہی زرینہ کو یہ سمجھاتے رہتے تھے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو جو کہ اس کے مرحوم شوہر کی اکلوتی نشانی تھا خطرے میں نہ ڈالے۔ زرینہ

ان سے بحث تو نہیں کرتی تھی لیکن ان کے خیال سے اتفاق بھی نہیں کرتی تھی اس نے اپنے طور پر یہ پختہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ذریعے اپنے شوہر کے قتل کا بدلہ ضرور لے گی۔

دراز گل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ فیڈرل بی ایریا کے نئے مکان میں منتقل ہو گیا اور زرینہ اپنے انڈسٹریل ہوم میں منتقل ہو گئی۔ پی آئی بی کالونی کے اس پورے کوارٹر کا آدھا حصہ اب انڈسٹریل ہوم کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور باقی آدھے حصے میں زرینہ اور اس کے بیٹے کی رہائش تھی۔

پی آئی بی کالونی کے جس کوارٹر کے ایک حصے میں زرینہ اپنے مرحوم شوہر کے ساتھ رہتی آ رہی تھی اس کے مالک صغیر احمد کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا تھا شازیہ کی دوسری شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی گئی تھی اور کچھ دنوں کے بعد اس نے اپنی ماں کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔

زرینہ پر شازیہ کے بہت احسانات تھے شازیہ نے ہی زرینہ کو لکھنا پڑھنا سکھایا تھا اور اسے شہری زندگی کے ان بہت سارے آداب اور اطوار سے واقف کروایا تھا جن کے بارے میں وہ پہلے کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ شازیہ تو چاہتی تھی کہ خیر زماں کی موت کے بعد بھی زرینہ اس کے گھر میں اسی طرح رہے جس طرح وہ پہلے رہتی تھی اور اس نے تو زرینہ سے یہاں تک کہا تھا کہ وہ اس سے کوئی کرایہ نہیں لے گی لیکن زرینہ کے لئے ایسا کرنا کچھ ٹھیک نہیں تھا جب اس کے مرحوم شوہر کے سگے ماموں اور ممانی اس مکان سے محض ذرا سے فاصلے پر موجود تھے تو پھر کس طرح ہو سکتا تھا کہ وہ ماموں ممانی کا گھر چھوڑ کر غیروں کے گھر میں رہتی؟

وہ اپنے ماموں دراز گل کے گھر آ گئی تھی اور پھر وہ اس وقت تک ان لوگوں کے ساتھ اس گھر میں رہی جب تک کہ وہ لوگ خود اس گھر میں رہے اور پھر وہ لوگ تو یہاں سے فیڈرل بی ایریا اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گئے اور زرینہ اپنے انڈسٹریل ہوم والے کوارٹر میں آ گئی۔

انڈسٹریل ہوم اچھا خاصا چل رہا تھا اور زرینہ کو کافی بچت ہو جاتی تھی شروع شروع میں تو دراز گل نے اس کی بہت مدد کی تھی اور دراز گل کی ہی مدد سے وہ اپنے کاروبار کو مستحکم کر سکی تھی اور اب تو وہ خود بہت تجربہ کار اور ہوشیار ہو گئی تھی۔ ایک طویل زمانہ

گزر گیا تھا اپنے عاشق کے ساتھ ایک دور افتادہ پہاڑی گاؤں سے بھاگ کر کراچی آنے والی ایک نو عمر‘ کم سن اور ناتجربہ کار لڑکی اب ایک درمیانی عمر کی عورت بن چکی تھی اور ایک نوجوان لڑکے کی ماں تھی وہ کاروباری معاملات میں بھی بہت کچھ جان چکی تھی اور اب مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کاروباری امور پر گفتگو کر سکتی تھی اور کرتی تھی۔ وہ اب اردو اس طرح بولتی تھی کہ یہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا تھا کہ اس کی مادری زبان اردو نہیں پشتو ہے۔ وہ کتنا بدل چکی تھی اس کی ساری شخصیت نے ایک نیا روپ دھار لیا تھا لیکن نہیں بدلی تھی تو بس ایک چیز۔ اس کی خواہشِ انتقام‘ وہ آج بھی اندھے انتقام کی آگ میں جل رہی تھی اور اس کے وجود کا رُواں رُواں اس آگ میں جل کر بھسم ہوا جا رہا تھا اس وقت وہ اس بات کو بھول جاتی کہ گل زماں اس کا اکلوتا بیٹا ہے اور اگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو کہ امیر خان کا ہوا تھا تو پھر کیا ہو گا اور اسے اپنی زندگی کے کتنے سال جیل کی نذر کرنے پڑیں گے۔ پھر یہ بھی تو ضروری نہیں تھا کہ عمر قید کی ہی سزا ہو سزائے موت بھی تو ہو سکتی تھی۔

دراز گل اور تاجور نے اس کو بار بار یہ باتیں سمجھائی تھیں اور ایسا نہیں تھا کہ زرینہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہو وہ سب کچھ سمجھتی تھی سب کچھ جانتی تھی لیکن وہ اپنے خوفناک اور خون آشام انتقامی جذبے کی شدت سے مجبور تھی وہ اس جذبے کے ہاتھوں ایک کھلونا بن کر رہ گئی تھی اسے اپنے اوپر اختیار نہیں رہا تھا۔ جب اس کی نظروں کے سامنے برسوں پرانا رات کا وہ منظر ابھرتا جب خیر زماں کا خون آلود جسم چارپائی پر پڑا ہوا پھڑک رہا تھا اور امیر خان ریوالور ہاتھ میں لئے ہوئے وہاں سے بھاگ رہا تھا تو اس کے خون میں ایک ایسا ابال آتا کہ اس کو اپنی رگوں میں آتشِ سیال بہتی ہوئی محسوس ہوتی وہ بے قابو ہو جاتی۔ اس کا سانس خود بخود تیز ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے امیر خان کا گلا گھونٹ دے۔ اس وقت وہ اور سب کچھ بھول جاتی اسے صرف امیر خان یاد رہ جاتا.......... امیر خان‘ جسے وہ ہر قیمت پر مردہ دیکھنا چاہتی تھی۔

جیسے جیسے اس کا بیٹا بڑا ہوتا گیا وہ اس کو اس کام کے لئے تیار کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتی گئی لیکن وہ اس بات کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتی تھی کہ اس کے بیٹے کے اندر اس معاملے میں وہ جوش و خروش‘ اضطراب و اضطرار اور اشتعال نہیں تھا جو کہ خود اس کے اندر تھا تاہم گل زماں کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش کرتی رہتی

تھی۔

گل زماں جب چھوٹا تھا تب ہی اس نے اس کو گولیوں والا نقلی ریوالور خرید کر دے دیا تھا اور اس کھلونا ریوالور سے وہ اس سے نشانے لگوایا کرتی تھی۔

"ایک دن اس کے ہاتھ میں اصلی ریوالور ہو گا اور اس اصلی ریوالور میں اصلی گولیاں ہوں گی اور ان گولیوں کی زد میں امیر خان کا سینہ ہو گا۔" وہ وحشت کے عالم میں سوچتی اور اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اس کے بعد کیا ہو گا؟ اس کے بارے میں وہ کچھ نہ سوچتی .... اس منزل کے آتے ہی وہ اپنے ذہن کے دروازے بند کر لیتی اس کے آگے کی منزل کے بارے میں وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی اگر سوچتی تھی تو دل لرزنے لگتا تھا اس لئے اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

"بس ایک بار امیر خان کا کام تمام ہو جائے۔" اس کے دل میں خواہش ابھرتی۔ "اس کے بعد جو ہو سو ہو۔ ان شاء اللہ میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہو گا۔"

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا بیٹا جوان ہو گیا تھا وہ کالج میں آ گیا تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ وہ بندوق اٹھائے اور اپنے باپ کے قتل کا حساب چکائے۔

زرینہ کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ امیر خان جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنے گاؤں چلا گیا ہے اسے یہ بات خود دراز گل نے بتائی تھی جسے بابر خیل کے کسی آدمی کی زبانی اس کا علم ہوا تھا۔

"یہ تو بہت اچھا ہے کہ وہ زندہ ہے۔" زرینہ نے دل ہی دل میں کہا۔ "خدا کرے کہ وہ اس وقت تک زندہ رہے جب تک کہ گل زماں اس کے سینے میں اپنے ریوالور کی ساری گولیاں اتار کر اس کو ٹھنڈا نہ کر دے۔"

لیکن کس طرح؟ گل زماں' امیر خان کو کیسے تلاش کرے گا؟ وہ اس کو کس طرح پہچانے گا؟

زرینہ کی مشکل یہ تھی کہ اس کا نہ تو اپنے گاؤں میں کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ ہی اپنے شوہر کے گاؤں میں۔ وہ خود بابر خیل کی رہنے والی تھی جہاں امیر خان بھی رہتا تھا جو اس کا سگا چچا زاد بھائی تھا۔ زرینہ کا گھر بابر خیل میں تھا اس کے والدین بابر خیل میں تھے اب وہاں اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ اگر وہ وہاں جاتی تو کسی بھی گھر کے دروازے اس کے لئے وا نہ

ہوتے' بلکہ شاید اس کو فوراً ہی قتل کر دیا جاتا کیونکہ وہ گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی تھی۔

ڈیرہ امین گل اس کے مرحوم شوہر کا گاؤں تھا۔ یہاں خیر زماں کے والدین اور بھائی بہن رہتے تھے یہ زرینہ کی سسرال تھی لیکن زرینہ کی تو کوئی بھی سسرال نہیں تھی اس کے شوہر کے گھر والوں نے تو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس کو نہیں اپنایا تھا وہ سب لوگ اس کے لئے اجنبی تھے اس کے دشمن تھے وہ ان کے درمیان بھی نہیں جا سکتی تھی۔

"اسے اکیلے ہی جانا ہو گا۔" وہ اپنے آپ سے کہتی۔ "اسے اپنے آبائی گاؤں جانا ہو گا اپنے دادا کے پاس اگر وہ زندہ ہوں تو یا اپنے چچا کے پاس اپنی دادی یا اپنی پھوپھی کے پاس .... جو بھی وہاں موجود ہو .... اسے ان لوگوں سے ملنا ہو گا وہ ان کا خون ہے اسے خاموشی سے ان لوگوں کی مدد حاصل کرنی ہو گی وہی لوگ اس کو امیر خان کی شناخت کروائیں گے .... اور اگر ان لوگوں نے اس کی مدد نہیں کی تو پھر کوئی اور راستہ تلاش کرنا ہو گا .... کچھ بھی کرنا ہو' کچھ بھی ہو امیر خان کو ختم تو بہرحال کرنا ہے۔"

امیر خان اور اس کے خاندان والوں کے بارے میں مزید کوئی خیر خبر اس کو نہیں معلوم ہو سکی اس نے کوشش بھی کی لیکن کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ دراز گل کو برسوں سے امیر خان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا آخری خبر اس کو بس یہی ملی تھی کہ وہ رہا ہو کر اپنے گاؤں چلا گیا ہے اس کے بعد کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔

"گاؤں سے کہاں جائے گا بدنصیب!" زرینہ اکثر سوچا کرتی۔ "گاؤں میں تو رہے گا ہی۔ اتنا طویل عرصہ گاؤں سے باہر کراچی کی جیل میں گزار چکا اب اور کہاں جائے گا۔"

گل زماں نے انٹرپاس کر لیا اور وہ بی ایس سی کے سال اوّل میں آ گیا زرینہ ایک ایک دن ایک ایک لمحے کا حساب کر رہی تھی ابھی دو سال کی دیر تھی۔

گل زماں کو بی ایس سی پاس کرنے میں دو سال چاہئیں تھے اور زرینہ نے جہاں اتنا طویل انتظار کیا تھا وہاں وہ دو سال تک مزید انتظار کر سکتی تھی۔

وہ خود تو یہ چاہتی تھی کہ یہ کام جلد از جلد پورا ہو جائے اور اس کے سر پر سے یہ بوجھ اتر جائے لیکن اس کا بیٹا ابھی اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بی ایس سی کرنے تک اپنے آپ کو اس قسم کی کسی الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ تو اس راہ سے مسلسل گریز ہی کر رہا تھا زرینہ اس بات سے کسی حد تک واقف تھی لیکن وہ اپنے ارادے سے دستبردار نہیں ہو سکتی تھی یہ اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

گل زماں کو اس سارے معاملے میں شروع ہی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اگر اس کے باپ کے قاتل کو گرفتار نہ کیا گیا ہوتا اور اسے سزا نہ ملی ہوتی تو شاید اس کا رویہ کچھ اور ہوتا لیکن اس کے باپ کے قاتل کو عدالت نے خاصی لمبی سزا دے دی تھی اور وہ اس سے مطمئن تھا اس کے دل میں کوئی شعلہ نہیں بھڑک رہا تھا۔

اور پھر اچانک اس کی ملاقات شمائلہ سے ہو گئی شمائلہ جب اس کی زندگی میں داخل ہوئی تو زندگی ایک دم بہت خوبصورت ہو گئی۔ اس قدر خوبصورت کہ گل زماں نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا اور اب وہ شمائلہ کے علاوہ اور کسی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا اس کی ساری تمناؤں' چاہتوں' امیدوں' آرزوؤں' امنگوں اور جذبوں کا مرکز شمائلہ ہی تھی اور شمائلہ کے بارے میں تو صرف سوچنا ہی کس قدر سرور انگیز تھا۔ اپنی ماں کے حکم کے بارے میں سوچنا اسی قدر وحشت ناک تھا.......... حد درجہ خوفناک۔

ہوش سنبھالنے کے بعد گل زماں نے جس شخصیت کو اپنے سے سب سے زیادہ قریب پایا تھا وہ اس کی ماں ہی تھی نہ باپ نہ کوئی بھائی بہن' بس ایک ماں.......... ماں ہی اس کے سب سے زیادہ قریب تھی اور وہ ماں کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ وہ اپنی ماں کی محبتوں کا واحد مرکز تھا اور ماں اس کی محبتوں کا واحد مرکز تھی۔ ماں اس پر جان چھڑکتی تھی اور وہ ماں سے زیادہ کسی دوسرے شخص کو عزیز نہیں رکھتا تھا۔ ماں محبت کے ساتھ ساتھ عزت اور احترام کا بھی مرکز تھی۔

چنانچہ گل زماں کے لئے ماں کی کسی خواہش کو پورا نہ کرنا اور اس کے حکم کی تکمیل نہ کرنا ممکن نہ تھا وہ سب کچھ کر سکتا تھا مگر ماں کے کہے کو ٹال نہ سکتا تھا۔

لیکن شمائلہ سے ملاقات کے بعد تو اس کی زندگی میں ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی تھی زندگی نے ایک نیا مفہوم پا لیا تھا اور اب وہ ان چیزوں کو گنوانا نہیں چاہتا تھا جو کہ اس نے حاصل کر لی تھیں۔ وہ تو ان کو سینے سے لگا کر رکھنا چاہتا تھا۔

وہ جب اس کام کے بارے میں سوچتا تھا جو اس کی ماں اس سے لینا چاہتی تھی تو اس پر اب پہلے کے مقابلے میں اور بھی بیزاری طاری ہو جاتی اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو تھپڑ تک نہیں مارا تھا اور اب اس سے یہ توقع رکھی جا رہی تھی' اسے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ ایک انسان کو قتل کر دے اور وہ خود کو اس کے لئے تیار نہیں کر پا رہا تھا ہر چند کہ وہ شخص اس کے باپ کا قاتل تھا۔

وہ اپنا کوئی راز اپنی ماں سے کبھی نہیں چھپاتا تھا ایک ماں ہی تو تھی جس کے ساتھ وہ ہر قسم کی باتیں کر سکتا تھا وہی تو اس کی واحد رازدار تھی اس کی کون سی ایسی بات تھی جو اس کی ماں کو معلوم نہ ہو۔ وہ اسکول اور کالج کی ساری خاص خاص باتیں ماں کو بتایا کرتا تھا اور اس میں اسے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی تھی۔

لیکن ایک بات ایسی تھی جو اس نے اپنی ماں کو نہیں بتائی تھی اور فی الحال وہ اس کو بتانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا اور یہ بات ایسی تھی کہ اسے ماں کو بتاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کی ماں اس بات کو پسند نہیں کرے گی اور یہ بات اس قدر خوبصورت' اس قدر دل نشین اتنی دل آویز تھی کہ وہ یہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس کو ناپسند کرے۔ بھلا شمائلہ کے ساتھ اس کی دوستی بھی کوئی ایسی چیز تھی جس کو کوئی ناپسند کرتا؟ کیا اس قدر حسین اور لطیف و پاکیزہ چیز کو کوئی ناپسند بھی کر سکتا تھا؟ نہیں وہ کسی کو یہ حق نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اس بات کو ناپسند کرے اپنی ماں کو بھی یہ حق نہیں دے سکتا تھا۔

اس لئے اس نے اپنی ماں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا وہ شمائلہ کے حسین تصور کے ساتھ کسی تلخی کو وابستہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کی اور شمائلہ کی دوستی بڑھتے بڑھتے اب اس مرحلے میں داخل ہو گئی تھی جہاں وہ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کا اور کبھی بھی ایک دوسرے سے الگ نہ ہونے کا عہد کر چکے تھے اور شمائلہ کے ساتھ زندگی گزارنے کے تصور کے ساتھ ہی جب اس کو اپنی ماں کے مطالبے کا خیال آتا تو اس پر ایک دم اوس پڑ جاتی۔ خدا جانے یہ کیسا عذاب تھا جو اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔

کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی ماں کو شمائلہ کے بارے میں بتا دے اور شمائلہ سے اس کی ملاقات بھی کرا دے لیکن پھر اس نے خود کو ایسا کرنے سے روک لیا۔ ماں یہ سب کچھ پسند نہیں کرے گی۔ اس سے جو اہم کام لینا چاہتی ہے اس کی تکمیل سے پہلے وہ اس قسم کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے گی اور اس سے کچھ کہنا سننا بھی بے کار ہو گا۔

اس نے ماں سے کچھ نہیں کہا اور کوئی دوسرا ایسا شخص موجود نہیں تھا جس کو وہ اپنے راز میں شریک کر سکتا۔ چنانچہ وہ اور شمائلہ ہی آپس میں ایک دوسرے کے رازداں تھے شمائلہ کے ساتھ حالات ذرا مختلف قسم کے اور زیادہ خوشگوار تھے اس کا بڑا بھائی تو ملٹری

اکیڈمی میں چلا گیا تھا اور اب وہ اپنی ماں اور ماموں کے ساتھ اکیلی رہ گئی تھی ماموں کا رویہ اس کے ساتھ انتہائی مشفقانہ اور محبت آمیز تھا اور ماں تو تھی ہی سراپا محبت۔ ہر ماں کی طرح جو کہ اپنی اولاد کے لئے سراپا محبت ہوتی ہے اور اس کی ماں یا اس کے ماموں کا اس سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ بھی نہیں تھا گھر میں کسی قسم کی کشیدگی کی فضا نہیں تھی۔

شمائلہ کو اپنے ماموں کے بارے میں یہ بات معلوم تھی کہ انہوں نے اپنی سگی چچازاد بہن کے شوہر کو قتل کرنے کے جرم میں چودہ سال قید بامشقت کی سزا کاٹی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے ماموں نے اپنی چچازاد بہن کو اس کے شوہر کو قتل کرنے کی کوشش اس لئے کی تھی کیونکہ ان دونوں نے اپنے خاندان والوں کی مرضی کے خلاف گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی اور خاندانی روایات کے مطابق ان دونوں کا قتل واجب تھا۔

شمائلہ جب بالکل ننھی بچی تھی تب اس نے گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ اس کا بچپن لاہور میں گزرا تھا اور پھر وہ کراچی آ گئی تھی اور یہیں رہ رہی تھی۔ گاؤں کے روایتی ماحول سے اس کا رابطہ کبھی بھی استوار نہیں رہا تھا۔ اس نے پاکستان کے دو سب سے بڑے شہروں میں پرورش پائی تھی اور اس کے لئے انتقام در انتقام کی ان خونی داستانوں میں کوئی کشش نہیں تھی اسے اپنے ماموں سے بہت محبت تھی ان کے ساتھ ہمدردی تھی اور اسے اس بات کا دکھ تھا کہ ماموں نے اپنی زندگی کا بہترین عرصہ جیل میں گزار دیا تھا' اور شاید .... شاید ماموں کو بھی اس کا احساس تھا کیونکہ کبھی کبھی ان کی باتوں میں تاسف کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔

تاہم اس کی ماں نے اس کو سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا کہ وہ کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کرے کہ اس کا ماموں سزا یافتہ ہے۔ کراچی میں آ کر ان لوگوں نے ایک بالکل نئی زندگی شروع کی تھی اور اب وہ ساری پرانی داستانوں کو بھول جانا چاہتے تھے یہاں کراچی میں کسی کو بھی امیر خان کے ماضی کے بارے میں نہیں معلوم تھا' اور نہ ہی کسی کو امیر خان کے ماضی سے کوئی دلچسپی تھی یہاں تو کسی کو بھی کسی کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

شمائلہ نے اپنے دوستوں میں سے کسی کو بھی اپنے ماموں کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ سزایافتہ ہیں ویسے بھی اس بات کی اب نہ کوئی ضرورت تھی نہ اہمیت وہ باب تو اب بند ہو چکا تھا ہمیشہ کے لئے۔

شمائلہ نے جب اپنی ماں کو اس پشتون نوجوان کے بارے میں بتایا جو اس کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا اور جس نے اس کی بہت مدد کی تھی تو شاہدہ کو اس کے سلسلے میں تجسس ہوا تھا۔

وہ لوگ اپنا گاؤں چھوڑ کر اپنے خاندان اور اپنی برادری وغیرہ کو چھوڑ کر کراچی میں آباد ہو گئے تھے اور اب ان کو یہیں رہنا تھا انہوں نے کراچی کو ہی اپنا گھر بنا لیا تھا اور جو بھی نئے رشتے ناتے بننے تھے یہیں اس شہر میں بننے تھے۔ سعداللہ خان کو فوجی افسر بننا تھا شمائلہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی تھی امیر خان کو کاروبار کرنا تھا بس اب سب کچھ کراچی میں ہی ہونا تھا کراچی میں ہی کرنا تھا۔

ایک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا پشتون نوجوان' یہ بات شاہدہ کے لئے خاصی پُرکشش تھی اس کے اپنے اور اس کے مرحوم شوہر کے خاندان میں شمائلہ کے لئے کوئی ایسا رشتہ موجود نہیں تھا جو شمائلہ کی عمر اور اس کی تعلیم کے لحاظ سے اس کے لئے موزوں ہو اور گاؤں میں بھلا پڑھے لکھے لوگ تھے ہی کہاں۔

شمائلہ نے جب اس پشتون نوجوان کو گھر بلانے کی خواہش ظاہر کی تو شاہدہ نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اپنے بھائی کو بھی اس کے بارے میں بتا دیا۔ امیر خان تو خود بھی یہی چاہتا تھا کہ شمائلہ کی کسی اچھے اور معزز پشتون گھرانے میں شادی ہو جائے وہ تو اب ذات برادری اور قبیلے وغیرہ کے فرق کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔

امیر خان جب پہلی بار گل زماں سے ملا تو اس سے مل کر اس کا جی بہت خوش ہوا۔

گل زماں بڑا خوبصورت نوجوان تھا لمبا تڑنگا' صحت مند بھرا ہوا جسم گوری رنگت' تیکھے اور کھڑے نقوش' قدرے گھنگریالے بال وہ کسی پرانی داستان کے بہادر نوعمر نوجوان شہزادے یا سردار کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

امیر خان اور شاہدہ گل زماں سے اس کے گھر اور خاندان اور شہر وغیرہ کے بارے میں پوچھ رہے تھے لیکن گل زماں کے پاس ان کو بتانے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

اس نے ان کو اپنے بارے میں کم سے کم بتایا اس نے بتایا کہ اس کے باپ کا انتقال اس کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور اس کی پرورش اس کی ماں نے کی تھی جو ایک چھوٹے سے انڈسٹریل ہوم کی مالک ہے۔ وہ اپنے گاؤں وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا سوائے اس کے کہ وہ صوبہ سرحد کے کسی دور افتادہ پہاڑی گاؤں کا رہنے والا تھا اس

نے بتایا کہ وہ تو کراچی میں ہی پیدا ہوا تھا اور اس نے یہیں تعلیم پائی تھی وہ کبھی اپنے گاؤں گیا ہی نہیں تھا۔

جب وہ وہاں سے رخصت ہونے لگا تو شاہدہ نے اس سے زور دے کر کہا کہ وہ کبھی اپنی ماں کو وہاں لے کر آئے اور اس سے اس کی ملاقات کروائے۔ گل زماں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی ماں کو لے کر آئے گا۔

گل زماں کے چلے جانے کے بعد شاہدہ اور امیر خان نے آپس میں اس کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ لڑکا ان دونوں کو ہی بہت اچھا لگا تھا۔

"کسی اچھے پشتون خاندان کا معلوم ہوتا ہے۔" شاہدہ نے اپنے بھائی سے کہا۔ "ماں پی آئی بی کالونی میں چھوٹا سا انڈسٹریل ہوم چلاتی ہے اور بیٹے کو اعلیٰ تعلیم بھی دلوا رہی ہے اچھے پڑھے لکھے لوگ معلوم ہوتے ہیں اس کی ماں سے ملاقات کرنی چاہیے۔"

"پہلے اسے موقع دو کہ وہ اپنی ماں کو ہمارے گھر لائے۔" امیر خان نے کہا۔ "اس سے بات چیت کر کے ہی معلوم ہو گا کہ یہ لوگ کہاں کے رہنے والے ہیں' کس قبیلے سے' کس خاندان سے ان کا تعلق ہے ان کے اور رشتے دار کون کون ہیں اور پھر اگر کوئی بات بنتی ہے تو دیکھیں گے۔"

☆======☆======☆

زرینہ جب اپنے بیٹے کے ساتھ ہانپتی کانپتی اپنے گھر واپس پہنچی تو اس کے سارے بدن پر رعشہ طاری تھا اور اس کے ہاتھ پیروں میں سنسنی دوڑ رہی تھی اس کا دماغ سن ہوا جا رہا تھا اور حواس جیسے جواب دیئے جا رہے تھے اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔

"تم نے .... تم نے اس کو دیکھ لیا؟" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں اپنے بیٹے سے کہا۔ "اس کو پہچان لیا تم نے اچھی طرح سے؟ وہ امیر خان ہے تمہارے باپ کا قاتل اور تم نے اسے ہلاک کرنا ہے' تم کو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا ہے۔ تم کو اپنے مقتول باپ کے خون کا حساب چکانا ہے اب .... اب .... اب تو تم نے اس کو دیکھ لیا اور پہچان لیا اب کوئی مشکل نہیں.........."

گل زماں کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا وہ بالکل بت بنا ہوا خاموش کھڑا تھا اس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔

"جاؤ.........." زرینہ نے دھیمی' ہلکی لیکن مستحکم آواز میں کہا۔ "اس کو قتل کر دو ....

امیر خان کو قتل کر دو اور اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے لو.......... تمہیں اس کے پیچھے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اماں.........." گل زماں کے پتھریلے ہونٹوں سے ایک پتھریلی آواز برآمد ہوئی۔ "اماں .... وہ شائلہ کا ماموں ہے؟"

"کون شائلہ؟ کیسی شائلہ؟" زرینہ نے غم و غصہ کے عالم میں زور سے چلائی۔ "میں کسی شائلہ کو نہیں جانتی ہوں۔ ہاں .... میں کسی شائلہ وائلہ کو نہیں جانتی ہوں میں صرف امیر خان کو جانتی ہوں' اس امیر خان کو جانتی ہوں جس نے میرے شوہر کو' تمہارے باپ کو قتل کیا تھا اور مجھ کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی وہ ہمارا دشمن ہے۔ وہ سب لوگ ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے دشمنوں کا خاندان ہے تم کو اس شخص کو قتل کرنا ہو گا تم کو اپنے باپ کے قاتل کو ٹھکانے لگانا ہو گا۔ تم اس سے بچ نہیں سکتے۔"

"آپ .... ذرا آرام کیجئے اماں۔" گل زماں نے نرمی سے کہا اور اس کو پلنگ پر لٹانے کی کوشش کی۔ زرینہ نے غصے کے عالم میں اس کے دونوں ہاتھوں کو جھٹک دیا۔

"اگر تم بزدل ہو گئے ہو' اگر تمہارے ہاتھوں میں ہتھیار اٹھانے کی طاقت نہیں ہے اور تم اپنے باپ کے خون کا بدلہ نہیں لینا چاہتے تو نہ سہی۔" زرینہ نے غصے میں گرج کر کہا۔ "میں تو ابھی زندہ ہوں اور میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت موجود ہے کہ میں اپنے شوہر کے قاتل سے انتقام لے سکوں۔ میں خود اپنے ہاتھ سے امیر خان کو گولی ماروں گی۔ میں اپنے شوہر کے قاتل کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کر دوں گی۔"

"نہیں اماں نہیں۔" گل زماں نے گھبرا کر کہا۔ "آپ ایسا مت کیجئے جو کچھ آپ چاہتی ہیں ویسا ہی ہو گا فی الحال تو آپ آرام کیجئے۔"

"میری قسمت میں اس وقت تک آرام نہیں ہے جب تک کہ امیر خان زندہ ہے۔" زرینہ نے کہا۔ "ابھی تک تو مجھے اس کے بارے میں نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے لیکن اب معلوم ہو چکا ہے۔ وہ تو یہیں کراچی میں موجود ہے زندہ سلامت بس اب تم کو دیر نہیں کرنی چاہئے اور مجھے صاف صاف بتا دو اگر تم اس کو مارنا نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں' میں خود اس کو مار دوں گی۔ تم تو اس کو مارنے کے بعد خاموشی سے یہاں سے کہیں باہر جا سکتے ہو میں تو کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔ میں کہاں جا سکتی ہوں؟ میں یہیں رہوں گی اور جو بھی میرا انجام ہو گا اس کو بھگتوں گی۔"

"نہیں نہیں اماں' ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" گل زماں نے اس کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ "آپ آرام کیجئے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اب سب کچھ تو ٹھیک اسی وقت ہو گا جب میں امیر خان کی موت کی خبر سنوں گی۔" زرینہ نے کہا۔ "اس سے پہلے تو کچھ ٹھیک نہیں ہو گا کچھ ٹھیک نہیں ہو گا۔" اور وہ تکئے میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔

گل زماں چند منٹ تک وہاں کھڑا رہا اور پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اس کو کیا کرنا ہے اس کی ماں انتقام کی آگ میں جل رہی تھی اور اندھا دھند تباہی و بربادی کے راستے پر جا رہی تھی وہ خود کو بھی تباہ کر لینا چاہتی تھی اور اس کو بھی تباہ کر دینا چاہتی تھی۔ اس کو ایسا کرنے سے روکنے کی ضرورت تھی اس کے دماغ میں جو خوفناک لاوا پک رہا تھا اس کو ٹھنڈا کرنے کی ضرورت تھی گل زماں پھانسی پر نہیں لٹکنا چاہتا تھا وہ جیل نہیں جانا چاہتا تھا وہ جینا چاہتا تھا اپنے لئے' اپنی ماں کے لئے اور شمائلہ کے لئے .... اس نے اور شمائلہ نے تو ابھی جینا سیکھا ہی تھا اور ماں چاہتی تھی کہ اپنے ساتھ ان دونوں کو بھی خون کے سمندر میں ڈبو دے۔

گل زماں اپنے گھر سے نکلا تو سیدھا دراز گل کے مکان کی طرف روانہ ہوا اسے اندازہ تھا کہ دراز گل اس وقت اپنے پی آئی بی کالونی والے مکان میں موجود ہو گا جہاں اب اس نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔

گل زماں کا خیال ٹھیک نکلا دراز گل اس وقت اپنے دفتر میں موجود تھا اور اس کے دفتر میں گل زماں کی آمد کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی گل زماں تو برابر اس کے دفتر میں آتا رہتا تھا اور کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔

لیکن دراز گل اس کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ کوئی نہ کوئی بہت خاص بات ضرور ہے گل زماں کے چہرے پر جیسے خاک اڑ رہی تھی۔

☆======☆======☆

"یہ .... یہ .... کون تھیں اماں؟" زرینہ اور گل زماں کے گھر سے نکل جانے کے بعد شمائلہ نے مرتعش آواز میں اپنی ماں سے پوچھا۔ "کیا .... یہی .... یہی۔"

"ہاں بیٹی۔" شاہدہ نے ایک لمبی اور گہری سانس لے کر جواب دیا۔ "یہی زرینہ تھی خیر زماں کی بیوی جس نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف خیر زماں سے شادی کی تھی جو خیر زماں کے ساتھ اپنے گاؤں سے بھاگ کر کراچی آئی تھی۔" اس کے آگے شاہدہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے آگے وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ اسی زرینہ کے شوہر خیر زماں کو امیر خان نے قتل کیا تھا لیکن یہ الفاظ اس کی زبان پر آ کر رک گئے وہ ان کو ادا نہیں کر سکی۔

"مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی امی........" شمائلہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "مجھے بھی نہیں معلوم تھی اور گل زماں کو بھی نہیں معلوم تھی ہم دونوں کو نہیں معلوم تھا کہ ہم ایک دوسرے کے دشمنوں کی اولاد ہیں۔"

"ہم لوگ اس دشمنی کی کافی سزا بھگت چکے ہیں۔" امیر خان نے ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اور خاص طور سے میں تو اپنا سب کچھ کھو چکا ہوں بیٹی۔ میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں بچا۔"

امیر خان نے ٹھیک ہی کہا تھا' اس دشمنی کے پیچھے وہ تو اپنا سب کچھ لٹا چکا تھا سب سے زیادہ عذاب تو اس کی قسمت میں لکھے تھے جنہیں اس کو جھیلنا پڑا تھا۔ سب سے زیادہ آزار تو اس کی ذات نے ہی سہے تھے یہ وہی تو تھا جس کی زندگی کے اتنے بہت سارے سال اس سے چھین لئے گئے تھے اور اس کے عزیز ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے اور وہ اپنے بہنوئی اور باپ کے جنازوں کو کندھا بھی نہیں دے پایا تھا۔

یہ انکشاف کہ گل زماں مرحوم خیر زماں اور زرینہ کا بیٹا تھا شاہدہ اور امیر خان کے لئے دل دہلا دینے والا تھا اور جو کچھ وہ سوچ رہے تھے اس کا پورا ہونا تو اب ناممکن تھا شمائلہ اور گل زماں کے خاندانوں کے درمیان تو دشمنی کی حکمرانی تھی۔

شاہدہ اور امیر خان تو اس صورت حال کو برداشت کر کے اس پر صبر کر سکتے تھے لیکن شمائلہ کیا کرتی؟ اس کی آنکھوں میں تو دنیا اندھیر ہوئی جا رہی تھی۔ اس کو نہیں معلوم تھا کہ اس کی محبت کا کیا انجام ہو گا وہ اس انجام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی مگر قبول کئے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس کا سگا ماموں گل زماں کے باپ کا قاتل تھا .... تو پھر گل زماں کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہو سکتا تھا؟ دشمنی کے علاوہ اور کون سا رشتہ ہو سکتا تھا؟ لیکن اس نے تو گل زماں کے ساتھ وہ رشتہ جوڑ لیا تھا جو دنیا کا سب سے زیادہ پاکیزہ اور مضبوط رشتہ تھا۔ ایسا رشتہ جو ازلی اور ابدی تھا اس نے اس کے ساتھ محبت کا رشتہ

جوڑا تھا اور وہ اس رشتے کو ساری زندگی قائم رکھنا چاہتی تھی لیکن .... لیکن یہ تو ابتدا میں ہی ٹوٹ رہا تھا ٹوٹتا جا رہا تھا۔ وہ اس کو زندہ اور باقی رکھنے کے لئے کیا کر سکتی تھی؟ اس کو نہیں معلوم تھا کہ خود گل زماں کے دل کی اب کیا کیفیت ہو گی۔

اس کے گھر میں سوگواری کی فضا طاری تھی امیر خان نے اس سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی اور شاہدہ نے بھی زیادہ بات نہیں کی اب کہنے سننے کے لئے کچھ زیادہ باقی نہیں تھا۔ شمائلہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور بستر پر لیٹ گئی اس کا دماغ اور اس کا جسم دونوں ہی شل ہوئے جا رہے تھے۔

رات گئے دروازے پر دستک ہوئی امیر خان نے اٹھ کر دروازہ کھولا وہ ان لوگوں کے جانے کے بعد گھر میں ہی موجود تھا اور کہیں باہر نہیں گیا تھا اس کو کچھ کام بھی تھے لیکن گھر سے باہر نکل کر کہیں جانے کو اس کا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

امیر خان نے جب دروازہ کھولا تو اس نے وہاں گل زماں کو پایا لیکن گل زماں اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی اور بھی تھا امیر خان اس بوڑھے آدمی کو نہیں جانتا تھا اسے گل زماں کی دوبارہ آمد پر بہت تعجب ہوا گل زماں نہ صرف یہ کہ یہاں دوبارہ آیا تھا بلکہ اکیلا نہیں آیا تھا کسی اور کو بھی اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ یہ دوسرا شخص کون تھا؟

"اوہ .... امیر خان.........." بوڑھے آدمی نے امیر خان کو دیکھتے ہی بے ساختہ کہا۔ "تم کس قدر بدل گئے ہو .... لیکن پھر بھی میں نے تم کو پہچان لیا۔ میں نے تم کو آخری بار اس دن دیکھا تھا جب عدالت میں تمہاری سزا کا اعلان ہوا تھا۔"

"آپ .... آپ کون ہیں؟" امیر خان نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"یہ ماما دراز گل ہیں۔" بوڑھے آدمی کے بجائے گل زماں نے فوراً جواب دیا۔ "یہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"دراز گل!" امیر خان نے پُرہیجان آواز میں کہا۔ "تو یہ آپ ہیں ماما دراز گل .... آپ کافی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آیئے .... آیئے اندر آیئے۔"

امیر خان نے ان دونوں کو اندر بلا لیا اور اس کے ساتھ ہی شاہدہ کو بھی بتا دیا کہ مرحوم خیر زماں کا سگا ماموں دراز گل آیا ہے۔

شاہدہ دراز گل کے نام سے بخوبی واقف تھی خیر زماں اور زرینہ کی شادی کے سلسلہ

میں دراز گل نے جو کردار ادا کیا تھا اس سے بابر خیل اور ڈیرہ امین گل کے اس وقت کے سارے ہی لوگ بخوبی واقف تھے۔ شاہدہ نے شاید ایک آدھ بار دراز گل کو کہیں اِدھر اُدھر دیکھا بھی تھا شاہدہ فوراً ہی بیتابانہ انداز میں دوڑی ہوئی آئی اور اس نے دراز گل کو سلام کیا دراز گل نے اس کو دعائیں دیں۔

"آپ مجھے دعا دے رہے ہیں ماما' مگر ہمارے حصے میں تو بس بدنصیبی ہی بدنصیبی ہے آپ تو جانتے ہیں' سب کچھ جانتے ہیں ماما دراز گل.........." اور وہ آگے کچھ نہ بول سکی اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"ہاں بیٹی' میں جانتا ہوں۔" دراز گل نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ "میں ان ساری بدنصیبیوں سے نہ صرف یہ کہ بخوبی واقف ہوں بلکہ ان کا چشم دید گواہ بھی ہوں جو ان دونوں خاندانوں پر نازل ہوئی ہیں بہت وقت گزر چکا ہے بہت بربادی ہو چکی ہے بس اب اس سلسلہ کو ختم ہو جانا چاہئے۔"

اس وقت شمائلہ اس کمرے میں داخل ہوئی اور شاہدہ نے اس کو دیکھ کر کہا۔ "آؤ بیٹی' اندر آ جاؤ .... یہ ماما دراز گل ہیں ہم لوگوں سے کچھ بات کرنے آئے ہیں۔"

شمائلہ سکڑی' سہمی ایک طرف بیٹھ گئی۔

"جو نقصان ہو چکا ہے ماما دراز گل اس کی تو اب تلافی نہیں ہو سکتی۔" امیر خان نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن مجھے اپنے کئے کی کافی سزا مل چکی ہے میں نے زرینہ بہن سے کہا تھا کہ میں ان سے معافی کا طلبگار ہوں اور یہ کہ ہم لوگوں کو ساری پرانی باتیں بھول جانا چاہئے۔"

"میں ساری پرانی باتوں کو بھلا دینے کے لئے ہی یہاں آیا ہوں امیر خان!" دراز گل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "جو کچھ ہو چکا ہے وہ مجھے سب معلوم ہے اور وہ بھی معلوم ہے جو کہ تم لوگوں کو نہیں معلوم ہے۔ زرینہ نے بچپن سے اپنے بیٹے کو اس بات کے لئے تیار کیا ہے کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کو اپنے ہاتھ سے گولی مارے اور آج اس نے امیر خان کو پہچاننے کے بعد گل زماں کو سختی کے ساتھ تاکید کر دی تھی کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کو ختم کر دے۔ گل زماں میرے پاس آیا اور اس نے مجھ کو ساری بات بتا دی۔ شمائلہ اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور اس کی عزیز دوست ہے۔ وہ بھلا اپنی عزیز دوست کے ماموں کو گولی کس طرح مار سکتا ہے؟ اور ویسے بھی اگر شمائلہ اور گل زماں کے درمیان دوستی کا

رشتہ نہ بھی موجود ہوتا تب بھی گل زماں اس کے لئے تیار نہیں تھا اسے امیر خان کا انجام معلوم تھا اور وہ اپنا بھی یہی انجام نہیں چاہتا تھا وہ زندہ رہنا چاہتا ہے پھانسی پر لٹکنا اور جیل جانا نہیں چاہتا۔"

دراز گل ذرا دیر کے لئے رک گیا اور ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگا جو بڑی خاموشی اور توجہ کے ساتھ اس کی بات سننے میں مصروف تھے۔

"گل زماں اس معاملے میں میری مدد چاہتا تھا اور میں نے اس کی مدد کی۔" قدرے توقف کے بعد دراز گل نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ "میں اس کو ساتھ لے کر زرینہ کے پاس گیا زرینہ غیظ و غضب کے عالم میں تھی اور اس کا یہ غصہ بجا بھی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کے دکھ کا اندازہ نہیں کر سکتا اس نے کس طرح زندگی گزاری .... اور کس طرح اپنے بیٹے کو پال پوس کر جوان کیا۔"

"اور اب وہ خود ہی اس کو ایک نامعلوم عذاب کے جہنم میں دھکیل دینا چاہتی ہے۔" شاہدہ نے آہستہ سے کہا۔

"میں نے اس کے پاس جا کر اس کو سمجھایا۔" دراز گل نے کہا۔ "میں اور گل زماں دونوں اس کے پاس گئے اور ہم نے اس کو بہت سمجھایا' اس کو سمجھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن ہم نے اس کو اس بات پر راضی کر لیا ہے کہ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر تم لوگوں کے ساتھ دوستی کر لے۔"

"واقعی؟" امیر خان نے حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔ "کیا .... واقعی؟"

"ہاں امیر خان۔" دراز گل نے کہا۔ "زرینہ نے تم کو اپنے شوہر کا خون معاف کر دیا ہے وہ اب تم سے کوئی بدلہ نہیں لینا چاہتی۔ میں نے اس کو اس بات پر راضی کر لیا ہے کہ اپنے بچوں کی خوشی کی خاطر اپنے بچوں کی دوستی کی خاطر ہم سب ان پرانی باتوں کو بھول جائیں مل کر ایک ایسی نئی زندگی کا آغاز کریں جس میں ایک دوسرے کے لئے نفرتیں نہیں ہوں گی بلکہ پیار ہو گا محبتیں ہوں گی۔"

"اگر زرینہ اس کے لئے آمادہ ہو گئی ہے تو سب سے زیادہ خوشی کی بات تو یہ میرے لئے ہے۔" امیر خان نے کہا۔ "خیر زماں کے قتل کی سزا کاٹ لینے کے بعد بھی میرے دل کو پوری طرح سکون حاصل نہیں ہوا تھا اگر زرینہ نے مجھے معاف کر دیا ہے تو مجھے بہت

خوشی ہو گی۔"

"ہاں' اس نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "اور مجھے یہ اختیار دے کر تم لوگوں کے پاس بھیجا ہے کہ میں اس کی طرف سے تم لوگوں کو بتا دوں کہ اس نے تم سب لوگوں کو معاف کر دیا ہے اور اگر اس کا بیٹا تمہارے گھرانے کے ساتھ کوئی نیا رشتہ جوڑنے کا خواہشمند ہے تو اس کو کوئی اعتراض نہیں ہے' لیکن میں اس سے یہ کہہ کر آیا ہوں کہ میں تم لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر اس کے پاس آؤں گا تاکہ خود اپنی زبان سے تم لوگوں کو معاف کرنے کا اعلان کرے اور تمہاری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔"

"یہ تو آپ نے بہت ہی اچھا کیا ماما دراز گل۔" امیر خان نے پُرہیجان انداز میں کہا۔ "ہم زرینہ کے پاس چلنے کے لئے تیار ہیں ابھی اور اسی وقت' ہاں ہم اس کے پاس چل کر معافی مانگیں گے وہ جب یہاں آئی تھی تو میں نے اس سے معافی مانگی تھی لیکن اس نے میری بات سنی ہی نہیں اس وقت وہ بہت غصے میں تھی۔ وہ گل زماں کا ہاتھ پکڑ کر یہاں سے چلی گئی۔"

"لیکن اب میں نے اس کا برسوں پرانا غصہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔" دراز گل نے کہا۔ "تم لوگ میرے ساتھ چلو .... آج ہم اس قصے کو ہمیشہ کے لئے دفنا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔"

"میں تیار ہوں۔" امیر خان نے کہا اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

شائلہ سارا وقت وہاں موجود رہی تھی اور ان لوگوں کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو کو خاموشی سے سنتی رہی تھی۔

"جب تک میں اور شاہدہ جانے کے لئے تیار ہوتے ہیں تب تک تم ماما دراز گل اور گل زماں کے لئے چائے وغیرہ کا بندوبست کرو۔" امیر خان نے شائلہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے امیر خان اور شاہدہ' دراز گل اور گل زماں کے ساتھ۔

"ہم تینوں نے فوراً ہی ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔" امیر خان آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ "اگرچہ وقت نے ہم لوگوں کی صورتوں کو کتنا زیادہ بدل ڈالا ہے لیکن پھر بھی ہم سب نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ زرینہ نے مجھ کو اور شاہدہ کو پہچان لیا اور میں نے اور

شاہدہ نے زرینہ کو پہچان لیا۔"

"کتنا زمانہ گزر گیا ان ساری باتوں کو۔" شاہدہ نے جیسے خواب میں بولتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اب گاؤں کی پرانی اور تکلیف دہ روایات کو بھول جانا چاہئے ہم ایک نئی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے بچے تو ایک نئی دنیا کے شہری ہیں ہمیں انہیں نفرتوں کی آگ سے بچانا چاہئے۔"

"نفرتوں کی آگ میں سب کچھ جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔" دراز گل نے کہا۔

"سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔"

وہ لوگ آپس میں باتیں کرتے رہے اور راستہ طے ہوتا رہا یہاں تک کہ بالآخر وہ لوگ پی آئی بی کالونی پہنچ گئے۔

"میں اس سے پہلے اکثر پی آئی بی کالونی آتا رہا ہوں۔" امیر خان نے کہا۔ "لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ بھی یہاں رہتے ہیں اور زرینہ بھی یہاں رہتی ہے۔" اس نے دراز گل کی طرف دیکھا۔

"میں اب یہاں نہیں رہتا ہوں۔" دراز گل نے کہا۔ "میرا دفتر یہاں ہے میری رہائش تو اب فیڈرل بی ایریا میں ہے میں تم لوگوں کو اپنے گھر لے چلوں گا تاجور سے اور بچوں سے ملواؤں گا۔ تاجور تم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہو گی اس کو ابھی تک اس بارے میں کچھ نہیں معلوم وہ تو ہمیشہ سے ان دشمنیوں کے خلاف تھی اور اس نے خون خرابے کو کبھی بھی پسند نہیں کیا۔"

"اور اب تو ان کو یہ جان کر بہت زیادہ خوشی ہو گی کہ وہ سارے پرانے قصے ختم ہو گئے اور ہم لوگوں نے ایک دوسرے کی جانب صلح اور محبت کا ہاتھ بڑھایا ہے۔" شاہدہ نے کہا۔ "ہم کل ہی ان سے ملنے چلیں گے اور پھر آپ سب لوگ زرینہ کو ساتھ لے کر ہمارے گھر آیئے۔ زرینہ تو میری بہن ہے۔ ایک مدت کے بعد مجھے اپنی گمشدہ بہن مل رہی ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جب ان کی گاڑی زرینہ کے مکان کے دروازے کے سامنے رکی تو امیر خان اور شاہدہ کے علاوہ دراز گل اور گل زماں کے دل کی دھڑکنیں بھی بہت تیز ہو گئی تھیں۔

دو منزلہ کوارٹر کے دروازے میں آٹومیٹک تالا لگا ہوا تھا جس کی ایک چابی گل زماں کے پاس بھی رہتی تھی عرصہ ہوا کہ زرینہ نے اس کوارٹر کو خرید لیا تھا اور پھر اس کی بالائی

منزل پر سیمنٹ کی چادریں ڈال کر اس کو قابل رہائش بنا لیا تھا۔

دراز گل پر ایک شدید اضطراری کیفیت طاری تھی اس کے لئے زرینہ کو سمجھانا کوئی آسان کام نہیں تھا یہ کوئی ایک دو دن کا غم کوئی مختصر سا صدمہ نہیں تھا یہ تو ایک عمر کا اندوہ تھا۔ اوائل جوانی میں ہی یہ گہرا زخم لگ گیا تھا جو آج تک نہیں بھرا تھا اور اس کا بھرنا آسان نہیں تھا اتنے پرانے درد کو یوں تھوڑی سی دیر میں بھلا دینا کوئی آسان بات تو نہیں تھی۔

دراز گل نے جب گل زماں کے ساتھ جا کر زرینہ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی تو شروع میں تو زرینہ نے اس کی بات سننے سے ہی انکار کر دیا تھا وہ کچھ سننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ مفاہمت کا کوئی تصور اس کے ذہن میں موجود نہیں تھا جس لمحے کے انتظار میں اس نے اتنے برس گزار دیئے تھے۔ اب ماما دراز گل اور اس کا اپنا بیٹا گل زماں مل کر اس سے اس لمحے کو چھین لینا چاہتے تھے۔ وہ اس کو بے بس اور لاچار کر دینا چاہتے تھے۔

"گل زماں اور شمائلہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں زرینہ۔" دراز گل نے آہستہ سے اس سے کہا۔ "یہ دونوں دشمن خاندانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان اس طرح ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں جس طرح تم نے اور خیر زماں نے ایک دوسرے سے محبت کی تھی۔ جبکہ تم دونوں کا تعلق بھی دشمن خاندانوں سے تھا تم دونوں نے اپنی محبت کے لئے ساری دنیا سے جنگ کی اور اپنا حق حاصل کیا اب تم اپنے بیٹے کو اس حق سے کیوں محروم کرنا چاہتی ہو؟"

زرینہ ایک دم خاموش ہو گئی بڑی دیر تک وہ خاموش رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے ماما' آپ جیسا کہیں آپ نے ہمیشہ میری مدد کی ہے آپ میری مدد نہ کرتے تو میرا اور خیر زماں کا دنیا میں کہیں کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا .... آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میں نے اپنے شوہر کا خون معاف کر دیا میں نے ان لوگوں کو معاف کر دیا اور اگر گل زماں شمائلہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کر لے مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"کیا سچ؟" گل زماں ایک دم دوڑ کر اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ "آپ سچ کہہ رہی ہیں اماں؟"

"ہاں گل زماں۔" زرینہ نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں سچ کہہ رہی

ہوں۔ میں سب کچھ تمہاری خوشی کے لئے کر رہی ہوں خدا تم کو خوش رکھے۔"

"میں ان لوگوں کو تمہارے پاس لے کر آتا ہوں تم ان لوگوں سے خود اپنی زبان سے کہہ دو کہ تم نے ان کو معاف کر دیا ہے۔ میں اور گل زماں ان لوگوں کو لے کر آتے ہیں۔"

اور اب دراز گل ان لوگوں کو لے کر آ گیا تھا گل زماں نے مکان کی چابی نکالی اور دروازہ کھول دیا وہ سب لوگ اندر داخل ہو گئے۔

مکان کا دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا اور جب یہ لوگ اندر داخل ہوئے تو انہوں نے زرینہ کو ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر لیٹے ہوئے پایا اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی اس نے آنکھ اٹھا کر آنے والوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

گل زماں دوڑ کر اپنی ماں کے پاس گیا اور اس کے قریب جاتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

اس کی ماں کا بے جان جسم صوفے پر پڑا تھا اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں اور پتھرائی ہوئی تھیں چہرے پر موت کی زردی تھی۔

زرینہ کا ایک ہاتھ اس کے سینے پر تھا اور اس کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔

گل زماں نے جلدی سے وہ کاغذ نکال لیا اس پر اردو میں صرف ایک جملہ تحریر تھا۔

"میں نے اپنے شوہر کے قاتلوں کو معاف کر دیا ہے لیکن اس کے لئے میں خود اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔"

☆====== ختم شد ======☆